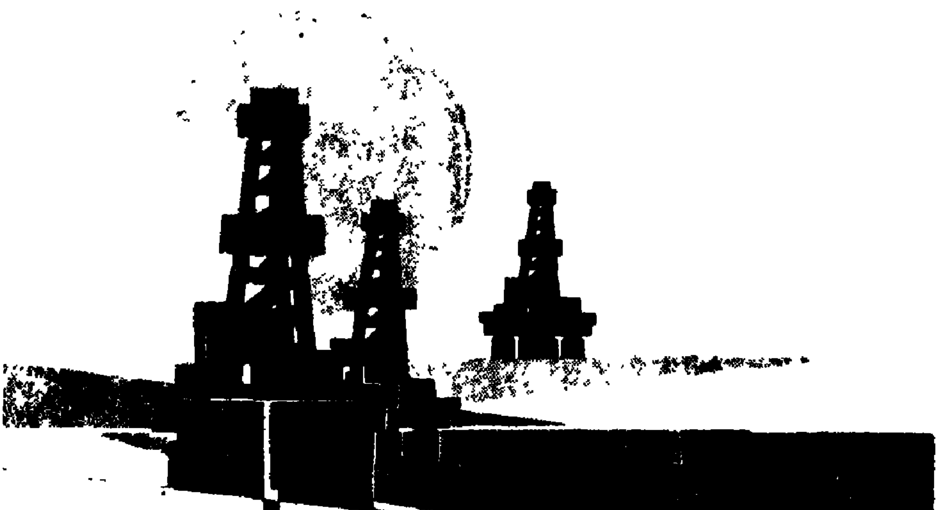
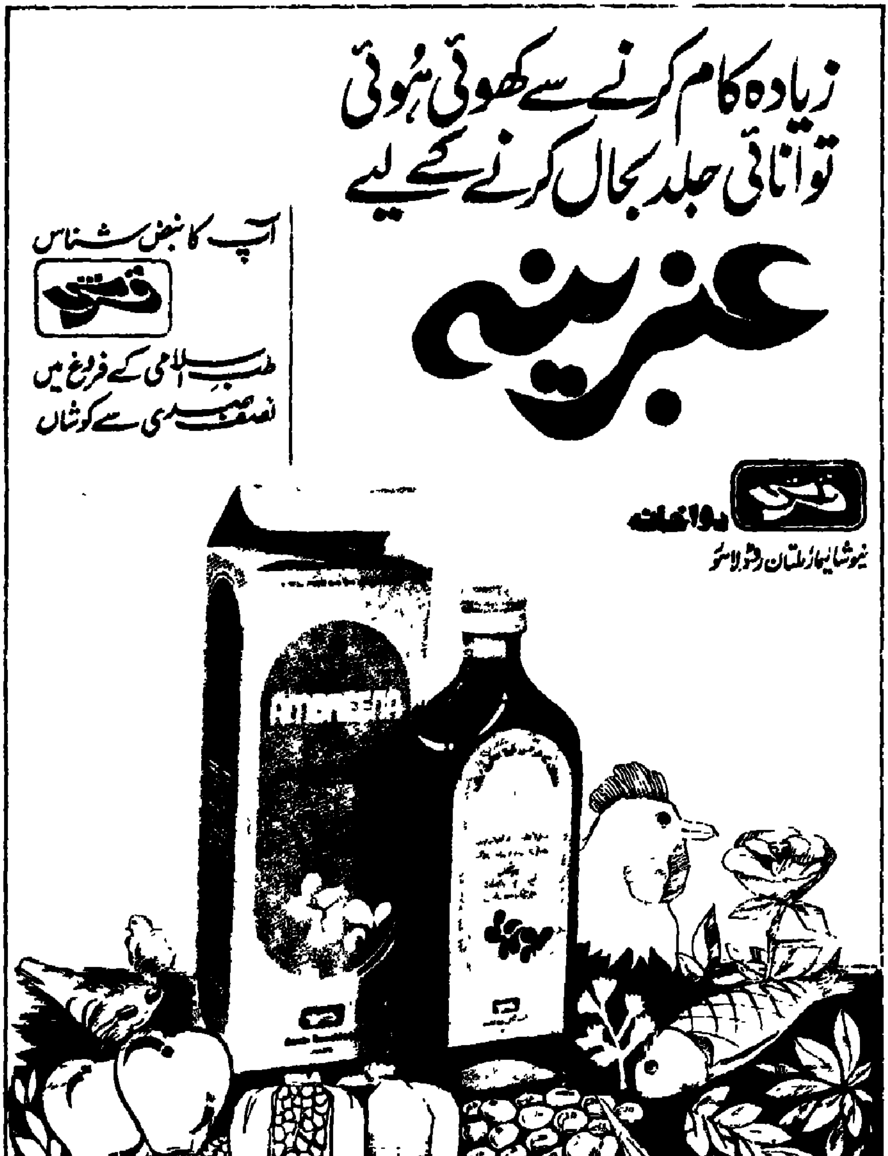


کراچی
۱۹۸۲ء



Adarts SUA-4/84




زیادہ کام کرنے سے کھوئی ہوئی
توانائی جلد بحال کرنے کے لیے
عنبرینہ
آپ کا نبض شناس
طبِ اسلامی کے فروغ میں
نصف صدی سے کوشاں
دواخانہ
نیوشالیمار ملتان روڈ لاہور


TX14
فلپس
وی سی آر
کنکشن کے ساتھ
Tropicalised
۱۲ وولٹ کی
بیٹری پر بھی
قابل استعمال
فلپس کا ۱۴" پورٹیبل ٹیلیویژن
آپکی تفریح کیلئے
ہر جگہ آپ کے ساتھ
دنیا بھر میں تکنیکی مہارت کے لیے مشہور فلپس پیش کرتے ہیں TX 14 چودہ انچ اسکرین کا بلیک اینڈ وائٹ پورٹیبل ٹیلیویژن۔ خوبصورت، مضبوط اور کم وزن TX 14 آپ جہاں چاہیں آسانی سے لے جا سکتے ہیں۔
اسے ۲۲۰ وولٹ اے سی کے علاوہ ۱۲ وولٹ بیٹری پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ TX 14 وی سی آر کنکشن کے ساتھ بھی دستیاب ہے۔
اپارٹمنٹ، چھوٹے گھروں اور دیہات کے لیے خاص طور پر موزوں اور بڑے گھروں میں ایک سے زائد سیٹ کے لیے بہترین TX 14 بجلی کے کم خرچ کے باعث ایک کفایتی سیٹ ہے۔
بعد از فروخت سروس کی سہولت ملک بھر میں ۲۰۰ سے زائد فلپس ڈیلرز اور فلپس سروس سینٹرز کراچی، لاہور اور راولپنڈی اعلیٰ تربیت یافتہ ماہرین کے ذریعہ فراہم کرتے ہیں۔
اعلیٰ کارکردگی، قابل اعتمادی اور پائیداری۔ یہی فلپس کی خصوصیت ہے۔
20" Super Table
24" Console
فلپس۔ ٹیکنالوجی میں اولین، اسٹائل میں جدید ترین
PH 13 84 UD

خواتین کے لیے صاف ستھرا تحریری ادب

ماہنامہ آنچل کراچی

مدیرۂ اعلیٰ سمیٰ کنول

نگران — مشتاق احمد قریشی

مدیرہ — زیب النساء

نائب مدیرہ — عطیہ زرین علوی

مدیر عمومی — راحیلہ ناز

منتظم — آغاز الدین قریشی

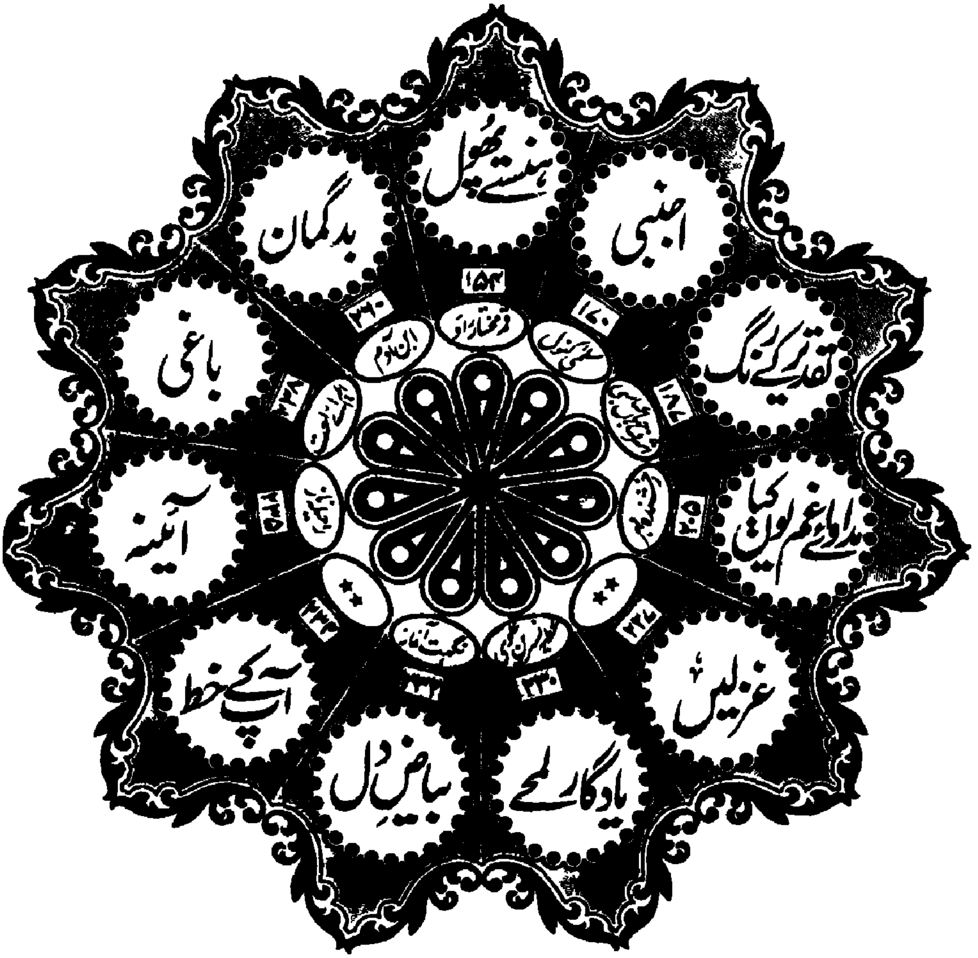
تزئین — تسنیم اختر

شمارہ — ۱۱ جلد — ۶ فروری — ۱۹۸۴ء قیمت بارہ روپے

خاص شمارہ



پبلشر پُرخسانہ بیگم نے شیخ سلطان ٹرسٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا ○ مقام اشاعت: ۱۰/۵ اے ناظم آباد کراچی ○ فون نمبر ۲۱۴۳۵۸



خط و کتابت کا پتہ، ماہنامہ آنچل، جی پی او بکس ۷۵ کراچی ○ دفتر کا پتہ۔ ۲۲ سعید مینشن بلمو ریا اسٹریٹ۔ آف آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی

سرگوشیاں

اَلسلامُ علیکم

فروری کا آنچل حاضرِ مطالعہ ہے۔

آنچل کی سالگرہ کے دن قریب آتے جا رہے ہیں۔ ہم نے تو کام بھی شروع کردیا۔ بہنوں سے گزارش ہے کہ وہ سالگرہ نمبر کے لئے اپنی اپنی نگارشات ۲۰ فروری تک روانہ فرمادیں۔ تاخیر کے باعث شاملِ اشاعت کرنا ہمارے لئے ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔

ہمیں ازحد خوشی ہے کہ آپ نے محترمہ سمیٰ کنول کے مختصر انٹرویو کو بڑی محبت و خلوص اور دردمندی سے قبول فرمایا۔

محترم کرنل اعجاز قدیر کے مذہبی مضامین کو قارئین نے ازحد پسند فرمایا ہے۔ ہم اِن سطور کے ذریعے محترم بھائی کرنل اعجاز قدیر سے التماس کرتے ہیں کہ اپنے بصیرت افروز اور تاریخِ اسلام سے متعلق مضامین سے آنچل کو نوازتے رہیں۔

اس ماہ محترم پروفیسر آل احمد سرور کا انٹرویو پیش کیا جارہا ہے۔ قارئین! گزشتہ برس پاک و ہند کے بڑے بڑے قلمکار و ادبی میدان کے اہم ستونوں کی آمدورفت رہی۔ یہ ایک خوش آیند بات ہے۔ ثقافتی اور سفارتی بنیادوں پر فنکار جتنا اہم رول ادا کرسکتے ہیں وہ کسی اور شعبے کے لوگوں سے ممکن نہیں۔

انہی اہم لوگوں میں پروفیسر آل احمد سرور بھی ہیں۔ ہماری دیرینہ خواہش تھی کہ اُن کا انٹرویو حاصل کریں۔ جب گزشتہ برس جناب مشتاق احمد قریشی ہندوستان جارہے تھے تو اُن سے بھی ہم نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا مگر وہ علی گڑھ نہیں جاسکے تھے۔

یہ انٹرویو بڑی دشواری سے حاصل کیا گیا ہے۔ کیونکہ پروفیسر صاحب پندرہ روز قبل ڈائجسٹوں کے بارے میں اپنی منفی رائے کا اظہار کرچکے تھے۔ ظاہر ہے آنچل کو انٹرویو دینے کا مطلب تھا کہ اپنے الفاظ کی نفی کرنا اور اس کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ جب اُنھیں پوری طرح یقین دِلا دیا کہ "آنچل" ڈائجسٹ نہیں بلکہ ماہنامہ ہے۔ کاغذ کی قلت کی وجہ سے بس ذرا سائز چھوٹا ہوگیا ہے تو یہ مشکل تمام کچھ جملے دینے پر راضی ہوئے۔ یہ انٹرویو بہت پہلے حاصل کیا جاچکا تھا۔ اس وقت کی بات ہے جب ایک روزنامے کے سوا کہیں اور اُن کا انٹرویو شائع نہ ہُوا تھا۔ مگر کچھ ناگزیر وجوہات کی بناپر تاخیر سے شائع ہورہا ہے۔

قارئین! جناب پروفیسر آل احمد سرورؔ بنیادی طور پر ایک استاد ہیں۔ ایک استاذ سب کا استاد ہوتا ہے۔ بالواسطہ بھی بلاواسطہ بھی۔ اُنھوں نے اَدب، تنقید اور اُردو زبان کے بارے میں جتنا بھی اظہارِ خیال فرمایا ہے گوکہ وہ ہماری ضرورت کے مطابق کافی نہیں۔ مگر اچھے طالبِ علم کی حیثیت سے ہمیں ہر بات کو گرہ میں باندھ لینا چاہیئے۔

ہم نے بارہا عرض کیا ہے کہ اُردو اَدب تخلیق کرنا آسان کام نہیں ایک اُردو اَدب ہی کیا؟ ہر زبان کا اَدب تخلیق کرنا اس وقت تک آسان نہیں جب تک کہ زبان و بیان پر پوری طرح عبور حاصل نہ ہو اس کے لئے مطالعہ شرطِ اوّل ہے۔ کتاب لکھنے کے لئے کتاب پڑھنا ضروری ہے۔ گوکہ ہم بھی ہنوز طالبِ علم ہی ہیں۔ لیکن اس وقت نئے لکھنے والوں سے مخاطب ہیں۔ اُن سے گزارش ہے کہ اگر وہ واقعی لکھنے لکھانے میں سنجیدہ ہیں تو اپنی تفریحات کو تج کر مطالعے کی عادت ڈالیں۔ یہی عادت ایک دن ذہنی و قلبی تفریح بن جائے گی۔ اُردو کے ادبِ عالیہ کا مطالعہ کریں۔ ساتھ ہی اِملے پر توجّہ دیں۔ حروفِ تہجّی کا صحیح استعمال بھی آنا ضروری ہے۔ ہمارے یہاں آج کل اِملے میں صوتی طریقے پر الفاظ لکھے جارہے ہیں۔ اور اِس بات کو قطعی نظرانداز کر دیا ہے کہ وہ لفظ عربی کا ہے۔ فارسی یا ہندی بھاشا کا۔ اِملا درست نہ ہونے کی وجہ مطالعے کا فقدان

ہے۔ کچھ بہنیں اصلاح پر بھی غور نہیں کرتیں اور دوبارہ سہ بارہ غلط اِملا لکھتی ہیں۔ ایک اچھا ادیب اِن خامیوں سے مبرّا ہوتا ہے۔

انشا پردازی بُری چیز نہیں لیکن اس کے لئے بھی زبان و بیان پر عبور ضروری ہے۔ کئی بہنوں کی تحریر محض بے ضرورت انشا پردازی کی وجہ سے بوجھل اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے ساتھ ہی اس میں واقعات کی کمی کی وجہ سے سُست رفتاری کی خامی بھی موجود ہوتی ہے۔ تشبیہہ اور استعارے بھی بے ضرورت نہیں ہونا چاہئیں۔ انتہائی ضرورت میں تو ٹھیک ہے ورنہ جو چیز جیسی ہے ویسی ہی لکھی جانی چاہیئے۔ بڑا ادیب کبھی تشبیہات واستعارات کا بے جا سہارا نہیں لیتا۔

شاعری کے ضمن میں گزارش ہے کہ بڑے شعراء کا مطالعہ کیجئے۔ بہت زیادہ مطالعہ... شعر کہنا آسان نہیں' دریا کو کوزے میں بند کرنا ہوتا ہے اور یہ فن آپ اپنے بڑے شعراء سے ہی سیکھ سکتی ہیں۔ شاعری کے لئے تجرباتِ زندگی' علم' فہم وادراک' مشاہدہ... یہ وہ اجزا ہیں جن کی ضرورت پڑتی ہے — خاص طور پر فارسی زبان کی شُدبُد بھی ہونا چاہیئے۔

جہاں تک علامتی شاعری اور علامتی نثر کا تعلق ہے تو محترم آل احمد سُرور اس کے بارے میں بہت واضح اظہارِ خیال فرما چکے ہیں۔ ابہام اگر کسی طرح ہو کہ صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں' تو ذہن پر خوشگوار اثر مرتب کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں ظفر اقبال کی شاعری بہت پسند ہے۔ غزل خوبصورت بھی ہوتی ہے اور سیدھی سادی بھی لیکن اپنے اندر معنوں کی ایک دُنیا چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔ اس وجہ سے انھیں ایک خاص طریقے کی داد ملتی ہے۔ جسے داد دینے والا بھی سمجھتا ہے اور داد لینے والا بھی۔

تخلیقِ ادب کی بات ہو رہی ہے تو ایک خوش خبری سُن لیجئے۔ اُردو کے نامور ادیب جناب اے۔ حمید صاحب نے آنچل کے لئے کچھ تخلیق کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اے۔ حمید صاحب تو وہ ہستی ہیں جو بچوں میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ اُن کا ایک خاص اسلوب ہے۔ ہم نے جب بھی اُن کی کوئی تحریر پڑھی تو ہمیں یہی محسوس ہوا کہ پھولوں کے کنج میں بیٹھے ہیں اور ہمارے چاروں طرف خوشبو بکھر رہی ہے۔ اے۔ حمید وہ واحد قلم کار ہیں جن کی تحریر کو پڑھ کر پھولوں کا احساس ہوتا ہے... انشاء اللہ جلد ہی ہم اُن کی تحریر آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

عزیز بہنو! آپ کی طرف سے ایک سوال اُٹھ سکتا ہے۔ جس کا جواب ہم پیشگی دے رہے ہیں۔ شاید آپ کو یہ خیال گزرے کہ آنچل میں مرد حضرات کا اوسط بڑھتا جا رہا ہے تو اُس کے لئے عرض ہے کہ ہماری کوشش ہے کہ بہتر سے بہتر تخلیقات آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کرنے کا فخر حاصل کر سکیں۔ آنچل نیم ادبی پرچہ کہا جاتا ہے اور ادب کو عورت اور مرد کے طبقات میں بانٹنے کی بدذوقی تو شاید آپ لوگ بھی نہ کریں۔ اس کے علاوہ ہماری یہ بھی خواہش اور کوشش ہے کہ آنچل کو تعلیم یافتہ طبقہ اور ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والا طبقہ بھی پڑھنے میں عار نہ سمجھے۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ بھی بڑے ادیب کی بڑی تحریر پڑھنا پسند کریں گی۔ اس طرح ہم آنے والی نسلوں کو ایک اچھا معیار پیش کر سکیں گے۔

اور یہ سب اس لیے بھی مجبوراً کرنا پڑتا ہے کہ ہمیں اپنی ہم صنف بہنوں کا تعاون تو حاصل ہے لیکن اچھی تخلیق کا فقدان ہی رہتا ہے جبکہ پرچے کے لیے زیادہ تحریروں کی ضرورت رہتی ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ بہتر سے بہتر کی تلاش میں آپ ہماری ہمنوا ثابت ہوں گی۔ خاصی سرگوشیاں ہو چکیں۔ اب کچھ ہنسی مذاق ہو جائے۔ بہت دنوں سے کوئی واقعہ نہیں سُنایا ہے۔ آئندہ ماہ کی سرگوشیوں میں ایک قصہ سُنائیں گے جس کا تعلق ماضی، حال اور مستقبل سے ہے۔ بہت ہی نئی بات سُننے میں آئی ہے۔

بس بے چین ہو گئی ہوں گی کہ ابھی سُنا دیں۔ نہیں' آئندہ...
اگلے ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

مُدیرہ آنچل ۱۶/۱/۸۲

ناقابلِ اشاعت،

بوجھ۔ بلا عنوان' سہاگ کا بٹوارہ۔ بہاروں کی منزل' جیون تجھ پہ وار دوں' ٹوٹے خوابوں کی چبھن۔ ویرانے میں پھول' طمانچہ' ڈوبتے چاند کے سائے

درجوابِ آں

ناہید اختر ۔ کراچی

عزیزہ ناہید اختر ۔۔۔ دُعا ۔ افسانہ موصول ہوا ۔ اچھا تھا چھپ جائے گا ۔ لیکن اس سے پہلے کے افسانوں کے لئے معذرت خواہ ہیں ۔ آپ کی طرف سے ارسال کردہ باقی اشیا بھی موصول ہوگئیں ۔

رعنا تبسم پاشا ۔ شہر ووڈ

عزیزہ رعنا تبسم ۔۔۔ دُعا ۔ محبت نامہ موصول ہوا ۔ خوبصورت لفظوں اور خلوص سے بھرپور تعریف کا شکریہ ۔ لیجئے جواب حاضر ہے ۔ تمام اراکینِ آنچل کی جانب سے سلام قبول فرمایئے ۔ آپ کی ارسال کردہ تمام اشیاء تو نہیں مگر کچھ جگہ پالیں گی ۔ نظم اور غزلوں کے لئے معذرت خواہ ہیں ۔

امتیاز طاہرہ ۔ خانیوال

عزیزہ بہن امتیاز طاہرہ ۔۔۔ دُعا ۔ آنچل کی پسند اور پہلی بار خط لکھنے کا شکریہ ۔ جس طرح آپ نے اپنے ذاتی پتے کو شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے ۔ ہمارا طریقہ کار نہیں ۔ آپ کی بہن نے یہ کالم پڑھ کر اگر ہماری طرف رجوع کیا تو ہم آپ کا پتہ اُن کو ذاتی لفافے میں لکھ بھیج دیں گے ۔

عظمیٰ عزیز خان ۔ لاہور کینٹ

عظمیٰ ۔۔۔ دُعا ۔ بیاضِ دل کے لئے بہت سے اشعار مل گئے ۔ نظم تو نظم ہے ہی نہیں ۔ ناراضگی ۔۔ کیوں ہوگی ۔ وہ بھی اپنی چھوٹی بہن سے ۔ بس قرعہ میں جب بھی آپ کا نمبر آجائے ۔

سمیرا سعید

عزیزہ سمیرا ۔۔۔ دُعا ۔ بچگانہ محبت سے بھرپور خط موصول ہوا ۔ آنچل کے لئے آپ کا خلوص پڑھ کر ہم بہت متاثر ہوئے آپ کے لئے دُعا ہے کہ اللہ آپ کو زندگی کے ہر امتحان میں کامیاب کرے آمین ۔

عفیفہ نازلی ۔ کراچی

عفیفہ بہن ۔۔۔ دُعا ۔ آپ کے خط کے ساتھ تمام چیزیں مل گئیں ۔ کچھ اس ماہ ۔ کچھ اگلے ماہ ۔ غزل اچھی ہے پسند آئی ۔

محمودہ ناہید ۔ کلور کوٹ

محمودہ بہن ۔۔۔ سلامت ۔ خط اور غزل مل گئی ۔ انشاءاللہ اگلے ماہ شامل کریں گے ۔ اس بار معذرت ۔ آنچل کی پسندیدگی کا شکریہ ۔

جی ۔ ایم ۔ جبیں ۔ گڈانی

پیاری سی بہن ۔۔۔ دُعا ۔ آئندہ اپنا پورا نام لکھنا ۔ آپ نے تو کوئی غلطی ہی نہیں کی پھر ناراضگی کیسی ؟ اگر آپ غلطی کرتیں تب بھی ہم اپنی پیاری سی بہن سے ہرگز ناراض نہ ہوتے ۔

فرحین بلوچ

فرحین ۔۔۔ دُعا ۔ آپ نے اپنے خط میں شہر کا نام نہیں لکھا ۔ آئندہ نہ بھولئے گا ۔ آنکھوں سے مزین غزل مل گئی ۔ دراصل اتنی آنکھیں ۔ اتنی آنکھیں ۔ آخر ہم کیا کریں گے اِن کا ؟

سیدہ مسرت جہاں ۔ جدہ

عزیز بہن ۔۔۔ تسلیمات ۔ خط موصول ہوا ۔ گزارش ہے کہ وہ نعت کچھ تھوڑی سی توجہ چاہتی ہے ۔ الفاظ کی نشست کو تبدیل کرنا ہے ۔ عدیم الفرصتی کے باعث یہ کام نہیں ہوسکا ۔ انشاءاللہ جب بھی وقت ملا پہلے اُسی پر کام کریں گے ۔

شمسہ اختر ضیا ۔ خانپور

شمسہ بہن ۔۔۔ سلامت ۔ خط اور غزل مل گئی ۔ باری پر انشاءاللہ چھپ جائے گی ۔ ہمیں خود بھی وہی افسانے پسند ہیں جن کا انجام بخیر ہو ۔ مگر نہ جانے تو ہم قلم کار بہنیں المیہ انجام کیوں لکھا کرتی ہیں ۔ ہماری تو دُعا ہے کہ وہ کبھی کسی لیلیٰ سے دوچار نہ ہوں ۔ بہترین تفریح وہی ہے جس سے تھوڑی دیر کے لئے انسان بہل جائے ۔

فرزانہ کوثر ۔ روہڑی

عزیزہ فرزانہ ۔۔۔ دُعا ۔ عنایت نامہ موصول ہوا ۔ یادگار لمحے کے لئے آپ نے جو اقتباس ارسال فرمایا ہے وہ بہت بار شائع ہوچکا ہے ۔ سالگرہ نمبر کے لئے کوئی نئی سی تحریر بھیجئے ۔

ناصرہ پروین ۔ عارف والا

عزیزہ ناصرہ ۔۔۔ پیار ۔ خط مل گیا ۔ آپ کا ایک شعر اگلے ماہ شائع ہوجائے گا ۔ اُن تمام لوگوں کا شکریہ جنہوں نے آپ کو آنچل پڑھنے کی اجازت دی ۔

روبینہ ظفر ۔ کبیر والا

عزیزہ روبینہ ۔۔۔ دُعا ۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ شادی کے بعد سے آپ کچھ کاہل سی ہوگئی ہیں ۔ کیا بات ہے کیا ظفر بھیا بہت مصروف رکھتے ہیں ۔ بہت بہت دنوں میں ہماری یاد آتی ہے ۔ تنقید نامہ موصول ہوا ۔

سمیرا چاند ۔ عارف والا

عزیزہ سمیرا ۔۔۔ سلامت ۔ آپ کے خط نے ہمیں بھی سوگوار کر دیا ہے ہمیں تو یقین ہی نہیں آتا کہ ہمارا بھائی ہمیں چھوڑ کے جاسکتا ہے ۔ ۔۔۔ آپ کے پاس جو خط ہے اُسے فوراً روانہ فرمادیں جب ہی

سدیق ہو سکے گی۔ نہ جانے کیوں ذیشان بھائی کی رحلت کا یقین نہیں آ رہا ہے۔
ب۔ آپ ذیشان میاں کا خط روانہ فرمائیں گی۔ ہم انہی صفحات پر آنچل
ے قارئین کو مطلع کر دیں گے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ہم آپ کو صبر
یلقین کریں یا خود کو...

شاذیہ لون۔ گوجرانوالہ

شاذیہ... دعا۔ تنقیدی خط موصول ہوا۔ جن جن افسانوں
آپ نے پسند فرمایا اُس کے لئے شکریہ۔ ٹائٹل کی تصویر کے بارے میں
ارش ہے کہ یہ ہماری بے خبری کی وجہ سے ہوا کیونکہ نہ ہم ملکی فلمیں دیکھتے
ں ساور نہ غیر ملکی بلاسر سے فلمیں دیکھتے ہی نہیں۔ توجہ دلانے کا
کریہ۔ آئندہ محتاط رہیں گے۔

نسیم نیازی۔ لطیف آباد

عزیزہ نسیم... دعا۔ خط، قطعہ اور تاج محل مل گیا۔ تاج محل
ا بہت تھا۔ قطعہ غلط سمجھا ہوا تھا۔ خط کا جواب حاضر ہے۔ آنچل کی
سند کا شکریہ۔

سیدہ افشاں انجم۔ لاہور

افشاں... دعا۔ آپ کی چیزیں انشاء اللہ اگلے ماہ شائع ہوں
ں سا ایران میں بھی آپ آنچل کو تھامے رہیں یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔
لٰہ آپ کو اور زیادہ توفیق عطا فرمائے۔ کہاں ہے کی...؟ آنچل تھامے
کھنے کی۔

سعدیہ قمر۔ گجرات

سعدیہ بہن... دعا۔ غزل مل گئی۔ یہ بتلائیے آپ غزل گوئی
یوں کرتی ہیں؟ جب تک اس کا سبب نہیں بتائیں گی۔ غزل کیسے شائع
ہوگی۔ کافی دیر ہوگئی سوچتے ہوئے کہ یہ غزل ہی ہے نا...؟

عذرا انداز بخاری۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان

عذرا... دعائے خیر۔ ہر بار آپ ہی کی غزل چھاپ کر کیا
ہم دوسری بہنوں کے ننھے ننھے سے دلوں کو توڑنے کے مجرم نہ ہوں گے۔
سوچ لیجئے۔ جب بھی موقع ملا آنکھ بچا کر آپ کی غزل چھاپ دیا کریں
گے۔ باقی۔ بہنوں سے اب خود نپٹ لینا۔

ریحانہ عثمان۔

ریحانہ... دعا۔ آپ نے بھی وہی غلطی کی کہ اپنے شہر کا نام
نہیں لکھا۔ آپ کی خواہش نوٹ کر لی ہے۔ اگر ممکن ہوا تو پوری کریں گے۔
لیجئے آپ کے خط کا جواب حاضر ہے۔

رُخسانہ دمساز بلوچ۔ حیدرآباد

عزیزہ رخسانہ... دعا۔ خط ملا۔ آپ کا افسانہ "ادھوری شخصیت"
زیر نظر ہے چھپ میں موجود ہے۔ سالگرہ نمبر کے لئے فروری کی دس تاریخ تک
افسانہ بھیج دیجئے مگر پسند ناپسند کا خطرہ ضرور رہے گا۔

نزہت سحر۔ کراچی۔

نزہت... آپ کی دو عدد غزلیں موصول ہوئیں۔ تین بے جوڑ
اور تقطیع سے بے دل مصرعے پہلی بار پڑھنے کو ملے۔ عزیزہ! پہلے تو
غزل کی ساخت، اس کا مزاج اور اس کے کہنے کے فن سے واقفیت
حاصل کیجئے۔ اس کے بعد شاعری کی زحمت فرمائیے گا۔ دل تو چاہ رہا ہے
کہ دونوں غزلیں چھاپ کر قارئین سے داد وصول کر کے آپ کو روانہ
کر دیں۔

رضیہ داؤد۔ ساؤتھ افریقہ

رضیہ بہن... سلامت۔ خط، غزل مل گئے۔ افسانوں کی پسند کا
شکریہ۔ آپ کی غزل شائع ہو رہی ہے۔ اقوالِ زریں بھی آئندہ شائع ہو
جائیں گے۔ اور کوئی خدمت؟

زاہدہ مجید۔ لاہور

عزیزہ زاہدہ... سلامت۔ خط اور باقی چیزیں مل گئیں۔ آپ
کے خط کی تحریر سے بہن طاہرہ مجید کی خوشبو آ رہی ہے۔ کیوں درست
ہے نا؟ آپ کی چیزیں اگلے ماہ شائع ہوں گی۔ انشاء اللہ۔

ایس۔ اے۔ جمیل آفریں۔ اسلام آباد

جمیل میاں... دعا۔ آفریں ہے آپ پر۔ نظمیں اور وہ بھی
اکٹھی پانچ عدد۔ بھائی ہمارے کس نے نسخے میں لکھا ہے کہ آپ نظمیں کہیں۔
ایسا کیجئے کہ اچھی اچھی کتابیں پڑھ ڈالئے۔

امتیاز احمد راہی۔ کراچی

محترم راہی صاحب... السلام علیکم۔ غزل مل گئی۔ آپ کی پہلی
غزلیں بھی ہمارے پاس ہیں۔ انشاء اللہ باری آنے پر شائع ہو جائیں گی۔

جاوید اقبال۔ ٹنڈو محمد خان

جاوید میاں... دعا۔ ایک غزل تو قدرے ٹھیک ہے۔
"اب تو یادوں سے چاہ کر لوں گا" یہ تو شائع ہو سکتی ہے مگر دوسری غزل پہلے
شعر کے بعد غزل نہ رہی۔ آپ کی والدہ کے انتقال پُرملال کی خبر پڑھ کر بہت
رنج ہوا۔ اتنی دور سے آپ کے لئے صبر و ہمت کے لئے دعا کرتے ہیں۔
ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ ہم تو ماں کو دنیا کی سب سے بڑی
نعمت سمجھتے ہیں۔ اگر اس کا سایہ نہ رہے تو بڑی کڑی دھوپ سے
گزرنا پڑتا ہے۔

ظہور احمد۔ بلوچستان

عزیزم ظہور میاں... دعا۔ آپ نے جن پُرخلوص الفاظ
میں ہمیں اپنی بڑی بہن مان کر ہمارے چھوٹے بھائی ہونے کا ثبوت
دیا ہے۔ اس سے دل متاثر ہوا۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے اور تمام صفاتِ حمیدہ
سے نوازے۔ آمین۔

حمید الزماں ناز۔ بہاولپور

محترم ناز... دعا۔ غزل مل گئی گو کہ پوری غزل پر صوت طاری ہے۔ مگر پھر بھی اچھی ہے۔ انشاءاللہ سالگرہ نمبر میں چھاپ دیں گے۔

شیخ سلیم ناز۔ ملتان

محترم شیخ سلیم ناز... السلام علیکم۔ آپ کی تازہ ترین غزلیں موصول ہوئیں۔ بہت سی غزلیں پہلے کی بھی موجود ہیں۔ باری باری چھپ جانے کی اُمید ہے۔

راؤ عبدالستار جاوید۔ کراچی

جاوید میاں... غزل مل گئی۔ تھوڑی اصلاح کے بعد شائع ہونے کے قابل ہو جائے گی۔ لیکن کب؟ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ آنچل کی پسند کا شکریہ۔

قدیر رانا۔ مکھنہ کالک

محترم قدیر رانا... تسلیمات۔ غزل مل گئی۔ آپ کی ابھی... غزلیں ہمارے پاس ہیں۔ آپ خود ہی دیکھ رہے ہیں کہ ایک صفحے میں ہم کس کس کو جگہ دیں۔ بس اسی مجبوری پر نظر رکھئے۔

رضوان جنید نعمانی۔ کراچی۔

عزیزم... دعا۔ خط اور غزل مل گئی۔ پڑھی اچھی ہے۔ انشاءاللہ اگلے ماہ شائع کر دیں گے۔ ایک بات کا خیال رکھئے گا۔ جو غزل بھی اپنے نام سے لکھ کر ارسال فرمائیں۔ وہ آپ کی اپنی ہو۔ آنچل کی تعریف کا شکریہ۔

یاسمین اقبال۔ ملیر سٹی

عزیزہ یاسمین... دعا۔ خط مل گیا۔ تعریفوں کا شکریہ بتمام مصنفین کو آپ کی جانب سے مبارک باد پہنچ جائے گی۔ آپ کا خط اس قابل تھا کہ 'آئینہ' میں جگہ پاتا مگر قرعے میں نہ آسکا خیر پھر سہی۔

ناصر سعید۔ عزیز آباد۔ کراچی۔

برادرم... دعا۔ لیجئے چوتھے خط کا جواب حاضر ہے۔ مگر صرف یہی بات جواب طلب ہے کہ آپ کا بیاض دل شائع کیوں نہیں ہوتا۔ زیادہ درست نہ ہوگا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شعر اچھا ہوتا ہے مگر غلط لکھا ہوتا ہے۔ اس لئے اشاعت ہونے سے رہ جاتا ہے۔

عابدہ سلیم ناز۔ لاہور

عابدہ بہن... دعا۔ غزل مل گئی۔ اچھی ہے مگر آپ نے تو ہر ترمیم کے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ خیر شائع ہو جائے گی۔

یاسمین افتخار۔ راولپنڈی۔

یاسمین بہن... دعا۔ تعریفوں سے مزین خط موصول ہوا شکریہ۔ جناب مشتاق احمد قریشی کو غزل کی تعریف اس کالم کے ذریعے پہنچ جائے گی۔ ان کی یہ غزل کچھ زیادہ ہی پسند کی گئی ہے۔ بہت سے خطوط میں تذکرہ ہے۔

ایم۔ اے خان۔ بھاگیانہ

عزیزم... دعا۔ بات دراصل یہ ہے کہ کہانیاں سب تو سچی نہیں ہوتیں۔ دراصل کہانی کا مطلب ہے کوئی واقعہ جو گزر چکا یا گزر رہا ہے اس کو بیان کرنا ہوتا ہے کہ بیان کرنے والا حقیقی واقعات کو جس طرح محسوس کرتا ہے۔ بیان کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ دلچسپی کے لئے اس میں رنگ آمیزی بھی کر دیتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔

عابدہ نورین۔ گوجرانوالہ

عابدہ... دعا۔ آپ کی چیزیں اچھی ہوں گی تو ضرور شائع ہوں گی۔ خط کا باقی حصہ جو افسانوں کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ وہ اچھا لگا شکریہ۔

بشریٰ رمضان۔ کراچی

عزیزہ بشریٰ... دعا۔ حضرت امام غزالیؒ کے اقوال موصول ہوئے۔ امام غزالیؒ کے اقوال اسی ماہ شائع ہو رہے ہیں۔ زیر نظر پرچے میں ملاحظہ کیجئے۔ اور کوئی خدمت...؟

عارفہ گل۔ کراچی

عارفہ... دعا۔ آپ کی چیزیں موصول ہوئیں۔ مگر ۱۹ جنوری... کو بیاض دل آئندہ ماہ شائع ہوگا۔ اقوال زریں بہت پرانے ہیں۔

قیوم طاہر۔ جدہ

عزیزم... دعا۔ خط، غزلیں، نظم اور تصویر موصول ہوئے۔ ان صفحات کے ذریعے آپ کو اطلاع دے دی۔ غزلیں اور نظم اچھی ہیں۔ مگر تاخیر سے ملنے کے باعث اگلے ماہ شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔ انشاءاللہ۔

کنور۔ ایچ رحمان۔ جدہ

برادرم... دعا۔ آپ کا خط موصول ہوا۔ آنچل کی تعریف کا شکریہ۔ آپ کی تحریر چونکہ بہت مختصر ہے آنچل کے ڈیڑھ صفحے میں بمشکل آسکے گی۔ شائع کرنے سے معذور ہیں۔ کچھ خیال نہ فرمائیے گا۔ یوں بھی ہمیں خود کلامی والی تحریریں پسند نہیں۔

خورشید انور ناز۔ لاہور کینٹ

بھائی خورشید انور... السلام علیکم۔ آپ کا خط اور اس کے ہمراہ تمام چیزیں مل گئیں۔ چونکہ سب چیزیں انتہائی تاخیر سے ملیں۔ یعنی ستره فروری اس لئے اس ماہ تو شامل اشاعت نہ ہو سکیں گی۔ عدیم الفرصتی کے سبب آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں۔ انشاءاللہ اگلے ماہ در جواب آں میں اس کے بارے میں جواب دے دیں گے۔

اس ماہ کی شخصیت

آل احمد سرور

فاطمہ زہرہ جسّانی

"کم سے کم وقت میں ایک بین الاقوامی ذہنیت کے حامل دانشور آل احمد سرور سے انٹرویو حاصل کرو" آنچل کی مدیرہ نے کتنی آسانی سے کس قدر مشکل ترین بات کہہ دی تھی۔ اس کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو شعر کہنے کی توفیق نہ رکھتا ہو اور جسے حکم ہو کہ صرف شعر کہے بلکہ ایسا شعر کہے جو ادب کے اعلیٰ ترمعیار پر پورا اترے





آنچل اور آنچل کے قارئین! میں عالمِ سکتہ میں کھڑی حیران رہ
ئی. کیا مجھے ایک بلند پایہ شاعر کے مقابل ہونا ہوگا؟ یا نقاد کے شکوہ و
بدبے سے نبرد آزما ہونا ہوگا، یا دانشور کے فہم و ادراک سے شرمندہ ہونا
ہوگا یا ایک پروفیسر کے آگے زانوئے گدائی تہہ کرنا ہوگا یا پھر بیک وقت
ن تمام اوصاف سے تعارف حاصل کرنا ہوگا، اک شخص، ہمہ صفات
نفرد شخصیتوں کے ساتھ معتبر تھا۔ وہ واقعی میرے لئے ایک حشر خیز
رہا تھا۔

آل احمد سرور صاحب اپنی حیران کن فلک بوس ادبی شخصیت کے
ساتھ گلشن اقبال میں اپنے ایک عزیز کے ہاں قیام فرما تھے۔ میں نے
ہر ٹھہر کر انٹرویو کے لئے کہا تو انھوں نے حیرت انگیز سادگی سے بلا لیا۔
وہ میرا انٹرویو لینا چاہتے تھے یا آنچل کے معیار کا؟ اس کے
سے میں کوئی فیصلہ کن بات کہنے کی پوزیشن میں نہ تھی اور نہ ہوں۔
وہ ایک درمیانے سائز کا کمرہ تھا۔ جو دو صوفہ سیٹ سے آراستہ تھا۔
یان میں خاصی وزنی میز اور گہرے سبز پردے۔ مجموعی طور پہ ایک
ن احساس دل میں جاگزیں ہوتا تھا۔ ایک ادیب کے لئے ماحول ایک
ت تحریک کا باعث ہو سکتا تھا۔ مجھے بہت دیر انتظار کرنا پڑا۔ موسم کی
یا وہ ماحول کی خاموشی اور پھر تنہائی کے احساس سے مجھے غنودگی سی آنے
لگی تھی تاہم وہاں پہلے سے موجود ایک مہمان جو خاتون ادیبہ ذکیہ بلگرامی کے
یٰی تھیں نے اپنی باتوں سے بیدار رکھنے کی کوشش کی تو اچانک میرے
ب آلودہ نیم غنودہ احساسات کی تمازت پاکر جاگ اٹھے۔ آل احمد سرور
ے سامنے تھے۔ سرخ و سفید رنگ۔ بوٹا سا قد اور بالوں میں اُفق جیسی
پر جیسی پاکیزہ چاندنی۔ موج در موج بکھری ہوئی۔ چہرے پر اپنی شخصیت
کے تمام رنگ لئے۔ آل احمد سرور واقعی متاثر کن تھے۔ میں ایک ٹک انھیں
دیکھتی رہی، سوچتی رہی اور حیران ہوتی رہی جو میری عمر کی طوالت سے کہیں
زیادہ پھیلی ہوئی شہرت، آگہی اور دانش کو سمیٹے ہوئے میرے آگے تھے۔
لوگ اپنے پسندیدہ دانشوروں سے ملنے کو ترستے ہیں اور ایک میں تھی۔
آنچل اور مدیرہ آنچل کی خواہش کے سبب لب جو آن کھڑی تھی۔ وہ میری
طرف متوجہ نہ تھے۔ تا ہم میں ہمہ تن بصارت آگہی کے آفتاب کو تک
رہی تھی وہ کسی تہذیب مجلس سے محو کلام تھے پھر اچانک غیر متوقع طور پہ
انھوں نے مجھے مخاطب کر لیا۔
"فرمائیے!"
"مجھے فاطمہ زہرا جبین کہتے ہیں۔" میں نے تعارف پیش کیا۔
"اچھا..." بہت ہی مختصر جواب تھا۔
"آج آپ نے ایک نشست طے کی تھی!"
"معاف کیجئے گا۔ شدید مصروفیات کے باعث میں کچھ کچھ بھول رہا
ہوں۔" انھوں نے اعتراف کیا تھا تاہم ایک متبسم لبوں پر رقص کناں تھا
"میں ماہنامہ آنچل کی جانب سے حاضر ہوئی ہوں۔ آپ مجھے ماہنامہ
آنچل کا خراج عقیدت سمجھ سکتے ہیں۔" میں نے ماہنامہ آنچل کا ایک سیٹ انھیں
پیش کیا۔ پہلے شمارے میں سلیم احمد مرحوم پہ مضمون تھا۔ جن کو آج مرحوم لکھتے
ہوئے میری انگلیاں فگار ہوئی جاتی ہیں۔
"اوہ...!" وہ بے ساختہ سسک اٹھے "تو سلیم بھی رخصت ہو لئے!"
"ہاں!" میں نے زیر لب کہا۔ فضا اداسی کی سرد لکیر میں چھپ سی
گئی تھی۔
"ایک بیش بہا شخص... جو چلا گیا... مگر اپنے پیچھے بہت جاندار
نقش چھوڑ گیا۔" محسوسات، جذبات اور کرب نہاں کی ایک دھند
رخساروں پر اتر آئی۔
"آپ کے رسالے کی اشاعت کتنی ہے؟" کہر آلود اداسیوں میں
نیم خفتہ شرر لوٹا۔
"جس طرح شوہر اپنی صحیح تنخواہ بیوی کو بتلانا مناسب نہیں سمجھتے۔"
میں نے بصد احترام کہا۔ "اسی طرح رسالے اپنی تعداد اشاعت کے بارے
میں مبہم رہتے ہیں۔"
"میں کسی شوہر کے بارے میں دریافت نہیں کر رہا!" انھوں نے
گویا استعارہ سنتے ہوئے احتجاج کیا۔
"تو پھر میری آمد کا مقصد آپ کا انٹرویو ہے!"
"انٹرویو...!" وہ بے تحاشا مسکرانے لگے۔ "میرے بارے میں
اس قدر شائع ہو چکا ہے کہ مزید گنجائش نظر نہیں آتی!"

"یعنی..." یہ میری نگاہ میں ایک سوال تھا۔

"آپ اس سے انٹرویو تیار کریں۔" وہ بنا کسی جھجک کے مکمل جواب تھے۔

"وہ انٹرویو تو نہیں کہلا سکے گا۔" میں نے اپنا فطری انداز لئے اُن سے مخاطب کیا۔

"کیا مطلب؟" ناک کے قریب چشمے کو لا کر آل احمد سرور نے مجھے گھورا۔

"وہ ایک تبصرہ ہوگا۔ جو اقتباسات پر مشتمل ہوگا۔" شکست کے احساس کا پہلا لمحہ بڑا جانگسل تھا اور میں اس لمحہ کو قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔

"پھر کیا ہوا؟" وہ پگھلنے پر آمادہ نہ ہے گویا...

"اگر میں اقتباسات پر مشتمل تبصرہ آنچل کو مہیا کرنے کا خیال رکھتی ہوتی تو براہ راست آپ سے شرف نیاز حاصل نہ کرتی۔" میں احساس شکست کے اس جان لیوا لمحہ کو پاش پاش کر دینا چاہتی تھی۔

"تو اس کے لئے آپ میری تقاریر سے استفادہ حاصل کر سکتی ہیں۔"

وہ شخص ایک مکمل اور ناقابل تردید گریز تھا میرے لئے واقعی ایک سوال تھا جو جواں نسل کو ہمیشہ کریدتا رہے گا۔ مجھے یاد آ گیا۔ ایک مقامی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے آل احمد سرور نے ڈائجسٹوں کے بارے میں بڑی منفی رائے کا اظہار کیا تھا۔ مجھے حیرت بھی تھی اس بات پر کہ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور کیا کسی ایسی لچک کی گنجائش ہرگز محسوس نہیں کر سکیں گے جہاں مثبت ماحول میسر آئے۔ لازمی نہیں کہ تمام ڈائجسٹ آل احمد سرور کی رائے کے مطابق معاشرے کے لئے منفی تشخص سے پہچانے جائیں۔ میرے لئے بڑا مشکل مقام تھا۔ ایک طرف آل احمد سرور صاحب مجھے کسی ڈائجسٹ کی وساطت سے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے تو میں بھی اپنے ماہنامہ آنچل کو محض ڈائجسٹ تسلیم کرانے پر آمادہ نہ تھی۔ دوسری طرف نشست میں دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ بیک وقت وہ مختلف باتیں کہتے تھے اور مجھے سخت دشواری اس بات میں تھی کہ میں آنچل اور آنچل کے ان معزز و محترم قارئین کو مکمل طور پر مثبت فکر دے کر کیونکر مطمئن کروں کہ وہ شخص جو ادب میں ایک بڑی توقع اور اُمید کے مترادف تھا۔ وہ کوئی "آسان گیم" نہ تھا اور مجھ ایسی نئی نسل کی نمائندہ ہستی کو چٹکیوں میں اُڑانے پر مصر تھا۔ میرے کئی سوالات آل احمد سرور نے بلا دریغ مسترد کئے اور بارہا ایسا ہوا کہ آل احمد سرور صاحب موزوں جواب سوچنے کو لمحہ بھر لیتے بھی، تو لوگ میرے سوال کا جواب نشست میں موجود لوگ متضاد رائے کے ساتھ دیتے۔ ایک عجیب درہم برہم نشست تھی۔ بیٹھ کر آنچل کے لئے انٹرویو پر آل احمد سرور کو آمادہ کرنا اور سوالات نیم آمادگی یا جبراً آمادگی کے ہاتھوں آل احمد سرور کی بے اعتنائیاں اور ان بے اعتنائیوں سے فائدہ اُٹھا کر دوسرے اراکین نشست کا نہ صرف بولنا بلکہ ضرورت سے زیادہ بولنا میرے لئے بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔

میں اپنی صحافتی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک حقیقی خلجان، ایک خلش انگیز تردد اور ایک ناخوش گواریت میں مبتلا تھی۔ تاہم احساس فرض کے سبب جتنا کچھ حاصل ہو سکا، وہ پیش خدمت ہے۔

بہر طور اس درہم برہم زیر و زبر نشست میں میں ایک نقاب پوش کی حیثیت لئے بہرحال آل احمد سرور کے آگے اپنی بے بسی و بے کسی کی تصویر بنی وہ سب کچھ حاصل کرتی رہی جو وہ مجھے دیتے رہے اور اراکین نشست



دیتے رہے؛ مجھ سے پوچھے بغیر کہ آیا میں اس دین سے مطمئن ہوں کہ نہیں۔ آل احمد سرور صاحب ایک طویل سفر کی حالت میں تھے اور یقیناً سفر کی رعایت سے میں اس انٹرویو کو بھی "سفر" ہی قرار دینا چاہتی ہوں جس میں آدمی جلدی میں ہر بات بالکل مسافرت کے عالم میں کر گزرتا ہے۔ اس کو آپ شدید مصروفیت قرار دیں، حالتِ سفر کی درماندگی قرار دیں۔ سفر کی اضطراری الجھن قرار دیں یا مجھ ایسی نئی نسل کی "تشنہ کلام" نمائندہ خاتون" کا فنی سقم قرار دیں۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ جو کچھ آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں وہ یقیناً قابلِ قدر ہوگا۔

پروفیسر آل احمد سرور اس دَور میں پیدا ہوئے۔ جب صاحبِ حیثیت لوگ علم کے حصول کو زندگی کا جزوِ لازم تصور کرتے تھے اور علم ان کی روزمرہ کی زندگی کا ایک قرینہ ہی تھا۔

س:۔ آنچل کے قارئین اور تمام پاکستان کے قارئین جو آپ کے رتبے کے معترف ہیں۔ اُن کے لئے میں آپ کے خاندانی اور تعلیمی پس منظر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں؟

ج:۔ وہ تو سب کو معلوم ہی ہے۔ اُنھوں نے ترش رُخ کر کہا۔ کیا وہ آنچل کی نمائندہ حیثیت سے مجھے مسترد فرما رہے تھے؟ یا ڈائجسٹوں کے بارے میں اپنے موقف کی رُو سے آنچل کو مسترد فرما رہے تھے؟ میں نے بڑے ضبط کے ساتھ "شدید اخلاص" اختیار کیا۔

س:۔ آپ بنیادی طور پر سائنس کے طالبِ علم تھے۔ پھر ادب کی طرف رجوع کے اسباب؟ میں بے حد مختصر تھی اور میرے اس اختصار ... نے انھیں واقعی جواب دینے کا پابند کر دیا کہنے لگے۔

ج:۔ ادب کی جانب رجوع کی بہت سی وجوہات ہیں۔ میں بدایوں کا رہنے والا ہوں اور میرے گھر کا ماحول، میرے شہر کا ماحول، میرے شہر کے معاشرے کا ماحول، میری رگوں میں مثلِ لہو گردش کناں تھے۔ فطرت اور میلانِ طبع کی نفاست اور غنائیت نے میڈیکل کی چھریوں چاقوؤں سے مناسبت محسوس نہ کی۔ والدین کا، خاندان کا اور اُن کی اُمیدوں کا... اُن کے توقعات کا بھرم رکھنے کے لئے نشتروں سے کھیلنے ضرور نکلے تھے۔ تاہم فکر کے بحرِ ناپیدا کنار کی اتھاہ گہرائیوں سے، شلوار سمیٹے نکل آئے۔ پروفیسرز کی رائے تھی کہ ہمیں شعبۂ سائنس ہی میں آگے بڑھنا چاہئے جبکہ کچھ پروفیسر میرے "فطری میلان" کی اہمیت سے ادب کی سمت کا تعین کر چکے تھے۔ اس معرکہ میں قوتِ فیصلہ نے ادب کو منتخب کر لیا۔ اس طرح میں نے اپنی فطرت کی مطابقت میں فیصلہ کر دیا۔ بی ایس سی تک انہی کے احترام میں چلا، پھر اپنی تشنگی کے حوصلوں کو لئے اپنے منتخب میدان میں چل پڑا۔ میرے ... ایک اہم تھا۔ میں سائنس کا طالبِ علم تھا اور میرے اساتذہ مجھے شعبۂ سائنس میں رہنے کا مشورہ دے رہے تھے جبکہ میرے خیال میں میں سائنس کا اوسط سے زیادہ معیار کا طالبِ علم تھا۔ میرے ایک دُوسرے اُستاد کی رائے تھی کہ میں اُدب میں زیادہ بہتر کارکردگی دکھا سکتا ہوں۔ بہرحال میلانِ طبع کے پیشِ نظر میں نے بی ایس سی کے بعد آرٹس کو اختیار کر لیا۔ اس طرح پہلے انگریزی اور پھر اُردو میں ایم۔ اے کر لیا۔

بدایوں یو۔ پی کی تہذیبی معاشرت نے پروفیسر آل احمد سرور کو ہمہ گیر توانائی بخشی۔ ان کے والد پوسٹل سروس میں رہے تھے اور جلد جلد تبادلوں کے سبب سرور صاحب کو بھی اپنے خاندان کے ساتھ مختلف مقامات پر مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کرنا پڑی۔ آل احمد سرور مختلف ماحول سے گزر کر نئے تجربات سے اپنی آگہی کو سنوارتے رہے انجام کار غازی پور سے میٹرک کیا۔ تاہم ورثہ میں بدایوں کی ادبی چاشنی کا تناسب بہرحال کثیر رہا۔ پیلی بھیت، گونڈہ، سیتاپور، بختیار پور اور غازی پور وغیرہ وغیرہ میں سرور صاحب رہے۔ ان تمام حقائق کے پیشِ نظر میں نے ان سے سوال کیا

س:۔ اگر آپ نے اپنی پوری تعلیم صرف بدایوں میں ہی حاصل کی ہوتی تو کیا آپ موجودہ انداز سے مختلف انداز میں ہمارے سامنے ہوتے؟

ج:۔ جن شہروں کو میری تربیتِ علم اور میری آگہی کو دخل حاصل ہوا ہے۔ ان میں دہلی، بریلی، سیتاپور، بدایوں، گونڈہ، علی گڑھ وغیرہ ہیں۔ ایک مخصوص تہذیب و تمدن اور میلانِ فکر کو لے کر اتنے سارے ماحولوں میں رہنا، بسنا اور رہتے بستے ہوئے فکر کو آراستہ کرنا مشکل ضرور تھا تاہم ناممکن نہ تھا مگر آپ کے سوال کا موزوں ترین جواب یہ ہے کہ میں ان مختلف مقامات پر تعلیم حاصل کرتے ہوئے معاشرت، تمدن اور آگہی کو برت در برت اُفق در اُفق تلاش کرتا رہا، سمجھتا رہا۔ اور اپنے ذہن، اپنی فکر اور اپنی شخصیت کو آراستہ کرتا رہا اور مجھے یقینی طور پر علم تھا کہ بہتر معیار اور بہتر طریقے سے زندہ رہنے کے لئے مجھ ایسے شخص کو محدودیتِ فکر و عمل کے ساتھ زندہ رہنا زیادہ مرغوب نہ ہو سکے گا اور اگر میری تعلیم کا حق صرف بدایوں کو حاصل ہوتا تو میں یقیناً وہ نہ ہوتا جو کہ آج ہوں۔

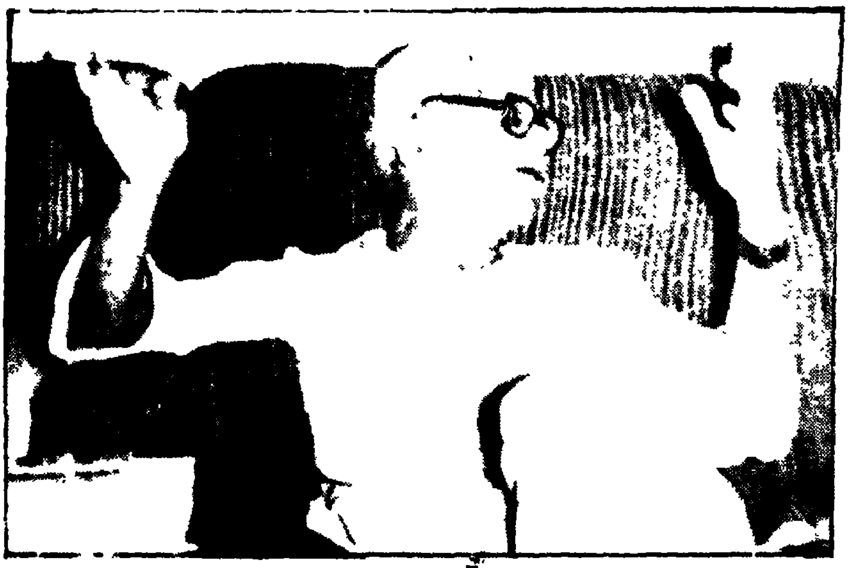
ہاں... آج بھی اس امر سے روگردانی قطعی ممکن نہیں کہ علم اور آگہی کے اس طویل سفر میں جگہ جگہ سے خوشگوار اثرات حاصل کرنے کے باوجود بنیادی طور پر آل احمد سرور کا بنیادی شخص بدایوں کا اُفق ہے۔ اگر کوئی شخص بدایوں کی فضاؤں میں رچ بس لے تو وہ بڑی اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ ادب سے رنگا ہوا...

پرکشش ماحول اپنی گود میں پلنے والی نسلوں کو ایک ممتاز اور منصوص تشخص دیتا ہے اور یہ تشخص اپنی ذات میں فلک بوس ہونے کے باوجود اپنے ماحول کے طلسمی حصار میں محدود ہو جاتا ہے۔ فانی، محشر، قادر اسی ماحول کا شاہکار ہیں جنھیں ادب نے حیرت سے دیکھا ہے۔ یہ لوگ جب تک اس حصار میں رہتے رہے، ماحول کی رگوں میں خون بن کر دوڑتے رہے لیکن جب یہ اپنے ماحول سے باہر آئے تو پورے عالم ادب کا تشخص بن گئے۔ بدایوں شاعروں کا شہر ہے۔ آپ ہر گلی میں قدم رکھ کر خوش بیان شاعر آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔ فاضل اوقات میں بدایوں کے لوگ فارسی، عربی، اردو ادب اور ان شاہکاروں کے متعلق

س۔ [illegible]

ج۔ وہ میرے چچا تھے جن کی کتابیں میں پڑھا کرتا تھا اور جنھوں نے میرے حوصلوں کو مہمیز کیا۔ میں انھیں سلام عقیدت پیش کرتا ہوں جو میری زندگی کے ایک مخصوص دور کی پرداخت کے سلسلے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے پاس مختلف شعرا کے دیوان تھے۔ ان دیوانوں کی کتب تھیں اور یہ سب میرے زیر مطالعہ رہیں یعنی بچپن ہی سے مجھے ادبی ماحول ملا جس سے بلا تامل میں نے خوب استفادہ کیا لیکن ہماری بیٹھکیں یا نشستیں تو اسی ماحول کے گرد گھوما کرتی تھیں۔

آل احمد سرور سے ہم نے سنا کہ بچپن میں والد کی لائبریری



بحث و مباحثے میں مصروف ملیں گے اور لازم تھا آل احمد سرور ایسے ماحول میں سے اپنے حصے کا ورثہ لیتے مرحلہ وار ارتقا سے گزرتے رہے اور ان کا معیارِ فکر و ادب بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا اور اس بلندی میں ادبی بیٹھکوں نے بھی یقیناً اہم کردار ادا کیا ہوگا اور کیا بھی ہے۔

س۔ میں یہ معلوم کرنا چاہوں گی کہ عیش صاحب کے علاوہ اور کہاں کہاں ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں جہاں سے افق در افق آفتاب طلوع ہوا کرتے تھے؟

ج۔ نہیں عیش صاحب کے چبوترے پر نشستیں نہیں ہوتی تھیں سرور صاحب نے ذکرِ اول کو یکسر مسترد کر دیا۔

میں چھپ کر طلسم ہوش ربا، آب حیات، قصہ چہار درویش جیسی شاہکار تخلیقات میں غیر معمولی دلچسپی پر انھیں بسا اوقات بری طرح ڈانٹ کھانی پڑی۔ پانچویں جماعت تک [illegible] ایسی کتابوں میں دلچسپی ان کے والد کو ایک آنکھ نہ بھاتی مگر حقیقتاً ان ہی کتابوں نے سرور صاحب کے بچپن کو ادب سے وابستگی کے لئے زرخیزی فراہم کی۔

س۔ اس شخصیت کے بارے میں کچھ فرمائیے جن کے اثرات آپ کی فکر پر مستند طور پر مرتب ہوئے؟

ج۔ تعلقات تو ہر ایک سے استوار رہے۔ سرور صاحب نے ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ حاضرین نشست پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا: "تاہم

علاوہ ازیں رسالہ "امامت" میں میں کے مرتب ہونے کیونکہ میرا معاملہ ایسا تھا کہ میرا ذہن ایک منفو تشخص رکھتا تھا۔ اور اس کو کسی نقشِ قدم کی کوئی خاص ضرورت کبھی محسوس نہ ہوئی۔ ہاں روزمرہ کی نشستوں سے اچھے خیالات ملتے تھے۔ جن سے تھوڑا بہت اکتساب کرکے فکر جو چیز پیدا کرتی تھی، وہ فن میں ندرت میں اور انداز میں مختلف ہی ہوا کرتی تھی۔ مولوی عطا کی نشستوں میں اچھے معیار کے شعراء اور صاحبِ ذوق ہوا کرتے تھے۔ جن سے بہت سی اچھی باتیں ملتی تھیں۔ وہ خود قصیدے لکھا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان نشستوں سے اس حلقۂ فکر سے شاعری میں کوئی اثر شامل ہو گیا ہو ورنہ مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں مناسب کو تھا تا ہو کرتا تھا اپنی فکر اپنے ذہنی اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق۔ پھر ہمارے یہاں عرس ہوا کرتے تھے اور شعرا منتخب قصائد پیش کیا کرتے۔ ان سے کچھ اثر ہو سکتا ہے کہ مجھے ملا ہو تاہم خصوصیت کے ساتھ کسی کی فکر مجھ پر حاوی نہیں۔

س:۔ آپ کو کب احساس ہوا کہ آپ شعر کہہ سکتے ہیں؟

ج:۔ شاید میں چوتھے درجے میں تھا۔ ان کے چہرے پہ یادوں کی قوسِ قزح بکھری پڑ رہی تھی: میں نے ایک شعر کہا تھا جو مجھے اب یاد نہیں۔ ہاں مجھے یہ یاد ضرور ہے کہ کالج میں ہمارے ایک پروفیسر تھے، حامد حسن قادری جو میری بڑی ہمت افزائی کرتے تھے۔ کالج کا سالانہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا اس میں طالبِ علم شعراء کے علاوہ اور دوسرے بہت سے شعرا شامل تھے بحیثیت سائنس کے طالبِ علم کے میں نے بھی ایک نظم پڑھی جو "تاج محل" پر تھی جو بعد میں ایک رسالے میں شائع بھی ہوئی۔ بس اب تو اس دور کی یادیں ہی سرمایہ ہیں۔

س:۔ آپ اپنی کس حیثیت سے بہت زیادہ مطمئن ہیں یعنی بحیثیت شاعر، نقاد، دانشور یا پروفیسر؟

واضح ہو کہ پروفیسر آلِ احمد سرور نے ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بحیثیت پروفیسر کے منسلک ہوئے اور بعد میں شعبہ اردو کے سربراہ بھی مقرر ہوئے۔

ج:۔ بھئی۔ میں نے اس بارے میں کبھی سوچا نہیں۔ وہ مکمل طور پر گویا حرفِ آخر تھے۔

س:۔ کبھی تو... کسی ایک لمحہ کے لئے سوچا ہوگا؟ میں نے اصرار کیا۔

ج:۔ معاملہ یہ ہے کہ میں بنیادی طور پر شاعر ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں متعارف شاعری سے ہوا مگر شاعری کے سفر میں منزل بہ منزل نئی فکریں ملتی گئیں۔ اب ان نئی فکروں میں اپنے تشخص کی کیفیت سمجھتا ہوں خواہ ان کا تعلق کہیں سے بھی ہو۔ میرے خیال میں صرف میں ہوں، ہمہ اوصاف اور ہمہ گیر۔ وہ نہ پھر بڑی معنی خیزی سے بولے "پہلے میں نے ساز تخلص تھا اور پھر سرور۔ کیونکہ ساز مجھے بہت زیادہ پسند نہ آیا۔

س:۔ شاعری میں اصلاح کے لئے زانوئے ادب کہاں تہہ کیا؟

ج:۔ کہیں بھی نہیں۔ شاید آپ کے لئے یہ بات باعثِ حیرت ہو کہ مستقبل میں شاعری کا مستقل ارادہ کوئی نہیں تھا۔ کبھی کبھی لکھ لیا کرتا تھا۔ شاید شاعری سے دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ مجھے آٹھویں کلاس میں اقبال کی بہت سی نظمیں یاد تھیں۔ ہائی اسکول میں بانگِ درا اور باقیات سے بے انتہا شغف رہا۔

یہاں یہ امر ہمارے لئے حیرت انگیز ہے کہ سرور صاحب نے اصلاح کے لئے اپنا کلام کسی کو استاد مان کر پیش نہیں کیا۔

س:۔ نثر کی ابتدا کب رجوع ہوئے؟

ج:۔ ابتدا کالج کے زمانے میں ہوئی۔ فانی اور معانی نے ایک رسالہ تزئین نکالا۔ فانی ایڈیٹر تھے اور معانی معاون ایڈیٹر تھے۔ معانی صاحب ادارے کی تمام خط و کتابت خود ہی کرتے تھے۔ ان کے کالج کے مشاعروں میں اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کی فرمائش پر میں نے دو افسانے لکھے۔ دو ایک انگریزی سے ترجمے کئے۔ اس کے بعد طبیعت رجوع ہی نہ ہوئی۔ آپ سمجھ ہی ہوں گی کہ اپنے میلانِ طبع سے آگہی مجھے شاعری کی منزلوں میں لے کر چلی۔ احباب کے اصرار نے نثر کی جانب متوجہ کیا اور پھر علی گڑھ کی معنی خیز علمی معمور فضا ؤں نے تو بہت اور ہمہ گیر توانائی سے نوازا۔

علی گڑھ سرور صاحب کے لئے ایک وسیع میدانِ علم و آگہی ثابت ہوا۔ خواجہ منظور حسین جو شعبۂ انگریزی کے سربراہ تھے اور انگریزی میگزین کو سیٹ بھی کرتے تھے۔ سرور صاحب بہت جلد غیر معمولی اہمیت حاصل کر گئے۔ مسٹر راس (ROSS) پر سرور صاحب کا ایک مضمون خواجہ صاحب نے پڑھا تو انھیں ایڈیٹر مقرر کیا۔ یہ سرور صاحب کی علمی و ادبی شخصیت کا نقشِ اولین تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا میگزین قُل بند مقبولیت کا حامل ہوتا ہے اور اس کا منصبِ ادارت واقعتاً مضبوط شخصیت کا دعوے دار ہوتا ہے۔ سرور صاحب نے اپنی شخصیت کو ادارت میں منوا لیا۔

انھوں نے سلسلۂ تکلم کو از سرِ نو جوڑتے ہوئے کہا۔

" فانی اور اصغر گونڈوی کو علی گڑھ یونیورسٹی میگزین ہی

تعارف کے لیے پیش کیا۔ کلامِ اقبال بھی اکثر شائع ہُوا کرتا تھا۔ بعد میں خواجہ محمود بیس ایڈیٹر مقرر ہُوئے جو ہمارے اچھے ساتھیوں میں سے تھے۔ اصُولاً علی گڑھ علم و آگہی کا ہی نہیں حسن نفیس کا شہر بھی ہے۔"

آل احمد سرور نے ہمیں بتایا

"معین احسن اُس دور میں ملّاں تخلص کرتے تھے جذبی ہنوز ملاں کے افق سے طلوع نہ ہوا تھا۔ خواجہ صاحب اور رشید احمد صدیقی صاحب کے درمیان ایک چپقلش تھی اور خواجہ صاحب اپنی بے حد خواہش کے باوجود رشید صاحب سے مضامین حاصل نہیں کرتے تھے۔ اُنھوں نے اس کام کے لئے سرور صاحب کو منتخب کیا۔

رشید صاحب کو ہموار کرنا کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ انھیں قائل کرنے والے میں غیر معمولی صلاحیتوں کا ہونا امر لازم تھا۔ رشید صاحب نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے ششر یعنی خواجہ صاحب کو لکھ دیں کہ ان کے مضامین مسترد نہ کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت رشید صاحب بڑے تلخ تھے۔ اسی دوران میں آل انڈیا ڈبیٹ یونیورسٹی میں مقرر ہُوا۔ سرور صاحب بھی اس میں شامل تھے۔ سرور صاحب کو اگرچہ انعام نہیں دیا گیا مگر اس مقابلے میں غیر معمولی طور پر سرفہرست رہے جبکہ رشید صاحب بھی جج صاحبان میں شامل تھے اور پھر اس کے بعد ملاقات میں رشید احمد صاحب نے اُنھیں بڑی مسرت سے مدعو کر لیا۔ جب سرور صاحب اُن کے بنگلے پر پہنچے تو رشید صاحب کھرپی لئے لان درست کر رہے تھے۔ اُن کے جسم پر بنیان اور تہبند کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ عجب بے تکلفی کی فضا میں رشید صاحب نے سرور صاحب سے میگزین میں لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ "گنجِ گراں مایہ" میں ان کا مولانا محمد علی جوہر پر آرٹیکل ایک بیش قیمت اضافے سے کم نہیں جو اس وعدے کے سبب حاصل ہُوا۔"

- آپ کا وہ پہلا مضمون جس کو آج پڑھ کر مطمئن یا غیر مطمئن ہونے کا احساس ہُوا ہو؟

ج:۔ "آج جب اپنے پرانے مضامین پڑھتا ہُوں تو کہیں تبدیلیوں کی گنجائش محسوس کرتا ہُوں اور کہیں مجھے یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اس سے بہتر لکھا جانا ممکن نہ تھا۔ میگزین کے مدیر کی حیثیت سے میں نے مضامین لکھے جو نوعیت کے اعتبار سے مختلف تھے۔ اس میں اقبال اور حفیظ کی شاعری پر بھی مضامین شامل تھے۔ وہ رُکے جیسے اپنی یادوں کی بارات کو سمیٹ رہے ہوں، پھر بولے میں آپ کو ایک واقعہ سُنانا چاہتا ہُوں۔"

"جی ارشاد" میں ہمہ تن گوش تھی۔

"علی گڑھ میں ایک مشاعرہ تھا۔ ۱۹۳۲ء کے آخر کی بات ہے جس میں مولانا حسرت بھی تشریف لائے تھے۔ اصغر گونڈوی اور حفیظ جالندھری بھی شامل تھے اور بھی بہت سے شعرا شامل تھے لیکن میں ان تینوں کا نام بالخصوص لینا چاہُوں گا۔ طلبا کے لئے نظم کا عنوان تھا "صبح بہار"۔ میں نے بھی نظم پڑھی پھر دیگر شعرا کرام نے اپنا کلام سُنایا۔ اس مشاعرے میں حفیظ مرحوم نے غزل کہی تھی کہ

چاند اور ستاروں کا سماں کیا دلکش اور سہانا ہے
افسوس ہمیں نیند آئی ہے افسوس ہمیں سوجانا ہے

اچھے شعرائے کرام کو سنو لینا میری عادت تھی اور اس وقت مجھے حفیظ کا ایک شعر بڑا عجیب لگا۔

اظہارِ محبت ہو بھی چُکا تم ہنس بھی چکے میں رو بھی چکا
اب سینے سے لگ جانا ہے یا دور ابھی ترسانا ہے

یہ تمام لوگ رشید صاحب کے ٹھہرے تھے۔ حفیظ سے جب ملاقات ہُوئی تو بولے "یہ شعر تم نے چھاپا"؟ اس دور میں حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام کی دوسری جلد جنگِ بدر تک مشاعرے کے بعد ہمیں سُنائی۔ حسرت نے اپنی غزل ترنم سے سُنائی۔ وہ دَور تھا احترام کا، عقیدت کا... اور لوگ احترام اور عقیدت سے گریز نہیں کرتے تھے۔ یہ وقت وقت کے ساتھ معدوم ہوگیا۔ اب تو لوگوں میں عقیدت اور احترام کے جذبات بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اس وقت جب حسرت نے یہ غزل سُنائی۔

طلب حاضر کی اہلِ رضا کی
یہ لغزش تھی زبانِ مدعی کی

اب ایک شعر مولانا حسرت نے اپنے بڑے ہی مخصوص رنگ میں پیش کیا۔

اب ان آنکھوں میں صبح شبِ وصل
نہ شوخی تھی نہ گنجائش !!!

لوگ تو صرف سُنا ہی کئے۔ حفیظ سے ضبط نہ ہُوا۔ وہ برملا زندگی سے بولے۔

"واہ مولانا! کیا جوان شعر کہا ہے"۔ مجھے آج تک وہ منظر یاد ہے کہ حفیظ کی اس بات پر حسرت، حفیظ کو بُری طرح گھُور کر رہ گئے۔ وضعداری کا وہ دَور آہستہ آہستہ ڈھل گیا۔ لوگ بڑے بڑے مشاعروں میں باقاعدہ طور پر ہوٹنگ کرنے لگے اور تو اور

دماغ کا فرصت کےشائق ہو گئے ہیں۔

برسبیلِ تذکرہ قدرے توقف کے بعد سرور صاحب بولے۔

"شعر... میری لطیف و پرتکلف محسوسات کی واضح صحیح زبان ہے جو میری فکر بیکراں کو بیان کرتی ہے۔ ماضی میں میں نے شاید ضرورتاً افسانے یا تراجم کئے ہوں تاہم نثر لکھنے کے باوجود مجھے نثر میں وہ لذت بے مثال نہ ملی جو شعری لطافتوں کا حصہ تھی۔

اس دور میں کتابیں تعداد میں کم ہوا کرتی تھیں۔ تاہم معیار اونچا ہوا کرتا تھا۔ اچھے لوگ کتابیں لکھتے اور تبصرے کے لئے دیا کرتے تھے۔ اگرچہ میری طالب علمی کا دور ہنوز جاری تھا۔ تاہم تبصرے کے لئے بہت سی کتابیں آجایا کرتی تھیں۔ "انکارے" پر تبصرہ بالخصوص اُس دور کی یادگار تحریر ہے۔ منظور صاحب جو "انگارے" کے بڑے حامیوں میں سے تھے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ پڑھا تو اُس پر تبصرہ لکھا جو رشید صاحب کو دکھایا۔ اُنھوں نے چند جملوں پر اصلاح کر دی۔

س:۔ کیا اصلاح میں مسودہ تبدیل ہو چکا تھا۔ یا چند پیراگراف حذف ہوئے تھے یا پھر اصلاح کے بعد مسودہ نئی چیز بن گیا تھا؟"

ج:۔ نہیں... تبدیلی کا مسئلہ ہرگز نہیں ہے۔ صرف کچھ الفاظ کی ترمیم سے حسنِ بیان میں اضافہ بھی ہوا تھا۔ میں تبصرہ نگار تھا اور حرف بہ حرف پُورا پڑھنے کے بعد ہی تبصرہ لکھنے پر آمادہ ہوا تھا۔

اُنھوں نے کہا۔

"تنقید اور تبصرہ ادب کی ایک اہم ترین صنف ہے جس کے معیار پر الفاظ کی تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس لئے ایک ایک لفظ کو پڑھ کر اور آگاہ ہو کر ہی صحیح اور منصفانہ تنقید یا تبصرہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔ آج کل تبصرہ نگار کتاب مکمل طور پر پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ صرف اپنی رائے لکھ کر فرض ادا کر دینے کو کافی سمجھ لیتے ہیں یا یُوں سمجھ لیجئے کہ اپنی رائے کے لباس میں کتاب کی فکری اثاثے کو مخفی کر دیا جاتا ہے جو حقیقتاً ایک منصفانہ فعل نہیں۔ رسالہ "سہیل" نکالا تو ہم نے اس کے معمولی معمولی کام کو بھی بڑی محنت کے ساتھ انجام دیا تاکہ ادب کو صحیح طور پر پیش کیا جا سکے۔ اس میں سروے بھی کرنے پڑتے تھے اور کتابوں پر تبصرے بھی لکھے گئے۔

س:۔ آپ کا دور... ادب کا بھرپور دور رہا ہے۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں؟ اور آج کے ادب سے آپ مطمئن ہیں؟ پُرامید ہیں؟

ج:۔ یہ خالصتاً سطحی سوالات ہیں۔ مفروضوں پر مبنی۔ میں اس سلسلے میں معافی چاہوں گا۔ اُنھوں نے کسی قسم کی لچک اور نرمی کے بغیر موضوع کو مسترد کر دیا۔

س:۔ شاید میرا اگلا سوال بہت سطحی نہ ہو۔ میں نے زیرِ لب کہا کیونکہ میرے خیال میں منفی پہلو پر بھی اظہارِ رائے کوئی خاص غلطی نہیں۔"

ج:۔ لکھا جا رہا ہے اور بہت لکھا جا رہا ہے۔ اچھا لکھا جا رہا ہے۔ لیکن جو چیز صحیح معنوں میں اچھی ہے۔ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اب اس سلسلے میں وقت اور نقاد ہی فیصلہ کر سکتے ہیں جو کسی چیز کی نوعیت کے بارے میں فیصلہ دیتے۔ ہاں نہیں اور اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو متعلقہ شعبوں میں اپنی رائے کے بارے میں مستند ہوں۔ اس لئے معیار کا تعین خاصا مشکل کام ہے۔ جب میں علی گڑھ پہنچا ہوں تو تحریکِ آزادی کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ ادب میں بھی خاصی ہلچل تھی۔ نہ صرف علی گڑھ میں بلکہ شاید پورے ملک میں ایک قسم کی ذہنی بیداری تھی۔ اس سے قبل یونین کے بحث و مباحثے ہوا کرتے تھے۔ مشاہیر تقاریر کیا کرتے تھے اور علی گڑھ کی باقاعدہ علمی اور ادبی حیثیت کا تعین دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کے سبب معتبر ہو چکی تھی۔ سید سلیمان ندوی ہمیشہ علی گڑھ آیا کرتے۔ اور دُوسری بڑی بڑی شخصیتیں بھی علی گڑھ کے طواف میں تھیں اور مجھے نہ صرف ان کا تعارف حاصل تھا بلکہ ان میں سے بیشتر سے مراسم بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب مجھے بار بار دلاتے رہے کہ مجھے سکون ملے اور بہت لکھنا ہے اور بہت اچھا لکھنا ہے۔ اس لگاؤ، اس عقیدت، اس محبت کی حدت آج بھی میرے خون میں رچی بسی ہوئی ہے۔ علی گڑھ کی تہذیب اور محبتوں کی حلاوتیں بڑی متاثر کُن اور اثر انداز تھیں۔ اس قدر کہ اس طویل مسافت کے بعد بھی دل اس کی لذت کی جستجو میں حیران و پریشان ہوتا ہے۔

اب آئیے ادب کی جانب۔ ادب کی ترقی کے سلسلے میں زبان کی مستحکم بنیاد از حد ضروری ہے۔ ادبی روایات سے واقفیت لازمی ہے۔ اس کے بعد اپنے گرد و پیش کا جائزہ۔ مشاہدہ اور ساتھ ساتھ وسیع مطالعہ اور مطالعے سے حاصل شدہ تجربہ از حد ضروری ہے۔ جب تک کلاسکس سے مطالعہ میں پختگی افکار میں پذیرائی اور پذیرائی کو اسلوب نہیں ملے گا۔ آپ کی تخلیق میں توانائی اور ہمہ گیری نہ ہوگی۔ کلاسکس کے مطالعے سے ہمیں خدوخال و شمائل ملتے ہیں یعنی فطری طور پر ایک سانچہ میسر آتا ہے جس میں اپنی محسوسات کی لطافتوں کو ڈھال کر اجاگر کرنا ہوتا ہے جیسے غالب

نے محسوسات کو بیان کا ایک اسلوب دیا ہے۔ اس اسلوب کو استعمال کرنے کے لئے فکر کو کوئی راستہ نکالنا ہوگا جو اس اسلوب سے استفادہ کرنے کے باوجود اپنا مخصوص قرینہ مقرر کرے۔ دورِ جدید کے نظامِ تعلیم کی ستم کے سبب زبان کی بنیاد کمزور ہوئی ہے یعنی ادبی روایات سے تو رشتہ برقرار ہے تاہم اس قدر مضبوط نہیں کہ اس پر ادب کی فلک بوس عمارت بڑی آسانی سے تعمیر ہو جائے۔

س۔ آپ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ سماجی اقدار اور شعور کی تشکیل میں ادب اہم کردار ادا کرتا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ادب نے اس ضمن میں اب تک کیا کردار کیا ہے اور آئندہ ادب سے کس قسم کی توقعات وابستہ رکھی جا سکتی ہیں؟

ج۔ ادب کے بارے میں ایک وضاحت ضروری ہے کہ ادب سماجی حالات سے متاثر ہوتا ہے اور سماجی حالات کو متاثر ہوتا ہے

———— اوران کا دارومدار دو طرفہ عمل پر صاد کرتا ہے۔ کسی نظم کا، کسی غزل کا، کسی افسانے کا یا کسی ادبی تخلیق کا معاشرے پر لازمی اثر ہوتا ہے۔ اس کے اچھے یا برے اثرات کی پیمائش کے لئے کوئی مقیاس یا آلہ موجود نہیں۔ موجودہ دور برق رفتاری کا دور ہے اور واقعات کی کثرت اس قدر زیادہ ہے کہ اس سرعت کے سبب ہماری تمام تر توجہ کسی موضوع پر بہت زیادہ دیر تک مرکوز نہیں رہ سکتی اور برق رفتاری نے خود اپنے آپ کو دریافت کرنے سے معذور کر دیا ہے تو پھر لازماً ہمیں دوسروں کو سمجھنے کی فرصت بھی مکمل طور پر میسر نہیں آ سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ موج در موج ہم رخشاں و خیزاں وقت کے دھاروں پر بہے جا رہے ہیں جس کے سبب ادیب کا معاشرے پر اثرات کا فوری اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ادب کے اثرات معاشرے پر لازماً مرتب ہوتے ہیں جس قدر معیارِ مطالعہ اعلیٰ ہوگا، فرد کے اندر اسی قدر اعلیٰ معیارِ فکر ... پایا جائے گا کیونکہ کردار کا میلانِ طبع سے ناگزیر رشتہ ہے۔ آدمی جس بات پر یقین کامل رکھتا ہے اسی پر عمل درآمد بھی کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ذہن کی تشکیل کے لئے اچھے محرکات کی ضرورت ہے اور یہ محرکات ادب فراہم کرتا ہے۔ اور ذہن کی تشکیل، فرد میں کردار کی تشکیل کا جزوِ لازم ہے یعنی کہ بہترین ادب و مطالعہ کے اثرات بھی ویسے ہی ہوتے ہیں اور فن پارے میں خوبی براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر آتی ہے سمجھئے نا۔ شاعر... استعارہ تشبیہ اور علامات کیوں ہے۔ اس کے پس منظر میں بے حساب عوامل ہیں جو معاشرے پر بے تحاشا اثرات چھوڑتے ہیں۔

س۔ آپ نے فرمایا کہ دورِ جدید کی برق رفتاری نے ہمیں اپنے سے بھی ملاقات کے قابل نہ رکھا۔ کیا ہمارے اور آپ کے ملک کے ادب میں اندھیرے میں راستہ ٹٹولنے والی کیفیت موجود ہے یا نہیں؟

ج۔ ہم جو دے رہے ہیں تو کن وسائل سے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں زندگی آہستہ آہستہ ترقی کا سفر طے کر رہی ہے۔ تاہم اس دور کو ہم ایک طرح سے صنعتی دور شمار کریں گے۔ ترقی یافتہ ممالک سے ٹیکنالوجی بر آمد ہوتی ہے جس کے سبب مادی ترقی کی رفتار مسلسل بڑھ رہی ہے۔ آسائشوں کے لئے جدید ٹیکنالوجی نے اتنے افق کھول دیئے ہیں کہ ہر فرد لذتِ حیات سے آشنا ہونے کے لئے آسائشوں کے حصول کو ہی ترجیحات قرار دیتے ہوئے بڑھو اور حاصل کرو کے فلسفے پر عمل پیرا ہے۔ اس بڑھو اور حاصل کرو والے فلسفے کو ہم مسابقت کا رجحان مقرر کر سکتے ہیں کیونکہ اس مسابقت میں کوئی اخلاقی، روحانی، معاشرتی... ثقافتی یا تمدنی مزاحمت کی اہمیت باقی نہیں رہ سکتی۔ حاصل کرنے والا صرف حاصل کرنے پر مصر ہوتا ہے تو پھر امرِ لازم ہے کہ حصول مقصد میں کسی قدر کی مزاحمت کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نتیجتاً اخلاقی زوال ناگزیر ہے۔ انسان صرف اور صرف غرض کا بندہ بن جاتا ہے اور اعلیٰ اقدار و محسوسات معدوم ہو جاتی ہیں اس صورتِ حال کو اگر میں کہ زوم رین کا فلسفہ قرار دوں تو آپ کو حیرت نہیں ہونی چاہئے کیونکہ میں صورتِ حال کو بیان کرنے کے لئے بالکل موزوں اور مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہوں۔ ایک زمانے میں میں نے ایک شعر کہا تھا جو حسبِ حال بھی ہے اور یاد بھی ہے

احباب سے یاں لطفِ صحبت بھی رہے
اپنے سے ملاقات کی فرصت کسے
عالم میں چراغاں ہو تو شرکت بھی رہے
تو اپنے چراغ کی حفاظت بھی رہے

اسلام ایک منضبط معاشرے کا نظامِ حیات پیش کرتا ہے۔ اسلام یہ نہیں کہتا ہے کہ پہاڑوں میں جا کر رہبانیت اختیار کی جائے پہاڑوں پر آپ جائیے اس لئے کہ آپ کو خلوت ملے۔ آپ حضرت سے آشنا ہوں۔ آپ اپنی پہچان کر سکیں لیکن اس سے قبل یہ بھی کہوں کہ مالی حیثیت سے آسودگی ہر فرد کا حق ہے۔

موں نے مزید کہا۔

اسلام ایک ضابطۂ حیات بن کر آیا اور ہند کے لوگوں کو گرانقدر اوصاف سے آشنا کیا۔ ہندوستان کی ثقافت پر اسلام کے گہرے نقوش ہیں۔ ہر اچھی چیز کو اچھے ذہن کا انسان نہ صرف اچھی نظر سے دیکھے گا بلکہ اچھائی کو اختیار کرنے پہ آمادہ ہو گیا۔ اسلام نے ہندوستان کو بہت کچھ دیا ہے۔ آج جو ہندوستان ہے وہ اسلام ہی کے باعث ہے اور یہ کہ آج ہندوستان میں جو اسلام ہے بہت سے اسلامی ممالک سے زیادہ طاقت ور، فعال، جاندار اور زندہ قوت ہے۔ اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں۔ اسلام نے اپنی مساوات کا ہند پر بے تحاشا اثر رکھا ہے۔"

س:۔ کیا آپ نے اردو زبان کے معاملے میں ہندوستان اور پاکستان میں فرق محسوس کیا؟

ج:۔ اس میں شک نہیں کہ اردو سے ناانصافی ہو رہی ہے تاہم بعض تبدیلیوں سے اردو مسخ نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مثلاً لفظ گمبھیر جو کہ اردو میں داخل ہوا، اس کو میں بھی بڑے ذوق و شوق سے استعمال کرتا ہوں۔ اس میں مجھے ایک صوتی آہنگ ملتا ہے جس کے اضافے سے اردو کو مسخ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دہلی کے اثرات کو ختم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دہلی کے اثرات بہرحال اسی شدت سے قائم ہیں جیسے کہ صدیوں سے تھے۔ فارسی، عربی کے اثرات بھی اردو پر موجود ہیں۔ انگریزی ایک ایسی زبان ہے جس کے اثرات تقریباً ہر زبان پر موجود ہیں۔ شاید پاکستان میں فارسی کے اثرات رُو بہ زوال ہوں لیکن یہاں لوگوں سے ملاقات کے بعد احساس یہ ہوا کہ آپ کے یہاں اردو ادب پر عربی کے اثرات نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے۔ آئندہ دس برسوں میں شاید مزید مثبت اثرات مرتب ہوں۔ یہ ایک خوش گوار تبدیلی ہے۔ اردو ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیب کا نام ہے اور ہم اس کی وسعتوں میں تہذیب کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی پالتے ہیں۔ میں اردو کو رُو بہ زوال تسلیم نہیں کرتا اور نہ کر سکوں گا۔ نوعِ انسان اگر کسی سے مایوس ہو سکتی ہے تو میں بھی اردو سے مایوس ہو سکتا ہوں۔ اگر نوعِ انسان اسلام سے مایوس نہیں۔ بالکل اسی طرح میں اردو سے مایوس نہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ زندہ زبانیں اپنے اطراف سے استفادہ کے ذریعہ ارتقاء کے مدارج طے کرتی ہیں یعنی جتنی قومیں اس قوم کو استعمال کریں گی، اپنی قومی زبان کی ملاوٹ سے زندہ رہیں گی۔ اس طرح مختلف اقوام کی زبانوں کے اثرات سے کوئی زندہ زبان مسخ نہیں ہو سکتی۔ آپ میرے زمانے کی دہلی کی اردو میں اور آج کی اردو میں بہت

سا فرق پائیں گے کیونکہ اردو میری دہلی کے ایوانوں سے ہوتی ہوئی طویل مسافتوں کی تبدیلیوں کے ساتھ عصرِ جدید کی اوجِ کمال پر پائی جاتی ہے مگر اگر ہم فراخدلی کے ساتھ کسی بھی زبان کو اس کی اصلی حالت کے ساتھ استعمال کریں تقریر میں، تحریر میں، تو سمجھئے کہ ہم نے امانت میں خیانت سے کام نہیں لیا۔

س۔ آپ کی نظر میں ادب کا موجودہ دور کیا ہے؟

ج۔ ٹھوس مادی حقیقت کا دور ہے جس میں انسان کی روحانی اہمیت کو صحیح طور پر شامل نہیں کیا جا رہا۔

انھوں نے صحافت کے بارے میں رائے دی۔

"آپ کے یہاں اردو اور انگریزی صحافت میں غیر معمولی تضادات پائے جاتے ہیں۔ رپورٹنگ صحیح نہیں ہو رہی۔ انگریزی صحافت بہرحال گوارا ہے۔"

س:۔ جدید علامتی شاعری پر اظہارِ رائے فرمایئے۔

ج:۔ جدید شاعری میں علامتی رنگ نمایاں ہے اور نمایاں ہو رہا ہے۔ رمز و اشارے تو ہمارے یہاں فارسی سے آئے۔ جیسے بادہ و مینا وغیرہ۔ جہاں تک علامت کا تعلق ہے اس کا ایک مخصوص پہلو ہے۔ مثلاً اقبال کی بھی علامتی شاعری ہے لیکن وہ زیادہ علامتی نہیں ہے۔ انھوں نے شاہین کو علامت کے طور پہ لیا ہے۔ اب یہاں دو باتیں ہیں۔ ایک ہے علامت اور دوسرا نشان۔ نشان FIX ہوتا ہے۔ لفظوں سے اس کا مطلب نکلتا ہے۔ علامت جو ہے شاعر اپنی طرف سے دیتا ہے جس کے لغوی معنی موجود نہیں ہوتے جیسے لالۂ صحرا کو تنہائی کی علامت کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ صحراؤں کی رہگزر میں لالہ کی مثال کھلنے والی، مہکنے والی حسین و جمیل تہذیب کے لئے استعمال کیا ہے یعنی تہذیبِ حجاز۔ اس کے لغوی معنی موجود نہیں تاہم کوئی نہ کوئی معنی لئے جا سکتے ہیں۔ دلالتِ التزامی پہلے سے موجود تھی لیکن اب استعمال زیادہ ہوا ہے۔ ایک اچھی علامت شاعر کے نفیس ذوق اور ذہنی جہاد کا پتہ دیتی ہے۔ آج کل علامت کے استعمال میں الجھاؤ بہت ہو گیا ہے۔ علامت کا واضح ہونا از حد ضروری ہے۔ جیسے گہرا دھندلکا، شیشے کا گھر وغیرہ۔ علامتیں ثقیل نہیں ہونی چاہئیں۔ مثلاً فیض نے ایک نظم لکھی تھی "کُتے"۔ وہ ایک علامتی نظم تھی۔ کُتے علامت کا لغوی مطلب تو ہے لیکن علامت خفی ہو تو ایک ہائی اسکول کا طالب علم اخذ نہ کر پائے گا۔

س:۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج کے علامت نگاروں نے ہمیں میٹرک کا طالب علم مقرر کر دیا ہے؟

آل احمد سرور سر تا پا ساختہ قہقہے بن گئے۔ سنبھلے تو بولے۔

"مذاق کو چھپانا آرٹ ہے۔ قت مقصود ہوتا ہے جب شاعر اپنے سلسلہ کلام کے دوران اظہر سے کہا۔

"غالب کی شاعری نے اردو ادب کی روح کو بے تحاشا متاثر کیا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر غالب نہ ہوتے تو آج حالی اور اقبال کے ناموں سے بھی آشنا نہ ہوتے۔ آج کے اچھے شعراء آپ کو انقلاب آفرین سمجھتا ہوں۔ جسے لوگ فوری طور پر قبول کرلینے پر آمادہ نہ ہوں۔ اقبال نے اسرار خودی لکھی تو لوگ یہ سمجھے کہ اقبال اپنے خیالات کو پھیلانا چاہتے ہیں تاکہ عالم اسلام لبریز ہو جائے۔ مگر اقبال نے اپنی لندن کی ایک تقریر میں کہا: میں نے شاعری اس لئے نہیں کی کہ عالم اسلام میں پھیلے بلکہ میں نے تو یہ چاہا کہ میرے خیالات ایک چھوٹے سے حلقے تک پہنچیں:

انھوں نے کہا۔

"جہاں ہماری غزل میں بڑی خوبیاں ہیں وہاں ایک خامی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ غزل بہت عمومی ہوگئی ہے یعنی اب انفرادیت کا فقدان ہے۔ اچھی شاعری یا غزل وہ ہے جس میں شاعر کی انفرادیت کا تجربہ جھلکے۔ غزل کی زبان اتنی عمومی ہے بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز تو میر نے بھی کہی اور غالب نے بھی اور کئی اور لوگوں نے۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے اس کا اظہار زیادہ بہتر انداز میں کیا تھا۔ اگر ہم اپنے پچھلے سرمایہ پر نگاہ رکھیں تو ہمیں نئی بات کہنے میں بھی ان سے مدد مل سکتی ہے۔ اس لئے مطالعہ ضروری ہے۔ خاص طور پر اردو کے کلاسکس کا کیونکہ میں اردو کو ایک خودمختار اور آزاد زبان سمجھتا ہوں۔ کسی کی ذیلی زبان نہیں سمجھتا"۔

اقبال کی شخصیت اور فن پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"اقبال اپنی حیثیت میں ایک آفتاب مثال ہیں جس کی روشنی کا پھیلاؤ شرقاً، غرباً، شمالاً، جنوباً اس قدر ہمہ گیر ہے کہ ان کی ہمہ گیر توانائی سے استفادہ کرنے سے گریز کا حوصلہ کسی میں نہیں۔ اقبال کی جو کلیت ہے اس کو نگاہ میں رکھنا ازحد ضروری ہے۔ انھوں نے نثر، شعر، مضامین اور خطبات میں جو کچھ کہا ہے بہترین سرمایۂ حیات ہے۔ اقبال کا حوالہ دیتے وقت ہمیں یہ دیکھ لینا چاہئے کہ ان کا میلان کیا ہے۔ آپ کے یہاں اقبال کے ایک پہلو پر زور دیا گیا تو ہمارے یہاں دوسرے پہلو پر... جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا چیزوں کو بڑے تناظر کے ساتھ ملاحظہ کیا جائے گا۔

اقبال کلاسک کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور کلاسک کو عظیم شاعروں اور ادیبوں کا نام ہے۔ اقبال کی حیثیت و نوعیت کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اقبال شناسی کا تقاضا ہے کہ ہم اقبال سے آگے افق دیکھیں۔ سرسید کی تحریک کے اثرات اب تک ادب پر بہت گہرے ہیں اور سرسید کی تحریک کی روشنی میں ہی اقبال کے ساتھ ہم انصاف کر سکیں گے"۔

ادبیات پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا!

"پاکستان میں اردو بڑی زبان ہے۔ ملک کی قومی زبان ہے جبکہ بھارت میں کئی زبانوں کو بڑا گنا جاتا ہے۔ تیلگو، مراٹھی، ہندی بنگلہ وغیرہ اور یہ زبانیں اردو کو متاثر کرتی ہیں۔ ہندوستان میں ادب کے معنی میں ان تمام زبانوں کو شامل کیا جاتا ہے جو وہاں بولی جاتی ہیں۔ تقسیم سے قبل اردو پر صرف بنگلہ کا اثر تھا۔ اب تقریباً ہر زبان کا اثر ہے اور ان زبانوں کے شاہکار اردو میں منتقل کئے جارہے ہیں۔ اردو آج بھارت میں پیشتر سے زیادہ مقبول ہے۔

انھوں نے بتایا کہ... بھارت میں تنقید، شاعری کے علاوہ نثر بھی بھرپور انداز میں رہی ہے۔ شاعری میں غزل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن نظمیں اور نثری نظمیں بھی لکھی جارہی ہیں۔

آخر میں انھوں نے کہا۔

"ادب کو موضوعاتی کام تک محدود رکھنا ناانصافی کی بات ہے۔ اس سے زندگی کو متحرک رکھنے کا کام لیا جانا چاہئے تاکہ انفرادی سطح پر ہر فرد اور اجتماعی سطح پر قومیں اعلیٰ ترین اخلاقی و معاشرتی اقدار کے ساتھ پہلو بہ پہلو زندہ رہ کر یہ ثابت کریں کہ ادب اصولاً کس قدر اہم چیز ہے جو زندگی کو نورِ بصیرت اور آگہی سے معمور کرتا ہے"۔

آل احمد سرور نے کہا۔

"میں ایک واقعہ سنا کر سوال کرنا چاہتا ہوں۔ میری منجھلی بہن کی شادی تھی جب دستور میں نے سوچا۔ مجھے بھی کچھ دینا ہے۔ زیور کی تلاش کی بجائے میں نظامی پریس گیا۔ پچاس کے قریب کتابیں خریدیں۔ بریلی سے ایک الماری خریدی اور اسے تحفے میں دے دی۔ پورا خاندان حیران تھا کہ یہ کیا تحفہ ہے؟ میں نے سنا ہے کہ بنگال میں لڑکی کو جہیز میں ٹیگور کی کتابیں دی جاتی ہیں۔ میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ لوگ اپنی لڑکیوں کو جہیز میں غالب اور اقبال کے دیوان کیوں نہیں دیتے کہ علم فروزاں ہو"۔

اور سرور صاحب کے اس سوال کے ساتھ ہی ہم نے اجازت چاہی کیونکہ دن اب عروج پر تھا اور زندگی دیگر مسائل کی جانب سمٹنا چاہتی تھی۔

اور در بند ہو گیا

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی کہ یکایک ثعلبہ بن حاطب بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور سلام کرکے نہایت ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا مگر اُس کی نگاہیں کچھ بے چین سی تھیں۔ سرور دو عالم ؐ ایک ہی نظر میں اُس کے دل کا حال جان گئے اور تھوڑے توقف کے بعد پوچھا: "ثعلبہ! کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ثعلبہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ ؐ! میری خواہش ہے کہ میرے پاس بہت دولت ہو۔ میرے لئے دُعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے مال دار کر دے۔"

رسالت مآب ؐ نے شفیق لہجے میں فرمایا: "اے ثعلبہ! اللہ تعالیٰ کو سادگی بہت پسند ہے۔ ذرا میری طرف دیکھو اور غور کرو۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ میری طرح صبر و شکر سے سادہ زندگی بسر کرو۔ سادگی میں بڑی عظمت ہے۔ میں اگر چاہوں تو یہ سب کے سب پہاڑ سونے کے بن جائیں۔ جہاں میں جاؤں یہ میرے ساتھ ساتھ چلیں، مگر نہیں! مال و زر انسان کی آنکھوں پر غفلت کی پٹی باندھ دیتے ہیں۔ یہ اسے اپنے پروردگار سے بہت دور کر دیتے ہیں۔"

ثعلبہ بن حاطب کے دماغ میں تو دولت کا سودا سمایا ہوا تھا۔ مال و زر کی حرص و طمع نے اس کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو مفقود کر دیا تھا۔ حضورِ اکرم ؐ کی باتیں سن کر بھی اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اس نے پھر استدعا کی: "حضورؐ! آپ کا فرمانا حق بجانب اور درست ہے مگر میری دلی خواہش ہے کہ میں مالدار بن جاؤں۔ میرے گھر میں بھی دولت کی ریل پیل ہو جائے اور میں لوگوں میں دولت مند کی حیثیت سے جانا اور پہچانا جاؤں۔ آپ ؐ کے نزدیک تو یہ کام کوئی مشکل نہیں۔ آپ ؐ اللہ تعالیٰ سے دُعا فرما دیں کہ میں مال و زر سے نوازا جاؤں۔ مجھے اس خدائے ذوالجلال کی قسم جس نے آپ ؐ کو اپنا نبی بنا کر بھیجا ہے کہ جب بھی مجھے دولت میسر آئے گی، میں ہر حقدار کا پورا پورا حق ادا کروں گا۔ کسی کو کبھی بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

رسولِ خدا ؐ نے ثعلبہ کو ایک بار پھر سمجھاتے ہوئے فرمایا: "اے ثعلبہ! یہ اچھی طرح جان لو کہ تھوڑا مال جو تمہارے اندر صبر و شکر کا جذبہ پیدا کرے جس کی موجودگی تمہیں یادِ الٰہی سے غافل نہ کر سکے، جو تمہاری درست سوچ و بچار کو بُرائی کی راہ پر نہ چلا سکے، اس زیادہ مال سے ہزار درجے بہتر ہے جس کی وجہ سے آنکھوں پر غفلت کی پٹی بندھ جائے، تمہیں قادرِ مطلق کا شکر ادا کرنے سے غافل رکھے، اس کے بتلائے ہوئے اصولوں سے منحرف کر دے اور تباہی کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دے۔"

ثعلبہ بن حاطب مکمل طور پر شیطان کی گرفت میں آ چکا تھا۔ اس کی عقل پر حرص و لالچ کے پردے پڑ چکے تھے۔ اچھے بُرے کی تمیز ختم ہو چکی تھی۔ اس کے رگ و پے میں دولت کی چمک سرایت کر چکی تھی۔ ضد کرتے ہوئے اس نے پھر عرض کیا: "یا رسول اللہ! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ احکامِ خداوندی بجا لانے میں کبھی بھی اجتناب نہیں کروں گا۔ اپنی تمام ذمہ داریاں حسن طریقے سے نبھاؤں گا اور آپ ؐ کو کبھی بھی شکایت کا موقع فراہم نہیں کروں گا۔ آپ ؐ ایک بار میرے حق میں دُعا فرما دیجئے۔"

ثعلبہ بن حاطب کا مستقبل آپ ؐ کی آنکھوں کے سامنے پلک جھپکتے ہی گزر گیا مگر اُس کی ضد کو دیکھتے ہوئے مجبوراً آپ نے دُعا فرمائی: "اے اللہ! تو گواہ ہے کہ ثعلبہ کو سب اونچ نیچ میں نے اچھی طرح سمجھا دی ہے۔ تو اپنے بے بہا اور گرانقدر خزانوں میں سے اس کی خواہش کے مطابق مال و زر عطا فرما۔"

"بس پھر کیا تھا ادھر رسولِ خدا ؐ کے متحرک ہونٹ ساکن ہوئے، ادھر رحمتِ خداوندی جوش میں آ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ثعلبہ بن حاطب پر رزق کے دروازے کھول دیئے۔ قدرت نے اس کے ہاتھوں میں ایسی طاقت دے دی کہ وہ جس چیز کو بھی اپناتا، وہی اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہو کر دھن برسانے لگتی۔ شروع شروع میں اس نے چند بکریاں خریدیں اور ان سے افزائش نسل کرنے لگا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اللہ تعالیٰ نے اس کے کاروبار میں اتنی برکت دی کہ مدینے کی بڑی سے بڑی حویلی میں بکریوں کا سمانا مشکل ہو گیا اور پھر اسے مجبوراً اپنے ریوڑ کو لے کر جنگل میں ڈیرہ جمانا پڑا۔

وقت گزرتا گیا۔ جوں جوں ثعلبہ بن حاطب کی بکریوں میں اضافہ ہوتا گیا، اس کے شب و روز میں نمایاں فرق رونما ہونے لگا۔ پہلے وہ بیشتر وقت مسجد میں یادِ الٰہی میں مصروف رہتا اور پانچ وقت نماز باجماعت نہایت باقاعدگی سے ادا کرتا۔ اسی لئے اکثر اسے مسجد کی کبوتری کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کی مصروفیات بڑھیں اور اس نے مسجد کے اوقات میں تبدیلی کر دی۔ شروع شروع میں وہ نماز عشاء کے وقت غیر حاضر رہتا مگر بعد میں وہ تقریباً سبھی نمازوں

کے وقت مسجد سے غائب رہنے لگا۔ جیسے جیسے اس پر دولت کی بارش ہوتی گئی، وہ دُنیا کی جھمیلوں میں پھنستا چلا گیا۔ جب وہ خود مصروف سے اپنے حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے جانوروں کے ریوڑ پر نگاہ ڈالتا تو اس کا دل یادِ الٰہی اور احکاماتِ خداوندی سے میلوں دُور ہوتا جاتا۔ یہاں تک کہ جمعہ چھوٹ گیا۔ عید کے روز بھی وہ مسجد میں حاضری دینے سے محروم رہنے لگا۔"

خدا کا کرنا کہ انہی زمانے میں زکوٰۃ کا حکم نازل ہوا اور اسے ہر ذی حیثیت مسلمان پر فرض کر دیا گیا۔ رسولِ اکرمؐ نے یہ حکم ملتے ہی اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ انھوں نے اپنے عامل مقرر کئے جو ہر علاقے میں مقیم مسلمانوں کے پاس جاتے اور حضورؐ کے حکم کے مطابق اُن سے زکوٰۃ وصول کرتے۔ دُوسرے مسلمانوں کی طرح آپؐ نے ثعلبہ بن حاطب کے پاس بھی اپنے دو عامل روانہ کئے۔ جونہی اسے اُن کے آنے کی غرض و غایت کا علم ہوا، اس کے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھی۔ فوراً ہی اس کے دماغ پر شیطان نے قبضہ جما لیا۔ وہ انھیں ٹالنے کی غرض سے بولا۔ "آپ لوگ ذرا دُوسری جگہوں کا چکر لگا آئیں، اس دوران میں میں اس کے متعلق سوچ لوں گا۔"

اس کا جواب سُن کر دونوں عامل وہاں سے دُوسرے بیابانوں قصبوں وغیرہ میں چلے گئے۔ خُدا اور اُس کے رسُولؐ کا حکم سُن کر مسلمانوں نے اپنے اپنے مال میں سے نصاب کے مطابق عمدہ اور صحت مند جانور زکوٰۃ کے لئے پیش کئے۔ سب جگہوں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد عامل پھر ثعلبہ بن حاطب کے پاس پہنچے اور زکوٰۃ کا مطالبہ کیا۔ دُوسرے مسلمانوں سے حاصل کی ہُوئی زکوٰۃ دیکھنے کے باوجود اُس کے دل و دماغ پر شیطان کا قبضہ غالب رہا۔ بحث و تکرار کی خاطر اس نے کہا۔ "حضورؐ کا وہ حکمنامہ تو دکھاؤ جس میں زکوٰۃ کے متعلق ہدایت کی گئی ہے۔" اسی وقت اسے حکمنامہ دکھا دیا گیا۔ پڑھنے کے بعد اس نے بُرا سا منہ بنایا اور حکمنامہ واپس کرتے ہوئے بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ "یہ تو ایک قسم کا جزیہ ہے۔ مَیں ایک مُسلمان ہُوں اور بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے جزیہ مجھ پر واجب نہیں۔ بہرحال آپ حضرات اس وقت تشریف لے جائیں۔ مال و زر کا معاملہ ہے۔ اس کے متعلق سوچنے کے لئے مجھے مہلت درکار ہے۔ محنت سے کمائی ہوئی دولت مَیں یُوں تو جگہ جگہ بانٹنے سے رہا۔ یہ انصاف کے منافی ہے۔"

دونوں عامل وہاں سے رخصت ہوکر رسالتِ مآبؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور پُورے دن کی کارروائی سے مطلع کیا۔ ابھی ثعلبہ کے معاملے کی تفصیلات انھوں نے عرض ہی نہیں کی تھیں کہ حضورؐ

نے فرمایا: "ثعلبہ ہلاک ہوگیا۔" اس کے بعد آپؐ نے دُوسرے مسلمانوں کے بھیجے ہوئے زکوٰۃ اداروں کی تھی، خیر و برکت کی دُعا فرمائی۔

اسی وقت ثعلبہ بن حاطب کے بارے میں ایک آیت نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ (ترجمہ)

"اور کچھ ان میں سے وہ ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ کیا کہ اگر ہمیں اللہ نے اپنے فضل سے نواز دیا تو وہ دل کھول کر خیرات کریں گے اور ان کا شمار نیکوکاروں میں ہوگا۔ جب اس نے انھیں اپنے فضل سے عطا فرمایا تو وہ اس کے ساتھ کنجوسی کرنے لگے اور روگردانی کرلی اور وہ منہ پھیرنے والے ہیں۔ پس اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں نفاق جما دیا۔" (سورۃ التوبہ)

جونہی ثعلبہ بن حاطب کو علم ہُوا کہ اس کے بارے میں حکمِ الٰہی نازل ہُوا ہے تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ چشم زدن میں دولت کا نشہ ہرن ہوگیا اور کچھ نہ سُوجھا۔ سیدھا زکوٰۃ لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ آپؐ نے سب کچھ دیکھا اور سنجیدگی سے فرمایا۔

"ثعلبہ! اب وقت گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرا صدقہ قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ یہ سب کچھ واپس لے جاؤ اور اب اپنے ہی تصرف میں لاؤ۔"

ثعلبہ نے بہت منت سماجت کی۔ رویا پیٹا۔ فریاد کی۔ اپنی خطاؤں کی معافی کی خاطر اپنے سر پر خاک ڈالی مگر توبہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مہلت گزر چکی تھی۔ لہٰذا اس کی زکوٰۃ قبولیت حاصل نہ کر سکی۔

رسالت مآبؐ کی وفات کے بعد خلیفۂ اوّل حضرت صدیقِ اکبرؓ کے عہدِ خلافت میں ثعلبہ پھر زکوٰۃ لے کر حاضر ہُوا۔ چونکہ اس کی زکوٰۃ رسُولِ خُداؐ نے منظور نہیں فرمائی تھی، اس لئے حضرت صدیقِ اکبرؓ نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح عہدِ فاروقی میں اس نے زکوٰۃ پیش کرنے کی کوشش کی مگر حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اسے شرفِ قبولیت نہ بخشا کیونکہ اس سے پیشتر حضورؐ اور حضرت صدیقِ اکبرؓ اس کو پہلے ہی رد کر چکے تھے۔ اسی حالت میں ثعلبہ بن حاطب اپنے کئے پر نادم ہوتا ہُوا حضرت عثمانِ غنیؓ کے عہدِ خلافت میں انتقال کر گیا۔

اسماء اعجاز

وہ دونوں تنہا اپنے اپنے پیار کے رشتوں کو کھو چکے تھے۔ اس لیے ایک دوسرے کی روح کو سیراب کرنے کے لیے ایک دوسرے کا سہارا بن گئے

بے لوث پیار اور خلوص کے مضبوط رشتے کی کہانی



رنگ برنگی پرندوں نے چوں چوں کرکے سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ بڑے سے پنجرے میں بند کبھی اِدھر کبھی اُدھر پھدکتیں اور شور مچاتیں۔ پنجرے کے پاس ہی زمین پر بیٹھی عالیہ غور سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ بڑھا کر اُن کو دانہ ڈالتی تو ایک دو لمحوں کو سب اِدھر اُدھر بکھر جاتیں پھر دانہ دیکھ کر قریب آجاتیں۔ عالیہ خود ہی مسکرا پڑتی پھر سنجیدہ ہو جاتی۔

اندر سے سلیم صاحب کے آواز دینے پر وہ چونک گئی پہلے اس نے منہ کھولا اور بولنا چاہا پھر منہ بند کرلیا، اور جس درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر وہ بیٹھی تھی اس کے سہارے سے بڑی مشکل سے اٹھی اور لنگڑاتی ہوئی آہستہ آہستہ اندر کی طرف چل دی۔

"بیٹی! اتنی دیر سے کیا کر رہی ہو؟" سلیم صاحب نے اسے دیکھ کر محبت سے کہا۔

"وہ . . . وہ . . . چڑیا . . ." عالیہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔ اُسے بولتے وقت ہو رہی تھی سلیم صاحب مسکرا دیئے۔

"اچھا . . چڑیوں کے پاس بیٹھی تھیں۔ اچھا ہے۔ اچھا ہے۔ اِن کو بھی تو تمھاری ضرورت ہے نا؟ اگر تم خود انھیں دانہ نہ ڈالوگی نا تو وہ مر جائیں گی۔" اُنھوں نے اُسے اس کی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔

"سب . . . سب مر جائیں گی؟" عالیہ نے پھر بڑی مشکل سے لفظوں کی ادائیگی کی۔

"ہاں! سب مر جائیں گی کیونکہ تم نے شروع سے انھیں پالا ہے تم ان کا خیال نہ رکھو گی تو وہ کیسے جئیں گی؟"

"نہ . . . نہ . . . یہ غلط ہے۔" عالیہ نے ایک دم کہا۔ اس کا منہ لال ہو گیا تھا سلیم صاحب حیران ہو گئے۔

"کیوں، غلط ہے بیٹے کیوں غلط ہے؟"

"میں . . . میری . . . اماں . . . نہیں ہے۔ میں نہ مری۔" عالیہ نے اتنا سا جملہ کہنے کے لئے دو منٹ لگا دیئے مگر سلیم صاحب بڑے حوصلے سے اس کی پوری بات سمجھ کر کہنے لگے۔

"بیٹی! یہ تو قانونِ قدرت ہے۔ تمھاری اماں اللہ کے پاس چلی گئی تھیں مگر تم اس لئے زندہ رہیں کہ خدا نے تمھیں، مجھے اور سب انسانوں کو عقل دی ہے اور یہ عقل ہمیں برداشت اور حوصلہ سکھاتی ہے کہ ہر انسان کو ایک نہ ایک دن خدا کے پاس جانا ہے۔"

"نہ . . . یہ بات بھی نہ . . ." عالیہ نے جھنجھلا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے

ہونے آنے کو درست کیا اور پھر کہنے لگی۔

"میں اماں کی بات نہیں کر رہی میں آپ کی بیٹی سعدیہ کی بات کر رہی ہوں۔"

"اوہ!" سلیم صاحب چکرا کر رہ گئے۔ اگرچہ عالیہ بہت مبہم سے الفاظ بولتی مگر سلیم صاحب سمجھ لیتے تھے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ عالیہ پر پھر آج اس کی اپنی ماں کی جدائی کا بھوت سوار ہو گیا ہے ایسا ہی ہوتا تھا جس دن عالیہ بہت اداس ہوتی اس دن وہ سلیم صاحب سے بار بار یہی پوچھتی کہ اس کی ماں سعدیہ اس کو کیوں اپنے پاس نہیں رکھتی۔ کیوں اس کے پاس نہیں رہتی۔ اسے اس بات کی سمجھ نہ آتی تھی کہ ایسا کیوں ہو گیا ہے۔

سلیم صاحب نے عالیہ کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا پھر اسے اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا کر کہنے لگے۔

"کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں اکیلا رہ جاؤں؟ تنہا؟"

عالیہ نے صرف نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر تم کیوں اپنی امی کو یاد کرتی ہو؟"

عالیہ نے کچھ نہیں کہا مگر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"تم سے تمھاری امی کو بڑی محبت تھی۔ بہت زیادہ ایک پل کو وہ تم سے جدا ہونا پسند نہ کرتی تھیں۔ انھوں نے سعدیہ کے بدلے میں تمھیں گود لیا تھا۔ پھر اتنے سال تمھیں پالا۔ پوسا اور جب اللہ کے پاس جانے لگیں تو تمھیں میرے حوالے کر دیا۔ اب بتاؤ میں تمھارے بغیر کیسے زندہ رہ سکتا ہوں۔" سلیم صاحب نے بڑی محنت سے عالیہ کو یقین دلایا تو عالیہ دھیمے سے مسکرا دی اُسے یقین آگیا تھا پھر بھی وہ ضرور پوچھتی۔

"سعدیہ امی . . . کیوں نہیں آتیں؟"

"میں تو کہتا ہوں کہ نہ آئے۔ اگر اس نے تمھیں لے جانے کا کہہ دیا تو میں کیا کروں گا۔ بولو۔ بتاؤ۔ تم میرے بغیر رہ لو گی؟ یا میں تمھارے بغیر رہ سکوں گا؟" سلیم صاحب اپنی آنکھوں کی نمی کو صاف چھپا جاتے۔

تب عالیہ کے چہرے پر ایک دم سکون کی لہر دوڑ جاتی۔

"بس . . . بس . . ." وہ صرف اتنا ہی کہتی اور تصویروں والی کتاب کھول کر بیٹھ جاتی۔ اس وقت سلیم صاحب ذہنی طور پر اتنے تھک جاتے کہ آنکھیں موند لیتے اور بند آنکھوں میں پی جانے والے آنسو ٹپ ٹپ کر کے اُن کے دل پر گرنے لگتے۔ وہ عالیہ کی اس اماں کو کہاں سے لاتے جو نہ آنے کے لئے چلی گئی تھی۔ اس تنہا اور معذور بچی کو بھی چھوڑ کر چلی گئی تھی اور نہ

اُنھیں یادوں کی دھند میں بھٹکنے کو چھوڑ دیا تھا۔

▼▼

امّاں نے فرطِ محبت سے نرم نرم کمبل میں لپٹی سُرخ و سفید بچّی کو سینے سے لگا لیا تھا۔

"اللہ! تیرا شکر۔ تو نے چاند سی بیٹی دے دی ہمیں۔"

"پہلے مجھے تو دکھا لیں۔" جاوید امّاں کے اُوپر چڑھتے ہوئے بولا۔

"ارے اماں کیا کرتی ہیں۔ انفیکشن ہو جائے گی۔ بہت چھوٹی ہے وہ۔" سعدیہ دُور سے اُسے دیکھ کر چلائی۔

"نہیں ہوتی انفیکشن، ماموں ہے وہ۔ اب پیار بھی نہ کرے۔ مہینوں سے ایک ایک کر کے تو دن کاٹے ہیں۔ تمہارا تو یہاں آنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔" امّاں ناراضگی سے بولیں۔

"لائیں مجھے دے دیں۔ یوں بھی اس کے دُودھ کا وقت ہو رہا ہے۔" سعدیہ نے بچّی کو لینے کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔

"سعدیہ! ہم نے بھی بچے پالے ہیں۔ تو تو بیٹی بڑی بے صبری ماں ہے۔" امّاں نے سمجھایا تو سعدیہ خجالت سے مُسکرا دی اور کہنے لگی۔

"امّاں! وہاں تو کوئی ہوتا ہی نہیں۔ گھر بھر میں بس میں اور یہ بچی۔ ... حسن شام کو آتے ہیں۔ یہاں آتے وقت خاص طور پر کہہ رہے تھے کہ بچّی کو ذرا الگ رکھنا انفیکشن نہ ہو جائے۔ پھر میری واپسی مشکل ہو جائے گی۔"

"ہاں بھئی! ٹھیک کہتی ہو۔ اولاد ہے ہی بڑی پیار کی چیز مگر یہ بھی تو نہ بھولا کرو کہ تم بھی ہمارے لئے ایسی ہی تھیں۔" امّاں نے بچّی کو سعدیہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"اس لئے تو ہر سال بھاگی آتی ہوں۔ اب بھی پُورا مہینہ رہوں گی۔"

"تجھے پتہ ہے بیٹے یہ مہینہ کتنا چھوٹا ہو جاتا ہے۔ کتنے کم دن لگتے ہیں مجھے اس ایک مہینے کے۔ جبکہ سارا سال تیرے انتظار میں کاٹے نہیں کٹتا۔"

"دراصل آپ کے پاس نوکروں چاکروں کی بھیڑ رہتی ہے نا! کوئی کام بھی تو نہیں ہوتا۔ ہمیں تو وہاں پتہ ہی نہیں چلتا کہ دن کہاں گزرا اور رات کہاں آئی۔ اتنا کام ہوتا ہے پھر شام کو آنا جانا لگ جاتا ہے۔" سعدیہ نے کہا۔

"ہاں بیٹی! وقت وقت کی بات ہے۔ کبھی ہمارے دن بھی ایسے گزرا کرتے تھے۔" امّاں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اچھا اب اسے مجھے دے دے اور تو اس کی بوتل میں دُودھ بنا لے۔"

"نہیں امّاں! اسے کمرے میں ہی لٹا لوں گی اور دُودھ بھی بنا لوں گی۔ اس کی عادت خراب نہیں کرنا ہے مجھے۔" سعدیہ ہنس کر اُٹھتے ہوئے بولی۔

"جیسے تیری مرضی!" امّاں بھی مُسکرا دیں۔

"امّاں! ہم بھی اپنی بیٹی کو سعدیہ باجی کو ہاتھ نہیں لگانے دیں گے۔" جاوید لسورتا ہُوا امّاں سے کہہ رہا تھا۔

"کون سی بیٹی کو؟" سعدیہ نے قہقہہ لگا کر پوچھا۔

"جو ہمارے یہاں ہو گی۔" جاوید نے چڑا کر کہا۔

امّاں اور سعدیہ ہنسنے لگیں تو جاوید کھسیانا سا ہو کر باہر نکل گیا۔

سعدیہ خود بھی گھر کی لاڈلی تھی۔ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے ماں باپ کے علاوہ باقی رشتے دار بھی پیار محبت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتے۔ پھر جب سے وہ پیدا ہوئی تھی گھر میں دولت کی ریل پیل ہو گئی تھی۔ شکل صورت بھی اللہ تعالیٰ نے خوب دی تھی۔

شادی ہوئی تو اگرچہ حسن زیادہ امیر گھرانے سے تو تعلق نہ رکھتا تھا مگر فارن سروس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ جس کی وجہ سے سعدیہ اور وہ اکثر پاکستان سے باہر ہی رہتے کبھی کبھار پاکستان آتے تو سب رشتے دار انھیں آنکھوں پر بٹھا لیتے۔

اب سعدیہ پورے سال بھر بعد آئی تھی جبکہ اس کی پہلی بچّی دو ماہ کی ہونے کو تھی مگر حال یہ تھا کہ سعدیہ اُسے کسی کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی۔ باہر رہنے سے یوں بھی سارے کام خود ہی کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اس لئے آسانی سے وہ بچّی کے تمام کام کر لیتی تھی۔ امّاں لاکھ ہاتھ بٹانا چاہتیں مگر وہ سب کچھ خود ہی کرتی۔ جاوید اگر دو منٹ سے زیادہ اسے گود میں لے لیتا تو سعدیہ کو بہانے بہانے سے پوچھنا پڑتا کہ کہیں جاوید کا گلا وغیرہ تو خراب نہیں اور اگر بچّی کو کہیں چھینک آ جاتی تو سعدیہ گھر بھر کے افراد کا جائزہ لیتی پھرتی کہ کس کو نزلہ کام ہے؟

امّاں کہتیں۔

"ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ جتنی محبت ہم اپنے بچّوں سے کرتے ہیں کوئی نہیں کرتا مگر سعدیہ نے تو حد ہی کر دی۔"


باتھ سائز
پامی
تازگی' بچت' خوشبو
پامی صابن سے
پامی ٹائیلٹ صابن کی حسین ٹکیہ
جھاگ دے زیادہ بھی اور بہت ملائم بھی
تازگی ہے پامی سے' زندگی ہے پامی سے
جسم پامی صابن سے دیر تک مہکتے ہیں
تازگی' بچت' خوشبو ساتھ ساتھ چلتے ہیں
پامی
بنانے والے
ذوالفقار انڈسٹریز لمیٹڈ
زیل کارپوریشن لمیٹڈ کا ذیلی ادارہ
PRESTIGE Z-L 373 5.81 RTS

"بس میں چاہتی ہوں کہ عالیہ بالکل بیمار نہ ہو۔ بہت موٹی تازی تندرست رہے اور جلدی بڑی ہو جائے" سعدیہ ہنس کر کہتی۔

"یہ بڑی ہو جائے گی نا! تو سعدیہ باجی تم بوڑھی ہو جاؤ گی" جاوید اُسے چھیڑتا۔

"فکر نہ کرو۔ میں اکیلی بوڑھی نہیں ہوں گی تم بھی میرے ساتھ ہی بوڑھے ہو گے۔ صرف تین سال کا تو فرق ہے"

"تو پھر تم اُسے اتنی جلدی بڑا کیوں کرنا چاہتی ہو؟ ابھی تو گڑیا سی ہے"

"میرا دل چاہتا ہے کہ عالیہ جلدی سے اتنی بڑی ہو جائے کہ اپنے پاؤں پر چلنے لگے۔ بس میرے ساتھ ساتھ گھر بھر میں پھرتی رہے، میرے ساتھ بازار جائے، پیاری پیاری باتیں کرے۔ پتہ ہے جاوید! مجھے بہت زیادہ بولتے ہوئے شرارتی بچے بہت اچھے لگتے ہیں"

"تبھی جب میں یہ سب حرکتیں کرتا تھا تو تم مجھے مارا کرتی تھیں"

"ارے ہاں! تمھیں یاد ہے ابھی تک۔۔۔ مگر جاوید عالیہ کی تو اور ہی بات ہے نا! اور پھر اب تو تم بھی مجھے بہت اچھے لگتے ہو"

"الٰہی تیرا شکر کہ سعدیہ باجی نے آج اپنے پیارے بھائی سے اظہارِ محبت تو کیا" جاوید مضحکہ انداز میں آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر بولا۔

"اسی لئے تو تمھیں ساتھ ہی لے جا رہی ہوں"

"وہاں کون سا تم دونوں اکٹھے رہو گے؟" امّاں نے بھی دخل دیا۔

"پھر بھی امّاں کبھی کبھار تو مل ہی لیا کریں گے"

"بس اس کی پڑھائی ختم ہو جائے تو جلدی سے اس کی شادی بھی کر دوں۔ میرے گھر میں رونق تو ہو"

"اور امّاں اگر یہ رونق بھی باہر چلی گئی؟"

"یہ تو اپنے مقدر کی بات ہے بیٹی! تمھیں روک سکی؟ جو اس کو روک لوں گی۔ یہ تو تم لوگوں کے دل سے ہی اُٹھے گا تو واپس آؤ گے ماں باپ کے کہنے پر کون آتا ہے"

"بس امّاں جانی! پڑھائی ختم کر کے دو سال نوکری کروں گا پھر واپس۔۔۔" جاوید نے امّاں کے گلے میں بازو ڈال دیئے

"اچھا اچھا! جیتے رہو، جہاں رہو خوش رہو"

پھر سعدیہ اور جاوید دونوں چلے گئے۔ جاوید تعلیم کے سلسلے میں اور سعدیہ واپس اپنے گھر۔

تین سال گزر گئے۔ جاوید تو ایک بار آن کر مل گیا تھا مگر سعدیہ نہ آسکی تھی۔ اُن کی ٹرانسفر وہاں سے کسی اور جگہ پر ہو گئی تھی۔ امّاں اور سلیم صاحب دن رات اس کا انتظار کرتے رہتے تھے۔

پھر ایک دن اچانک ہی سعدیہ کا خط آ گیا۔ اگلے ہفتے میں وہ آ رہی تھی۔ اس کے یہاں دُوسرا بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ اسی لئے وہ یہاں آنا چاہتی تھی۔

گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ امّاں نے سعدیہ اور عالیہ کے لئے الگ الگ کمروں کا بندوبست کیا۔ سارا گھر صاف ستھرا کرایا گیا۔ امّاں کو یاد تھا سعدیہ بچوں کے معاملے میں کس قدر محتاط ہے اس لئے انھوں نے ہر چیز اپنی نگرانی میں صاف کروائی تھی۔ عالیہ کے کھیلنے کے لئے انھوں نے کھلونوں کا انبار لگا لیا تھا

مقررہ دن پر سعدیہ اور حسن دونوں ہی آن پہنچے۔ جہاز سے اُترے تو حسن نے عالیہ کو گود میں اُٹھا رکھا تھا۔ امّاں حیران ہوئیں پر بولیں کچھ نہیں۔ جانتی تھیں کہ بچوں کے معاملے میں وہ دونوں کسی کی نہیں سُنتے۔

اِدھر اُدھر کی باتوں میں رات گزر گئی۔ اگلے دن امّاں پر انکشاف ہُوا کہ عالیہ تو ابھی چلتی ہی نہیں۔

"مگر کیوں؟" پریشانی سے امّاں کے مُنہ سے بات نہیں نکل رہی تھی کسی نے جواب نہ دیا۔

"بتاتے کیوں نہیں؟"

"امّاں پیدائش کے وقت ہی بچّی کے سر میں چوٹ آ گئی تھی اس سے جسم کے کچھ حصّے مفلوج ہو گئے ہیں" سعدیہ نے گلوگیر لہجہ میں کہا۔

"کچھ علاج کروایا؟"

"آپ کو پتہ ہے امّاں! وہ کتنا ترقی یافتہ ملک ہے۔ ایک ایک چیز چیک کروالی۔ کہتے ہیں علاج ممکن نہیں ہے" اب کے حسن نے کہا۔ سعدیہ تو رو رہی تھی۔

"اچھا تم چُپ کرو! روؤ مت۔ تمھارے لئے ایسی حالت میں رونا مناسب نہیں" امّاں نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "اللہ بہتری کرے گا"

مگر اب امّاں کی توجہ پوری کی پوری عالیہ پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ عالیہ بڑی پیاری بچی تھی۔ سُرخ و سفید گول مٹول

ایک بازو اور ایک ٹانگ بالکل صحیح کام کرتے تھے مگر دوسرا بازو اور ٹانگ کام نہ کرتے۔ اس کے علاوہ وہ بول بھی نہ سکتی تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ اگر وہ سن لے تو بول سکتی ہے ابھی چھوٹی تھی اس لئے کانوں پر کوئی آلہ بھی نہ لگا سکتی تھی۔

سعدیہ چند دن کے بعد ہی اسپتال چلی گئی اور وہاں اس کے یہاں بچہ پیدا ہوا۔ اب کے اتنی خوشیاں نہ منائی جا سکیں مگر حسن کے گھر والوں نے بہت خوشی منائی۔ امّاں تو بس عالیہ کو دیکھ دیکھ کر ہی آدھی رہ گئی تھیں۔ سعدیہ نئے آنے والے بچے میں اتنا گم ہو گئی تھی کہ عالیہ کا بھی اُسے ہوش نہ رہا تھا۔ امّاں ہی اُسے نہلاتیں دُھلاتیں، کپڑے پہناتیں۔ کھانا کھلاتیں غرضیکہ اس کا ہر کام امّاں ہی کرتیں اور اگر نہ کرتیں تو وہ چُپ چاپ بیٹھی رہتی۔ بول تو سکتی نہ تھی کہ کسی سے کہتی یا ضد کرتی یا شور مچاتی۔ اسی لئے امّاں کو ہر وقت اس کا خیال بھی رہتا۔

اب کے حسن اور سعدیہ دو مہینے کے لئے آئے تھے مگر یہ دو مہینے بھی پلک جھپکتے میں گزر گئے اور ان کی واپسی کے دن آ گئے جیسے جیسے روانگی کا وقت قریب آتا جا رہا تھا سعدیہ پریشان ہو رہی تھی۔ چھوٹے سے بچے کے ساتھ ایک معذور بچی کو کس طرح سنبھالے گی۔ سارا وقت اس کی اور حسن کی چخ چخ مچی رہتی۔ کسی نوکرانی کا بندوبست بھی نہ ہو پا رہا تھا۔ اگر کوئی آتی بھی تو اتنی رقم مانگتی کہ جسے وہ لوگ دے نہ سکتے۔

امّاں محسوس کرنے لگی تھیں کہ سعدیہ اور حسن دونوں ہی عالیہ کو بوجھ تصور کرنے لگے ہیں۔ امّاں کو یاد آیا تھا کہ کس طرح سعدیہ کسی کو ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی مگر اب . . . ؟ وہ حیران ہوتیں سعدیہ کی ممتا کو کیا ہُوا؟ امّاں جھنجھلا کر پوچھتیں۔

"وہاں ایسے بچوں کے ساتھ لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"وہاں تو امّاں ایسے ادارے بنے ہیں کہ جہاں اس طرح کے بچوں کو رکھا جاتا ہے۔" سعدیہ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔

"پھر۔" امّاں سوالیہ نشان بن گئیں۔

"میں وہاں نہیں رکھ سکتی۔ اتنی محنت سے تو میں نے اُسے پالا ہے۔"

"مگر کیا کرو گی؟" حسن نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"امّاں! آپ ہی بتائیں کیا کروں؟" سعدیہ نے اُمید طلب نظروں سے امّاں کی طرف دیکھ کر پوچھا تو امّاں سمجھ گئیں کہ وہ دونوں کیا چاہتے ہیں۔ آہستہ سے بولیں۔

"رکھ لوں گی۔ میں پال لوں گی۔"

"آپ کو تکلیف ہوگی امّاں!" سعدیہ نے اوپری دل سے کہا۔

"اولاد کے لئے ہی تکلیف اُٹھائی جاتی ہے۔"

حسن اور سعدیہ عالیہ کو خوب پیار کر کے ابّا اور امّاں سے لپٹ لپٹا کر واپس چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد امّاں عالیہ کو اپنے ساتھ بھینچ کر خوب روئیں تو انھوں نے محسوس کیا کہ عالیہ بھی رو رہی تھی۔ وہ بول نہ سکتی تھی، اگر سُن بھی نہ سکتی تھی تو کیا ہُوا؟ سمجھ تو سکتی تھی اور اس دن پہلی بار اُن کے دل میں خیال آیا کہ عالیہ کو صرف جسمانی طور پر ہی تو دیکھ بھال کی ضرورت نہیں ہے اس کی تو ذہنی پرورش پر زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔

اس دن کے بعد دونوں میاں بیوی نے اپنی زندگی کا ایک ہی مقصد بنا لیا کہ کسی طرح عالیہ اس قابل ہو جائے کہ تھوڑا بہت اپنے آپ کو سنبھال لے۔

امّاں اپنے ہاتھوں سے عالیہ کے بائیں بازو اور ٹانگ کی مالش کرتیں تو سلیم صاحب روزانہ اسے خود ورزش کرواتے۔ اپنے ساتھ ساتھ گھنٹوں کے حساب سے پکڑ پکڑ کر چلاتے۔ زندگی بے حد مصروف ہو گئی تھی، اور عالیہ اب چلنا سیکھنے لگی تھی جس دن اس نے پہلا قدم اُٹھایا امّاں نے ڈھیر ساری خیرات تقسیم کی۔ پھر انھوں نے عالیہ کے ہاتھوں میں بیساکھیاں پکڑا دیں تاکہ اس کی صحیح ٹانگ مضبوط اور طاقتور ہو جائے۔ سارا دن دونوں میاں بیوی محنت کرتے تھک جاتے تو رات سکون اور اطمینان سے گزر جاتی۔ بڑھاپے کو کام نے جوانی میں بدل دیا تھا۔

* *

تین سال گزر گئے۔ . . اب عالیہ بغیر بیساکھیوں کے گھسیٹ گھسیٹ کر چلنے لگی تھی۔ ایک ٹانگ کے کمزور رہ جانے کی وجہ سے چلنے میں خاصی دشواری محسوس ہوتی تھی مگر ڈاکٹر اور عالیہ کے نانا، نانی بہت پُر اُمید تھے۔ یوں بھی اب وہ چھ سال کی ہو گئی تھی۔

مگر ان تین سال میں سعدیہ اور حسن ایک بار بھی نہ آ سکے عجیب بات تو یہ تھی کہ امّاں نے یا سلیم صاحب نے بھی انھیں آنے پر زور نہ دیا تھا۔ وہ تو خود عالیہ کے ساتھ مصروف رہتے تھے۔ وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہُوا۔

اب تین سالوں بعد حسن کی پاکستان میں ٹرانسفر ہو گئی

تھی۔ یوں بھی وہ پروموشن پر آ رہا تھا۔ پہلے سے بھی بڑا افسر بن گیا تھا وہ۔ اور ان کی سوشل لائف پہلے سے بہت زیادہ مصروف گزرنے لگی تھی۔۔ سعدیہ کے یہاں تیسرا بچہ بھی پیدا ہوگیا تھا مگر وہ دونوں بچے صحت مند تھے، تندرست تھے اور اپنے آپ کو عام بچوں کی طرح وقت پر سنبھال لیا تھا۔

امّاں مطمئن تھیں کہ اب بیٹی اور داماد کچھ عرصہ تو ساتھ رہیں گے اور ممکن ہے اسی عرصہ میں اُن کو عالیہ کو ساتھ رکھنے کی عادت ہو جائے مگر عادت تو کیا ہوتی امّاں خود ہی بیمار پڑ گئیں اور ایسی بیمار پڑیں کہ اُٹھ نہ سکیں۔

سلیم صاحب تنہا رہ گئے تو اُن کے لئے عالیہ کا کام کرنا مشکل ہوگیا۔ سعدیہ اور حسن نے دیکھا۔ دونوں محسوس کر رہے تھے کہ سلیم صاحب کے لئے یہ زیادتی ہے۔ عالیہ کا تمام کام چونکہ زیادہ تر امّاں ہی کرتی تھیں اس لئے سلیم صاحب کو اتنا تجربہ بھی نہ تھا۔ یوں بھی بیوی کی موت کا اُن پر کچھ اتنا اثر تھا کہ زندگی اور زندگی کے جھمیلے ان کو اپنی طرف مائل نہ کر پا رہے تھے۔

سعدیہ عالیہ کو لے گئی۔ سلیم صاحب چُپ ہو گئے۔ مناسب بھی یہی ہے کہ اب عالیہ اپنے ماں باپ کے پاس رہے۔ انھوں نے اس کے ساتھ بڑی محنت کی تھی۔ اُسے چلنا سکھا دیا تھا اور یہی اس کی سب سے بڑی معذوری تھی مگر اب بھی اُسے کسی مدد کی ضرورت تھی۔

سعدیہ لینے کو تو لے گئی مگر دن میں چار چار مرتبہ فون آتے۔

"ابا! عالیہ کھانا نہیں کھا رہی کس طرح کھلاؤں۔ جانے امّاں کیسے کھلاتی تھیں؟"

"ابا! نہلاتے میں عالیہ مجھ سے گر گئی۔ اُسے بہت چوٹ لگی ہے آپ کو یاد کر رہی ہے۔"

"ابا! عالیہ بہت ضد کر رہی ہے۔ مجھے تو اس کی کسی بات کی ہی سمجھ نہیں آ رہی۔"

سلیم صاحب پہلے ہی دُنیا سے بے زار ہو رہے تھے اس کی باتوں سے تنگ آنے لگے۔

"بیٹی! عالیہ تمھاری اولاد ہے تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اولاد کو کس طرح پالتے ہیں۔"

"مگر ابا! وہ معذور ہے میں کیا کروں؟" سعدیہ روہانسی ہوگئی۔

"جس طرح تمھاری ماں اسے پالتی تھی۔ اُسی طرح تم بھی کرو۔ وہ بڑی محنت کرتی تھیں۔" سلیم صاحب کو غصہ آگیا۔

"امّاں کے پاس تو وقت تھا۔ میرے پاس تو اتنا وقت نہیں ہوتا کہ میں تینوں بچوں کو خود سے نہلا بھی سکوں۔ کھانا بھی خود کھلاؤں۔"

"تو آیا رکھ لو؟" سلیم صاحب نرم پڑ گئے۔

"آیا تینوں کا کام کرنے پر راضی نہیں ہوتی۔ حسن بھی اسی وجہ سے چڑچڑے ہوئے رہتے ہیں۔" سعدیہ بالکل ہی رو دی تو سلیم صاحب چُپ ہو گئے۔ وہ کہہ بھی کیا سکتے تھے حسن ایک اعلیٰ افسر تھا اور مزید ترقی سامنے نظر آ رہی تھی۔ مگر ترقی یونہی تو نہیں مل جاتی۔ اس کے لئے بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔ آدمی کو سوشل ہونا پڑتا ہے۔ حسن ہر شام گھر سے باہر گزارتا ہے۔ ساتھ میں سعدیہ کا ہونا بھی ضروری تھا۔ آیا دونوں لڑکوں کو تو رکھ لیتی تھی مگر عالیہ کو کسی طور رکھنے پر تیار نہ ہوتی۔ جو نہ بول سکتی تھی، نہ سُنتی نہ سمجھتی تھی۔ ایک پرابلم تھی جس نے سعدیہ کو ذہنی مریضہ بنا دیا تھا، اور اسی۔۔۔ وجہ سے حسن بھی چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔

اُنہی دنوں سعدیہ کی کسی دوست نے اُسے معذور افراد کے لئے بنائے گئے کسی ادارے کا پتہ بتا دیا۔ پہلے کچھ دن سعدیہ اکیلی سوچتی رہی پھر حسن کو بتایا۔۔ تو دونوں اس لائن پر سوچنے لگے۔ قباحت صرف یہی تھی کہ دُنیا کیا کہے گی۔ معذور بیٹی کو بوجھ سمجھ کر اُتار دیا۔

مگر روز روز کی پرابلم اور مشکل نے آخر دونوں کو ذہنی طور پر رضامند کر ہی لیا تھا۔ سلیم صاحب کو پتہ بھی نہ چلا وہ الگ شہر میں رہتے تھے۔ سعدیہ اور حسن عالیہ کو ادارے میں داخل کروا آئے۔ دونوں بہت مطمئن ہو کر سوئے تھے۔ بڑی بھاری فیس تھی۔ عمارت بہت خوبصورت تھی۔ معذوروں کو بہت سی آسائشیں ایسی بھی دے رکھی تھیں جو عام زندگی میں یہاں کے لوگوں کو میسر نہیں ہوتیں۔ ٹی وی پر ان کے لئے فلمیں چلائی جاتیں۔ انھیں پڑھانے لکھانے کی کوشش بھی کی جاتی۔ غرضیکہ گھر اور ماں باپ کی محبت کے علاوہ وہاں سب کچھ تھا، اور سعدیہ کے خیال میں عالیہ کو اور کیا چاہیئے تھا۔ وہ کون سا بول لیتی ہے یا سُن لیتی ہے۔ ایک دم ہی سعدیہ اور حسن نے اپنے سر سے بوجھ اُترا ہوا محسوس کیا۔

اور مطمئن ہو کر اپنی اگلی پروموشن کی جدوجہد میں تن من سے مصروف ہوگئے۔

ڈھائی سال گزرتے پتہ بھی نہ چلا حسن پھر ملک سے باہر جا رہا تھا۔ سعدیہ بہت خوش تھی۔ حسن کی جاب بہت اچھی تھی۔ اچھی تنخواہ بے شمار سہولتیں۔ غرضیکہ زندگی کے تمام سکھ ان کے منتظر تھے۔ انھیں چونکہ بہت جلدی ہی جانا تھا اس لئے سعدیہ نے سلیم صاحب کو لکھا تھا کہ وہ چند دن کے لئے ان کے پاس چلے جائیں۔

سلیم صاحب سعدیہ کے پاس آگئے۔ ایک دن گزرا، دو دن گزر گئے جب انھیں عالیہ نظر نہ آئی تو انھوں نے سعدیہ سے پوچھا۔ پہلی بار اس مسئلے پر دونوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی، اور سعدیہ ڈر بھی رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے . . . اپنی وکالت کرتے کرتے، اس نے سلیم صاحب کو سب کچھ بتا دیا یہ بھی کہ پہلے وہ ہر ہفتے عالیہ سے ملنے جاتے تھے مگر عالیہ ان سے ملتی نہ تھی اس لئے نگران کا خیال تھا کہ وہ ان کو پسند نہیں کرتی۔ پھر وہ مہینے بعد جانے لگے اور اب تو کبھی حسن چلے جاتے ہیں اور کبھی سعدیہ!

سلیم صاحب کے دل پر چوٹ سی لگی۔

"جس پودے کو سعدیہ کی اماں نے اپنا خون دے دے کر پالا تھا، بڑا کیا تھا اسے جانے سعدیہ نے کس طرح برباد کر دیا؟" مگر وہ کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ سعدیہ اس بچی کی ماں تھی۔ صرف اسی قدر کہہ کر رہ گئے۔

"بیٹی! تم نے اس کے ڈھائی تین سال برباد کر دیئے؟"

جواب میں سعدیہ نے پھر سے وہی سارے رونے روئے وہی مصروفیتوں کا ذکر . . . کہنا نہ ماننے کی شکایت اور حسن کے چڑچڑے ہونے کا خدشہ . . . یوں سلیم صاحب کو ایک بار پھر چپ ہو جانا پڑا۔

جانے سے پہلے سعدیہ اور حسن عالیہ کو ملنے کے لئے گئے۔ اس کی سال بھر کی پیشگی فیس بھی داخل کروائی۔ سال بھر کا تمام سامان دیا۔ ان کے ساتھ سلیم صاحب بھی تھے۔ پھر جب وہ عالیہ کے کمرے میں گئے تو سلیم صاحب یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ عالیہ تو بستر سے لگ کر رہ گئی تھی۔

"یہ تمھیں کیا ہوا؟" سلیم صاحب کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ ٹکٹکی سے عالیہ کو دیکھتے جا رہے تھے۔

نگران ساتھ ہی ساتھ تھا جلدی سے کہنے لگا۔

"بیمار رہی ہے بچی۔ فلو ہو گیا تھا۔ بہت دنوں سے بیمار تھی۔"

"مگر اس بچی کی معذوری اس کی آنکھوں میں تو ہم نے کبھی آنے نہ دی تھی۔" سلیم صاحب تڑپ کر رہ گئے۔

"صاحب کیا کہتے ہیں آپ بھی . . . بچہ معذور ہو اور آنکھوں میں معذوری کا احساس نہ ہو۔ یہ تو بڑی غیر فطری سی بات ہے!" نگران برا مان گیا۔

"ہاں آپا! ہم آتے رہتے ہیں۔ یہاں عالیہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔" سعدیہ مطمئن لہجے میں بولی مگر سلیم صاحب نے چپکے سے دیکھا کہ عالیہ نے سعدیہ کے دوپٹے کا کنارا پکڑ لیا تھا۔ جیسے فریاد کر رہی ہو۔

"نہ جاؤ . . . نہ جاؤ . . ."

پر سعدیہ چلی گئی۔ حسن بھی چلا گیا۔ اُن کے دونوں ہنستے کھلکھلاتے دوڑتے بھاگتے بچے بھی چلے گئے اور عالیہ دور تک انھیں دیکھ بھی نہ سکی۔ معذور تھی، اٹھتی کیسے، دیکھتی کیسے . . . کسی کو اُٹھانے کے لئے کہتی کیسے؟

سلیم صاحب ایک دن رُک گئے تھے۔ پھر جب سعدیہ اور حسن چلے گئے تو وہ اگلے ہی دن عالیہ کو وہاں سے لے آئے عالیہ کے گارڈین تھے۔ اس لئے ادارے والوں کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ سلیم صاحب نے تمام سال کی فیسیں بھی واپس نہ لیں۔ بس عالیہ کو اپنی زندگی کی متاعِ عزیز کی طرح سمیٹا اور واپس اپنے شہر اپنے گھر میں آگئے۔ اس گھر میں جہاں پر عالیہ نے اپنی زندگی کے تین بہترین سال گزارے تھے۔ یہاں سے جب وہ گئی تھی صحت مند پیاری سی بچی تھی۔

مگر اب جبکہ سلیم صاحب اسے لائے تھے تو گود میں اٹھا کر لائے تھے۔ اس کی اپنی ماں کی لاپرواہیوں نے اسے کئی سال پیچھے جا پھینکا تھا۔ اب سلیم صاحب عالیہ کو سعدیہ کے کسی ناطے سے نہیں پال رہے تھے۔ وہ تو اس کو اپنی بیوی کی امانت سمجھ کر پال رہے تھے جس طرح سعدیہ کی اماں نے عالیہ پر محنت کی تھی۔ اسی طرح وہ بھی اس پر جان نچھاور کرنے لگے۔

عالیہ کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ وہ بات بات پر چڑ جاتی . . . رونے لگتی . . . یا پھر اپنے صحت مند ہاتھ سے چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگتی۔ سلیم صاحب جانتے تھے کہ وہ احتجاج کر رہی ہے اپنی معذوری کا، اپنے ماں باپ

کی تنہائی کا۔ ۔ ۔ اور صبیح تو جب نہ ملنے کا لیے میں وہ اسے گلے سے لگا لیتے۔ ۔ ۔ پیار کرتے۔ ۔ ۔ دُنیا جہان کی چیزیں اسکے سامنے ڈھیر کر دیتے۔

سلیم صاحب نے دن رات ڈاکٹروں کے پاس جا جاکر۔ ۔ ۔ حکیموں سے مشورے لے لے کر اس کا علاج شروع کیا تھا جو کچھ کسی نے بتایا وہ کر گزرے۔ عالیہ کی خدمت کو انھوں نے اپنی عبادت بنا لیا تھا، اور یوں عالیہ کھوئی ہوئی توانائی حاصل کرنے لگی۔ چلنے قدم اُٹھانا بھولی تھی اس سے زیادہ دوبارہ سیکھ گئی۔ ۔ ۔ آنکھوں کی کھوئی چمک اور لبوں سے روٹھی ہوئی مُسکراہٹ آہستہ آہستہ واپس آنے لگی۔

سلیم صاحب نے جاوید سے تو رابطہ توڑ ہی رکھا تھا کہ اس نے باہر جاکے اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی اور کبھی بھول کر بھی اپنے وطن واپس آنے کی کوشش نہ کی تھی۔ بس اماں کے مرنے پر آیا تھا تو صرف چند دن کے لئے۔ بیوی تب بھی نہ آئی تھی۔ اس کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ اس سے زیادہ بہانہ اور کیا ہوتا۔ جاوید چند دن رہا، اور سلیم صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا رہا مگر سلیم صاحب نہ ملنے۔ یوں رشتے ناطے تقریباً منقطع ہو کر رہ گئے تھے۔

اور اب عالیہ میں کھو کر انھوں نے سعدیہ کو بھی بھلا دیا تھا۔ یوں بھی وہ سعدیہ سے خوش نہ تھے۔ اس نے اپنی بیٹی عالیہ پر اپنی پروموشن اور سوشل لائف کو ترجیح دی تھی۔ اگر وہ معذور تھی تو کیا؟ انسان تو تھی؟ بول نہ سکتی تھی، سُن نہ سکتی تھی تو کیا؟ سمجھ تو سکتی تھی احساس سے عاری تو نہ تھی۔ اس نے تو انسانیت کی توہین کی تھی۔ انسان تو اس دُنیا کی قیمتی ترین شے ہے اور انسان بھی وہ جو اپنی اولاد ہو! سلیم صاحب کو اپنی اس تربیت پر شک ہونے لگا جو انھوں نے سعدیہ کو دی تھی۔ انھوں نے تو سعدیہ پر بڑی محنت کی تھی۔ اولاد کے لئے تو دونوں میاں بیوی نے پوری دُنیا بھلا رکھی تھی۔ ان کے مُنہ سے اِدھر بات نکلتی اُدھر پوری ہو جاتی مگر کہیں نہ کہیں کمی ضرور رہ گئی تھی۔ شاید وہ کمی یہی تھی کہ انھوں نے خود تو اولاد کے لئے ہر قسم کی قربانی دی تھی مگر انھیں کسی کے لئے ایثار کرنے کی تعلیم نہ دے سکے۔ شاید اسی لئے جاوید اور سعدیہ۔ ۔ ۔ کے پاس نہ ماں باپ کے لئے ایثار تھا اور نہ ہی معذور اولاد کے لئے۔

اور سلیم صاحب اپنی اولاد کے بدلے میں شاید تاوان ادا کر رہے تھے کہ اس بڑھاپے میں عالیہ کی دیکھ بھال کو انھوں نے اپنے لئے عبادت کا درجہ دے دیا تھا۔ جو داغ سعدیہ نے انسانیت کے ماتھے پر لگا دیا تھا وہ اسے مٹا دینا چاہتے تھے۔ اپنا خونِ جگر دے کر بھی وہ عالیہ کو کسی قابل بنانا چاہتے تھے۔

سارا دن دونوں بے حد مصروف رہتے۔ عالیہ کو انھوں نے معذور بچوں کے اسکول میں داخل کروا رکھا تھا۔ صبح اپنے ہاتھوں سے اُسے تیار کروا تے۔ ناشتہ کراتے اور اسکول چھوڑ کر آتے۔ دوپہر کو خود لینے جاتے اور رات کو بستر تک جانے کا سارا وقت اکٹھے گزارتے۔

اس کی سماعت کے لئے آلے کی ضرورت پڑی تو سلیم صاحب نے تب بھی اس کے ماں باپ کو نہیں لکھا بلکہ اپنے وسائل استعمال کرکے باہر سے منگوا لیا۔ عالیہ کے سلسلے میں وہ اب کسی دوسرے کا احسان نہیں لینا چاہتے تھے۔ عالیہ ان کی تھی اور وہ عالیہ کے۔ ۔ ۔ حسن اور سعدیہ کو ادارے والوں نے اطلاع دے دی تھی کہ عالیہ کو سلیم صاحب لے گئے ہیں۔

حسن نے سلیم صاحب کو بے حد شکریے کا خط لکھا تھا مگر انھوں نے جواب دینا تک گوارہ نہ کیا تھا۔ کبھی کبھار سعدیہ کا خط بھی آجاتا تو وہ بہت کم جواب دینے کی ضرورت محسوس کرتے۔ یوں بھی حسن اب بہت اُونچے عہدے پر فائز تھا۔ انھیں زیادہ خط و کتابت کی فرصت بھی کم ملتی تھی۔ وہ زیادہ تر ٹور پر ہی رہتے سعدیہ ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ اسی لئے انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو امریکہ کے بہت اچھے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ سلیم صاحب نے تب بھی کوئی تبصرہ نہ کیا اور رابطے اور تعلق آہستہ آہستہ کم ہوتے گئے۔

عالیہ نے اپنے اسکول سے ہائی کلاس تک تعلیم حاصل کر لی تھی اور بڑے اچھے نمبروں پر کامیاب ہوئی تھی۔ سلیم صاحب اس میں وہ اعتماد اور خودداری پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے جو صحت مند انسانوں کی سوچ کا حصہ ہوتی ہے۔ اب عالیہ انٹرمیڈیٹ کی پرائیویٹ طور پر تیاری کر رہی تھی۔ اُسے خود سلیم صاحب پڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے لئے بے شمار دلچسپیاں پیدا کر رکھی تھیں۔ اپنی اتنی خوبصورت کوٹھی کو انھوں نے چڑیا گھر میں بدل ڈالا تھا کہ عالیہ کو پرندے بہت پسند تھے۔

پڑھائی سے فارغ ہوتے ہی وہ چڑیوں، طوطوں اور

اور مرغوں میں گھر جاتی۔ کسی کو دانہ ڈالتی، کسی کو پانی۔۔ کسی کا پنجرہ صاف کرتی۔ یہ سارے کام اگر وہ نہ کرتی تو کوئی بھی نہ کرتا یہ سلیم صاحب کا حکم تھا اور اسی لئے وہ ان سب کے لئے اپنی اہمیت سے واقف تھی اور خوش تھی۔

پھر بھی کبھی کبھی جب وہ سارے کاموں سے فارغ ہو جاتی تو اسے اپنی ماں کی یاد بڑی شدت سے آتی۔ کتنی پیاری تھی اس کی ماں۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ بالکل اپنی ماں پہ ہے۔۔۔ بڑی خوبصورت ہے، بڑی پیاری ہے مگر وہ تو معذور تھی۔ دوسروں کی نظر اس کی خوبصورتی پہ پڑنے سے پہلے اس کی معذوری پہ پڑتی تھی اور بجائے تعریف کے اُن کی آنکھوں میں ہمدردی، اور ترس کی لہریں اُترا آیا کرتیں۔

عالیہ ان سب مرحلوں سے بخوبی گزر سکتی تھی مگر جب اُسے اپنے بھائی۔۔ اپنی ماں کی یاد آتی تو اپنے آپ میں گھٹ کر رہ جاتی جب سے سعدیہ اور اس کے ابو کے تعلقات کشیدہ سے ہوگئے تھے تب سے انھوں نے یہاں آنا جانا بھی کم کر دیا تھا۔ اتنا کم کہ عالیہ کو تو اب ٹھیک سے اپنی ماں کی کوئی بات یاد بھی نہ رہی تھی۔

مگر وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ سلیم صاحب کے سامنے وہ کبھی کسی کو یاد نہ کرتی۔ وہ اب بوڑھے ہوگئے تھے۔ کمزور بھی زیادہ سے زیادہ ہوتے جا رہے تھے۔ تب بھی انھوں نے کبھی بھول کر بھی اپنی زبان پر سعدیہ یا حسن کا نام آنے نہ دیا تھا۔ نہ ہی کبھی اپنی کسی کمزوری کو ظاہر کرتے۔۔۔ بس زندگی کو معمول پر ہی رکھا تھا۔

جس اسکول میں عالیہ پڑھتی تھی اب سلیم صاحب کی کوششوں کی وجہ سے اُسے اسی اسکول میں بطور ٹیچر رکھ لیا گیا تھا۔ سلیم صاحب کو روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی مگر عالیہ کو کام کی ضرورت تھی۔ اور اس سے بہتر کام اُسے اور نہ مل سکتا تھا۔

جس دن عالیہ اپنے پہلے مہینے کی تنخواہ لائی، اُسی دن سلیم صاحب اُسے لے کر بازار چلے گئے۔ دونوں نے ڈھیر ساری شاپنگ کی۔ پھر عالیہ نے اپنے پیسوں سے انھیں ٹریٹ دی۔ دونوں ایک دوسرے کی خاطر ہنستے رہے، خوش ہوتے رہے اور جب واپس گھر آئے تو نوکر نے بتایا کہ بڑی بی بی آئی ہوئی ہیں۔

"بڑی بی بی۔۔۔ یعنی امی!" عالیہ کی خوشی کے مارے آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"جی۔۔! وہ بہت دیر آپ لوگوں کا انتظار کرتی رہیں۔"

پھر اُن کی طبیعت کچھ خراب تھی چائے پی کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔"

"میں جگا دوں گی انھیں؟" عالیہ نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

"صبح مل لینا! طبیعت خراب ہوگی!" سلیم صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔۔۔ ابو۔۔ جگا دیتے ہیں۔ پھر گول دے دیں گے نا!" عالیہ ٹھنکی تو سلیم صاحب چپ ہوگئے مگر تبھی اندر سے سعدیہ شال لپیٹتی ہوئی آگئی مگر انھیں دیکھ کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"ارے۔۔۔ عالیہ۔۔۔ میری بچی۔۔۔ یہ تم ہو؟"

"ہاں تو۔۔۔ امی۔۔۔ امی۔۔۔" عالیہ کچھ کہہ نہ سکی مگر دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔

سلیم صاحب بہت ناراض تھے مگر اولاد کے سامنے بے بس سے کھڑے بھیگی آنکھوں سے دیکھتے رہے پھر دونوں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

رات گئے تک تینوں باتیں کرتے رہے۔۔ سلیم صاحب بار بار کہتے۔

"عالیہ اب سو جاؤ۔ صبح اسکول جانا ہے۔"

"میں نے تو سنا تھا کہ تم نے ہائی اسکول پاس کر لیا ہے۔"

"مگر امی میں وہاں پڑھاتی ہوں۔۔" عالیہ نے فخر سے کہا۔

"اچھا۔۔؟" عالیہ گنگ رہ گئی۔ "عالیہ تم پڑھاتی بھی ہو؟"

"ہاں۔۔ ہاں۔۔۔ تم کیا جانو۔۔ تمھاری جنرل نالج سے اس کی جنرل نالج کہیں زیادہ ہوگی۔ چاہو تو مقابلہ کر لو۔" سلیم صاحب نے فخر سے کہا۔ سعدیہ حیران سی بیٹھی رہ گئی۔ چہرے پر پچھتاوؤں کے سائے تھے۔

کچھ دن کے بعد سعدیہ جانے کی تیاری کرنے لگی۔ وہ یہاں مکان کی خریداری کے سلسلے میں آئی تھی۔ حسن کی ریٹائرمنٹ میں چند ماہ باقی تھے، اور اب وہ یہاں کوٹھی خریدنا چاہتے تھے۔ حسن کے دوست کی معرفت سودا وغیرہ طے ہو رہا تھا اور اسی لئے سعدیہ کو چند دن مزید رُکنا پڑا تھا۔ انھیں ایک اُمید تھی کہ شاید ایک سال کے لئے ملازمت میں توسیع مل جائے۔ حسن بہت کوشش کر رہا تھا۔ سلیم صاحب نے کوئی رائے نہیں دی

وہ شاید ان کے معاملوں میں دخل ہی نہ دینا چاہتے تھے۔
پھر حسن۔۔۔ سعدیہ کو واپس جانا تھا۔ اسی دن سے ملتے
۔۔۔ پہلی بار عالیہ اور سلیم صاحب کو اپنے ساتھ
[illegible]

"ابو! اب تو آپ بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ عالیہ بھی بڑی ہوگئی ہے۔ آپ دونوں میرے پاس آجائیں نا!" سلیم صاحب حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں جانتی ہوں ابو کہ یہ بات مجھے بہت پہلے کہنی چاہئے تھی مگر آپ تو ہماری مجبوریوں سے واقف ہی ہیں۔ فارن سروس میں انسان کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ بڑا سوشل ہونا پڑتا ہے۔"

"میں نے کوئی شکوہ تو نہیں کیا۔۔۔؟"

"نہیں ابو شکوہ کیسا۔۔۔ آپ نے تو عالیہ کو۔۔۔" سعدیہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی اور سلیم صاحب نے ایک دم اس کی بات کاٹ دی۔

"عالیہ میری بیٹی ہے۔ تمہاری ماں کی نشانی ہے یہ میرے پاس۔ اس کے بغیر تو میری زندگی اُدھوری ہے۔ میں جی نہیں سکتا۔ نہ کسی کا میرے اُوپر کوئی احسان ہے اور نہ میرا کسی کے اوپر اس سلسلے میں کوئی احسان ہے۔"

پھر تینوں چُپ ہوگئے۔ جاتے جاتے بھی سعدیہ نے پھر کہا۔

"چند دن کے لئے ہی آجاتے۔ آپ دونوں۔۔۔!"

"امی! میری نئی نوکری ہے۔ کیسے آسکتی ہوں۔ وہ بچے جواب بولنا سیکھ رہے ہیں۔ ادھورے رہ جائیں گے۔" عالیہ نے لڑکھڑاتی زبان میں مشکل سے کہا۔

"ابو! آپ نے اس میں اتنا احساسِ فرض پیدا کردیا ہے۔" سعدیہ نے سلیم صاحب کے گلے ملتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"بچوں کو میرا پیار دینا۔۔۔!" سلیم صاحب نے بات بدل دی۔

سعدیہ چلی گئی۔ چند دن دونوں کے ہی بڑے تکلیف دہ گزرے۔ اس کے ساتھ دونوں کو بہت شکوے تھے۔ بڑی شکایتیں تھیں مگر جب وہ آئی تھی تو کچھ نہ کہہ پاتے۔ کوئی شکوہ، کوئی شکایت زبان پر نہ آپاتی۔ جانے یہ کیسے رشتے تھے؟ کیسی محبتیں تھیں؟ مگر سلیم صاحب نے اس کے جانے کے بعد حسن کو لکھ دیا تھا کہ وہ اس طرح یہاں نہ آیا کرے۔ عالیہ کے لئے یہ سب کچھ برداشت کرنا شاید مشکل ہو۔

پورا سال گزرنے پر حسن اور سعدیہ پاکستان آئے مگر اپنے آبائی شہر میں آنے کی بجائے انہوں نے دار الحکومت میں گھر لے لیا تھا۔ جس زندگی کے وہ عادی تھے اُسی میں وہ دونوں رہنا چاہتے تھے۔ حسن دوبارہ ملازمت کرنا چاہتے تھے۔ کہ انہیں سلیم صاحب کا لکھا ہوا خط یاد تھا۔ اس لئے وہ ان کے پاس نہیں آئے تھے۔ عالیہ نے سُنا، سلیم صاحب نے بھی سُنا دونوں کا ہی دل چاہا ہوگا۔۔۔ ملنے کو۔۔۔ مگر دونوں میں سے کسی نے ظاہر نہ کیا۔

مگر سعدیہ کا روز فون آنے لگا تھا۔ پہلے چند دن وہ حال چال پوچھتی رہی۔ پھر ایک دن اُس نے سلیم صاحب کو صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اب عالیہ کو اپنے پاس لے جانا چاہتی ہے۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" سلیم صاحب کو اپنے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی معلوم ہوئی۔

"ابو ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تنہا رہتے رہتے میری صحت تباہ ہوگئی ہے۔ آپ مجھے دیکھیں تو پہچان نہ پائیں۔"

"مگر تمہارے بیٹے۔۔۔؟ اُن کو اپنے پاس بلاؤ۔ اس طرح تم عالیہ کی ذہنی حالت خراب کردو گی۔" سلیم صاحب کو غصہ آنے لگا تھا۔

"اب میں کیا بتاؤں؟ بڑے نے کسی امریکی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ اُسے کیسے بلاؤں اور وہ کیوں آئے گا؟ اور چھوٹا تو ابھی پڑھ رہا ہے۔ ایک بار آیا تھا مگر اُسے پاکستان پسند نہیں ہے۔ وہ یہاں رہنا نہیں چاہتا۔"

"ہوں۔۔۔!" سلیم صاحب چُپ ہوگئے۔

"بتایئے ابو! اس لئے میں نے پچھلی بار بھی کہا تھا کہ آپ دونوں ہمارے پاس آجائیں۔"

"بیٹی! میں تو نہیں آسکتا۔" سلیم صاحب نے ریسیور عالیہ کے ہاتھ میں دے دیا۔

"عالیہ! بیٹے تم ہمارے پاس آجاؤ۔ تمہارے ابو ریٹائرمنٹ کے بعد بہت چڑچڑے ہوگئے ہیں۔ سارا دن پلنگ پر لیٹے رہتے ہیں۔ کہیں آتے جاتے نہیں۔۔۔ پلیز عالیہ۔۔۔ چند دن کے لئے ہی سہی۔۔۔ آجاؤ نا۔۔۔"

"مگر امی۔۔۔ میں کیسے آسکتی ہوں۔" عالیہ نے سلیم صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب سی اُمید بھری نظروں سے اس کی

حرف دیتی ہے ہمیشہ۔

"عالیہ! نوکری تو تمھیں یہاں بھی مل سکتی ہے۔"

"مگر میں ابو کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"وہ بھی تمھارے ساتھ آ جائیں گے۔" سعدیہ نے تیزی سے کہا تو عالیہ نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر ان سے پوچھا۔ انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"امی! ابو نہیں آ سکتے اور نہ ہی میں۔" عالیہ نے جلدی سے کہا۔ سعدیہ شاید کچھ کہہ رہی تھی مگر عالیہ نے فون بند کر دیا اور بغیر سلیم صاحب کی طرف دیکھے اپنی چڑیوں کے پاس چلی گئی۔

اگلے دو دن میں حسن اور سعدیہ کے کئی بار فون آ چکے تھے۔ سلیم صاحب نے فون اٹھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ نوکر سے ریسیو کرواتے یا عالیہ ہوتی تو وہ ریسیو کرتی۔

"بیٹی! تمھاری ماں زبردست ڈپریشن کا شکار ہے۔ رونے لگتی ہے تو روتے چلی جاتی ہے۔ . . اس سے بات کر لو۔"

عالیہ نے پریشانی سے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سلیم صاحب کھڑے تھے۔

"عالیہ۔ . . بیٹی! تم نے مجھے معاف نہیں کیا نا اور اب پچھتاووں نے مجھے گھیر رکھا ہے چندا۔" سعدیہ سسکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"امی! آپ تو بہت مضبوط اعصاب کی مالک ہیں۔ تمام عمر آپ نے بیٹی کی جدائی سہی ہے۔ آپ کو کیا ہو گیا۔" عالیہ کی آواز میں طنز تھا۔

"نہیں سہی۔ . . میں نے کوئی جدائی نہیں سہی۔ کوئی غم نہیں دیکھا۔ میں نے تمام عمر اسٹیٹس بناتے بناتے گزار دی۔ اور اب۔ . . ایک دم تنہا رہ گئی۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہ رہا۔ نہ سوشل لائف، نہ اسٹیٹس اور نہ رشتے ناطے، اور اُن کی محبتیں۔ میں تہی دامن ہوں۔ عالیہ تم میری جھولی بھر دو۔ پلیز عالیہ۔ . . میری بات مان لو۔" عالیہ چپ ہو گئی۔ اس کا دل بھر آ رہا تھا۔

"بولو، عالیہ! تم بھی چھوڑ دو گی مجھے، جس طرح تمھارے بھائیوں نے چھوڑ دیا۔ . . مجھے سب چھوڑ گئے۔ . . بتاؤ عالیہ، بولو۔ . . ."

"امی میں کیا بتاؤں؟"

"تو پھر مجھے اجازت دو۔ میں تمھارے پاس آ جاؤں۔ میں اکیلے زندگی نہیں گزار سکتی۔ ہمیں اپنے گھر بلا لو۔ اپنے پاس۔ . ." عالیہ نے جلدی سے سلیم صاحب کی طرف دیکھا۔ اشارے سے پوچھا تو انھوں نے سر ہلا دیا۔ یکدم عالیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"امی! آپ یہاں آ جائیں۔ ہمارے پاس۔ دیکھیں تو ہی ہمارے پاس کتنا کچھ ہے۔ ہمارا گھر کتنا پیارا ہے، میرے پرندے میری چڑیاں۔ . . میرے طوطے۔ . . میرے اسکول میں کتنے پیارے پیارے بچے ہیں۔ کبھی دیکھیں تو ہماری دنیا میں کتنی رونق ہے کتنی زندگی ہے۔ یہ رونق ختم بھی نہیں ہوتی، قائم رہتی ہے ہمیشہ اس طرح۔ . ." عالیہ کبھی اتنے صاف لہجے میں نہ بولی تھی جتنا آج اس وقت بول رہی تھی۔

پھر فون بند کر کے وہ سلیم صاحب کے پاس آ گئی۔ خوشی کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ایسے میں اس نے ان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

"ابو! اب امی اور ابو یہاں آ جائیں گے نا۔ میں کتنا چاہتا تھا کہ میری امی یہاں آ جائیں تو میں اُن کی گود میں سر رکھ کے سوؤں۔ وہ۔ . . وہ میرے بالوں میں کنگھی کریں۔ کبھی میں ان کے پاؤں دباؤں۔ . . میں دبا سکتی ہوں ابو۔ . . اس ہاتھ سے۔ آپ کو پتہ ہے؟ امی کی ٹانگوں میں تکلیف رہتی ہے۔ وہ آئیں گی نا، تو میں روزانہ ان کی ٹانگیں دبایا کروں گی۔ میں دبا سکتی ہوں ابو میں امی کے سب کام کر سکتی ہوں۔"

عالیہ کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر سلیم صاحب کے ہاتھوں کو بھگو رہے تھے اور وہ خود بہتی آنکھوں کو صاف کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کر رہے تھے۔

کہ انھوں نے اپنی دانست میں عالیہ کو ماں اور باپ دونوں کی محبت دی تھی پھر بھی۔ . . پھر بھی یہ ماں کی محبت کی تشنگی عالیہ کے دل کے کسی کونے میں چھپی رہ گئی تھی کہ وہ کبھی دیکھ نہ سکے

سوئمبر

راجکماری بیلاوتی کے سوئمبر اور محمود غزنوی کے اسلامی شعار اور مہر و محبت کی پاکیزہ کہانی

راجکماری لیلاوتی کے سوئمبر کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔

وہ ریاست لاہور کے راجہ، راجہ بھاست کی اکلوتی اولاد تھی۔ یہ ریاست چھوٹی تھی لیکن اس کا شہرہ دُور دور تک تھا۔ ساری شہرت کی وجہ لیلاوتی کا حسن تھا۔ اُمڈتا، جھومتا شباب۔ اپسرا اوّل جیسا تراشیدہ دمکتا جھلکتا بدن، شوخ نظروں اور نقوش کا تیکھا پن ایسا کہ دیکھنے والے مدہوش ہو جاتے۔ قدیم قصے کہانیوں کی طرح قرب و جوار کی تمام ریاستوں کے راجکمار، لیلاوتی کے نادیدہ عاشق تھے۔ راجکماری کی ہوشربا جوانی کا یہ عالم تھا کہ مندروں کے پنڈت دُعا مانگتے کہ اے بھگوان! لیلاوتی کو دیوداسی بنا کر مندر میں بھیج دے تاکہ وہ بے جان مورتیوں کے بجائے زندہ دیوی کی پرستش شروع کر دیں۔ دہلی، اجمیر، مالوہ، بھیرہ گنج، گوالیار، نگر کوٹ۔ غرض اُس زمانے کی تمام ریاستوں کے راج دلارے لیلاوتی سے شادی کے خواہش مند تھے۔ اُنھوں نے شادی کے پیغام بھی بھیجے تھے لیکن راجہ بھاست نے اعلان کر دیا تھا کہ شادی کا فیصلہ سوئمبر میں ہوگا۔ راجکماری اپنی پسند سے اپنا جیون ساتھی منتخب کرے گی۔

ایک ہزار سال پہلے لاہور نہ اتنا بڑا شہر تھا اور نہ یہ قلعہ تھا۔ اِسی جگہ ایک چھوٹا سا شکستہ قلعہ تھا جو شہر کی مختصر آبادی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ قلعے کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا دریائے راوی قدرتی فصیل کا کام دیتا تھا۔ دریا پار راجکماری کی نزہت گاہ تھی۔ ایک بہت خوبصورت باغ جس کے درمیان میں مرمر کی بارہ دری تھی۔ لیلاوتی کے شب و روز کا بیشتر حصہ، کنیزوں اور ہم جولیوں کے ساتھ اس نزہت گاہ میں مسکراہٹیں بکھیرتے اور قہقہے لگاتے گزرتا تھا۔

راجکماری کے سوئمبر میں پندرہ دن باقی تھے۔

ہندو دھرم میں سوئمبر، شادی کی رسم کہلاتی تھی۔ اِس رسم کو مذہب کا تحفظ بھی حاصل تھا۔ اس رنگا رنگ رسم کے موقع پر اطراف کے تمام راجکمار سج دھج کر راجکماری کے گھر آتے۔ راجکماری بھی سولہ سنگھار کر کے پھولوں کا ہار لیے دوشیزگی کے نرم و نازک قدم اٹھاتی، اُمیدوار راجکماروں... کے درمیان آتی۔ راجکماروں کے دل دھڑکنے لگتے۔ یہ دھڑکنیں اُس وقت کچھ اور تیز ہو جاتیں جب راجکماری، کسی اُمیدوار کے قریب ہو کر اُس کے قد و قامت، رعنائی اور وجاہت کو غور سے دیکھتی تو اُمیدوار سمجھتا کہ اُس کی تمنا بر آئی۔ لیکن جب راجکماری مسکرا کے آگے بڑھ جاتی تو اُس کا دل ڈوبنے لگتا۔ پورا پنڈال گھومنے لگتا اور اُس کا سر ندامت سے جھک جاتا۔

سوئمبر کے رواج کے مطابق اگر شہزادی ایک چکر میں کسی راجکمار کو پسند نہ کر پاتی تو اُسے کراس وقت تک راجکماروں کے درمیان گھومنا پڑتا جب تک وہ کسی کے گلے میں ہار ڈال کے اپنا جیون ساتھی نہ منتخب کر لیتی۔ راجکماری کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ بغیر کسی کو منتخب کیے واپس چلی جائے۔ جس وقت شہزادی اپنی پسند کے راجکمار کے گلے میں پھولوں کا گجرا ڈال دیتی تو وہ راجکمار فوراً اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا پھر تمام ناکام راجکمار باری باری اُن کے پاس آتے اور نیم دلی سے مبارک باد دیتے۔ شادی کا منڈل پہلے ہی سے تیار ہوتا۔ مندر کا پروہت (بڑا پیشوا) مذہبی اشلوک پڑھتا اور دُولہا دُلہن کے دامن باندھ کر پھیرے گھمائے جاتے۔ پھیرے گھومنے کے بعد بندھن پختہ ہو جاتا۔ راجکماری لیلاوتی، پڑھی لکھی گیان دھیان والی دوشیزہ تھی۔ وہ ہندو دھرم کی تمام رسومات کو پسند کرتی لیکن طبیعت میں ایک بے چین قسم کی آزاد خیالی تھی۔ اُسے سوئمبر کی خوشی تھی لیکن اکثر اُسے یہ خیال پریشان کرتا رہتا کہ چند ساعتوں میں تمام عمر کے ساتھی کو منتخب کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے لیکن اِس رسم کو توڑنے کی بھی اُس میں ہمت نہ تھی۔

اُس رات وہ کچھ زیادہ ہی فکر مند تھی۔ چٹختی ہوئی چاندنی اور راوی کی لہروں میں ہچکولے کھاتا چاند بھی اُسے فرحت نہ بخش سکا۔ سندری اور شوبھا اُس کے ساتھ تھیں۔ تھیں تو یہ کنیزیں لیکن وفادار ہونے کی وجہ سے انھیں لیلاوتی کی سہیلیوں جیسا مرتبہ حاصل تھا یا اُس سے بھی کچھ زیادہ۔

لیلاوتی چلتے چلتے ٹھہر گئی۔ سندری سے بولی "کیوں ری۔ سوئمبر



میں کتنے دن باقی ہیں؟"
سندری نے روپا کی طرف دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
لیلاوتی شرمندہ سی ہو گئی اور کچھ ایسی گھبرائی کہ یہ بھی بھول گئی کہ اُس نے سندری سے کیا سوال کیا تھا۔ بناوٹی غصے سے بولی۔ "ہنس کیوں رہی ہے تو؟"
روپا اب تک خاموش تھی۔ لیلاوتی کے اس سوال پر اُسے بھی ہنسی آ گئی۔ راجکماری اور پریشان ہوئی۔ "کیا سوال کیا تھا میں نے؟"
ذہن پر زور ڈالنے پر بھی لیلاوتی کو اپنا سوال یاد نہ آیا۔

نرم ہوتے ہوئے بولی۔ "سندری! روپا۔ میں تمھیں اپنا ہمدرد سمجھتی ہوں۔ مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو؟"
راجکماری کی آواز میں ایک درد، ایک کسک تھی۔
"راجکماری جی! مجھے معاف کر دیجئے۔" سندری نے معذرت چاہی۔ "آپ نے سوال ہی ایسا کیا تھا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔"
"سوال۔" راجکماری نے پھر ذہن پر زور ڈالا۔ "کیا سوال کیا تھا جس سے تمھیں دورہ پڑ گیا؟" راجکماری نے اپنا بوجھ سندری پر ڈال دیا۔
سندری کو کہنا پڑا۔ "جی! آپ نے پوچھا تھا۔ سوئمبر میں کتنے

دن باقی ہیں۔ بس ہنسی آگئی مجھے۔"

"صرف پندرہ دن باقی ہیں۔" دیپا نے لقمہ دیا۔ "راجکماری جی! آپ نے سندری سے تو یوں پوچھا تھا جیسے سوئمبر آپ کا نہیں سندری کا ہو رہا ہے۔"

راجکماری نے سوچا۔ سندری کا اُس کے سوال پر ہنسنا کچھ بے جا نہ تھا۔ خود راجکماری کو معلوم تھا کہ سوئمبر میں پندرہ دن باقی ہیں۔ وہ مہینوں سے ایک ایک دن گن رہی تھی۔ پندرہ دن بعد۔

"اگلے سے اگلے منگل کو۔" سندری نے اُس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔

"ہاں پورے پندرہ دن بعد۔" دیپا نے ٹکڑا لگایا۔ "ہماری راجکماری جی۔ بھارت کے سب سے خوبصورت راجکمار کو پسند کریں گی پھر پنڈت مہاراج پھیرے گھمائیں گے اور اور..."

دونوں ہنسنے لگیں۔ راجکماری گلاب کے اونچے پودے کے پاس کھڑی تھی۔ شاخ پر کھلا گلاب بہار دکھا رہا تھا۔ ہوا کا جھونکا آتا تو گلاب لہرا کر راجکماری کی طرف جھک جاتا۔

سندری راجکماری کی خاموشی سے پریشان تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ راجکماری پہلے کی طرح ہنسے بولے... ہنستے ہنستے اُس نے کہا۔ "اور بھارت کا ایک راجکمار اس گلاب کی طرح راجکماری کے قدموں میں سر جھکائے گا۔"

"گلاب۔" راجکماری نے جھومتے ہوئے گلاب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ذرا دیکھ کے۔" دیپا نے ٹوکا۔ "شاخوں میں کانٹے بھی ہیں راجکماری۔"

راجکماری چونک پڑی۔ جیسے کوئی خواب سے بیدار ہو جائے۔ دیپا نے اُس کی پریشانی، فکر اور اُلجھن کا جواب دیا تھا۔ اُسے یوں... محسوس ہوا جیسے وہ پھولوں اور کانٹوں کے درمیان کھڑی ہے۔

راجکماری ٹھنڈی سانس لے کے بولی۔ "دیپا تو نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ مجھے اپنی اُلجھن کا پتہ چل گیا۔ لڑکی کا سوئمبر پھول اور کانٹوں کا میلہ ہوتا ہے۔ مجھے کانٹوں سے ہاتھ بچا کر پھول چُننا ہے۔ لیکن جب کھلی آنکھوں سے پھول چُنتے وقت کانٹے چبھ جاتے ہیں تو میں آنکھیں بند کر کے پھول کیسے چُن سکوں گی۔"

"بند آنکھیں۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔" دیپا حیران ہو گئی۔ "آپ تو راجکمار کو کھلی آنکھوں سے پسند کریں گی۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو دیپا۔" راجکماری نے دیپا کو گھورا۔ "سب ہی راجکمار پھول جیسے ہوں گے لیکن یہ تو بتا۔ مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ کس راجکمار کا دل اُس کے چہرے کی طرح نرم و نازک ہے۔ میری آنکھیں دل کے اندر چھپے ہوئے کانٹوں کو کیسے دیکھ سکیں گی؟"

اس کا جواب دیپا یا سندری کسی کے پاس نہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگیں۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد۔ راجکماری نے کہا۔ "میں نے اس کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔ میں ہر راجکمار کے دل اور دماغ میں جھانکوں گی پھر فیصلہ کروں گی۔"

"کیا حل ڈھونڈا ہے راجکماری؟" سندری نے بے چینی سے پوچھا

"ہاں راجکماری! ہمیں بھی بتاؤ۔" دیپا نے بھی اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

راجکماری کے دل کا بوجھ اور ہلکا ہو گیا۔ وہ اطمینان سے بولی۔ "ہر راجکمار کو نزہت باغ کے سیر کی دعوت دی جائے گی۔"

"بس بس سمجھ میں آگیا۔" سندری ہنستے ہوئے بولی۔ "راجکمار سیر کو آئیں گے اور آپ چھپ کے انھیں دیکھیں گی۔"

"واہ جی، یہ کیا بات ہوئی۔" دیپا نے اعتراض جڑ دیا۔ "صرف دیکھنے سے دل اور دماغ کا حال کیسے معلوم ہو گا؟"

سندری کیا جواب دیتی۔ اعتراض ٹھیک تھا۔ اس نے بے بسی سے راجکماری کی طرف دیکھا۔

"راجکماری مسکرائی۔" دونوں باتیں ٹھیک ہیں۔ بعض مرد اپنی چال ڈھال ہی سے پہچان لئے جاتے ہیں۔ ضرورت محسوس ہوئی تو میں اُن سے گفتگو بھی کروں گی لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

"راجکماروں کو سیر کی دعوت کون دے گا۔ یہ بھی سوچا ہے آپ نے؟" سندری نے بھی ایک اعتراض اُٹھایا۔ وہ اپنے اعتراض پر بہت خوش تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ راجکماری کے پاس اس کا جواب نہیں۔

"سوچ لیا ہے۔" راجکماری نے سندری کی خوشی پر اوس ڈال دی۔ "تمھیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر راجکمار... سیر کے وقت تم دونوں اُس کے ساتھ ہو گی۔ اُسے یہ شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ راجکماری بھی باغ میں موجود ہے۔"

دونوں کنیزوں نے راجکماری کے اس منصوبے کو خوب سراہا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ لیلاوتی نے واپسی کا حکم دیا۔ خوبصورت اور سجا سجایا بجرہ پہلے ہی کنارے کھڑا تھا۔ راجکماری کنیزوں کے ساتھ اٹھلاتی، راوی کی لہروں سے کھیلتی پار اُتری۔ ممتا کی ماری رانی کلدیپ قلعے کے دروازے پر کھڑی راجکماری کا انتظار کر رہی تھی۔

رانی کلدیپ نے راجکماری کو سینے سے بھینچتے ہوئے کہا۔ "لیلاوتی اب زیادہ دیر سیر نہ کیا کر۔ کچھ دن باقی ہیں پھر یہ آنکھیں تو تجھے دیکھنے کو ترس جائیں گی۔"

"نہیں ماں رانی..." لیلاوتی افسردگی سے بولی۔ "میں کہیں جانا

سیں چاہتی۔ آپ خود ہی مجھے جُدا کر رہی ہیں!"

"بیٹی اپنے ہی گھر اچھی لگتی ہے لیلاوتی!" کلدیپ نے آہ بھری۔ "کسی کی امانت ہے اُس کے گھر خیریت سے پہنچ جائے۔ یہی ہماری خوشی ہے۔ دھرم بھی یہی کہتا ہے۔"

دونوں قلعہ کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچیں۔ لیلاوتی نے سوچا۔ گفتگو کا یہ اچھا موقع ہے۔ کیوں نہ اپنے منصوبے کا آغاز کیا جائے۔ وہ ٹھہر کے بولی۔ "ماں رانی میری ایک خواہش ہے۔"

"ہم تو تیری خواہشوں پہ قربان ہونے کو تیار ہیں۔ بول میری لیلاوتی کیا چاہتی ہے؟"

"دیکھو نا، رانی ماں۔" لیلاوتی الفاظ تولتے ہوئے بولی۔ "دُور دُور سے مہاراج آئیں گے اور قلعے میں بند ہو کے بیٹھ جائیں گے بھلا کیا سوچیں گے وہ اپنے دل میں؟"

"لیلاوتی تو اس کی فکر نہ کر۔" رانی کلدیپ جوش سے بولی۔ "مہاراجوں کی اتنی خاطر مدارات کی جائے گی۔ وہ اپنی راجدھانیوں کو بھول جائیں گے۔ میں نے اُن کے لئے ایسے ایسے پکوانوں کا انتظام کیا ہے کہ اُنھوں نے آج تک نہ کھائے ہوں گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن..." لیلاوتی کہتے ہوئے ڈری۔

"ہاں ہاں! تو کہہ۔ کیا چاہتی ہے اور..." رانی نے زور دیا۔ "اس کے علاوہ میں نے ناچ گانے کا بھی بندوبست کیا ہے۔ کئی ریاستوں کے طائفے بلوائے ہیں۔"

"ماں رانی، اُن کی سیر و تفریح کا بھی انتظام ہونا چاہیئے۔" لیلاوتی نے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" رانی نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "لیکن یہاں گھومنے پھرنے کی جگہ کونسی ہے؟"

"میری نزہت گاہ۔ میرا باغ۔" لیلاوتی نے جھٹ سے کہا۔

"ہاں، باغ تو تیرا دیکھنے کے قابل ہے۔" پھر رانی سوچتے ہوئے بولی۔ "پر تیرا کیا بنے گا۔ سیر کے بنا تو تیرا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔"

"واہ، ماں رانی۔" لیلاوتی ٹھنک کے بولی۔ "مہاراج سیر کریں گے۔ مجھے کھا تو نہیں جائیں گے۔ میں باغ کی حویلی کے اندر رہوں گی۔ وہ باہر سیر کرتے پھریں۔"

"اچھا تیری مرضی۔" رانی کلدیپ کچھ پریشان ہو گئی۔ "میں راجہ سے بات کروں گی۔"

"اور رانی ماں۔ ایک بات اور سُن لو۔" لیلاوتی نے فوراً دوسرا قدم اُٹھایا۔ "راج پتا سے کہہ دینا مجھے یہ شور و غل پسند نہیں۔ قلعہ کیا سج رہا ہے۔ دن بھر اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہتی ہے۔ مہمان آئیں گے تو اور ہنگامہ ہوگا۔ مجھے اُلجھن ہوتی ہے ایسی باتوں سے۔ میں تو کل ہی راوی پار اپنے باغ میں چلی جاؤں گی۔ سوئمبر تک وہیں رہوں گی۔"

"لیکن لیلاوتی..."

"کچھ نہیں ماں رانی۔" لیلاوتی نے رانی کو بولنے نہ دیا۔ "یہ میری آخری خواہش ہے۔ اگر آپ اور راج پتا میری خوشی نہیں چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ میں صبر کر لوں گی۔"

لیلاوتی نے روٹھ جانے والی اداکاری کی۔ رانی کلدیپ کا دل تڑپ اُٹھا۔ جلدی سے بیٹی کو سینے سے لگایا۔ بولی۔ "دل نہ چھوٹا کر لیلاوتی۔ کیسے انکار کریں گے راجہ جی۔ تو جیسا چاہتی ہے وہی ہوگا۔"

لیلاوتی کی آنکھیں خوشی سے ہنسنے لگیں۔

راجہ بھارت بھی اب تک جاگ رہا تھا۔ اسے رانی کلدیپ اور اُس سے زیادہ راج دلاری لیلاوتی کا انتظار تھا۔ اکلوتی اولاد اور اب تو وہ صرف چند دنوں کی مہمان تھی۔ راجہ اُسے زیادہ سے زیادہ... خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ لیلاوتی کو ہر بات کی آزادی تھی۔ جب تک خواہش ہوتی سوتی رہتی۔ جہاں جانے جی چاہا۔ رتھ تیار کرایا اور چل دی۔ ندی پار جانے کے لئے دو دو بجرے ہر وقت قلعہ کے برابر لگے رہتے۔ کھانے پینے، آنے جانے کسی بات کی روک ٹوک نہ تھی۔

کلدیپ اور لیلاوتی پہنچیں تو راجہ خوش ہو گیا۔ اُس نے لیلاوتی کو اتنے پیار اور کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ لیلاوتی گھبرا اُٹھی۔

"راج پتا! آپ مجھے کس طرح دیکھ رہے ہیں؟" لیلاوتی نے گھبراہٹ چھپانے کو سر جھکا لیا۔

"یہ باپ کے پیار اور شفقت کی نظریں ہیں لیلاوتی۔" راجہ نے قریب آ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "یہ نظریں بھی اب ہم سے چھین لی جائیں گی۔"

راجہ آبدیدہ ہو گیا۔ لیلاوتی نے فوراً راہِ فرار اختیار کی۔ "میں جا رہی ہوں۔ بڑی نیند آ رہی ہے ماں رانی۔"

"کچھ دیر ہمارے پاس بھی بیٹھو بیٹی۔" باپ کی محبت نے زور مارا۔

"جانے دیجئے مہاراج! بہت تھکی ہوئی ہے بیچاری۔" رانی نے بیٹی کی طرفداری کی۔

لیلاوتی جواب کا انتظار کئے بغیر اپنے کمرے کی طرف چلی۔ تیز تیز قدموں سے۔ جیسے بھاگ رہی ہو۔

●

لاہور کے کوچہ و بازار کو دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا۔ جس حد تک ہو سکا سڑکیں پختہ ہوئیں۔ صبح و شام چھڑکاؤ کر کے گرد کو دبایا گیا۔ لاہور آنے والے تمام راستوں کے کنارے کنارے بانس گاڑ کر ڈھیبیاں باندھی

گئیں۔ ڈیوڑھیوں میں قندیلیں لٹکائی گئیں۔ چار سمتوں میں چار آرائشی دروازے تیار ہوئے۔ اوپر دیوی، دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی گئیں۔
غرض یہ کہ لاہور میں جشن کا سماں تھا۔ سوئمبر کے پنڈال میں عام آدمیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ پھر بھی عوام بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ دوسرے ریاستوں کے راجکماروں کو ایک نظر دیکھنے کے لئے لوگ دن بھر آرائشی دروازوں کے چکر لگاتے رہتے۔
ایک ہفتہ پہلے سے راجکمار آنا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے بنگال کا راج کمار آیا۔ بنگال لاہور سے ہزاروں میل دور ہے لیکن ہاتھی مزاج راجکمار سفر کی صعوبتوں سے لاپرواہ ہو کر لاہور پہنچا۔ گندمی رنگ، چھوٹا قد، چھریرہ بدن، سر پر گول ٹوپی جس کے گرد قیمتی ہیروں کی بیل ٹکی ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک سو خادموں اور ریاستی حکام کا قافلہ تھا۔ جب وہ استقبالیہ نعرے لگانے والوں کو ہاتھ ہلا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتا تو اُس کے ہاتھ کے ساتھ ساتھ اُس کی گول گول بڑی بڑی آنکھیں بھی حرکت کرتیں۔
بندیل کھنڈ کے چنڈال خاندان کا راجکمار سیاہ رنگت کا ایک گرانڈیل جوان تھا۔ سر پر مرصع تاج جس میں پرندوں کے رنگ برنگ کے پر بھی لگے تھے۔ وہ ایک رتھ پر بھالا تانے اِس طرح کھڑا تھا جیسے سوئمبر کے بجائے میدانِ جنگ میں آیا ہو۔ ریاست مالوہ کے راجکمار کے سر پر پگڑی تھی۔ پگڑی کے ہر بل میں قیمتی جواہرات... آویزاں تھے۔ اجمیر میں اُس وقت چوہان خاندان کی حکمرانی تھی۔ یہ ٹھاکروں کا جنگجو خاندان تھا۔ اجمیر کا راجکمار دراز قامت تھا۔ ہلکی خنجر نما مونچھیں، ماتھے پہ قشقے کا نال۔ گھوڑے کو کبھی دُلکی کبھی پویا بھگاتا داخل ہوا۔
گجرات کا سولنگی راجکمار تخت پر بیٹھ کے لاہور میں داخل ہوا۔ چھوٹا سا تخت، چاندی کے پائے، چاروں طرف سونے کا کام کیا ہوا۔ گجرات سے لاہور کے مضافات تک اُس نے گھوڑے پر سفر کیا تھا۔ لیکن لاہور کے دروازے پر پہنچ کر گھوڑا چھوڑ دیا۔ اُس کے حواریوں کی تعداد بھی پچاس کے قریب تھی۔ صرف ریاست دہلی کا راجکمار ایسا تھا جس کے ساتھ کوئی نہیں آیا۔ اُس نے پورا سفر تنہا طے کیا۔ تومار خاندان کا یہ خوبصورت راجکمار گھوڑا اُڑاتا ہوا لاہور میں اِس انداز سے داخل ہوا کہ دیکھنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ اس کی وضع قطع، چال ڈھال اور لباس سب سے جدا تھا۔ سر پر نوکدار ریشمی صافہ، ماتھے کی طرف ایک سونے کا گول تمغہ سا جس کے اندر بے شمار چھوٹے چھوٹے ہیرے جڑے تھے۔ انگرکھے نما کوٹ۔ بل دی ہوئی دھوتی، کھلتا رنگ، بڑی بڑی مسکراتی آنکھیں، چوڑا سینہ، [illegible]
کی عورتیں تو اُسے دیکھنے کے لئے ایک دوسری پر ٹوٹی پڑتی تھیں۔
تیرہ ریاستوں کے راجکمار لاہور پہنچ چکے تھے۔ لاہور کے قریب بھاٹیہ کی بڑی ریاست تھی جس کا راجہ بجی رائے تھا۔ بڑا مغرور، خود سر اور بدنیت۔ یہ ریاست بھیرہ، خوشاب، پنڈی بھٹیاں، بھٹنڈا اور سرگودھا کے علاقوں پر مشتمل تھی۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی لیکن راجہ لالچی تھا اور اُس کی نظریں لاہور پر لگی رہتی تھیں۔ شمالی بھارت کا سب سے بڑا راجہ، مہاراج جے پال تھا۔ اُس کی ریاست صوبہ ملتان، جلال آباد (افغانستان)، ہمالیہ، کابل کی وادی سے لے کر کشمیر کے نیچے نیچے [illegible] کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔ مہاراج جے پال کے دانت بھی لاہور پر تھے۔ اُسے لاہور کے راجہ بھارت سے یہ شکایت تھی کہ اُس نے سولہ سال پہلے سلطان محمود غزنوی کے باپ امیر سبکتگین سے ملاقات کی تھی۔ امیر سبکتگین، غزنی کا حاکم تھا اور اُس کے اور جے پال کے درمیان ہمیشہ سے لڑائیاں ہوتی چلی آ رہی تھیں۔ اِس اختلاف کی بنا پر اُس نے اپنے راجکمار کو نہیں بھیجا۔
راجہ بھارت نے سیناپتی (وزیر اعظم) سے سوئمبر میں آنے والے راجکماروں کی فہرست منگوائی۔ سیناپتی خود فہرست لے کر حاضر ہوا۔ راجہ نے فہرست کے ایک ایک نام کو پڑھا۔ پھر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ سیناپتی نے اُسے پریشان دیکھ کر کہا۔ "اگر مہاراج یہ سوچ رہے ہیں جے پال نے اپنے راجکمار کو نہیں بھیجا تو آپ کی سوچ ٹھیک ہے لیکن اگر کوئی اور پریشانی ہے تو مجھے آگاہ کیا جائے۔"
"جے پال ہی ہماری پریشانی کا سب سے بڑا سبب سیناپتی ہے...!" راجہ افسردگی سے بولا۔ "تمہیں مہارانی کلدیپ کے سوئمبر کی بات تو یاد ہوگی؟"
"یاد ہے مہاراج۔" سیناپتی نے فوراً جواب دیا۔ "اُس سوئمبر کی ایک ایک بات مجھے ایسے ہی یاد ہے جیسے یہ کل کا واقعہ ہو۔ اُس وقت میں آپ کے ساتھ ہی تھا۔ راجہ جے پال بھی راجکماروں کی صف میں موجود تھا۔ مہارانی نے آپ کو پسند کر کے گجرا آپ کے گلے میں ڈال دیا۔ اُس وقت جے پال غصے سے بھڑک اُٹھا تھا۔ اُس نے دوڑ کر آپ پر خنجر سے حملہ کیا تھا اور آپ نے اُس کے ہاتھ مروڑ کر خنجر چھین لیا تھا۔"
"لیکن اب ہم میں اُس کے ہاتھ سے خنجر چھیننے کی طاقت نہیں۔" راجہ بھارت نے غمگین آواز میں کہا۔ "جے پال کی طاقت پہلے سے سوگنا بڑھ چکی ہے۔ جے پال کو ہم سے یہ بھی شکایت ہے کہ ہم نے غزنی کے امیر سبکتگین سے کیوں ملاقات کی؟"
"مہاراج۔" سیناپتی جوش سے بولا۔ "سیاسی حالات کے تحت آپ کا ایک مسلمان امیر سے ملنا بالکل جائز تھا۔ آپ نے

جے پال سے تعلقات بحال کرنے کے لئے کیا کیا کوششیں نہیں کیں لیکن اُس نے آپ کو ہمیشہ حقیر سمجھا۔ راجہ بھاٹیہ اس کا دوست ہے وہ ہماری مدد نہیں کرتا۔ کسی اور میں اتنی طاقت نہیں کہ جے پال کو سمجھا سکے۔ آپ کو ہی کرنا چاہیئے تھا۔"

"سیناپتی! مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے پر آمادہ ہے۔" لاہور کا بوڑھا راجہ بہت پریشان تھا۔ سیناپتی کو اُس کی پریشانی کا پورا احساس تھا۔ اِس لئے وہ راجہ کو یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ جے پال کا بیٹا آنند پال اِس وقت بھی راجہ بھاٹیہ کا مہمان ہے اور یہ مہمانی اور میزبانی مصلحت سے خالی نہیں۔ راجکمار آنند پال کے ساتھ ہزاروں تیز رفتار سوار اور دس ہاتھی بھی تھے۔۔۔

سیناپتی نے اِس خطرے کے تحت لاہور کے چاروں طرف اپنی فوجیں لگا دی تھیں لیکن آنند پال اور بھی راجہ کے اگرچہ ظاہری طور پر راجہ بھارت کا دوست تھا لیکن راجکماری لیلاوتی کے سوئمبر کے موقعے پر آنند پال کو مہمان بنانا مخالفت کا ایک شاخسانہ ہی سمجھا جا سکتا تھا۔

سیناپتی نے راجہ کو تسلی دینے کے لئے کہا۔ "ہم ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ تمام سرحدی چوکیوں کو چوکنا کر دیا گیا ہے اور امدادی فوج بھی تعینات کر دی گئی ہے۔"

راجہ کو گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ "تم نے یہ سب کیوں کیا؟ کسی خطرے کی اطلاع ملی ہے تمہیں؟"

"ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے مہاراج!" سیناپتی نے احتیاط برتتے ہوئے کہا۔ "ابھی سوئمبر میں کئی دن باقی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ راجہ جے پال اپنے کسی راجکمار کو سوئمبر میں بھیج دے۔"

راجہ کی پریشانی دُور نہ ہوئی۔ اُس نے کہا۔ "سیناپتی! تم اپنی وفاداری کے تحت ہم سے کوئی بات ضرور چھپا رہے ہو۔ تمہیں خطرے کا احساس بھی ہے اور تم جے پال کی طرف سے پُرامید بھی ہو۔ یہ دونوں خیال تمہارے دماغ میں ایک ساتھ کیسے آ گئے؟"

سیناپتی عجیب طرح کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ سوئمبر جیسے خوشی کے موقع پر کسی خطرے کا ذکر کرنا راجہ کی خوشیوں کا خون کرنے کے مترادف تھا لیکن اُس کی خاموشی اُس کے فرائض سے چشم پوشی بھی تھی۔ اُس کے ضمیر نے ملامت کی۔ سیناپتی نے دبی زبان سے کہا۔ "مہاراج! میرے باپ دادا کی وفاداریاں ریاست لاہور سے وابستہ رہی ہیں۔ میرے لئے اِس سے بڑھ کر اور کوئی فخر نہیں ہو سکتا کہ میں لاہور کی حفاظت کرتے کرتے خود کو قربان کر دوں۔ مجھے۔۔۔

جے پال کی طرف سے اُمید اِس لئے ہے کہ اُس کا بیٹا راجکمار آنند پال اِس وقت پنڈی بھٹیاں میں راجہ بھی راجہ بھاٹیہ کا مہمان ہے۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" راجہ بھارت مسرت سے بولا۔ "پنڈی بھٹیاں میں راجکمار آنند پال کی موجودگی اِس بات کی علامت ہے کہ وہ سوئمبر میں شریک ہونا چاہتا ہے۔"

"جی مہاراج! یہ تو خوشی کی بات ہے۔" سیناپتی نے آواز دبا کر کہا۔ "لیکن یہ بات پریشانی کی بھی ہو سکتی ہے۔ آنند پال کے ساتھ سوار اور دس جنگی ہاتھی بھی ہیں۔"

راجہ بھارت کا خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ مرجھا گیا۔ "بھگوان ہماری رکشا کرے۔" راجہ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ اور وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔

وفادار سیناپتی نے کہا۔ "مہاراج! صحیح حالات سے آپ کو باخبر رکھنا میرا فرض تھا۔ میں نے تمام احتیاطی تدابیر بھی اختیار کر لی ہیں لیکن میں اب بھی نااُمید نہیں ہوں۔ جے پال پورے بھارت کے راجاؤں کو ناراض نہیں کر سکتا۔ اگر اُس نے سوئمبر میں گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو تمام ریاستیں ہمارا ساتھ دیں گی۔ سوئمبر، دھرم کا مسئلہ ہے۔ دھرم کی توہین کوئی برداشت نہ کرے گا۔"

"نہیں سیناپتی!" راجہ بھارت مایوس لہجے میں بولا۔ "جے پال کو پورے بھارت نے مہاراج تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے یگیہ کے گھوڑے کو کسی نے نہیں باندھا۔"

قدیم بھارت میں رواج تھا کہ جب کوئی راجہ بہت زیادہ طاقتور ہو جاتا تو وہ یگیہ کی رسم کا اہتمام کرتا۔ اِس رسم کے تحت ایک گھوڑے کو قیمتی ساز سے سجا کر چھوڑ دیا جاتا۔ گھوڑے کے ساتھ دس پانچ محافظ سوار ہوتے۔ اِس گھوڑے کو بھگا دیا جاتا۔ یہ گھوڑا ایک ریاست سے دوسری ریاست پھر تیسری ریاست میں بھاگتا رہتا۔ اِس طرح گھوڑا تمام ریاستوں میں چکر لگاتا۔ اگر کسی ریاست کا راجہ گھوڑے کو پکڑ کر باندھ لیتا تو اِس کا مطلب یہ نکالا جاتا کہ وہ راجہ، گھوڑے کے مالک کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتا اور جنگ پر آمادہ ہے۔ پھر اُن دونوں میں جنگ چھڑ جاتی۔ جو فتحیاب ہوتا اُسے بھارت کا مہاراج تسلیم کر لیا جاتا۔

دو سال پہلے راجہ جے پال نے بھی یگیہ کا گھوڑا چھوڑا تھا۔ یہ گھوڑا دُور نزدیک کی تمام ریاستوں میں پھرتا رہا۔ کسی کو اُسے پکڑ کے باندھنے کی ہمت نہ پڑی۔ بھارت کے وہ تمام راجہ جن کی ریاستوں میں یگیہ کا گھوڑا گھوما تھا۔ راجہ جے پال کے مطیع ہو گئے۔ راجہ جے پال نے اُس دن سے مہاراج جے پال کا لقب اختیار کر لیا تھا۔

راجکماری لیلاوتی کی ماں رانی کلدیپ بھی ایک ریاست کی راجکماری تھی۔ رانی کلدیپ کے باپ نے بھی سوئمبر کا انتظام کیا تھا۔ جس میں کلدیپ نے راجہ بھارت کے گلے میں گجرا ڈالا تھا۔ اُس وقت جے پال راجکمار تھا اور کلدیپ کی آرزو لے کر سوئمبر میں آیا تھا۔ اپنی ناکامی کے بعد وہ راجہ بھارت سے اُلجھ پڑا تھا۔ گو کہ اس وقت دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی لیکن اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد بھی اُن کے دل صاف نہ ہوئے تھے۔ راجہ بھارت کے دل میں اسی وجہ سے وسوسے اُٹھ رہے تھے۔

سیناپتی اُسے تسلیاں دے کر واپس اپنی حویلی پہنچا تو اُسے ایک عجیب خبر ملی۔ پنڈی بھٹیاں بھیجے ہوئے جاسوسوں میں سے ایک نے ..... اطلاع دی کہ آنند پال ایک ہزار سواروں کے ساتھ چنیوٹ کی طرف گیا ہے۔ آنند پال کے ساتھ پانچ سو سوار تھے۔ مزید پانچ سو سوار اُس نے راجہ بھاٹیہ سے حاصل کئے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اُس نے جنگی ہاتھی، پنڈی بھٹیاں میں چھوڑ دیئے تھے۔ سیناپتی دیر تک اِس خبر پر غور کرتا رہا لیکن اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آنند پال... چنیوٹ کی طرف کیوں گیا ہے۔ اگر اُسے راجکماری کے سوئمبر میں گڑبڑ کرنا تھی تو اُسے لاہور کا رُخ کرنا چاہئے تھا۔

دوسرے دن اُسے خبر ملی کہ آنند پال نے چنیوٹ میں صرف دو گھنٹے قیام کیا پھر وہ آگے بڑھ گیا ہے۔ قیاس ہے کہ وہ جھنگ کی طرف جا رہا ہے۔ سیناپتی کے لئے یہ خبر بڑی اطمینان بخش تھی۔ آنند پال لاہور سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ سوئمبر میں صرف تین دن باقی تھے۔ اِن تین دنوں میں آنند پال کا لاہور پہنچنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ سیناپتی خوش خوش راجہ کے پاس پہنچا۔

"جے ہو مہاراج، دشمنوں کا مُنہ کالا ہو گیا۔" سیناپتی نے فخر اور انبساط کے ملے جلے جذبات کا اظہار کیا۔ راجہ بھارت بہت افسردہ تھا۔ اُسے سیناپتی کی یہ خوش کلامی اچھی نہ لگی۔ اُس نے سیناپتی کو حیرت سے دیکھا، پوچھا "دشمن سر پر موجود ہے سیناپتی تم اُس کا مُنہ کیسے کالا کر رہے ہو؟"

"مہاراج! آپ بے فکر ہو کے خوشیاں منائیں۔" سیناپتی نے اسی جوش سے کہا "میرے جاسوسوں نے خبر دی ہے کہ خطرہ ٹل گیا۔ آنند پال کی طرف سے کسی جھگڑے کا امکان نہیں۔"

"جاسوسوں کی خبر غلط بھی ہو سکتی ہے۔" راجہ بھارت نے بے اطمینانی ظاہر کی۔ "آنند پال جنگی ہاتھیوں اور سواروں کو لے کے پنڈی بھٹیاں میں شکار کھیلنے تو نہیں آیا۔ اُس کا کوئی مقصد ضرور ہوگا۔"

سیناپتی نے مسکرا کے کہا "مہاراج! اُس کا کوئی مقصد ہو گا لیکن اب لاہور آنے کا مقصد ہرگز نہیں۔ آنند پال پنڈی بھٹیاں سے چلا گیا ہے۔"

"کیا سچ...؟" سیناپتی اطمینان سے بولا "آنند پال پہلے چنیوٹ گیا لیکن وہاں ٹھہرنے کے بجائے اب جھنگ روانہ ہو چکا ہے۔"

سیناپتی نے راجہ بھارت کو یہ نہیں بتایا کہ آنند پال نے اپنے سواروں کی تعداد دوگنی کر لی ہے۔ شاید وہ راجہ کو یہ بتا کر کسی شبہ میں مبتلا نہ کرنا چاہتا تھا۔

راجہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا "سیناپتی! میرا خیال ہے کہ جے پال اور بجی رائے کو محمود غزنوی کے حملے کا خطرہ ہے۔ جے پال نے اسی لئے آنند پال کو پنڈی بھٹیاں بھیجا ہوگا۔"

سیناپتی نے اِس معاملے پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ اُسے موقع مل گیا، فوراً بولا "مہاراج نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔ میں نے سُنا ہے کہ محمود غزنوی نے جے پال کو شکست دے کر کابل سے درہ خیبر تک کا تمام علاقہ چھین لیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ محمود جنوب کی طرف سے بھارت میں داخل ہونے کا منصوبہ بنا رہا ہو۔"

"چلو یہ اچھا ہی ہوا۔" راجہ بھارت کو بھی اطمینان ہو گیا "اب سوئمبر اطمینان سے ہو سکے گا۔"

راجکمار آنند پال کے جھنگ کی طرف جانے کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن جس خدشے کا اظہار راجہ بھارت نے کیا تھا۔ وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ غزنی کے حاکم امیر سبکتگین نے راجہ جے پال کو شکست دے کر پشاور کا علاقہ اور درہ خیبر اور کابل کا درمیانی علاقہ فتح کر لیا تھا لیکن سبکتگین کی وفات کے بعد اُس کے جانشینوں کو جنگ میں مشغول دیکھ کر جے پال نے پھر اِن علاقوں پر قبضہ جما لیا تھا پھر اُس کے بیٹے محمود غزنوی نے تخت نشین ہوتے ہی بڑی برق رفتاری سے چند سرحدی شہروں، علاقوں یعنی صوبہ لمغن جس میں جلال آباد بھی شامل تھا۔ کو فتح کر لیا۔ صرف پشاور اس کے قبضہ میں نہ آ سکا تھا۔

●

راجکماری لیلاوتی کے سوئمبر میں بہتر گھنٹے سے بھی کم وقت رہ گیا تھا۔ تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ جتنے اُمیدواروں کی توقع تھی۔ سوائے آنند پال کے سب لاہور پہنچ چکے تھے۔ لیلاوتی اپنے منصوبے کے مطابق دریا پار اپنی نزہت گاہ میں مقیم تھی۔ آج تمام راجکماروں کو باری باری نزہت گاہ کی سیر کو آنا تھا۔ راجکماروں کو دعوت دی جا چکی تھی اور وہ بنک سنک سے درست ہو کے سیر کے لئے تیار تھے۔

راجکماری نے رعیا اور سندری کی ڈیوٹیاں مقرر کیں۔ سدپا کو... راجکماری کے پاس ٹھہرنے کا حکم ہوا۔ سندری کو راجکماروں کے استقبال



کپڑوں میں نکھار
مہک ہر بار
فیملی
SHAHEEN FOUNDATION

کا فرض سونپا گیا۔ سعیا اور سندری کنیزیں تھیں لیکن صورت ایسی پائی تھی کہ جو دیکھے تو بس دیکھتا ہی جائے۔ راجکماری کی طرح اُن دونوں نے بھی سولہ سنگھار کئے تھے۔ راجکمار کے آنے کا وقت ہُوا تو سندری چھم چھم کرتی دریا کی طرف چلی۔ بسنتی ساڑھی، چُست چولی، دھبارے دار سرمہ، دانتوں پر مسّی، راجکماری کو اس پر کچھ ایسا پیار آیا کہ واپس بُلا کے اُسے پیار کیا۔ اور سینے سے لگایا۔ سعیا کی سج دھج بھی ایسی ہی تھی دیکھنے میں قیامت اور چلنے میں فتنۂ قیامت۔

سب سے پہلے بنگال کے پرولاس راجکمار کی کشتی ساحل سے لگی۔ نزہت گاہ تک جانے کے لئے ساحلِ دریا سے اُوپر تک سنگی سیڑھیاں بنی تھیں۔ سندری راجکمار کے استقبال کے لئے پانی کے قریب آخری سیڑھی تک آگئی تھی۔ جیسے ہی کشتی ساحل پر لگی سندری نے ایک ادائے خاص سے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"نمسکار راجکمار، پدھاریئے"۔ اس کے ساتھ ہی سندری نے ایک ہاتھ راجکمار کی طرف سہارے کے لئے بڑھا دیا۔ راجکمار کی حیران نظریں جم کر رہ گئیں۔

گورا گورا ہاتھ، کہنیوں تک طلائی کنگن اور چوڑیوں سے بھرا ہُوا، پور پور انگوٹھیاں، چمکتے دمکتے فیروزے والی۔ کانوں میں لمبے لمبے بالے، ماتھے پر ٹیکہ، مقیاس الشباب کے درمیان سینے پر جھولتا ہوا چندن ہار بنگالی راجکمار اب تک سحر بنگالہ سے دوچار ہُوا تھا لیکن لاہور کے چندر مکھی جادو نے اُسے کچھ ایسا از خود رفتہ کیا کہ ساری چوکڑی بھول گیا۔ ایک پیر کشتی میں ایک خشکی پر۔ سکتہ سا طاری ہوگیا۔ کشتی ذرا ڈگمگائی تو اُسے ہوش آیا۔

چنچل سندری مُسکرائی۔ "سنبھل کے راجکمار! میرا سہارا لے لیجئے"۔

راجکمار نے ڈرتے، جھجکتے سندری کے ہاتھ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"نمستے راجکماری جی"۔ راجکمار نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں کہا۔

قدیم بھارت میں علاقائی طور پر بہت سی زبانیں بولی جاتی تھیں لیکن جس طرح برصغیر میں اُردو زبان، عوام اور خواص میں یکساں طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح "قدیم بھاشا" اس وقت بھارت کی عام زبان تھی۔

راجکمار، سندری کا ہاتھ پکڑ کر کشتی سے باہر آیا۔ سندری کے خوبصورت ہاتھ کے لمس نے اُس کے رہے سہے حواس بھی غارت کر دیئے۔ راجکمار اور سندری پہلو بہ پہلو سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ سندری کا ہاتھ اب تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ سندری دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔ بنگالی راجکمار اُسے راجکماری پیلاوتی سمجھ بیٹھا تھا۔

سندری نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا: "راجکمار جی! اب آپ کو سہارے کی ضرورت نہیں۔ میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے"۔

راجکمار بوکھلایا۔ سنبھلا پھر بڑی انکساری سے بولا: "راجکماری جی! ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے تو اب اسے الگ نہ کیجئے۔ آپ میرے ساتھ بنگال چلئے۔ میری راجدھانی میں روشنی ہوجائے گی"۔

راجکمار کی باتوں میں سندری کو کچھ ایسا لُطف آرہا تھا کہ اُس نے غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ مُسکراتی رہی ہنستی رہی... راجکمار ریشہ خطمی ہو رہا تھا۔ وہ سندری کے ایک ایک انگ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ راجکمار کو باغ کی سیر کی دعوت دی گئی تھی لیکن راجکمار بار بار سندری کا شکریہ ادا کرتا کہ راجکماری نے سو سُبھر سے پہلے ہی اُسے اپنے جمالِ جہاں تاب کے دیدار سے سرفراز کیا۔ راجکمار نے باغ کی رونق کو تو نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ غنچوں کی تعریف نہ پھولوں کی تحسین۔ اُس کے لئے سب سے بڑی سیر تو سُندری کے حُسنِ دلپیکر کا دیدار تھا۔

سُندری، راجکمار کو باتوں میں لگائے ہوئے نزہت گاہ کی حویلی کے اُس برآمدے میں لے آئی جس کے برابر کے کمرے میں راجکماری اور سعیا بیٹھی تھیں۔ طے یہ ہُوا تھا کہ سُندری ہر راجکمار کو اُس برآمدے میں لاکے اُس سے باغ کے بارے میں ایک خاص سوال پُوچھے گی جس سے راجکمار کی ذہانت کا اندازہ ہوسکے گا۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو... راجکمار کو اندر بلوا کر باتیں بھی کی جائیں گی۔

سُندری نے برآمدے میں پہنچ کر راجکمار سے سوال کیا۔

"راجکمار جی! یہ تو بتایئے اِس باغ کی کس چیز نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟"

راجکمار نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فوراً جواب دیا: "یہ باغ کیا چیز ہے راجکماری جی! مجھے تو آپ کے حُسن نے متاثر کیا ہے۔ آپ کو دیکھنے سے مجھے فرصت ہی نہیں مل سکی کہ باغ کی طرف توجہ دیتا۔ سچ پُوچھئے راجکماری جی! اِس باغ کا اصل پھول تو آپ ہیں۔ آپ میرے ساتھ چلئے، میں آپ کو اپنی رانی بناؤں گا۔ راج رانی، بنگال کی رانی... آپ ہمارے ملک کے پہاڑ، دریا، چشمے دیکھ کر..."

اُسی وقت برآمدے والے کمرے کی ایک کھڑکی کے دونوں پٹ آپس میں ٹکرائے۔ راجکمار نے چونک کر اُدھر دیکھا اور پُوچھا: "ہیں... کیا میرے اور آپ کے سوا کوئی اور بھی یہاں موجود ہے؟"

سُندری ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی: "راجکمار جی... آپ فکر نہ کیجئے۔ آپ کی باتیں راجکماری اچھی طرح سُن رہی ہے"۔

بنگالی راجکمار پھر بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس نے پُوچھا: "لیکن یہ کھڑکی؟"

"وہم نہ کیجئے۔ ہوا سے بند ہوئی ہے۔"

"جی ہاں! ہوا سے بند ہوئی ہوگی۔" راجکمار بھلا اپنی محبوبہ کی بات کیسے رد کر سکتا تھا۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا میری ریاست بنگال کے جھنے دریا، پہاڑ...."

اور سندری سوچ رہی تھی کہ اس بے وقوف راجکمار کی باتیں سن کر راجکماری اور دیپا کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ یقیناً انھیں ہنسی کے دورے پڑ رہے ہوں گے۔ سندری کی سوچ ٹھیک ہی تھی۔ راجکمار نے جب سندری کو "راجکماری" کہہ کر مخاطب کیا تو دیپا اور راجکماری کو زور سے ہنسی آئی۔ دیپا نے جلدی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ راجکماری اپنا پیٹ دبا کر بیٹھ گئی لیکن ہنسی تھی کہ رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ وہ لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی۔ کبھی اٹھتی، کبھی بیٹھتی۔ کبھی کھڑکی کے کھلے ہوئے پٹ سے باہر جھانکتی۔ اسی حال میں دیپا کا ہاتھ کھڑکی سے لگا اور کھڑکی کا پٹ دوسرے پٹ سے ٹکرا کر بند ہو گیا۔

راجکمار نہ معلوم کہاں کہاں کی باتیں کرتا۔ سندری کا دماغ چاٹتا رہا۔ آخر سندری تنگ آ گئی۔ اس نے کہا۔ "راجکمار جی! اس کا مطلب ہے کہ آپ کو باغ کی کوئی چیز پسند نہیں آئی۔ باغ کے پھولوں، کیاریوں نے آپ پر کوئی تاثر نہیں چھوڑا۔"

"بالکل نہیں راجکماری جی۔" راجکمار نے پورے جوش سے کہا۔ "مجھے تاثر تو راجکماری جی آپ کی ذات نے کیا ہے۔ آپ کے حسن نے کیا۔ جوانی اور شباب نے کیا ہے۔"

اس وقت کھڑکی کے پٹوں میں پھر بھڑبھڑاہٹ ہوئی۔ راجکمار نے چونک کر دیکھا اور بولا۔ "راجکماری جی! یہ پھر ہوا نے...."

"ہاں ہاں، ہوا نے۔" سندری جھلا گئی۔

راجکماری لیلاوتی نے سندری سے کہا تھا کہ اگر ضرورت ہوئی تو وہ دیپا کو بھیج کر راجکمار کو اندر بلوا لے گی۔ سندری نے ذرا دیر انتظار کیا جب دیپا باہر نہیں آئی تو اسے راجکمار کو واپس بھیجنے کی فکر ہوئی۔

سندری بڑے پیار سے بولی۔ "راجکمار جی! بس آپ تشریف لے جائیے، سیر ختم ہوئی۔"

"ارے اتنی جلدی۔" راجکمار گھبرا گیا۔ "پھر، پھر کب ملاقات ہوگی؟"

"راجکماری لیلاوتی کو تو آپ سوئمبر میں دیکھیں گے۔" سندری چڑ کے بولی۔ "مجھے آپ نے دیکھ لیا بس تشریف لے چلئے۔"

"ایں .... کیا .... کیا کہا آپ نے راجکماری جی؟" راجکمار گڑبڑا گیا۔

"راجکماری نہیں۔ میں سندری ہوں سندری۔" سندری بگڑ گئی۔

"کیا آپ کے دیس میں راجکماریاں ایسی ہوتی ہیں۔ راجکمار جی! میں ایک معمولی خادمہ ہوں۔ مجھے دیکھ کے آپ کا یہ حال ہوا ہے تو پھر راجکماری کو دیکھتے ہی آپ بے ہوش ہو جائیں گے۔ ذرا سنبھل کے جائیے گا سوئمبر میں۔"

راجکمار کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کی گردن شرم سے جھک گئی۔ سندری اسے دریا کی طرف واپس لے چلی۔ اس کھڑکی کے اندر سے قہقہوں کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ دیپا اور راجکماری ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں۔ ان کے قہقہوں کی آوازیں راجکمار کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں لیکن اس کی گردن پھر نہ گھوم سکی۔

سندری نے راجکمار کو کشتی میں سوار کرا دیا۔ راجکمار کی اتنی بھی ہمت نہ ہوئی پلٹ کر سندری کو دیکھے۔ کشتی دوسرے کنارے پہنچی۔ چار بندیل کھنڈ کا چندل راجکمار اپنی پالکی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ کشتی کنارے لگتے ہی اپنا لمبا بھالا سنبھال کے کشتی کی طرف یوں بڑھا جیسے شکاری شکار پر جھپٹتا ہے۔ کشتی بان اگر ہوشیار نہ ہوتا تو کشتی ضرور الٹ جاتی۔ اس نے گھور کر اس دیو نما راجکمار کو دیکھا پھر خاموشی سے کشتی چلانے لگا۔ چندال راجکمار جہاں کشتی پر تنکا تھا ایسے کھڑا تھا جیسے ہوشیار چوکیدار محل پر پہرہ دیتے ہیں۔ سندری نے گئے اس ہیت کذائی میں دیکھا تو اس کی ہنسی چھوٹ گئی لیکن اس نے آداب مہمان نوازی کا خیال کرتے ہوئے فوراً اپنی ہنسی کو دلفریب مسکراہٹ میں تبدیل کر دیا۔

"پدھاریے راجکمار جی۔" سندری نے تبسم کی بجلیاں گراتے ہوئے راجکمار کی پیشوائی کی۔ راجکمار نے جواب میں اپنے سفید سفید دانت نکال دیئے۔ سندری نے چاہا کہ راجکمار کے سہارے کے لئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دے لیکن ڈر گئی۔ ایسا نہ ہو کہ راجکمار اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے دے اور اس کے ہاتھ کے جوڑ چٹخنے لگیں۔ راجکمار کو کسی سہارے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس نے اپنے بھالے کو ہوا میں بلند کر کے کشتی سے خشکی کی طرف ایک زوردار چھلانگ لگائی۔ کشتی اس کے زور سے پیچھے ہٹی اور تجربے کار کشتی بان کی کوشش کے باوجود ایک چکر کاٹ کر الٹ گئی۔ کشتی بان پانی میں گر کر ڈبکیاں لگانے لگا۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا اور کشتی کو سیدھا کیا۔

راجکمار چھلانگ لگا کر کشتی سے تو بخیریت نکل آئے لیکن کشتی پیچھے ہٹنے کی وجہ سے کنارہ دور ہو گیا اور راجکمار خشکی پر پہنچنے کے بجائے کنارے سے ٹکرا کر قلابازی کھا گئے۔ سندری کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ راجکمار نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی اور فوراً کیچڑ سے نکل کر ساحل پر آ گئے۔ ان کے سیاہ چہرے پر گیلی مٹی کی تہہ جم گئی تھی جسے انھوں نے بڑی بے تکلفی سے اپنی آستینوں سے پونچھ ڈالا اور سیڑھیاں پھلانگتے باغ میں پہنچ گئے۔ سندری کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ راجکمار باغ کے ہر درخت، پودے اور روش کو وحشت ناک

نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جو پھول، پھل انھیں پسند آتا وہ ہاتھ بڑھا کر ڈال کے توڑ لیتے۔ پھول تو وہ کانوں پر لگ لیتے اور پھل کو بے ڈھنگے پن سے کھانے لگتے۔

سندری، راجکمار کو کسی نہ کسی طرح بارہ دری کے برآمدے تک لے گئی۔ راجکماری اوشا کا اِس بن مانس کو دیکھ کر جو حال ہوا ہوگا، اُس کے خیال ہی سے سندری کو اِس قدر ہنسی آ رہی تھی کہ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ برآمدے میں پہنچ کے وہ ایسی بدحواس ہوئی کہ راجکمار سے سوال کرنا ہی بھول گئی۔ وہ کبھی راجکمار کو دیکھتی اور کبھی کھلی کھڑکی کی طرف۔ کھڑکی کے پٹ، سرگم کے ..... تاروں کی طرح بار بار جھنجھنا اُٹھتے اور سندری کھلکھلا کر ہنس پڑتی پھر سندری کو ایک دم اپنا فرض یاد آ گیا۔ اس نے سنبھل کر سنجیدگی سے پوچھا۔

"راجکمار جی! آپ کو باغ کی کون سی چیز سب سے زیادہ پسند آئی؟"

چنچل راجکمار نے بڑی تیزی سے نظریں گھما کر باغ کو دیکھا پھر باغ کے سب سے اونچے درخت پر اُس کی نظریں جیسے اٹک کر رہ گئیں۔

سندری نے ذرا دیر جواب کا انتظار کیا جب راجکمار نے جواب نہ دیا تو اُس نے کہا۔ "راجکمار جی! آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

راجکمار نے بغیر سر گھمائے جواب دیا۔ "اس پیڑ کی طرف دیکھو جسے میں دیکھ رہا ہوں۔"

"پیڑ...!" سندری نے پہلے حیرت سے راجکمار کو دیکھا پھر اُس کی نظروں کا تعاقب کر کے باغ کے سب سے اونچے درخت تک اُس کی نظریں پہنچ گئیں۔

"ہاں، وہ اونچا پیڑ...!" راجکمار بڑے رُعب سے بولا۔ "سب سے اونچا۔ تاڑ جیسا سیدھا، بالکل میرے بھالے کی طرح۔" اور راجکمار نے جھٹ سے اپنا بھالا ہوا میں اُچھالا جو نیچے آکر زمین میں گڑ گیا۔

سندری سہم کے رہ گئی۔

سندری جانتی تھی کہ یہ چنچل راجکمار اِس قابل بھی نہیں کہ راجکماری اِس کی طرف نظر اُٹھا کے دیکھے۔ اُس نے فوراً اپنی جان چھڑائی اور چنچل کو کشتی میں سوار کر کے قلعے بھیج دیا۔

اِس کے بعد تھانیسر، متھرا، قنوج، مالوہ، اجمیر کے راجکمار آئے۔ وہ بھی سندری کے کان کھا کے رہے۔ کوئی بھی اِس قابل نہ تھا کہ راجکماری کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل کرتا۔ ہاں، اِن میں سے کچھ راجکماروں نے تفریح کا سامان ضرور مہیا کیا اور اُن کی بے تکی حرکتوں سے کنیزوں اور راجکماری کو خوب ہنسنے کا موقع ملا۔

سب سے آخر میں دہلی کا راجکمار سرون کمار آیا۔ سندری آتری سیڑھی پر کھڑی تھی۔ راجکمار کو دیکھ کر اُس پر ایک عجیب طرح کی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر راجکمار کے سہارے کے لئے وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتی تھی لیکن وہ خیالوں میں ایسی گم ہوئی کہ راجکمار کو سہارا دینا بھی یاد نہ رہا۔ راجکمار خود ہی کشتی سے اُتر کر خشکی پر آ گیا۔ سبز دھوتی اور سفید کُرتے میں ملبوس راجکمار کوئی آسمانی دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی کمر میں چمڑے کی پیٹی تھی جس میں ایک طرف خنجر دوسری جانب تلوار تھی۔ ترکش اور کمان کاندھے سے لٹکی تھی۔ سندری کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ کام دیو (محبت کا دیوتا) ہے اور ابھی کمان میں تیر چڑھا کر کسی کے دل کو زخمی کرے گا لیکن اُس کے تیر چلانے سے پہلے ہی سندری زخمی ہو گئی۔

سندری خیالوں کا سلسلہ توڑتی بھاگ کر راجکمار کے پاس پہنچی اور زیورات سے بھرا ہوا ہاتھ راجکمار کی طرف بڑھا دیا۔

راجکمار نے اُس کے ہاتھ پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ "یہ کیا ہے؟"

"میرا ہاتھ...!" سندری کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھنے میں آسانی ہوگی آپ کو۔"

راجکمار نے اُس کے ہاتھ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہوئے متانت سے بولا۔ "میں نہیں جانتا تم کون ہو لیکن؛ نادان ضرور ہو، مرد، جس عورت کا ہاتھ پکڑتے ہیں، موت کے دروازے تک اُس کا ساتھ دیتے ہیں۔"

سُندری دنگ رہ گئی۔ وہ راجکمار کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

راجکمار نے آدھی سیڑھیوں پہ رک کر کہا۔ "عورت میں اگر... خود اعتمادی ہو تو وہ مرد کے آگے بھی چل سکتی ہے۔"

سندری، راجکمار کی بات کا مطلب پوری طرح تو نہ سمجھ سکی لیکن اُس کا دل چاہا کہ وہ بولتا رہے۔ اُس کی آواز اور الفاظ میں بڑا رس تھا۔ جیسے بانسری کی مدھر تانیں، دل موہ لینے والی۔

اوپر پہنچ کر سُندری نے راجکمار کو چھیڑا۔ "آپ عورت کو کیا سمجھتے ہیں؟"

راجکمار نے اُسے غور سے دیکھا۔ "دیوی... عورت ہر روپ میں مقدس ہے۔"

"اگر وہ کنیز ہو تو آپ کیا کہیں گے؟" سندری نے کلیجہ تھام کے پوچھا۔

"کنیز ہو یا راجکماری۔" راجکمار نے اطمینان سے کہا۔ "گلاب کیچڑ میں کھلے یا چمن میں گلاب ہی کہلائے گا۔ عورت بہر صورت عظیم اور قابلِ احترام ہے۔"

سُندری کا دل چاہا کہ وہ چیخ کر کہے کہ اے راجکمار عظیم تُو ہے۔

قابلِ احترام تو ہے لیکن! وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ دونوں سیر کرتے آگے بڑھتے رہے۔ راجکمار سرون کمار ایک ایک پودے، پیڑ، شاخ، پھول کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دور چلتا پھر پلٹ کر روشوں اور پیڑوں کی قطاروں کو اس طرح دیکھتا جیسے وہ انھیں گن رہا ہو اور اپنی یادداشت میں محفوظ کر رہا ہو۔

حویلی کے برآمدے تک پہنچتے پہنچتے سندری اس قدر مرعوب ہو چکی تھی کہ راجکمار سے سوال کرتے وقت اس کی زبان لرز رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا۔ سندری نے گھبرائے گھبرائے سے لہجے میں پوچھا۔

"راجکمار جی! آپ نے ہمارے نزہت باغ کی سیر کی اور ہر چیز کو بغور دیکھا بھی ہے کیا آپ ایک جملے میں بتا سکیں گے کہ اس باغ کی کس چیز نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے؟"

سرون کمار نے سندری کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہاری دوسری نادانی ہے کنیز! حسن خواہ کسی متحرک پیکر کا ہو یا ہوا سے جھومتے ہوئے گل بوٹوں کا۔ اس کا تاثر ایک جملے میں نہیں بیان کیا جا سکتا پھر یہ باغ تو سراپا حسن ہے۔" پھر ذرا ٹھہر کے بولا۔ "میرا نام سرون کمار ہے تم اس وقت میری راہبر ہو۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو اپنا نام ہمیں بتا دو۔"

"سندری..." سندری کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

"سندری، سندرتا، حسن۔" راجکمار مسکرایا۔ "تعجب ہے کہ تم... سندرتا اور حسن کو الفاظ میں قید کرنا چاہتی ہو۔"

سندری پریشان ہو گئی۔ "راجکمار! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ آپ ایسا جواب دیجیے کہ میری سمجھ میں آ جائے۔"

"مجھے افسوس ہے سندری۔" راجکمار نے معذرت کی۔ "میں نے تو ایک حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ تمھیں مرعوب کرنے کی کوشش ہرگز نہیں کی۔ اب میں تمھارے سامنے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم میری باتوں کا مطلب سمجھ جاؤ گی۔ تمھارے گلے میں موتیوں کی مالا ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے موتی پروئے ہوئے ہیں۔ نیچے کی طرف سب سے بڑا موتی ہے پھر بتدریج اوپر کی طرف موتی چھوٹے ہوتے چلے گئے ہیں۔ اگر اس مالا کو توڑ کر اس طرح گوندھا جائے کہ بڑا موتی اوپر ہو اور چھوٹے نیچے کی طرف پروئے جائیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ موتی بھی وہی ہوں گے اور مالا بھی وہی لیکن! اس کا حسن ختم ہو جائے گا۔ یہی صورت اس باغ کے پودوں، کیاریوں اور روشوں کی ہے۔ میں جب غور کرتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس باغ کا مالی بڑا احساس اور حسن کا شیدائی ہے۔ باغ کی ہر روش میں پھولدار پودوں کو اس ترتیب سے لگایا گیا ہے کہ... قوسِ قزح کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ جب ہوا کے ہلکے خرام جھونکے... روشوں کا منہ چومتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دھنک نکل آئی ہے۔ مجھے باغ کے اس حسنِ ترتیب ہی نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔"

سرون کمار کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ روپا کمرے سے نکل کر... برآمدے میں آ گئی۔ اس نے راجکمار کو ہاتھ جوڑ کر سلام کیا پھر کہا۔ "راجکمار جی! حویلی کے اندر چلیے۔"

سرون کمار نے ایک نظر روپا پر ڈالی۔ روپا بھی سندری کی طرح بنی ٹھنی تھی پھر کچھ سوچ کے کہا۔

"مجھے نزہت باغ کی سیر کی دعوت دی گئی تھی۔ ایسی پرفضا جگہ کو چھوڑ کے بند کمرے میں بیٹھنا۔ ان فضاؤں اور ہواؤں کی توہین ہے۔"

روپا بھی بڑی شوخ تھی۔ فوراً بولی۔ "راجکمار جی! اب تک آپ نے باغ دیکھا لیکن یہ نزہت باغ ہے اور نزہت آپ کو حویلی کے اندر ہی دکھائی دے گی۔ آئیے پدھاریے۔" اور وہ مٹک مٹک کے آگے چلنے لگی۔

راجکمار کو کسی کی دل آزاری منظور نہ تھی۔ وہ روپا کے پیچھے چلنے لگا۔ سندری بھی اس کے ساتھ ہو گئی۔ راجکمار نے کمرے میں قدم رکھا۔ نظر سامنے پڑی تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ آنکھوں میں چکاچوند ہوئی۔ خون کی بالیدگی میں ایک دم تیزی آ گئی۔ اور سرور کی لہریں رگ و پے میں دوڑ گئیں۔ راجکماری لیلاوتی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ بجلیاں گرا رہی تھی۔ وہ اس وقت مہادیو کے مندر کی مورتی لگ رہی تھی، جیسے کسی دیوتا نے بڑی نفاست سے سنگِ مرمر سے تراش کر اس کا پیکر ڈھالا ہو۔ لیلاوتی سر سے پیر تک گنگا جمنی کامدار کپڑوں میں ملبوس اور جواہرات کے زیورات میں غرق تھی لیکن! اصل چمک دمک تو اس کے شہابی رخساروں اور مہتاب رنگ پیشانی کی تھی۔ آنکھوں میں تڑپتی بجلیوں کی تھی۔ سہاتی برتی، پھول برساتی مسکراہٹ میں تھی۔

راجکمار تو مبہوت تھا ہی لیکن اس کی وجاہت کی آب و تاب نے لیلاوتی پر بھی مدہوشی سی طاری کر دی تھی۔ سلام کو اٹھنے والے اس کے دونوں ہاتھ درمیان ہی میں رک کر رہ گئے تھے۔ سندری اور روپا، دونوں کی محویت کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ جب دو نظروں کا یہ ٹکراؤ یا ملاپ کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گیا تو روپا نے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ راجکمار اور راجکماری ایک ساتھ چونک پڑے۔ راجکماری کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ جڑ گئے۔ اس نے تعظیماً... جھکاتے ہوئے کہا۔ "نمسکار راجکمار...!"

کا فرض سونپا گیا ...

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ راجکمار کو بھی کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اُس حُسن کو جواب دینا بے ادبی سمجھا۔ اُس کی نظریں اب تک لیلاوتی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

حویلی کے اِس کمرے میں صرف چند چھوٹی چھوٹی چوکیاں رکھی تھیں جن کے پائے چاندی کے تھے اور اُن پر سونے کے تاروں سے کام کیا ہوا تھا۔ چوکیوں پر گدے اور گدوں کے اوپر ایرانی غالیچے بچھے تھے۔ یہ کمرہ زیادہ آراستہ تو نہ تھا مگر بڑے سلیقے سے سجا ہوا تھا۔

لیلاوتی نے بھاری پلکوں کو جنبش دی۔ وہ دیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "راجکمار! اِس طرح نہ دیکھئے کہ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگے۔"

راجکمار نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اُس چوکی کی طرف بڑھا جس طرف راجکماری نے اشارہ کیا تھا۔ چوکی پر بیٹھنے سے پہلے اُس نے پلٹ کر ایک بار پھر راجکماری کو دیکھا اور کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اِس وقت میں لاہور کی راجکماری لیلاوتی کے حضور میں ہوں۔"

"راجکمار کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔" نحیف مسکراہٹ اور برق پاش نظروں کی بارش ہونے لگی۔

"نظریں یقیناً دھوکہ کھا سکتی ہیں۔" سرون کمار نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن دل کی دھڑکنیں کبھی دھوکہ نہیں دیتیں۔ اگر آپ راجکماری نہیں ہیں تو کوئی اور پیکر آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"راجکمار سرون کمار کا اندازہ ٹھیک ہے۔" راجکماری سامنے بیٹھ گئی۔ "لیلاوتی میرا نام ہے۔"

راجکمار کے لبوں پر ہلکا سا تبسم آیا۔ پہلا فاتحانہ تبسم۔

"آپ پہلے اور شاید آخری راجکمار ہیں ..." راجکماری نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ "آپ سے ملنے کی، میرا مطلب ہے آپ سے گفتگو کرنے کی میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے آپ کو اندر بلوا لیا۔"

سرون کمار نے سندری اور سعیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا بھی شکرگزار ہوں اور ان دونوں باسلیقہ لڑکیوں کا بھی جن کے توسط سے میں آپ تک پہنچا۔"

ذہین و زیرک راجکماری نے اشارے سے دونوں کنیزوں کو باہر بھیج دیا۔

"دہلی سے لاہور تک آنے میں آپ کو بڑی تکلیف اُٹھانا پڑی ہوگی۔" راجکماری نے گفتگو کے لئے بہانہ تلاش کیا۔

"جی نہیں راجکماری لیلاوتی۔" سرون کمار نے سنبھل کر جواب دیا۔ "جذبہ کی شدت ہر فاصلے کو گل بدامان کر دیتی ہے۔ جس وقت میں باغ کی سیر کر رہا تھا تو معاً میرے ذہن میں خیال آیا کہ لاہور کے راجہ اور رانی یقیناً بڑے نفیس طبیعت کے مالک ہیں کیونکہ باغ کا مالی اپنی انفرادی کوشش سے یہ نفاست اور سلیقگی نہیں پیدا کر سکتا۔ اُس وقت مجھے آپ سے بھی ملنے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی تھی۔"

راجکماری سرون کمار کی باتوں میں کھو سی گئی۔ اُس کا دِل چاہا کہ سرون کمار بولتا رہے اور اُس کے کانوں میں سرون کمار کے الفاظ رس گھولتے رہیں۔ پھر سعیا آئی۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں طلائی تھالیاں تھیں۔ ایک میں خشک میوہ دوسری میں نمکین دالیں وغیرہ۔

باتیں ہوتی رہیں۔ میوہ کھایا جاتا رہا۔ ڈھلتی رات فضا میں کیف گھولنے لگی۔ روح کی بے چینیاں بڑھ گئیں۔

لیلاوتی نے سرون کمار کو حویلی میں اِس لئے بلایا تھا کہ اُس کے دِل میں جھانک کر اصل راجکمار کو تلاش کرے لیکن تنہائی کے سرور اور قربت کے کیف نے گیان دھیان سے منہ موڑ لیا۔ راجکماری چوکی سے اُتر کر راجکمار کے قدموں میں آبیٹھی۔ شوخ طبیعت سعیا واپس جاتے ہوئے سوائے ایک شمع کے اور تمام شمعیں گل کر گئی تھی۔ ممکن تھا کہ یہ آخری شمع بھی جھلملا کے اندھیرے کے پردے میں رُخ چھپا لیتی کہ عقل مند سندری تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اندر تے ہوئے دھارے رُک گئے۔ مچلتا شباب انگڑائی نہ لے سکا۔ سندری کی تیز نظروں نے متوالوں کو چونکا دیا۔ لیلاوتی نے مخمور نظروں سے سرون کمار کو دیکھا پھر نظریں جیسے آپ ہی آپ جھک گئیں....

سرون کمار اپنی جگہ شرمندہ تھا۔ وہ راجکماری سے معذرت کرنا.. چاہتا تھا لیکن سندری نے اُسے گفتگو کا موقع نہ دیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی باہر لے آئی۔ سرون کمار کو کنیز کی یہ حرکت ناگوار تو گزری لیکن وہ احتجاج نہ کر سکا۔

رات کا پچھلا پہر ہو رہا تھا۔ سندری، راجکمار کو لئے ہوئے دریا کے کنارے پہنچ گئی۔ اُس نے ذرا سختی سے کہا۔ "راجکمار جی! پریم کا یہ مطلب تو نہیں کہ اُس میں ڈوب کے دُنیا کو بُھلا دیا جائے۔ اگر میں دخل نہ دیتی تو شاید...."

"میں تمہارا شکرگزار ہوں سندری۔" راجکمار کا سر شرمندگی سے نہ اُٹھ رہا تھا۔

"راجکمار! یہ خیال رہے کہ اب راجکماری کی عزت آپ کے ہاتھ ہے۔" سندری نے گھاٹ کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے کہا۔

"اطمینان رکھو سندری۔" راجکمار نے بڑے عزم سے جواب دیا۔ "اگر لیلاوتی نے مجھے سوئمبر میں قبول کر لیا تو میں زندگی بھر اُس کی پوجا

کروں گا۔"

سندری نے راجکمار کو پار اُتارنے کا پہلے ہی انتظام کر رکھا تھا۔ راجکمار کشتی پر سوار ہونے لگا تو سندری نے سرگوشی کی: "راجکماری نے آپ پر بھروسہ کیا۔ آپ کو اتنے قریب بلایا۔ آپ اُسے دھوکہ دینے یا بدنام کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ آپ یہاں سے زندہ واپس نہ جا سکیں۔"

"راجپوت کی زبان کا اعتبار کرو سندری۔" راجکمار کو سندری کی یہ بات بُری معلوم ہوئی لیکن اُس نے دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ یہ سندری کے کمال خلوص کا نتیجہ ہے۔

راجکمار قلعہ میں واپس پہنچا تو ستارۂ سحری چمک رہا تھا۔

●

دن چڑھنے کے ساتھ بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ مطلع صبح ہی سے ابر آلود تھا اور بارش کا امکان پیدا ہو گیا۔ سوئمبر کا پنڈال قلعہ کے بڑے میدان میں لگایا گیا تھا۔ بادلوں کو دیکھ کے سب ہی پریشان ہو گئے۔ راجہ بھارت اور رانی کلدیپ مندر کے اندر مہادیو کے بُت کے سامنے سر جھکائے بادل صاف ہو جانے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ لاہور کے سیناپتی نے موسم کے مزاج بگڑتے دیکھ کر قلعہ کے ایک بڑے ہال میں متبادل پنڈال بنوا دیا تاکہ بارش ہونے کی صورت میں سوئمبر کا لطف کم نہ ہونے پائے۔

لاہور کے راجکمار کو سندری کے انتظام کے تحت اِس طرح قلعہ میں بھیجا گیا تھا کہ کسی کو بھی اُس کے واپس آنے یا راوی پار سیاغ میں ... پُرکیف اور عشرت انگیز لمحات گزارنے کی خبر نہ ہو سکی۔ راجکمار کے جانے کے بعد راجکماری لیلاوتی بھی اپنی کنیزوں کے ساتھ قلعہ میں آ گئی تھی۔ بناؤ سنگھار کرنے والی عورتوں نے صبح ہوتے ہی اُسے گھیر لیا۔ راجکماری کے غسل کے لئے پانی میں کئی طرح کی خوشبوئیں ملائی گئیں۔ پہلے بیسن اور ابٹن سے اُس کے جسم کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا گیا پھر نہلایا دُھلایا گیا۔ سوئمبر کے لئے لیلاوتی نے خود اپنی مرضی سے ست رنگی ساڑھی پسند کی تھی۔ اُسی طرح کی رنگ دار چست چولی بھی تھی۔

"... تک راجکماری کا سنگھار ہوتا رہا" پنڈال میں تمام راجکمار ... سج دھج سے آ کر جمع تھے۔ ہر ایک نے اپنے بہترین علاقائی لباس پہنے تھے۔ پنڈال کے بیچ میں آگ روشن تھی ... ایک موٹے پنڈت کے گرد بیٹھے تھے۔ یہ موٹا پنڈت ... لاہور کا سب سے بڑا پنڈت تھا۔ راجہ بھارت اور رانی کلدیپ ... پیر چھونے کو اپنی عزت افزائی سمجھتے تھے۔ تمام پنڈتوں کے اوپری دھڑ ننگے تھے۔ صرف کمر تک دھوتیاں بندھی تھیں۔ اُن کی گردن اور کمر کے گرد جنیؤ (زنار) اس طرح پڑے تھے جیسے عورتیں ساڑھی کا پلّو اپنے شانے پر ڈالتی ہیں۔

راجکماری کی آمد کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ سب کی نظریں پنڈال کے اُس حصے پر لگی تھیں جہاں موتیوں سے ... ایک پردہ پڑا تھا۔ راجکماری کو اسی پردے سے نمودار ہونا تھا۔ راجہ اور رانی کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ راجکمار بے چین ہونے کے باوجود ... رہے تھے۔ پنڈال میں ریاستی حکام اور معززین شہر کے علاوہ کسی اور کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ ہر طرف مسرت کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ اور پنڈال کے باہر بانسری اور شہنائی کی دھیمی دھیمی تانیں بکھر رہی تھیں۔ سب ہی خوش تھے سوائے ریاست لاہور کے سیناپتی کے۔ سیناپتی صرف وزیر ہی نہ تھا، وہ ریاستی فوج کا سپہ سالار بھی تھا۔ وہ پنڈال کے صدر دروازے پر کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ پھیکا پھیکا سا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی کرب کو سینے میں دبائے زبردستی وہاں کھڑا ہے۔ وہ بار بار گھوم کے باہر کی طرف دیکھتا جیسے اُسے کسی کا انتظار ہو۔

راجہ بھارت نے سیناپتی کو کئی بار اپنے پاس بلایا۔ سیناپتی کی نشست راجہ کے برابر تھی۔ راجہ کے ہر بلاوے پر سیناپتی کام کا بہانہ کر دیتا اور اپنی جگہ سے ایک قدم آگے پیچھے نہ ہوتا۔ کچھ دیر بعد راجکماری لیلاوتی چودھویں کا چاند بن کر پنڈال میں داخل ہوئی۔ روپا اور سندری اُس سے آگے آگے تھیں۔ روپا موتیوں کا پردہ اُٹھا کر... راجکماری کو اندر لائی۔ سندری راجکماری کے اوپر موتی اور جواہر نچھاور کر رہی تھی۔ راجکماری سر جھکاتے ہوئے سیدھی بڑے پنڈت کے پاس پہنچی۔ پہلے اُس کے پھر دوسرے پنڈتوں کے پیر چھوئے۔ سب نے اُسے دعائیں اور آشیرباد دی۔ پھر راجکماری راجہ اور رانی کے پاس پہنچی۔ اُن کے پیر چھو کر دعائیں پائیں۔ اُسی وقت روپا سونے کی تھال لے کر راجکماری کے پاس پہنچ گئی۔ تھال میں موتیوں کے تازہ پھولوں کا گجرا رکھا تھا۔

راجکماری نے پہلی بار نظریں اُٹھا کر ... پھر راجکماروں کو دیکھا۔ ہر راجکمار اپنی جگہ تن کر بیٹھ گیا لیکن راجکماری کی برق پاش نظروں کی کوئی تاب نہ لا سکا۔ ہر راجکمار کے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی۔ راجکماری پر کسی کی نظر نہ پڑتی تھی۔ وہ تو اِس وقت دیوی بنی ہوئی تھی۔ آسمانی دیوی۔ سب کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ راجکماری لیلاوتی نہیں بلکہ ایک ایسی مورتی تھی جسے آسمانی دیوتاؤں نے خود اپنے ہاتھوں سے تراش کر اُس میں جان ڈال دی ہے۔

پنڈال میں پہلا قدم رکھتے وقت راجکماری کے پیروں میں

زندگی میں پہلی مرتبہ اتنے بہت سے نامحرموں کے سامنے آئی تھی۔ جھجک اور شرم فطری چیز تھی لیکن جب بڑے پنڈت نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے راجکماروں کے سامنے جانے کا حکم دیا تو وہ اُس وقت تک خود پر پوری طرح قابو پا چکی تھی۔ وہ بڑی استقامت اور حوصلے کے ساتھ اپنے اُمیدواروں کی طرف بڑھی۔ راجکمار دائیں بائیں دو قطاروں میں بیٹھے تھے۔ راجکماری نے پہلے دائیں جانب کے راجکماروں کی طرف رُخ کیا۔ اب اُس کی آنکھوں میں شرم کی جگہ شوخی تھی اور لبوں پر ہلکا ہلکا تبسم۔ گجرے کی تھالی لئے رو پا اُس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ سُندری ان دونوں کے پیچھے تھی۔ سُندری کے پاس جو تھالی تھی اُس میں سونے کا ایک ٹھوس لٹو سا تھا جس میں ایک زنجیر پیوست تھی۔ شاید یہ کنگنے کا بدل تھا۔ سندری کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ جب راجکماری کسی راجکمار کے گلے میں گجرا ڈال دے تو سندری فوراً آگے بڑھ کر زنجیر والا سونے کا کنگنا اُس راجکمار کی دائیں کلائی میں باندھ دے۔

راجکماری شوخ نظروں سے ایک ایک راجکمار کو دیکھتی، ایک لمحے کے لئے اُس کے سامنے رُک کر اُس کے دل کی دھڑکن تیز کرتی آگے بڑھتی رہی۔ دائیں جانب کی قطار ختم ہو گئی تو وہ بائیں جانب ہو گئی۔ اُس نے بائیں طرف چلنا شروع کیا تھا کہ پنڈال کے دروازے سے جہاں ریاست کا سیناپتی کھڑا تھا، ایک آدمی گھبرایا ہُوا داخل ہُوا۔ اُس نے آہستہ سے جلدی جلدی سیناپتی سے کچھ کہا۔ سیناپتی جو پہلے ہی گھبرایا ہُوا تھا وہ اور گھبرا گیا۔

سیناپتی نے اُس آدمی کو کچھ ہدایات دے کر باہر بھیج دیا پھر جلدی سے بڑے پنڈت کے پاس پہنچا اور جُھک کر اُس کے کان میں کچھ کہا۔ پتہ نہیں سیناپتی نے اُس سے کیا کہا کہ اُس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھوٹی سی کتاب اُس کی گرفت سے نکل کر فرش پر گر گئی۔ سیناپتی اُس کے پاس سے ہٹ کر سیدھا راجہ بھارت کے پاس پہنچا۔ راجہ رانی سے بھی اُس نے دھیرے دھیرے کچھ باتیں کیں پھر تیزی سے پنڈال کے باہر آیا۔

پنڈال کے باہر ایک سپاہی اُس کا گھوڑا لئے موجود تھا۔ سیناپتی ادھیڑ عمر کا تھا لیکن اُس کے اعضاء مضبوط اور پھرتیلے تھے۔ وہ جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہُوا اور دیکھتے ہی دیکھتے قلعہ کے باہر نکل گیا۔ سوئمبر کا بڑا پنڈت بہت گھبرایا ہُوا تھا۔ وہ بار بار راجہ بھارت کی طرف دیکھتا۔ راجہ بھارت اور رانی کلدیپ خود بھی بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔

اور پنڈت سے مشورہ لیا۔ وہ بدحواس ہو کر کھڑا ہو گیا اور چیخ کر راجکماری سے کہا: "راجکماری جی! جلدی کیجئے۔ سوئمبر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔"

راجکماری کو پنڈت کا یہ حکم بڑا بُرا معلوم ہُوا۔ وہ اب دوسری بار اپنے شیدائیوں کے سامنے سے اٹھلاتی اور لہراتی گزر رہی تھی۔ اُس نے اپنا جیون ساتھی تو نہ جانے کب کا دل ہی میں پسند کر لیا تھا۔ وہ چاہتی تو پہلے ہی چکر میں دہلی کے راجکمار سورن کمار کے گلے میں گجرا ڈال سکتی تھی لیکن یہ اُس کی زندگی کے حسین ترین لمحات تھے۔ وہ ان لمحات سے زیادہ سے زیادہ لطف اُٹھانا چاہتی تھی لیکن اُسے بڑے پنڈت کے حکم کی بھی تو تعمیل کرنا تھی حالانکہ اُسے پہلے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ سوئمبر کا وقت بھی مقرر ہوتا ہے۔

راجکماری نے اپنے قدموں میں تیزی پیدا کی اور کئی راجکماروں کے سامنے سے گزرتی ہوئی سورن کمار کے قریب پہنچی۔ رو پا تھالی لئے ساتھ تھی۔ راجکماری نے جلدی سے مہکتا ہُوا گجرا تھالی سے اُٹھا کر راجکمار کے گلے میں ڈال دیا۔

بڑا پنڈت جلدی سے اُٹھ کے راجکماری کے پاس گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے راجکماری کا ہاتھ اور دوسرے سے راجکمار کو پکڑا اور انہیں گھسیٹتا ہُوا، روشن الاؤ کے پاس لے آیا۔ سوئمبر کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ راجکماری نے دہلی کے راجکمار کے گلے میں گجرا ڈال کر اُسے اپنا جیون ساتھی تسلیم کر لیا تھا۔ دوسرے اُمیدوار راجکماروں کے چہرے اُتر گئے لیکن وہ ایک ایک کر کے راجہ بھارت کے پاس گئے اور اُسے مبارک بادی۔ راجہ گھبرایا گھبرایا سا تھا اور خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ رانی کلدیپ اُس سے بھی زیادہ پریشان معلوم ہوتی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور پیر کانپ رہے تھے۔

تمام حاضرین اور راجکماروں نے راجہ رانی کی یہ حالت دیکھی لیکن یہ سوچ کر اپنے دلوں کو مطمئن کر لیا کہ ہر لڑکی کے والدین کو رخصتی کے وقت ایسے ہی غم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اُدھر بڑا پنڈت بغیر راجہ سے اجازت حاصل کئے اپنے کام میں مصروف تھا۔ راجکمار اور راجکماری اُس کے پاس بیٹھے تھے اور وہ خشک میوہ، صندل اور مختلف دالیں پر اشلوک پڑھ پڑھ کر انہیں آگ میں پھینک رہا تھا۔ یہ ہندو دھرم کے نکاح کا طریقہ تھا۔ اِس سے فارغ ہو کر پنڈت نے راجکماری کا پلّو... راجکمار کے کُرتے کے ساتھ باندھ دیا اور انہیں ایک چھوٹے پنڈال میں چکر لگانے کا حکم دیا۔ اِس رسم کو پھیرے کہا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد جب تک دُلہا دُلہن پورے پھیرے نہ لگا لیں اُس وقت تک شادی پکی نہیں ہوتی۔ پنڈت بڑی بے چینی سے انہیں پھیرے

لگا تے رہے تھے اور باجا بجانے والے بھی باجا بجا رہے تھے۔ بے جاں لے ساتھ ہوں تب لوگوں کے قریب جا کر جلدی جلدی پھیرے ڈالنے کی ہدایت کرتا مگر راجکمار اور راجکماری شرم و حیا کی وجہ سے آہستہ آہستہ گھوم رہے تھے۔

پھیرے ختم ہوتے ہی پنڈت نے شادی کی تکمیل کا اعلان کیا اور پھرتی سے اپنا سامان سمیٹ کر جانے کے لئے تیار ہو گیا حالانکہ ایسے موقع پر انھیں منہ مانگا انعام و اکرام دیا جاتا ہے۔ پنڈت وہاں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہرا اور لوگوں کی آنکھ بچا کر باہر نکل گیا۔ چھوٹے پنڈت انعام کی لالچ میں وہیں بیٹھے رہے۔ شادی کی رسم ختم ہو گئی تھی۔ راجکمار اور راجکماری۔ بزرگ حاضرین اور دوسرے راجکماروں سے آشیرواد اور مبارک باد وصول کر رہے تھے۔

ٹھیک اُس وقت راجہ بھارت کی تھرتھراتی آواز اُن کے کانوں میں گونجی۔ سب لوگ چونک کر اُدھر دیکھنے لگے۔

راجہ ایک جھٹکے سے کہہ رہا تھا۔ "ریاست لاہور کے وفادار دوستو! تمہیں یہ سُن کر افسوس ہوگا کہ مہاراجہ جے پال کے لڑکے آنند پال نے لاہور پر حملہ کر دیا ہے۔ ہماری بہادر فوجیں بزدل حملہ آور کا بے جگری سے مقابلہ کر رہی ہیں۔ آپ خاموشی سے اپنے اپنے گھروں کو جائیے اور ہماری فتح کے لئے دُعا کیجئے۔ میں اپنے مہمان راجکماروں سے شرمندہ ہوں اور اُن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ فوراً لاہور سے چلے جائیں۔ یہ ہماری اور آنند پال کی جنگ ہے۔ انھیں اس میں حصہ لینے کی ضرورت نہیں۔"

راجہ بھارت کی مختصر تقریر ختم ہونے سے پہلے ہی پورا پنڈال خالی ہو چکا تھا۔ صرف مہمان راجکمار ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ لباس، زبان اور چہرے مہرے میں ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن اِس وقت اُن میں ایک قدر مشترک پیدا ہو گئی تھی۔ یہ قدر مشترک تھی خوف و ہراس کی۔ سب اپنی جگہ ڈرے ڈرے . . . اور سہمے سہمے تھے پھر بندیل کھنڈ کے چندل راجکمار کو جیسے طیش آ گیا۔ ایک چھوٹا نیزہ اِس وقت بھی اُس کے پاس تھا۔ اس نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور اعلان کر دیا کہ جب تک یہ نیزہ اِس جگہ گڑا رہے گا وہ راجہ بھارت کی طرف سے جنگ کرتا رہے گا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے راجکمار بھی لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ راجہ بھارت نے بڑی مشکل اور کوشش کر کے اُنھیں واپس جانے پر آمادہ کیا۔

راجکماری لیلاوتی کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ گم صم کھڑی تھی۔ راجکمار اُسے تسلیاں دے رہا تھا۔ "لیلاوتی ہوش میں آؤ۔ جنگ تو بہادر کی اصل زندگی ہے۔ اگر ہم بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے تو دوسرے جنم میں کسی اچھی صورت میں پیدا ہوں گے۔"

ہندو دھرم آواگون کا قائل ہے۔ اِس مذہب کے مطابق مرنے والا فوراً دوسرا جنم لے لیتا ہے۔ اگر اُس کے اعمال اچھے ہوئے تو اُسے اچھی شکل ملتی ہے ورنہ کتا، بلی یا کسی اور حقیر جانور کا روپ اُسے ملتا ہے۔

راجکمار نے دیکھا کہ راجکماری بالکل بُت بن گئی ہے تو اُسے فکر ہوئی۔ اُس نے راجکماری کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھنجوڑا، پھر راجکماری جیسے خواب سے چونکی اور راجکمار کی باہوں میں جھول گئی۔ راجکمار کے ہاتھوں میں آتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔ راجہ بھارت اور رانی کلدیپ بے بسی سے اُنھیں دیکھ رہے تھے۔ اُن کے کلیجے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ اُن کی بیٹی کو بیاہے ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ اُن پر یہ مصیبت آ پڑی۔ اِس وقت افراتفری کا یہ عالم تھا کہ سوائے چند وفادار کنیزوں کے اور سب راجہ کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ پنڈال میں اُن کے پاس مدپا اور سندری کے علاوہ اور کوئی بھی نہ تھا۔ راجکمار دونوں کنیزوں کی مدد سے راجکماری کو اُٹھا کر اُس کی خواب گاہ میں لے گیا۔ مدپا نے اُس کے مُنہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے تب جا کے کہیں راجکماری کو ہوش آیا۔

کچھ دیر پہلے قلعہ میں کیسی چہل پہل تھی۔ ہر طرف بھاگ دوڑ تھی۔ چہرے شاداں و فرحاں، مسکراہٹیں اور قہقہے بکھرے ہوئے تھے لیکن اب وہاں قبرستان جیسا سناٹا طاری تھا۔ لوگ کونے کھدروں میں دبکے ہوئے پرارتھنا کر رہے تھے۔ قلعہ کی حفاظتی فوج فصیل پر مورچے سنبھال کے بیٹھ گئی تھی۔ راجہ کا جنگی ہاتھی تیار کر کے اُس کی محل سرا کے سامنے پہنچا دیا گیا تھا۔ راجہ، رانی اور راجکماری نے بہت کوشش کی کہ راج کمار سردن کمار واپس دہلی چلا جائے لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ لیلاوتی کو جیتے جی چھوڑنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا۔

شمالی بھارت کا طاقتور راجہ جے پال عرصہ سے لاہور پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی بہانے کی تلاش میں تھا اور چاہتا تھا کہ لاہور پر بے خبری کے عالم میں حملہ کیا جائے تاکہ لاہور کے راجہ کو کسی طرف سے مدد نہ مل سکے۔ اِس کے لئے اُس نے پہلے بھیرہ کے راجہ بجی رائے کو اپنے اعتماد میں لیا اور طے یہ ہوا کہ لاہور پر قبضے کے بعد اِس ریاست کو آدھا آدھا بانٹ لیا جائے۔ بجی رائے دولتمند ہونے کے باوجود بڑا لالچی تھا وہ فوراً راضی ہو گیا۔ راجہ جے پال نے اپنے لڑکے آنند پال کو سوار فوج اور ہاتھیوں کے ساتھ بجی رائے کے پاس بھیج دیا اور ظاہر یہ کیا کہ آنند پال لاہور کے سوئمبر میں شرکت کرنے جا رہا ہے۔

آنند پال نے بھیرہ پہنچ کے بجی رائے سے مشورہ کیا کہ اگر وہ تھی

ساتھ رکھے گئے تو بات کھل جانے کا خطرہ ہے۔ بس اُس نے ہاتھیوں کی کمی کو اپنے سواروں سے پورا کر دیا۔ آنندپال نے بظاہر جنگ کا رُخ کیا لیکن رات ہوتے ہی اُس نے اپنا گھوڑا لاہور کی طرف موڑ دیا اور صبح ہونے سے پہلے پہلے لاہور کی سرحدوں میں پہنچ گیا۔

لاہور کا جہاندیدہ سیناپتی اگرچہ دھوکہ کھا گیا تھا لیکن احتیاط کے طور پر اُس نے چند جاسوس آنندپال کے پیچھے لگا رکھے تھے۔ آنندپال نے جیسے ہی لاہور کا رُخ کیا۔ سیناپتی کے جاسوس اُسی وقت یہ خبر لے کر لاہور چل پڑے اور آنندپال کے لاہور پہنچنے سے تین گھنٹے پہلے اُنھوں نے سیناپتی کو اِس صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

ریاست لاہور کے پاس باقاعدہ فوج صرف پانچ ہزار تھی۔ رات ہونے کی وجہ سے سیناپتی مزید فوج کا انتظام نہ کر سکتا تھا پھر وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اِس حملے کی خبر قلعہ والوں کو ہو اور راجکماری لیلاوتی کا صبح کو ہونے والا سوئمبر کھٹائی میں پڑ جائے۔ اُس نے صرف پانچ سو سوار قلعہ میں رکھے اور باقی فوج کو فوراً آنندپال کے مقابلے پر بھیج دیا۔ سیناپتی خود سپہ سالار بھی تھا لیکن اُس نے اس وقت محاذ پر جانا مناسب نہ خیال کیا وہ ہر صورت سے راجکماری کے سوئمبر کی رسم کو پورا کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے نائب کو تاکید کی کہ آنندپال کو اُس وقت تک قلعہ سے دُور رکھے جب تک راجکماری کا سوئمبر نہیں ہو جاتا۔ سیناپتی کے بہادر اور وفادار نائب نے اپنے سپہ سالار کے حکم پر پُورا پُورا عمل کیا۔ اُس نے اپنی مختصر فوج کو کئی ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور اُنھیں حکم دیا کہ چاروں طرف پھیل کر آنندپال پر حملہ کرے تاکہ اُس کی رفتار سُست پڑ جائے۔

نائب سالار کی اِس حکمتِ عملی سے آنندپال کی طوفانی رفتار لشکر میں سُستی پیدا ہو گئی۔ وہ جب قدم آگے بڑھاتا لاہوری فوج کی ہزار، پانچ سو کی ٹکڑی اچانک کسی طرف سے نمودار ہوتی اور آنندپال کے لشکر کو اُلجھا کر اُسے رُکنے پر مجبور کر دیتی۔ آنندپال نے بہت کوشش کی وہ صبح ہونے سے پہلے ہی دریائے راوی عبور کر کے قلعہ پر قابض ہو جائے لیکن وہ اِس میں کامیاب نہ ہو سکا اُس کے بعض فوجی دستوں نے کئی جگہ سے راوی کو عبور کر لیا لیکن وہ خود دوپہر سے پہلے دریا کے کنارے تک پہنچ سکا۔

راجکماری لیلاوتی کے سوئمبر کی آخری رسمات کے دوران...

سیناپتی کو جو اُس وقت تک پنڈال میں موجود تھا یہ اطلاع دی گئی کہ آنندپال اپنے لشکر کے ساتھ دریا پار، نزہت باغ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اُس وقت سیناپتی نے پنڈال کے بڑے پنڈت اور راجہ بھارت کو اِس کی اطلاع دی اور درخواست کی کہ سوئمبر کی رسم جلد نمٹانے کے بعد وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کریں۔ اِس اطلاع کے بعد وہ خود بھی دریا پار کر کے اپنے نائب سے جا ملا۔

راجہ بھارت سر جُھکائے ہوئے باہر آیا۔ اُس کا جنگی ہاتھی اُسے لے جانے کے لئے تیار تھا۔ راجہ ہاتھی پر سوار ہونے کے بجائے فصیل کے اُوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھا۔ رانی کلدیپ، لیلاوتی، راجکمار اور دو کنیزوں کے علاوہ اُس کے ساتھ اور کوئی نہ تھا۔ راجہ نے فصیل پر چڑھ کے دریا پار نظر دوڑائی۔ نزہت گاہ کے اُس طرف گرد و غبار کے بادل سے اُٹھتے دکھائی دے رہے تھے جو اِس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ جنگ اگرچہ زوروں پر ہے لیکن لاہور اور اُس کے باسی آنندپال کی زد میں ہیں اور اُنھیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ راجہ تھکا تھکا سا نیچے اُترا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

عجیب سناٹا تھا اُس وقت راجہ کے اِس آراستہ پیراستہ کمرے میں۔ سب کے سب دم بخود بیٹھے تھے۔ کسی میں بولنے کا یارا نہ تھا۔ آخر رانی کلدیپ نے خاموشی کا طلسم توڑا۔ اس نے کہا۔ "مہاراج! کوئی فیصلہ کیجئے۔ مجھے قلعہ میں مُنہ چُھپا کر بیٹھنا کسی طرح پسند نہیں۔" رانی نے پُورے حوصلے کا اظہار کیا۔

راجہ نے غمگین نظروں سے کلدیپ کو دیکھا۔ "کلدیپ! میں یہ الفاظ تمھاری زبان سے سُننا چاہتا تھا۔ مجھے کب چُھپ کے بیٹھنا پسند ہے، میرا ہاتھی تیار ہے۔ میں یُدھ کے لئے جا رہا ہوں لیکن تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گی۔"

رانی کلدیپ عجیب طرح سے مُسکرائی۔ پتہ نہیں یہ مُسکراہٹ تھی یا بے بسی اور بے کسی کا شائبہ جو اُس کے لبوں پر آ گیا تھا۔ "راجہ! ساری دھرتی کی خوشیاں تو تمھارے سنگ بتیں رہی۔ اب اِس سنکٹ میں تمھیں اکیلا چھوڑ دوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے کلدیپ۔" راجہ بھارت نے بھرپور پیار سے رانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اِس وقت ایک ہستی یہاں بھی موجود ہے جس کی جان راجہ بھارت سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور اُس ہستی کی جان تم اور صرف تم بچا سکتی ہو۔"

رانی کلدیپ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولی۔ "راجہ جی! دُنیا میں ماں کے بعد عورت کے لئے سب سے بڑا رشتہ، دھرم پتی کا ہوتا ہے۔ شوہر تو بھگوان ہوتا ہے مہاراج! میں اپنے بھگوان کو کیسے چھوڑ دوں۔"

راجہ بھارت نے پہلو بدلا اور ذرا سختی سے بولا۔ "کلدیپ! وقت بہت کم ہے، بحث مت کرو۔ اگر تم مجھے بھگوان سمجھتی ہو تو اِس بھگوان کا حکم ہے کہ تم اِن سب لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر فوراً ملتان روانہ ہو جاؤ۔


صابن تیرا صابن میرا صابن 313
بدر 313 ڈی لکس
313 بدر
کپڑے دھونے کا بہترین صابن جو ہر صابن سے زیادہ کپڑے دھوتا ہے
313 بدر 313 ٹرانسپیرنٹ
تربیت یافتہ ماہرین کی زیرنگرانی اعلیٰ کے جدید ترین پلانٹ پر تیار شدہ
کپڑے دھونے کے لئے صرف 313 صابن ہی استعمال کریں
313 الحجاز لمیٹڈ
ہیڈ آفس: ۱۴- ڈیوس روڈ۔ لاہور، فون: ۳۰۴۳۱۳-۳۰۹۹۴۴
ORIENT

ملتان کا حاکم ابو فتح داؤد ایک مسلمان ہے تمہیں کسی ہندو ریاست میں پناہ نہ مل سکے گی۔ صرف سومنی ہی سے نیکی کی امید کی جا سکتی ہے۔"

رانی کلدیپ لاجواب ہو گئی۔ اب تو اُسے بھگوان نے حکم دیا۔۔ بھگوان سے وہ کیسے بحث کرتی۔ رانی نے لیلاوتی کی طرف دیکھا۔ اُس نے ایک سسکی لے کر سر جھکا لیا۔ رانی اپنی جگہ سے اُٹھ کر راجکمار سروپ کمار کے پاس گئی۔

"راجکمار، میں غم سے بہت شرمندہ ہوں۔" کلدیپ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا: "میرے بھگوان کا حکم ہے کہ میں تم لوگوں کو ساتھ لے کر ملتان چلی جاؤں۔ تم میرے ساتھ ہو گے تو مجھے بڑا سہارا رہے گا۔"

راجکمار نے ایک نظر لیلاوتی پر ڈالی پھر بڑے استقلال سے بولا: "راج ماتا! آپ کے بھگوان نے آپ کو جو حکم دیا ہے آپ اُس پر عمل کیجئے لیکن میں تو اُس حکم پر عمل کروں گا جو میرا بھگوان مجھے دے رہا ہے۔"

راجہ بھارت سنہ نے چونک کر راجکمار کو دیکھا: "تمہارا بھگوان کیا حکم دے رہا ہے راجکمار بیٹے! ہمیں بتاؤ۔ ہم تمہارے بھگوان کا حکم بھی سن لیں گے۔"

راجکمار نے راجہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور تلوار پر ہاتھ رکھ کر بولا: "مہاراج! میرا بھگوان مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اے سروپ کمار اگر تو ملتان چلا گیا تو تاریخ تجھے بزدل کہے گی۔ تاریخ سمجھے گی کہ دلی کا راجکمار اپنی نئی دلہن کی خاطر میدان جنگ سے منہ چھپا کر بھاگ گیا۔ میں ملتان ہرگز نہیں جاؤں گا اور لاہور میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔"

"لیکن راجکمار۔۔" راجہ بھارت نے کچھ کہنا چاہا کہ راجکمار نے اُس کی بات کاٹ دی۔

"مہاراج۔۔!" راجکمار کی آواز میں شیر جیسی گرج تھی: "مہاراج! پرماتما کی قسم میں آپ کا ہر حکم مانوں گا سوائے اِس کے کہ آپ مجھے ملتان جانے کا حکم دیں۔ مجھے حالات کا پورا پورا اندازہ ہے لیکن جو زندگی آپ مجھے بخشنا چاہتے ہیں اُس پر میں موت کو ترجیح دیتا ہوں۔"

کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ رانی نے محسوس کیا کہ یہ خاموشی وقت کا زیاں ہے۔ اُس نے راجکمار سے کہا: "راجکمار بیٹے! ہم تم پر جس قدر فخر کریں وہ کم ہے۔ ٹھیک ہے ہم تمہیں ملتان بھیجنے پر مجبور نہیں کرتے۔ اُس کے بجائے میں تمہیں ایک اہم کام سپرد کرتی ہوں۔ یہ کام تمہاری لاہور میں موجودگی سے بھی زیادہ اہم ہے۔ بولو، راجکمار، تم میرا کام کرو گے؟"

"کیوں نہیں راج ماتا۔" راجکمار رانی کلدیپ کے قدموں میں بیٹھ گیا: "آپ کے حکم کی تعمیل میں اگر میری جان قربان ہو جائے تو یہ میرے لئے ایک بڑا اعزاز ہو گا۔"

رانی کلدیپ نے راجکمار کو زمین سے اُٹھا کر گلے لگایا پھر اپنے ہاتھ سے ایک جڑاؤ کنگن اُتارا۔ کنگن اُس نے راجکمار کی طرف بڑھایا اور بھرائی آواز میں کہا: "راجکمار! ہم شکست کھا چکے ہیں۔ لاہور کی ریاست آنند پال کے قبضے میں چلی جائے گی لیکن ہماری شکست عارضی ہے۔ ایک نہ ایک دن اِس پر پھر ہمارا قبضہ ہو گا۔ تمہیں اِس وقت یہ بات عجیب سی معلوم ہو گی لیکن یہ میرا دھرم ہے۔ میرا ایمان ہے یہ کنگن ایک دن لاہور کو آنند پال کے قبضے سے نکال کر پھر ہمارے خاندان کے حوالے کرے گا۔"

راجہ بھارت اور راجکماری لیلاوتی دُکھ اور حیرت سے رانی کلدیپ کی باتیں سُن رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے رانی کا دل اِس قدر بھر آیا کہ وہ سسکیاں بھر کے رونے لگی۔ جب ذرا دل ٹھہرا تو اُس نے کہا: "راجکمار بیٹے! تم میرا کنگن لے کر سیدھے غزنی روانہ ہو جاؤ۔ غزنی کا حاکم اِس وقت سبکتگین کا بیٹا محمود غزنوی ہے۔ اب سے سولہ سترہ سال پہلے میں اور راجہ بھارت سبکتگین سے ملے تھے۔ اُس وقت میں نے سبکتگین کے ہاتھ میں راکھی باندھ کر اُسے اپنا بھائی بنایا تھا۔ سبکتگین نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میری بہن جب بھی مجھے بلائے گی میں اُس کی مدد کو غزنی سے لاہور ضرور آؤں گا۔"

"لیکن سبکتگین تو اب مر چکا ہے رانی!" راجہ بھارت نے رانی کو لرزتی آواز میں یاد دلایا۔

رانی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "مہاراج! شاید آپ کو یاد نہیں۔ سبکتگین نے یہ بھی کہا تھا۔ اُس کا یہ وعدہ سلطنت غزنی کا وعدہ ہے۔ اگر وہ مر جائے تو اِس وعدے کی پابندی اُس کا بیٹا کرے گا یا جو بھی غزنی کے تخت پر بیٹھے گا۔ یہ وعدہ اُس کا ایمان ہو گا۔ سبکتگین مسلمان تھا۔ اُس کا بیٹا محمود بھی مسلمان ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ جب محمود کو اُس کے باپ کا وعدہ یاد دلایا جائے گا تو ضرور ہماری مدد کرے گا۔ مسلمان وعدہ خلافی کبھی نہیں کرتے اور دوسری قوم کے لوگوں سے کئے ہوئے وعدے کو تو وہ جان دے کر بھی پورا کرتے ہیں۔"

"ایشور کرے ایسا ہی ہو۔" راجہ بھارت ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

اُن کی جدائی کا منظر بڑا دردناک تھا۔ وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے الگ ہو رہے تھے۔ راجہ بھارت یُدھ کے لئے جا رہا تھا۔ جہاں اُس کا مارا جانا یا گرفتار ہونا لازمی تھا۔ رانی کلدیپ اور راجکماری لیلاوتی، ملتان کے لئے روانہ ہو رہی تھی۔ ایک امید موہوم کو سینے سے لگائے اُن دنوں لاہور سے ملتان کوسوں دُور تھا۔ ایک تو ان دو عورتوں کا وہاں تک پہنچنا ہی مشکل تھا اور اگر پہنچ بھی گئیں تو۔۔۔

انھیں پتہ نہ تھا کہ ملتان کا حاکم ابو فتح داؤد ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے۔ دہلی کا راجکمار سرون کمار جس کی ابھی تھوڑی دیر پہلے شادی ہوئی تھی وہ ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تو دوسرے راجکماروں کی طرح بھاگ کر جان بچا سکتا تھا لیکن وہ . . . تنوار خاندان کا اعلیٰ نسب راجکمار تھا۔ اس کی محبت نے گوارہ نہ کیا کہ مصیبت کے وقت اپنی بیوی اور سسرالی عزیزوں کو چھوڑ جائے۔ راجکمار کو نئی نویلی دھرم پتنی بیلاوتی سے بھی جدا ہونا پڑ رہا تھا۔ بظاہر وہ رسمی بندھن میں بندھ گئے تھے اور ان کی ملاقات نہ ہوئی تھی لیکن راجکماری کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کا کیف راجکمار کو مخمور کئے ہوئے تھا اور وہ اس کی قیمت اپنی جان دے کر ادا کرنا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے راجہ بھارت ہاتھی پر سوار ہو کے قلعے سے نکلا۔ فیلبان کے علاوہ صرف پانچ سواروں نے اس کے ساتھ دریائے راوی عبور کیا۔ دریا میں ان دنوں پانی کم تھا۔ ہاتھی اور... گھوڑے آسانی سے دریا پار کر گئے پھر راجکمار نے رانی کلدیپ اور راجکماری کو نمناک آنکھوں سے رخصت کیا۔ راجکماری فرطِ جذبات سے راجکمار سے لپٹ گئی۔ راجکمار نے بھی اسے اپنی محبت بھری باہوں میں سمیٹ لیا۔ دونوں کی آنکھیں نمناک تھیں۔ دیکھنے والوں کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ روپا اور سندری نے وفاداری اور نمک حلالی کا پورا پورا ثبوت دیا اور وہ راجکماری کے ساتھ ہی ملتان کی طرف چل پڑیں۔

راجکمار انھیں دور تک جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب جانے والوں کے گھوڑے گرد کی اوٹ میں چھپ گئے تو وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اس نے آخری نظر لاہور کے قلعے پر ڈالی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ راجکمار جلد سے جلد لاہور سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ آنند پال کی فوجوں نے کئی جگہ سے دریا کو عبور کر لیا تھا اور اس کے دستے دریا کے کنارے کنارے قلعے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

راجکمار سرون کمار غزنی کے راستوں سے بے خبر تھا۔ اسے رانی کلدیپ اور راجہ بھارت نے بتایا تھا کہ اگر وہ کسی طرح جالیہ یا کھیوڑی پہنچ جائے تو پھر ماری انڈس اور عیسیٰ خیل کے راستے وہ غزنی پہنچ سکتا ہے۔ اس راستے میں بے شمار جنگل، پہاڑ، دریا حائل تھے لیکن غزنی کا قریب ترین یہی راستہ تھا۔ راجکمار نے کنگن سنبھال کے اندر کی جیب میں رکھ لیا تھا اور اپنے کپڑے اتار کے معمولی کپڑے پہن لئے تھے۔ تاکہ راستے میں پہچانا نہ جائے۔ اس نے ٹھگوں اور چوروں سے بچنے کے لئے اپنے ساتھ کوئی قیمتی سامان بھی نہیں لیا۔

● راجکمار راستے سے ناواقف، قدم قدم پہ نئی زبان، نئے رسم و رواج۔ کبھی پہاڑ راستے میں حائل کبھی ریگستان کی جھلسا دینے والی دھوپ اور لو۔ راجکمار اگر غزنی کا راستہ پوچھتا تو پکڑا جاتا۔ وہ بھٹکتا رہا اور کئی بار پکڑا گیا۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ جب رہائی ملتی تو پھر ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھتا۔ کئی ماہ تک راجکمار راہ میں بھٹکتا رہا۔ کبھی شمال میں جاتا تو کبھی جنوب میں۔ اس طرح ٹھوکریں کھاتے کھاتے عیسیٰ خیل پہنچ گیا۔

عیسیٰ خیل میں محمود غزنوی کی ایک چھوٹی سی چھاؤنی تھی۔ مسلمانوں کے علاقے میں پہنچ کے راجکمار کو بے حد خوشی ہوئی۔ اب اس کی منزل قریب تھی۔ چھاؤنی کے محافظ کو جب اس نے بتایا کہ وہ محمود غزنوی کے پاس راجہ بھارت کا ایک ضروری پیغام لے کر آیا ہے تو محافظ نے اسے غزنی بھیجنے کا انتظام کیا لیکن راجکمار کی بدقسمتی نے یہاں بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ دو دن چھاؤنی میں آرام کرنے کے بعد جب راجکمار غزنی جانے کے لئے تیار ہوا تو غزنی سے ایک قاصد نے آکر اطلاع دی کہ امیر محمود غزنوی ایک لشکرِ جرار کے ساتھ براستہ کابل، پشاور تشریف لے گئے ہیں۔ راجکمار کا دل بیٹھنے لگا۔ اب غزنی جانا بیکار تھا۔ ظاہر تھا کہ امیر کسی جنگ پر گئے ہیں اور واپسی سال چھ مہینے سے پہلے کسی طرح ممکن تھی۔

راجکمار کو اس خبر سے صدمہ تو بہت ہوا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور چھاؤنی کے محافظ سے پشاور کا راستہ پوچھ کر چل پڑا۔ کئی ماہ کے سفر کے بعد جب وہ پشاور پہنچا تو معلوم ہوا کہ امیر محمود غزنی واپس جا چکے ہیں۔ راجکمار بھی غزنی کی طرف روانہ ہوا۔ غزنی پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ امیر بھیرہ پر حملہ کرنے کے لئے جا چکے ہیں۔ دوسرا کوئی ہوتا تو کب کا چھوڑ بیٹھتا لیکن راجکمار نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ اب وہ غزنی پہنچ گیا تھا۔ غزنی اس کی منزل تھی۔ وہ غزنی میں مقیم ہو کر امیر کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

اس دوران میں شمالی مغربی ہندوستان کا نقشہ بڑی حد تک بدل گیا تھا۔ اس علاقے کے . . سب سے طاقتور راجہ آنند پال نے امیر محمود غزنوی کے ہاتھوں پیہم شکستیں کھا کے خود اپنا خاتمہ کر لیا تھا۔ بھیرہ کے راجہ بجاٹیہ کا بھی یہی انجام ہوا۔ بجاٹیہ کے تمام علاقوں... پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور اس کی گورنری نواسہ خان کو دی گئی۔ نواسہ خان کا اصل نام سکھ پال تھا اور یہ راجہ آنند پال کا نواسہ تھا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

بھیرہ کی فتح کے بعد جب امیر محمود غزنوی غزنی واپس آیا تو راجکمار کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ امیر کو بتا دیا گیا تھا کہ یہ جوان کئی سال تک راہ کی تکالیف برداشت کر کے یہاں تک پہنچا ہے

اور یہ سفر اُس نے صرف امیر سے ملاقات کے لئے کیا ہے۔

امیر اُس سے کمال شفقت سے پیش آیا۔ اُس نے کہا۔ "اے جوان ہمیں معلوم ہُوا ہے تم نے غزنی تک پہنچنے کے لئے بہت تکلیف اُٹھائی ہے۔ اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔ ہم تمہاری ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے؟"

"اے غزنی کے راجہ۔" راجکمار نے نظریں نیچی کر کے کہا "میں ریاست لاہور کی راجدھانی سے آیا ہوں۔ جس وقت میں لاہور سے چلا تھا وہاں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔"

"ذرا ٹھہرو..." امیر محمود نے اُسے روکا "پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

"میں سرون کمار ہوں" راجکمار نے امیر سے نظریں ملاتے ہوئے کہا "میں لاہور کے راجہ..."

"تم راجہ بھارت کے بیٹے ہو؟" امیر محمود بیچ میں بول پڑا اور اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ امیر محمود کے درباریوں نے محمود کو حیرت سے دیکھا۔ راجکمار کو تعجب ہوا کہ امیر اُٹھ کے کیوں کھڑا ہو گیا ہے۔

راجکمار نے نظریں نیچی کر لیں، بولا "افسوس کہ لاہور کے راجہ کے کوئی بیٹا نہیں۔ اُس کی صرف ایک بیٹی ہے۔ راجکماری لیلاوتی۔ میں اُس کا شوہر ہوں، اے امیر محترم۔"

امیر محمود اپنی جگہ سے بڑھ کر راجکمار کے پاس آیا اور اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا "سرون کمار، بیٹے اور داماد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ تم راجہ بھارت کے داماد ہو تو رشتے میں میرے بھائی ہوئے۔"

راجکمار کا دل اِس زور سے دھڑکا جیسے سینے سے نکل جائے گا "آپ راجہ بھارت کو جانتے ہیں، امیر؟" راجکمار نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں سرون کمار۔" امیر نے مسکرا کے جواب دیا اور اُسے اپنی مسند پر لا کے اپنے برابر بٹھایا۔

"ہم راجہ بھارت کو بھی جانتے ہیں اور رانی کلدیپ کو بھی۔ خلد آشیانی ابا حضور اُن کا ذکر اکثر ہم بھائیوں سے کیا کرتے تھے۔ ہمارے لئے حکم تھا کہ اگر رانی کلدیپ کو کسی وقت ہماری مدد کی ضرورت پڑے تو ہم فوراً اُن کے پاس پہنچ جائیں۔"

"تو پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ رانی کلدیپ نے آپ کے والد امیر سبکتگین کے ہاتھ میں راکھی باندھی تھی؟" راجکمار نے حوصلہ کر کے دریافت کیا۔

"ہاں سرون کمار۔" امیر خوشدلی سے بولے "ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی ہندو عورت کسی مرد کے ہاتھ میں راکھی باندھ دے تو وہ اُس کا بھائی بن جاتا ہے۔ اُن دونوں میں ایک قسم کا خون کا رشتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اب تم بتاؤ ہمارے پھپھا اور پھپھو کا کیا حال ہے اور اُنھوں نے تمھیں ہمارے پاس کیوں بھیجا ہے؟"

راجکمار نے غمگین لہجے میں کہا "امیر محترم میں نے کہا تھا کہ جس وقت میں لاہور سے چلا ہوں، لاہور کو راجہ آنند پال کی فوجیں گھیرے ہوئے تھیں۔ لڑائی قلعہ تک پہنچ چکی تھی۔"

"کیوں حملہ کیا تھا آنند پال نے لاہور پر؟" امیر محمود نے بے چینی سے پوچھا۔

"وجہ تو کوئی بھی نہ تھی امیر۔" راجکمار نے سنبھل کے کہا "راجہ بھارت نے مجھے بتایا تھا کہ راجہ جے پال کو اُس سے محض اِس وجہ سے عداوت تھی کہ اُس نے کسی وقت آپ کے والد امیر سبکتگین سے ملاقات کی تھی۔"

"بدذات جے پال۔" امیر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

راجکمار نے مختصر طور پر لاہور پر آنند پال کے عین سوئمبر کے وقت بزدلانہ حملے کا حال سُنایا اور بتایا کہ کن حالات میں اُسے اور رانی کلدیپ کو لاہور چھوڑنا پڑا۔ جب اُس نے یہ بتایا کہ رانی کلدیپ اور راجکماری لیلاوتی پناہ حاصل کرنے حاکم ملتان کے پاس گئی ہیں تو امیر محمود بھڑک اُٹھا۔

امیر محمود نے بڑے ناگوار لہجے میں کہا "یہ کیا غضب کیا تم نے سرون کمار۔ تم نے اُنھیں ملتان کیوں جانے دیا؟"

"امیر محترم! ملتان کا حاکم آپ کا مسلمان بھائی ہے۔" سرون کمار کو امیر کا یوں چیں بجبیں ہونا سمجھ میں نہ آیا۔ "امیر محترم... ہمیں اپنے ہندو راجاؤں سے وفا کی اُمید نہ تھی۔ تمام راجہ، راجہ جے پال سے ڈرتے تھے۔ ایک مسلمان حاکم ہی سے ہمیں کچھ اُمید ہو سکتی تھی۔"

"وہ مسلمان نہیں ہے سرون کمار..." امیر محمود اتنی زور سے چیخا کہ پورا دربار دہل کے رہ گیا "وہ... وہ مشرک ہے، کافر ہے۔ وہ اسلام کے نام پر ایک دھبہ ہے۔ اُس نے ہمارے خلاف جے پال کی مدد کی تھی۔ بھیرہ کی جنگ میں بھی اُس نے اپنے فوجی دستے بھیجے تھے۔"

امیر نے اُسی وقت لشکر کو تیار ہونے کا حکم دے دیا۔ امیر کا غصہ جب ٹھنڈا ہُوا تو اُس نے کہا "سرون کمار، تم حاکم ملتان کو نہیں جانتے۔ حاکم ملتان، ابو فتح داؤد، مسلمان نہیں قرامطہ ہے مسلمانوں کا دشمن۔ ہمیں خطرہ ہے کہ اُس نے رانی اور راجکماری کو آرام کے بجائے تکلیف دی ہو گی اور اگر رانی نے غلطی سے کہیں ہمارا ذکر کیا ہو گا تو اُس کا اُلٹا اثر ہوا ہو گا۔ بہرحال تم اطمینان رکھو۔ ہم جلد ہی ملتان پہنچ کر اُن دونوں کو آزاد کرائیں گے۔"

امیر نے ایک قاصد نواسہ خان کے پاس بھی روانہ کیا کہ وہ.. راجہ بھارت کے بارے میں معلومات حاصل کر کے جلد از جلد دربار غزنی کو مطلع کرے۔ نواسہ خان نے جلد ہی محمود غزنوی کو مطلع کیا کہ لاہور پر آنند پال نے بھیرہ کے راجہ بجی رائے کی مدد سے حملہ کیا تھا۔ لاہور کی فوج نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا تھا لیکن راجہ بھارت اس جنگ میں مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اطلاع دی کہ رانی کلدیپ اور راجکماری لیلاوتی جو بھاگ کر ملتان چلی گئی تھیں وہ اس وقت بھی ملتان کے قلعے میں قید ہیں۔ ابو الفتح داؤد نے ان کی مدد کرنے کی بجائے انھیں قید میں ڈال دیا ہے۔ امیر محمود غزنوی پہلے ہی ابو الفتح کے خلاف تھا اب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک بھرپور حملہ کر کے ملتان کے قرامطی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے تاکہ اسلام کے خلاف اس فتنے کا سدباب ہو سکے۔

●

تاریخ اسلام میں یوں تو خلافت عباسیہ کا دور تقریباً سوا پانچ سو سال پر محیط ہے لیکن اس میں شروع کے صرف سو سال ایسے ہیں جسے عباسیوں کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ اس زریں دور کا آخری خلیفہ متوکل بن معتصم تھا۔ اس خلیفہ کے بعد دور عباسی زوال پذیر ہونا شروع ہوا اور پھر کوئی ایسا خلیفہ نہ ہو سکا جو اپنے اجداد کا ہم پلہ ہوتا۔

عباسیوں کے پندرھویں خلیفہ معتمد کے زمانے میں دنیائے اسلام میں ایک ایسا فتنہ پیدا ہوا جس نے اسلام کو بڑا زبردست نقصان پہنچایا۔ اس فتنے کو تاریخ میں "قرامطہ" کہا جاتا ہے۔ اس فرقے کا بانی ایک چھوٹے قد کا آدمی تھا جس کی ٹانگیں ٹیڑھی تھیں اور آنکھیں سرخ۔ اسی وجہ سے لوگ اسے قرمط یا قرامطہ کہتے تھے۔ بظاہر یہ بڑا عابد و زاہد، بزرگ صورت سادہ لباس اور پرہیزگار دکھائی دیتا تھا۔ اسی لئے اس سے متاثر ہوئے اور اس کے قریب ہی آ گئے اور کوفہ میں یہ فتنہ پھولنے پھلنے لگا۔

قرامطہ نے نہ صرف اذان میں ترمیم کر دی بلکہ خانہ کعبہ کے بجائے بیت المقدس کو قبلہ قرار دے دیا۔ اس نے صرف چار رکعت نماز مقرر کی۔ دو رکعت فجر اور دو رکعت مغرب۔ باقی فرض اور سنتیں اپنے پیروؤں کو معاف کر دیں۔ اس بے دین نے کلام اللہ میں بھی ترمیم کی۔ جمعہ کے بجائے دو شنبہ (پیر) کو افضل دن قرار دیا۔ ہفتے میں دو چھٹیاں ضروری تھیں اور سال بھر میں صرف دو روزے فرض کئے۔ شراب کو جائز قرار دیا اور نہانے دھونے حتیٰ کہ غسل جنابت کو بھی غیر ضروری قرار دیا صرف وضو کو طہارت کا درجہ حاصل تھا۔ اس نے فریضہ حج بھی بیت المقدس میں ادا کرنے کا حکم دیا۔

جب اس فتنے نے زور پکڑا تو عباسی خلیفہ نے حاکم کوفہ کو اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ عباسی خلافت زوال پذیر تھی۔ خود عباسی خلیفہ شراب و شباب کے رسیا ہو گئے تھے ان کے حکام کیسے اچھے رہ سکتے تھے۔ حاکم کوفہ بھی ایک شرابی آدمی تھا۔ اس نے قرامطہ کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا اور قید خانے کی چابی تکیے کے نیچے رکھ دی۔ سونے سے پہلے اس نے خوب شراب پی اور بدمست ہو کر پڑ گیا۔ حاکم کوفہ کی کنیز قرامطی فرقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے تکیے کے نیچے سے چابی نکالی قید خانے کا تالا کھول کر قرامطہ کو بھگا دیا اور پھر چابی اسی طرح لا کر سرہانے رکھ دی۔

صبح کو جب قرامطہ کے فرار ہونے کی خبر لوگوں میں پھیلی تو انھیں یقین ہو گیا کہ قرامطہ اپنے کشف و کرامت سے نکل گیا ہے۔ اس کا اور چرچا ہوا اور ضعیف الاعتقاد لوگ اس کے شیدائی ہو گئے۔ حکومت کے باغی، چور، اچکے اور تمام شرابی کبابی لوگوں کی اس فرقے نے پشت پناہی کی اور اس نے اس قدر طاقت پکڑی کہ امرا، وزرا اور خلیفہ تک کو اس کے مقابلے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

امیر محمود غزنوی بادجود اپنی بعض کمزوریوں کے بڑا مذہب پرست اور دیندار آدمی تھا۔ جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ ملتان پر ایک قرامطہ کا قبضہ ہے۔ اس وقت سے وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ ایک مذہبی اجتماع میں (جس میں امیر محمود بھی شریک تھا) ایک مولانا نے تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ فرقہ قرامطہ مسلمان ہرگز نہیں کیونکہ بحرین کے قرامطی حاکم... ابو طاہر نے سنہ ۳۱۷ھ میں مکہ معظمہ پر حملہ کر کے بیس ہزار حاجیوں کو قتل کیا۔ غلاف کعبہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ خانہ کعبہ کا دروازہ توڑ دیا اور گرز مار کر سنگ اسود کو اکھاڑ کر اپنے ساتھ بحرین لے گیا۔ ابو طاہر مسلسل سولہ سال تک مسلمانوں اور خصوصاً حاجیوں کو لوٹتا رہا اور دنیائے اسلام اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی تھی جب سنہ ۳۳۹ھ میں ابو طاہر واصل جہنم ہوا تو مصر کے اخشیدی یا فاطمی حاکم نے حجر اسود کو قرامطیوں سے واپس لے کر خانہ کعبہ میں نصب کیا۔

مولانا کی اس تقریر نے محمود غزنوی کے تن بدن میں آگ لگا دی اور وہ دوسری صبح کو ملتان کی طرف چل پڑا۔ امیر محمود، سنگ اسود کی بے حرمتی کا حال سن کر اس قدر بے چین ہوا کہ اس نے خراب موسم کی بھی پرواہ نہ کی حالانکہ یہ بارش کا زمانہ تھا اور ندی نالے پانی سے بھرے ہوئے تھے اور دریاؤں میں سیلابی کیفیت تھی۔ سردار ما کو اس سفر کی اتنی خوشی ہوئی کہ وہ اپنی پچھلی تمام تکلیفیں بھول گیا۔ اسے

یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ رانی کلدیپ اور راجکماری لیلاوتی ملتان پہنچ گئی ہیں اِس خبر نے اُس کے مُردہ تن میں جان ڈال دی تھی۔

اُس وقت تک جے پال مر چکا تھا اور اُس کا بیٹا آنند پال اُس کی جگہ راجہ تھا۔ یہی آنند پال جس نے لاہور پر حملہ کر کے سروان کمار کو غزنی آنے پر مجبور کیا تھا۔ سروان کمار کو اب آنند پال کی زیادہ فکر نہ تھی وہ تو جلد از جلد ملتان پہنچ کر رانی لیلاوتی سے ملنا چاہتا تھا محمود غزنوی نے ملتان پر حملے کے لئے آنند پال کے علاقے سے گزرنے کا فیصلہ کیا۔ آنند پال نے محمود غزنوی کے آنے کی خبر سُنی تو فوجیں لے کر اُس کا راستہ روکنے بڑھا۔ آنند پال دراصل برسات کے موسم سے فائدہ اُٹھا کر امیر محمود کے لشکر کو تباہ کرنا چاہتا تھا لیکن امیر کا برق رفتار لشکر آنند پال کے ہراول کو شکست دے کر دریائے کابل پار کر گیا۔ یہاں صوابی کے مغرب میں آنند پال کا لشکر موجود تھا۔ امیر محمود نے اُسے زبردست شکست دی اور وہ دریائے سندھ عبور کر کے جہلم کی طرف بھاگ گیا۔ امیر محمود نے اُس کا پیچھا سوہدرہ (وزیر آباد) تک کیا لیکن آنند پال ہاتھ نہ آیا اور کشمیر کی طرف نکل گیا۔ امیر کو ملتان پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لئے اُس نے آنند پال کا تعاقب ملتوی کر دیا۔ سوہدرہ سے روانگی کے وقت امیر محمود نے اپنے لشکر کے دو حصے کئے۔ ایک حصے کو پھالیہ اور بھیرہ کے راستے ملتان روانہ کیا اور خود باقی فوج لے کر پنڈی بھٹیاں اور چنیوٹ ہوتا ہُوا ملتان روانہ ہُوا۔ دراصل اُس نے ملتان کو دو طرف سے گھیرنے کا ارادہ کیا تھا تاکہ ابو فتح داؤد بچ کر نہ نکل سکے۔

حاکم ملتان ابو فتح داؤد بڑی عیش و عشرت سے حکومت کر رہا تھا۔ اُس نے ایسے تمام عالموں کو جو قرامطہ کے مخالف تھے اپنی ریاست سے نکال باہر کیا تھا یا اُنھیں قید میں ڈال رکھا تھا۔ ہندو راجاؤں سے اس کے گہرے مراسم تھے اور دراصل وہ اُن ہی کے اوپر ملتان میں ایک بے دین حکومت قائم کئے ہوئے تھا۔ اُس کے حرم میں بے شمار حسین عورتیں تھیں اور رات دن ناچ گانے کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ حسن بن صباح کی طرح ابو فتح داؤد نے بھی ملتان میں ایک "جنت ارضی" بنائی تھی جس میں خوبصورت عورتیں اپنے حسن و شباب سے آنے والوں کا استقبال کرتیں۔ یہ تمام حوریں کہلاتی تھیں اور انھیں حکم تھا کہ وہ جنت میں آنے والوں کی ہر خواہش کی بلاچوں و چرا تکمیل کریں۔ ملتان کی اِس جنت میں قرامطہ فرقے میں شامل ہونے والوں کو صرف ایک بار جانے کی اجازت تھی۔ اُن کو شربت میں بے ہوشی کی دوا شامل کر کے بے خود کر دیا جاتا تھا۔ اِس بے خودی کے عالم میں اُنھیں جنت میں بھیج دیا جاتا۔ اُنھیں اپنے حواس پر قابو نہ ہوتا۔ اس لئے وہ اِس جنت کی ہر چیز کو حقیقی سمجھنے لگتے اور جب واپس آتے تو لوگوں میں اِس کی خوب تشہیر کرتے۔ قرامطہ اِس طرح سے اپنے فرقے میں اضافہ کرتے تھے۔ اِس فرقے میں داخل ہونے والے کو ابو فتح داؤد کے ہاتھ پر موت کی بیعت کرنا پڑتی تھی اور اُسے جو حکم دیا جاتا تھا وہ اُسے بجا لانا پڑتا تھا۔

مہارانی کلدیپ اور راجکماری لیلاوتی بہت ٹھوکریں کھانے کے بعد ملتان پہنچی تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ حاکم ملتان مسلمان ہے اور اگر اُن کی مدد نہ کرے گا تو کم از کم اُنھیں پناہ تو دے گا۔ ملتان پہنچ کر مہارانی اور راجکماری نے داؤد سے ملاقات کی اور اپنی تباہی کی داستان رو رو کے بیان کی۔ راجکماری کے حُسن کو دیکھ کر داؤد کے مُنہ میں پہلے ہی پانی بھر آیا تھا لیکن جب مہارانی نے اُسے یہ بتایا کہ اُس نے اپنے داماد کو امیر محمود کے پاس مدد کے لئے بھیجا ہے تو داؤد کا دماغ بالکل ہی اُلٹ گیا۔ اُس نے مہارانی کلدیپ کو اُسی وقت قید میں ڈال دیا اور راجکماری کو حوروں میں داخل کر کے جنت میں بھجوا دیا۔

جنت میں خوبصورت لڑکیوں کو لانے کے لئے ابو فتح داؤد نے ایک باقاعدہ محکمہ قائم رکھا تھا۔ اِس محکمے کے آدمی گاؤں گاؤں چکر لگاتے اور جہاں کوئی خوبصورت لڑکی دکھائی دیتی اُسے قیمت دے کر خرید لیتے اگر اُس کے والدین راضی نہ ہوتے تو پھر وہ اُسے اغوا کر کے جنت میں پہنچا دیتے۔ جنت میں داخل ہونے کے بعد ہر لڑکی جنت میں آنے والوں کے ہاتھوں داغدار ہو جاتی۔ وہاں سے بھاگنے یا بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔۔۔۔ لیلاوتی کا بھی اِس جنت میں پہنچ کے وہی حال ہوتا جو دوسری لڑکیوں کا ہُوا تھا لیکن وہ اپنی ماں کلدیپ کی جُدائی برداشت نہ کر سکی اور جنت میں پہنچتے ہی ایسی سخت بیمار ہوئی کہ جینے کے لالے پڑ گئے۔ چونکہ جنت میں کسی بیمار کو رہنے کی اجازت نہ تھی اِس لئے لیلاوتی کو مجبوراً جنت سے نکال کر اُس کی ماں کلدیپ کے پاس قید میں بھیج دیا گیا۔ اس طرح اُس کی جان بھی بچ گئی اور عزت بھی۔

ابو فتح داؤد بڑا شاطر انسان تھا۔ اُس نے بھیرہ کے راجہ بجی رائے بھاٹیہ کی امیر محمود غزنوی کے خلاف مدد کی تھی۔ اُسی وقت سے اُسے خطرہ تھا کہ امیر محمود کسی نہ کسی وقت اُس پر حملہ ضرور کرے گا۔ وہ در پردہ زبردست تیاریاں کرتا رہا۔ اُس نے اپنے جاسوس سندھ، پنجاب اور سرحد میں پھیلا رکھے تھے تاکہ اُسے محمود کے حملے کی خبر ملتی رہے۔ امیر محمود جب غزنی سے نکل کر آنند پال کے مقابلے پر آیا تو ابو فتح کو فوراً خبر مل گئی۔ آنند پال کی شکست سے وہ خوفزدہ ہو گیا تھا لیکن اُس کے لشکر کے ہر سپاہی نے اُس کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی تھی۔ اُسے اُن کی جان نثاری اور بہادری کا بڑا زعم تھا۔

امیر محمود جانتا تھا کہ ابو فتح داؤد بہت چالاک ہے۔ اِس لئے اُس نے دھوکہ دینے کے لئے سوہدرہ سے اپنے نصف لشکر

کے ساتھ پہلے پیش قدمی کی۔ اس نے نصف لشکر کو حکم دیا کہ وہ دو روز بعد دوسرے راستے سے ملتان کی طرف روانہ ہو۔ ابو فتح داؤد کے جاسوس امیر محمود کی اس چال کو نہ سمجھ سکے۔ انھیں یہ گمان ہوا کہ بقیہ لشکر بھی اسی راستے سے چلے گئے۔ یہی خبر انھوں نے ابو فتح داؤد کو پہنچائی۔ ابو داؤد نے اپنا پورا لشکر چنیوٹ اور جھنگ کے راستے پر اکٹھا کر دیا کیونکہ محمود اسی راستے سے آ رہا تھا۔

امیر محمود جب ملتان کے قریب پہنچا تو ابو فتح داؤد بڑی شان سے اس کے مقابلے پر آیا۔ امیر محمود شام کے وقت ملتان کے نواح میں پہنچا تھا۔ دشمن کیل کانٹے سے لیس اس کے مقابلے پر موجود تھا۔ امیر نے صبح کو جنگ کے آغاز کا فیصلہ کیا۔ وہ رات امیر محمود کے لشکر نے ملتانی لشکر کے سامنے اپنے خیموں میں گزاری۔ صبح ہوتے ہی امیر محمود نے پہل کی اور اپنے برق رفتار سواروں کے ساتھ ابو داؤد کے لشکر پر جا پڑا۔ ابو داؤد کے جان نثار بڑی بہادری سے لڑے اور کئی گھنٹے تک محمود کے سواروں کو روکے رکھا۔ اس وقت محمود کو ایک غیبی مدد حاصل ہوئی۔ محمود کا وہ لشکر جو جیرہ کے راستے چلا تھا وہ دریا پار کر کے دوپہر کے وقت ابو فتح داؤد کے دائیں جانب نمودار ہوا۔ ابو داؤد اس وقت تک اپنے محفوظ دستے بھی جنگ میں جھونک چکا تھا۔ محمود کے نئے لشکر نے زبردست حملہ کیا اور ابو داؤد کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ابو فتح داؤد بغیر جنگ کیے اپنا مال و متاع لے کر پنج ندی کی طرف بھاگ گیا۔

امیر محمود غزنوی فاتحانہ ملتان کے قلعے میں داخل ہوا۔ ملتان کے لوگوں نے اس سے امان مانگی۔ محمود نے حکم دیا کہ صرف قرامطیوں کو قتل کیا جائے اور انھیں پناہ دینے والوں کو بھی قتل کر دیا جائے۔ قرامطی چن چن کے مارے گئے۔ بقیہ کو امان ملی۔ امیر محمود نے سب سے پہلے قید خانہ دیکھنے کی خواہش کی۔ اسے ملتان پہنچتے ہی معلوم ہو گیا کہ مہارانی کلدیپ قید خانے میں ہے اور اب تک زندہ اور سلامت ہے۔

وہ منظر بھی بڑا مدح فرما تھا جب امیر محمود نے اپنی جیب سے کنگن نکال کر مہارانی کلدیپ کو پیش کیا۔ مہارانی کے فرطِ مسرت سے آنسو نکل آئے۔ اس نے امیر محمود کو سینے سے لگا کر پیار کیا۔ کلدیپ مہینوں برسوں سے بیمار تھی لیکن اس وقت اُس میں جانے کہاں سے طاقت آ گئی تھی کہ وہ اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے اُسے کوئی بیماری نہ ہو۔ پھر رانی کی نظر سرون کمار پر پڑی۔

سرون کمار امیر کے سرداروں کے پیچھے ذرا دور کھڑا تھا۔ کلدیپ "بیٹا! بیٹا!" کہتی اُس کی طرف بڑھی۔ اُس کے پیچھے راجکماری لیلاوتی تھی۔ اُس کا چہرہ مسلسل بیماری اور پریشانی سے مرجھایا ہوا تھا لیکن سرون کمار اور امیر محمود کو اس قید خانے میں دیکھ کر وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ کلدیپ، سرون کمار کو بھی گلے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ وہ دونوں ماں بیٹی، غزنی کی مدد اور سرون کمار کی طرف سے بالکل ناامید ہو چکی تھیں اور اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر بیٹھ رہی تھیں۔ امیر محمود ان لوگوں کے ملاپ کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ کلدیپ سے اس مختصر ملاقات کے بعد محمود اپنے لشکر میں چلا گیا اور ان لوگوں کو ایک بڑی حویلی میں منتقل کیے جانے کا حکم دیتا گیا۔ ملتان شہر میں لوٹ مار کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا کیونکہ شہر کے معززین نے اپنے طور پر امیر محمود کو دو کروڑ درہم تاوانِ جنگ پیش کیا اور بیس لاکھ درہم سالانہ خراج دینا منظور کر لیا۔

کلدیپ، لیلاوتی اور سرون کمار جب حویلی میں پہنچے تو انھیں تنہائی میسر ہوئی۔ کلدیپ کی طبیعت پہلے ہی خراب تھی۔ اس غیر متوقع خوشی نے اسے کچھ سہارا دیا تھا لیکن وہ پھر نڈھال ہو کر پڑ گئی۔ اب سرون کمار اور لیلاوتی بالکل تنہا تھے۔ ان کے درمیان کوئی نہ تھا۔ یوں بھی میاں بیوی کے درمیان کون آ سکتا ہے وہ تو مذہبی اور قانونی اعتبار سے ایک دوسرے کے تھے۔ سرون کمار نے لیلاوتی کو اتنی قوت سے اپنے بازوؤں میں بھر لیا کہ لیلاوتی کی پسلیاں چٹخنے لگیں لیکن اُن بازوؤں کے حصار۔۔۔ میں وہ سب کچھ بھول گئی اور گھنٹوں اُن مضبوط اور محبت بھری باہوں میں جھولتی رہی۔



وہ رات سروان کمار اور لیلاوتی نے سہاگ رات کی طرح گزاری۔ رات ہوتے ہی وہ کلدیپ کے دوا دارو کا انتظام کر کے اور ایک خادم اور ایک خادمہ اُس کے پاس چھوڑ کے ایک سجے ہوئے کمرے میں آ گئے۔ یہ کمرہ پہلے ہی آراستہ تھا لیکن لیلاوتی نے اِسے حجلۂ عروسی کی شکل دینے کے لئے اِس میں اپنے ہاتھ سے جھنڈیاں بنا کر لٹکائی تھیں اور کاغذ کے پھول دیواروں پر جگہ جگہ چپکائے تھے۔ عروسی سیج بھی اس نے خود ہی سجائی تھی چنبیلی اور بیلے کے پھول بھی لیلاوتی نے منگوائے تھے۔ چھپر کھٹ پر اتنے پھول بچھائے گئے تھے کہ بستر نظر نہ آتا تھا اور کمرہ طرح طرح کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ اِس وقت لیلاوتی کو اپنی دونوں وفادار کنیزیں سندری اور روپا بہت یاد آ رہی تھیں۔ اُن دونوں کو لاہور سے ملتان کے سفر کے دوران جب وہ ایک سرائے میں مقیم تھیں تو ڈاکو پکڑ کے لے گئے تھے جب سے اب تک اُن کا کوئی پتہ نہ لگا تھا۔

کچھ رات گزرنے کے بعد سروان کمار دُولہا بنا ہوا کمرے کے ایک دروازے سے اور لیلاوتی دُلہن کے کپڑوں میں دوسرے دروازے سے داخل ہوئی۔ وہ دونوں اِس وقت اپنی بارات کے خود ہی باراتی تھے۔ لیلاوتی، شرمائی لجائی آ کر سیج پر بیٹھ گئی پھر سروان کمار نے اُس کے پاس آ کر اپنی ہیرے کی انگوٹھی اُسے پہنائی اور گھونگھٹ اُلٹ کر اُس کا مُنہ دیکھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مُسکرائے اور پھر فرطِ محبت اور جذبات سے اِس طرح لپٹ گئے کہ دو جان ایک قالب بن کر رہ گئے۔ اُن کی آرزوؤں اور اُمنگوں کو نیا جنم ملا تھا۔ وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے لاہور کی تباہی کے بعد پھر ایک دوسرے سے مل بھی سکتے ہیں۔ جذبات کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ نہ وہ کمرے کا دروازہ ہی بند کر سکے اور نہ جگمگ کرتی روشنیوں میں سے کوئی شمع گل کر سکے۔

اسی طرح رات بیت گئی۔

حویلی کی کنیز کئی بار آئی اور جھانک کر مُسکراتی ہوئی واپس ہو گئی۔ وہ تو امیر محمود کی آمد کی خبر نے اُسے دُلہا دُلہن کو جگانے پر مجبور کر دیا ورنہ وہ جگانے کی کوشش نہ کرتی۔ امیر محمود اپنی پھپھو کی عیادت کو آ رہا تھا۔ سروان کمار اور لیلاوتی گھبرا کے شرماتے ہوئے اُٹھے۔ کنیز بہت دیر سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ امیر کے آنے کی خبر ملی تو وہ دونوں جلدی جلدی تیار ہو کر کلدیپ کے پاس پہنچ گئے۔

امیر محمود عیادت کو آئے اور مہارانی کو اپنے ساتھ غزنی لے جانے کی خواہش کی۔

مہارانی نے لیلاوتی کو دیکھتے ہوئے نحیف آواز میں کہا: "امیر محترم! مجھ میں اب سفر کرنے کی طاقت نہیں۔ زندگی کے جو دن باقی ہیں مجھے یہیں گزارنے دیئے جائیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ اگر لیلاوتی اور سروان کمار پسند کریں تو آپ اِن دونوں کو اپنے ساتھ لیتے جائیے۔ ابھی یہ ناتجربے کار ہیں۔ ان کے لئے غزنی سے زیادہ عافیت کی اور کوئی جگہ نہیں"

امیر محمود نے لیلاوتی اور سروان کمار کی طرف دیکھا جو برابر برابر کھڑے تھے۔ لیلاوتی نے سر جھکا کر کہا: "امیر محترم! اگر میرے پتی سروان کمار اجازت دیں تو میری یہ دلی خواہش ہے کہ جس طرح میری ماتا مہارانی کلدیپ نے آپ کے مرحوم والد کے ہاتھ میں راکھی باندھی تھی اِسی طرح میں آپ کے ہاتھ میں راکھی باندھنے کا اعزاز حاصل کروں۔"

امیر نے سروان کمار کی طرف دیکھتے ہوئے فوراً اپنا ہاتھ لیلاوتی کی طرف بڑھا دیا۔

لیلاوتی نے مُسکرا کے مگر ادب کے ساتھ کہا: "امیر محترم! اس طرح نہیں۔ راکھی کے تہوار میں ابھی کئی مہینے باقی ہیں۔ آپ مجھے اجازت دیتے جائیے میں سروان کمار کو ساتھ لے کر غزنی آؤں گی۔ اور وہاں راکھی باندھوں گی۔"

امیر محمود نے اُسے اجازت دے دی اور کہا: "ہم اپنے مفتوحہ علاقوں کے گورنر نواسہ خان کو حکم دیتے جائیں گے کہ جب بھی تم لوگوں میں سے کوئی بھی غزنی آنا چاہے اُسے حفاظت سے ہمارے پاس پہنچا دیا جائے۔"

امیر محمود نے واپس جا کر ملتان کے انتظام کے احکامات جاری کئے۔ ابو فتح داؤد نے ملتان کی تمام مسجدوں کو بند کرا دیا تھا اور ایک مندر کو توڑ کر ایک مسجد تعمیر کی تھی جس کی قبلے کی سمت بیت المقدس کی طرف تھی صرف اُس مسجد میں لوگوں کو نماز پڑھنے کی اجازت تھی۔ امیر نے تمام مسجدوں کو کھلوا لیا اور ابو داؤد کی بنائی ہوئی مسجد کو مسمار کرا دیا۔ اُس نے تمام قیدی آزاد کر دیئے۔ تبلیغ اور ترویج اسلام کے لئے علمائے دین کا تقرر کیا۔

امیر محمود نے ابو فتح داؤد کو گرفتار کر کے سزا دینے کی قسم کھائی تھی لیکن خراسان میں ایلک خان کی بغاوت کی وجہ سے اُسے فوری طور پر غزنی واپس جانا پڑا۔ اِس طرح ابو فتح داؤد کچھ دِنوں امیر محمود کے ہاتھوں سے بچا رہا۔ محمود کے جانے کے چند دِنوں بعد مہارانی کلدیپ کا انتقال ہو گیا اور لیلاوتی اور سروان کمار برصغیر کو چھوڑ کر غزنی چلے گئے اور وہیں آباد ہو گئے۔

ادھوری شخصیت

رخسانہ نگار عدنان

اُسے اپنے ہر جذبے میں ادھورے پن کا احساس ہوتا تھا۔ آدھی محبت آدھی نفرت ادھوری خوشیاں الغرض یہ کہ اُس نے ہر خوشی کو آدھا سمجھ کر اُس سے مُنہ موڑ لیا تھا۔

ادھوری شخصیت کی پوری کہانی



اس کی ایک دم آنکھ کھلی تو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اُٹھ کر لائٹ آن کی اور سامنے کلاک پر نگاہ دوڑائی تو شام کے سات بج رہے تھے۔

"اوہ میں اتنی دیر تک سوتی رہی۔" وہ ایک ہی جست میں باتھ روم پہنچ گئی لیکن پھر خود ہی اپنی بدحواسی پر ہنس دی "اوہ اپنے وقفی کی بھی انتہا ہے۔ اتنا تو کھلانے کی کیا بات ہے۔ بھئی مجھے کہاں جانا ہے۔ یہیں گھر پہ تو رہنا ہے۔"

وہ آرام سے ہاتھ منہ دھونے لگی۔ جلتی ہوئی آنکھوں پر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تو بے حد سکون کا احساس ہوا۔ ہاتھ منہ دھونے کے بعد وہ کمرے سے باہر آئی تو سب لوگ چائے پینے میں مصروف تھے۔ وہ بھی کرسی کھسکا کر بیٹھ گئی۔

"اتنی دیر سے کہاں تھیں تم؟" امی نے پوچھا۔

"سو رہی تھی۔"

"سو رہی تھیں اور میں سمجھی تم اسٹڈی کر رہی ہو۔ امتحان بھی تو قریب ہے تمہارا۔"

"ہاں... لیکن طبیعت خراب تھی۔ صبح سے ہلکا ہلکا بخار محسوس ہو رہا ہے۔" اس نے کہا لیکن امی اَن سنی کر کے نخلے فہد میں لگ گئیں۔

"امی میری طبیعت خراب تھی۔" اس نے دوبارہ بتایا۔

"اچھا۔" انھوں نے قدرے حیرت سے دیکھا۔ "لیکن تم بچی تو نہیں ہو کہ تمہارے آگے پیچھے پھرا جائے۔ اپنا خیال خود رکھا کرو۔" انھوں نے تنبیہہ کی تو وہ دم بخود سی ان کو دیکھتی رہ گئی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔

"امی میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اولاد چاہے کتنی ہی بڑی ہو جائے والدین کے لئے بچہ ہی ہوتی ہے۔"

"بیٹا تم فضول باتیں بہت کرنے لگی ہو کبھی کام کی بات بھی کر لیا کرو۔" امی ایک دم طیش میں آ گئیں۔

"آپ میری بات سنتی ہی کب ہیں۔ آپ کو تو میری ہر بات فضول لگتی ہے۔" وہ شکایتاً بولی۔

"خدا تم سے سمجھے، تم اب دودھ پیتی بچی تو نہیں ہو کہ ہر کام تم سے انگلی پکڑ کر کروایا جائے۔" امی نے غصے سے کہا اور فہد کو لے کر باہر چلی گئیں۔

"کیوں فضول بحث میں اُلجھتی ہو۔ وہ تمہاری ماں ہے اور ماں سے اس لہجے میں بات نہیں کی جاتی۔" حنا آپی نے سمجھایا۔

"آپی میں نے کبھی گستاخی نہیں کی ہے۔"

"پھر یہ سب کچھ کیا تھا؟"

"امی مجھے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ انھیں مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں صبح سے بخار میں تپتی رہی لیکن انھوں نے کوئی خبر نہ لی۔" ثمینا کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

"ثمینا یہ تمہارا وہم ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل امی صبح سے کاموں میں اتنی مصروف تھیں کہ یاد ہی نہ رہا ہوگا۔" حنا آپی نے تردید کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں ہمیشہ انھیں یاد نہیں رہتی۔" وہ تلخی سے بولی۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ ہمیں تم سے زیادہ چاہتی ہیں ثمینا والدین کو ساری اولاد ایک جیسی عزیز ہوتی ہے۔ تم خواہ مخواہ دل چھوٹا کرتی ہو۔" حنا آپی نے چائے بنا کر اس کی جانب بڑھائی اس نے جلدی سے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی تو لب سلگ اُٹھے۔ اس لمحے جلال اندر داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر ثمینا کا موڈ اور خراب ہو گیا۔

"کیسے مزاج ہیں آپ کے؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

"ٹھیک ہی ہیں۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"لگتا ہے آج مطلع صاف نہیں ہے؟" وہ ذرا شرارت سے مسکرایا۔

"جی ہاں خیال رکھیئے گا۔ اولے پڑنے کا امکان بھی ہے۔" حنا آپی نے کہا تو وہ خوش دلی سے ہنس دیا۔

"ارے صاحب ہماری قسمت میں تو اولے ہی لکھ دیئے گئے ہیں۔ آپ دیکھتی نہیں ہیں ہر وقت کتنا سہما سہما رہتا ہوں" اس نے بسکٹ کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ثمینا نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہر وقت تو آپ سہمے ہوئے نہیں ہوتے۔" حنا آپی دلچسپی سے بولی۔

"ہاں، بس ایک خاص وقت ہوتا ہے۔" جلال نے کن اکھیوں سے ثمینا کی طرف دیکھتے [illegible] کرسی کھسکا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں چل دیں تم؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"تم... ؟" وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ "اتنے بے تکلف کب سے ہیں آپ؟"

"جب سے ہوش سنبھالا ہے!" وہ مزے سے بسکٹ کھاتے ہوئے بولا۔

"انتہائی ڈھیٹ انسان ہیں آپ۔" ثینا نے اپنی طرف سے اس کی سبکی کی لیکن وہ اطمینان سے بولا۔

"بہت بہت شکریہ!"

"اس نے خونخوار نگاہوں سے اُسے گھورا اور غصّے سے چل دی۔

"کہاں جارہی ہیں؟" اس نے دوبارہ ٹانگ لگائی۔

"جہنم میں!" وہ غصّے سے پھٹ پڑی۔

"تو پھر اس بندے کو بھی ساتھ لے چلیے۔ اکیلا بیچارہ کیا کرے گا؟"

"میرے لئے ایک ہی جہنم کافی ہے۔ آپ کی ضرورت نہیں مسٹر جلال!"

"بھئی اس مسٹر کے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ صرف جلال ہی کافی نہیں ہے؟"

"میں تکلفات کو پسند کرتی ہوں۔" وہ نخوت سے بولی۔

"ہمیں تو یہی معلوم نہیں ہوسکا کہ آپ کیا کیا پسند کرتی ہیں۔" جلال نے طویل سانس لے کر کہا۔

"سب کچھ پسند فرماتی ہوں لیکن آپ کو نہیں۔"

اس نے ابرو چڑھا کر کہا تو جلال بے ساختہ ہنس دیا اُسے ہنستے دیکھ کر وہ جھنجھلا کر بولی۔

"آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے۔ ۔ ۔؟"

"غصّے میں انسان کبھی دُرست فیصلہ نہیں کرتا۔"

"آپ کا کیا مطلب ہے میں پاگل ہوں؟" اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"کچھ کچھ تو مشکوک ہو چلا ہوں۔" جلال نے اطمینان سے کہا تو وہ غصّے سے پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی جلال کا قہقہہ باہر تک اس کا پیچھا کرتا رہا۔

"کتنا ڈھیٹ ہے کم بخت۔ ذرا اثر نہیں ہوتا۔"

وہ اپنے کمرے میں آکر گرنے کے سے انداز میں ایزی چیئر پر گر پڑی۔

آج احساسِ محرومی رہ رہ کر دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ وہ لاکھ سر جھٹک کر دل بہلانے کی کوشش کرتی لیکن ایک ہی سوال ذہن کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر پورے وجود میں شور برپا کر رہا تھا۔ امّی کو مجھ سے کوئی محبت نہیں، نہ جانے کیوں وہ ایسا سمجھتی تھی۔ یہ احساس بچپن ہی سے اس کے دل میں جاگزیں تھا۔ اب تو اس کی جڑیں اور مضبوط ہوگئی تھیں۔ برسوں سے یہ سوال ذہن کی دیواروں پر ہتھوڑوں کی مانند برس رہا تھا۔ اکاس بیل کی مانند اس کے سارے وجود پر چھا گیا تھا۔

ثمینا کبھی کبھی بہت اپ سیٹ ہوجاتی تھی۔ وہ بے حد حساس واقع ہوئی تھی امّی کی ذرا سی بے توجہی سے اندر تک سلگ اٹھتی۔ وہ تین بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ لگاتار تین بیٹیاں ہونے کے بعد امّی کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ انھیں بیٹے کا بے انتہا شوق تھا ابو بھی ان کے شوق میں برابر کے شریک تھے بیٹے کی خواہش میں وہ پیروں فقیروں تک گئیں لیکن مراد تھی کہ پوری ہی نہ ہوتی تھی ان چکروں سے وہ دن بدن چڑچڑی ہوتی گئیں۔ نانی انھیں لاکھ سمجھاتیں کہ اللہ کو دینا ہوگا تو وہ ضرور دے گا۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

نانی شروع سے ہی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ سب بچوں سے محبت کرتی تھیں۔ خصوصاً ثینا تو بے حد لاڈلی تھی۔ امّی بچوں کی جانب کم ہی توجہ دے پاتی تھیں۔ ان کا سسرالی خاندان اور میکہ اتنا بڑا تھا کہ آئے دن کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی رہتی تھی۔ ان تقریبات کی وجہ سے وہ بے حد مصروف رہتیں۔ حنا آپی اکثر ان کے ساتھ ہولیتیں لیکن ثمینا صرف سے انکار کردیتی۔ وہ انکار کرکے امّی کی بے توجہی کا بدلا چکانا چاہتی تھی یا شاید اپنی اہمیت جتانا چاہتی تھی۔

جب ننھا فہد پیدا ہوا تو امّی ابو کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ امّی کی بیشتر توجہ اب اسی طرف رہنے لگی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ثمینا کبھی کبھی حسد کا شکار ہوجاتی۔ امّی سے وہ بے حد شاکی رہنے لگی تھی لیکن اس کے باوجود اسے اپنے اکلوتے بھائی فہد سے بے حد پیار تھا۔ امّی ابو کی آنکھوں کا تارا ننھا فہد ثمینا کو بھی بے حد عزیز تھا لیکن امّی کی ناانصافی پر کبھی کبھی وہ غصّے سے تلملا اٹھتی۔

امّی نے کبھی اس کے لاڈ برداشت نہیں کئے تھے، وہ جب بھی ضد کرتی امّی بُری طرح جھڑک دیتیں۔ ثینا چاہتی تھی وہ اسے بچوں کی طرح سمجھیں لیکن امّی اس بات کی بالکل روادار نہ تھیں۔ اس کا اب بھی دل چاہتا تھا کہ امّی کی گود میں سر رکھ کر سوئے۔ ان سے بے جا ضد کرے لیکن ساری خواہشات پر اس وقت پانی پھر جاتا جب امّی اسے نظر انداز کردیتیں۔ وہ جتنا نمایاں ہونے کی کوشش کرتی امّی اتنا ہی اس کی اہمیت کم کردیتیں۔

مینا باجی کی شادی حال ہی میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ حیدرآباد میں مقیم تھیں۔ حنا آپی کی منگنی بھی ہوگئی تھی۔ ثینا سارا دن اپنے کمرے میں گھسی فضول سوچوں میں سر کھپاتی،

جلال اس کا عم زاد تھا اور ٹمینا کو بے حد چاہتا تھا لیکن وہ اسے بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ اُسے دیکھ کر ہی مُنہ پر بارہ بج جاتے تھے حالانکہ جلال بڑی خوبصورت شخصیت کا مالک تھا۔ بے حد بے باک اور نڈر وقار لمبا چوڑا وجود ایک دَم آنکھوں میں کھُب جاتا تھا لیکن ٹمینا اسے چڑانے کے واسطے نظر انداز کر دیتی۔ جلال کو بھی ٹمینا کو تنگ کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔

ٹمینا اسے نظر انداز کر کے اپنی اہمیت جتانا چاہتی تھی۔ امی کی بے توجہی کا بدلہ وہ دوسروں کو تنگ کر کے لیتی تھی۔ بے حد موڈی واقع ہوئی تھی۔ موڈ ہوتا تو شرارتیں بھی کر لیتی۔ اگر موڈ بگڑ جاتا تو ہر ایک کو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔

جنا آپی سے اس کی اچھی دوستی تھی۔ تائی بھی بے حد چاہتی تھیں لیکن اسے تو امی کی توجہ چاہیئے تھی۔ انھیں ستانے کے لئے اکثر اُوٹ پٹانگ قسم کی حرکتیں کرتی۔ انھیں ستاتی لیکن امی اپنی فطری عادت کی وجہ سے کوئی توجہ نہ دے پاتیں۔ ان کا یہ رویہ دیکھ کر ٹمینا کا اتنا موڈ آف ہوتا کہ دل چاہتا اپنے آپ کو شوٹ کر لے۔ وہ امی کو ستانے کے لئے ہر روز نت نئے پلان بناتی۔ وہ بی۔ اے کی اسٹوڈنٹ تھی لیکن کبھی کبھار بچکانہ حرکتیں بھی کر گزرتی۔

ایزی چیئر پہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اُس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سوچتے سوچتے ایک دم اس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ دوڑ گئی۔ شاید پھر کوئی نیا پلان بنا لیا تھا۔

اُسے پینٹنگ کا بے حد شوق تھا۔ اس کی تصویر کا موضوع اکثر ماں بچہ ہوتا تھا۔ بچہ جو ماں کی چھاتی سے لپٹا نہایت مطمئن انداز سے ادھ کھلی آنکھوں سے مسکرا رہا ہوتا۔ ٹمینا کو اکثر ایسا محسوس ہوتا جیسے اس بچے کی جگہ وہ خود ہے لیکن حقیقت کے یاد آتے ہی دل میں درد کی ایک ایسی لہر اُٹھ آتی کہ وہ کبھی کبھی طیش میں آ کر تصویریں بگاڑ دیتی۔ ایسا کرتے وقت لاشعوری طور پہ ماں کی تصویر پہ رنگ پھیر دیتی۔

آجکل وہ ایک نئی تصویر بنا رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی ماں کی ٹانگوں سے لپٹی کھڑی تھی۔ آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لئے ماں کی جانب یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ ماں مجھے اپنی آغوش میں چھپا لو۔۔۔ عدم تحفظ کی اندھی وادی میں گرنے سے بچا لو۔۔۔ اٹھا لو مجھے۔۔۔ اُٹھا لو۔۔۔ اُٹھا لو۔۔۔ چیختی چنگھاڑتی وحشی آوازیں اس کے وجود میں شور مچا رہی تھیں۔ چلا رہی تھیں۔ وہ اینزل پکڑے ساکت آنکھوں سے تصویر کو گھورے جا رہی تھی۔ دو آنسو ٹپک کر بچی کے خوفزدہ چہرے پہ پڑے تو وہ چونک اُٹھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو منتقل ہو کر بچی کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔ وہ حیرت اور استعجاب سے تصویر دیکھنے لگی۔ بچی کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو اسکی معصومیت اور اضافہ کر رہے تھے

دوسرے لمحے وہ تصویر ہاتھ میں تھامے امی کے کمرے کی جانب جاتی ہوئی دکھائی دی۔

امی چھ سالہ فہد کے کپڑے تبدیل کرنے میں مصروف تھیں۔ اس نے کپڑوں پہ چائے گرا دی تھی۔ کپڑے تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس پر برس بھی رہی تھیں۔ ٹمینا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

"امی۔۔۔ امی!" اس نے آواز دی۔

"کیا ہے؟" امی کی آواز میں ترشی گھلی ہوئی تھی۔ ٹمینا وہیں ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ جواب نہ پا کر امی نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں تصویر تھامے مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔

"کیا ہے یہ؟"

"امی یہ میں نے بنائی ہے۔ دیکھئے کتنی خوبصورت تصویر ہے ایک بچی اپنی ماں سے لپٹی کھڑی ہے اور۔۔۔"

امی نے اس کی بات کاٹی "کیا فائدہ ان فضول کاموں میں وقت ضائع کرنے کا۔"

"فضول کام!" ٹمینا نے حیرت سے اُنھیں دیکھا۔ "نہیں امی یہ فضول کام نہیں ہے ایک فن ہے۔"

"ایسی چیزیں بازار سے بھی خریدی جا سکتی ہیں۔ تصویر بھی بنائی تو ماں اور بچے کی۔ ابھی تک بچپنا نہیں گیا" امی فہد کے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے کہا تو ٹمینا کا دل ٹوٹ سا گیا اس نے کتنے ارمان سے یہ تصویر بنائی تھی۔ اپنے تمام احساسات اور جذبات کو اس میں سمو دیا تھا۔

"تم سے کل میں نے کہا تھا کہ بیگم اقبال کے گھر چلنا لیکن تم چلیں نہیں۔"

"میرے پاس وقت نہیں تھا" اس نے بڑی رکھائی سے جواب دیا۔

"اس قسم کے فضول کاموں کے لئے تمہارے پاس وقت ہے اور اتنی اہم تقریب کے لئے وقت نہیں تھا۔ خدا تم سے سمجھے" امی نے جھلاتے ہوئے کہا کہ وہ مرے مرے قدموں سے باہر آ گئی کمرے

میں آکر اس نے ایک لمحے کو تصویر غور سے دیکھی اور دوسرے لمحے اُسے لان میں پھینک کر تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

کالج میں چھٹی ہو چکی تھی لیکن وہ لاپرواہ سی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ کبھی ایک لڑکی سے گپ شپ لگاتی، کبھی دوسری لڑکی سے باتوں میں مصروف ہو جاتی۔ اُسے یوں ٹہلتے دیکھ کر اس کی کلاس فیلو ناہید نے پوچھا۔

"ارے ثمینا کیا بات ہے؟ ابھی تک کالج میں نظر آ رہی ہو۔ تم تو ہمیشہ آخری پیریڈ بھی بڑی مُردہ دلی سے اٹینڈ کرتی ہو؟"

"بھوک لگتی ہے نا۔" وہ مسکرائی۔

"بڑی بے صبری ہو لیکن بھئی آج بھوک نہیں ستا رہی؟"

"ستا رہی تھی لیکن مابدولت نے بند کباب کھا کر پیٹ کا دوزخ بھر لیا۔"

"کیوں آج گھر جانے کا ارادہ نہیں ہے؟" ناہید نے شرارت سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

"بھئی میرا مطلب ہے کہیں اور پروگرام تو نہیں ہے؟" ناہید نے معنی خیزی سے کہا تو ثمینا نے بڑی قہر آلود نگاہوں سے اُسے گھورا۔

"جی نہیں میرا کوئی ایسا پروگرام نہیں، بندے کی پہچان رکھا کرو۔"

"پھر کیا وجہ ہے یوں گھومنے پھرنے کی؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں ہے گاڑی نہیں آئی ابھی تک۔" اس نے شانے اُچکائے۔

"تمہاری گاڑی تو بڑی وقت کی پابند ہے؟"

"تم تو بال کی کھال نکالنا شروع کر دیتی ہو۔ محکمۂ پولیس سے کوئی تعلق ہے کیا؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"ارے بابا ناراض کیوں ہوتی ہو۔ ہم تو چلے۔ ہائے ہائے۔" ناہید نے بیگ سنبھالا اور گیٹ کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

"دفعان ہو جاؤ۔ کم بخت ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتی ہے۔" وہ ابھی پوری طرح اسے کوس بھی نہ پائی تھی کہ پیچھے سے ناہید نے آواز لگائی۔

"ثمینا تمہارا ڈرائیور دھوپ میں سڑ رہا ہے۔ بے چارہ نہ جانے کب سے سن باتھ لے رہا ہے۔ کچھ اس کے رنگ کا ہی خیال کر لو۔ بچوں کو ڈرانے کا ارادہ ہے کیا؟"

"تم اپنی فکر کرو۔ دوسروں کے غم میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" ثمینا نے وہیں سے جھاڑ پلائی۔ کلائی پہ بندھی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ دو بج رہے تھے۔ کالج کی تقریباً تمام لڑکیاں جا چکی تھیں۔ اکا دکا کھڑی تھیں۔

"اُوں، ابھی تو دو ہی بجے ہیں۔" وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ سخت کوفت کا سامنا تھا۔ ٹہل ٹہل کر وقت گزارا۔ جب پورے ڈھائی بجے تو وہ بیگ سنبھالے گیٹ سے باہر آئی۔

گھر پہنچ کر وہ آنکھیں نچاتی ہوئی اندر داخل ہوئی لیکن یہ دیکھ کر اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ سب لوگ کھانے میں مصروف تھے۔ وہ بے دم سی ہو کر صوفے پہ گر پڑی۔

"اتنا نہ ہو سکا میرا انتظار ہی کر لیتے۔ ایک مرتبہ جب فہد نے دیر کر دی تھی تو پورے تین بجے تک امی نے ٹیبل پر کھانا نہ لگنے دیا تھا اور میرا اتنا بھی انتظار نہ ہو سکا۔"

اُسے یوں صوفے پہ دیکھ کر ابو نے پوچھا۔ "ثمینا بیٹے کھانا نہیں کھاؤ گی؟"

"نہیں ابو مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے جھوٹ بولا... حالانکہ پیٹ میں چوہوں کی دوڑ ہو رہی تھی۔ پھر اس نے کن اکھیوں سے امی کی طرف دیکھا۔ وہ فہد کو کھانا کھلانے میں [illegible] ثمینا انتظار کر رہی تھی کہ امی دیر سے آنے کا سبب [illegible] کی لیکن حسبِ معمول انھوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب مڑ گئی۔

"ثمینا! آج بہت دیر کر دی تم نے؟" نانی نے پوچھا تو اس کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے

"نانی آج میرا سائیکالوجی کا پریکٹیکل تھا۔"

"بیٹے جلدی آ جایا کرو۔ جلدی سے ہاتھ منہ دھو آؤ۔ کھانا ابھی گرم ہے۔ میں ابھی گرم گرم چپاتیاں لے آتی ہوں۔"

ثمینا نے نانی کی بات نظر انداز کر کے پُراُمید نظروں سے امی کی جانب دیکھا اور بولی۔

"امی کیا واقعی آج دیر ہو گئی ہے"

"آں... ہاں۔" وہ فہد کو کھانا کھلاتے کھلاتے چونک سی گئیں۔

"نہیں کوئی خاص دیر تو نہیں ہوئی۔ کالج میں اتنی دیر تو ہو جاتی ہے۔"

ثمینا نے تلخ نگاہوں سے امی کو دیکھا اور تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کتابیں ٹیبل پر پھینک کر وہ اپنے بیڈ پہ گر

پڑتی۔

"ایک میں ہی احمق ہوں کہ انھیں متوجہ کرانے کے لئے ہلکان ہوئی جا رہی ہوں۔ نہ جانے کیسی مٹی کی بنی ہوئی ہیں۔ کیا ایسی مائیں بھی ہوتی ہیں؟ سمیع غلط کہتی ہے کہ اگر اُسے ذرا بھی دیر ہو جائے تو اس کی امی فکرمندی سے دروازے پر ٹہلتی ہوئی ملیں گی۔ مجھے جلانے کو کہتی ہے؛" وہ دیر تک بیڈ پر پڑی اپنی قسمت کو کوستی رہی۔ بھوک سے پیٹ میں مروڑ اٹھی تو ایک دم کھڑی ہوئی غصے کے مارے کھانا کھانے کو دل نہ چاہ رہا تھا۔ وہ اسی طرح اپنے آپ کو سزا دے کر خوش ہوتی تھی۔ کمرے سے باہر آئی تو سب لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ صرف امی فہد کو لئے کھڑی تھیں۔ شاید وہ ضد کر رہا تھا۔

ٹینا فرج کھول کر جائزہ لینے لگی۔ سامنے ہی کینو پڑے نظر آگئے تو اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ کینو باہر نکالے ہی تھے کہ امی نے وہیں سے کہا۔

"ٹینا اور کوئی فروٹ کھا لو۔ آج رحیمو کینو تھوڑے لایا ہے جنا کو ڈاکٹر نے کینو کا جوس بتایا ہے۔ تم کل کھا لینا۔"

مارے غصے کے وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ دل چاہا سارے کینو اٹھا کر باہر پھینک دے۔ پورا وجود جل اٹھا۔ آنکھیں تک شعلوں کی لپیٹ میں آگئیں۔ طیش میں کچھ سمجھ میں نہ آیا تو جھٹ سے پانی کی بوتل منہ سے لگالی۔ ٹھنڈے پانی نے جلتے ہوئے وجود کو کافی سکون پہنچایا۔ منہ سے بوتل ہٹا کر اس نے امی کی طرف دیکھا تو لرز سی گئی۔ وہ غصے سے اُسے گھور رہی تھیں۔

"کتنی مرتبہ منع کیا ہے کہ بوتل سے منہ مت لگایا کرو۔ اتنا ہاتھ بھی نہیں ہلایا جاتا کہ گلاس میں انڈیل کر پی لو۔ ٹینا تم نے بہت تنگ کیا ہے مجھے۔ نہ جانے تمھیں کب عقل آئے گی۔ بالکل بچوں کی سی حرکتیں کرتی ہو۔"

وہ غصے سے اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ فرج بدستور کھلا پڑا تھا۔ امی نے زور سے فرج بند کیا اور اپنے بیڈروم کی جانب چلی گئیں۔ ٹینا کھڑی آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔

"آپا بوتل سے پانی پینا بُری بات ہے۔" فہد نے قمیص کا دامن پکڑ کر اُسے ہلایا تو وہ چونک کر واپس اس دنیا میں آگئی۔

"آں۔۔۔ ہاں!"

"آپا بوتل سے پانی پینا بُری بات ہے تو پھر آپ کیوں پیتی ہیں؟"

"اس لئے کہ میں بہت بڑی ہوں۔" اس کی آواز ڈوب ڈوب گئی۔

"اچھا اب آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کیجئے۔ ورنہ امی خفا ہوں گی۔"

ٹینا نے اس کے گال چوم لئے۔ فہد چلا گیا تو ٹینا نے سارے کینو نکال کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھے اور ان کا جوس نکالنے میں مصروف ہوگئی۔ امی کی بات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نہ جانے کیوں اب اُسے ضد سی ہوگئی تھی۔ امی جس بات سے منع کرتیں ٹینا وہی کرتی۔

جوس نکالنے کے بعد اس نے ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے اُچک لیا۔ اس نے گھبراتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تو جلال مزے سے جوس پی رہا تھا۔

وہ پوری جان سے جل گئی۔

"بہت مزے دار ہے۔" جلال شرارت سے مسکرایا۔

"اگر مجھے علم ہوتا کہ آپ نوش فرمائیں گے تو اس میں زہر ملا دیتی۔" ٹینا نے غصے سے دانت کچکچائے۔

"کوئی بات نہیں تمھارے ہاتھوں سے تو میں زہر بھی پینے کو تیار ہوں۔ محبت سے اگر زہر بھی دیا جائے تو۔۔۔"

"محبت؟" ٹینا نے غصے سے اس کی بات کاٹی۔

"ہاں محبت۔۔۔ کبھی تم نے اس جذبے کو محسوس کیا ہے؟" جلال نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس نے سٹپٹا کر آنکھیں چرالیں۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"اگر مجھے غور سے دیکھتیں تو یوں نہ کہتیں!" وہ اس کے قریب چلا آیا۔ جلال کے وجود سے اٹھتی ہوئی خوشبو اُسے دلاسے دے رہی تھی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے آپ کی طرف دیکھنے کی۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"ضرورت ہے، جبھی تو کہہ رہا ہوں۔" جلال نے اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں اور سنجیدگی سے کہا۔ "ٹینا اتنی انجان ہو یا پھر بنتی ہو!"

"کیا کہا؟" وہ ایک دم تنک سی گئی۔

"تم نے میرے چہرے پر لکھے ہوئے جذبے پڑھے؟"

"میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا اور نہ ہی کبھی ضرورت محسوس ہوئی۔" اس نے بے رُخی سے جواب دیا۔

”جہاں تک ضرورت کا سوال ہے تو محبت ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ کیا تم اس کی اہمیت سے انکار کر سکتی ہو؟“ جلال نے اپنی بات منوانی چاہی لیکن وہ بڑی سرد مہری سے بولی۔

”مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔“

”کیوں؟“

”اعتبار ہی نہیں رہا۔“ اس نے پلٹ کر کہا لیکن جلال ایک دم اس کے سامنے آ گیا۔

”چاہت کا دوسرا نام اعتبار ہے۔ تم نے شاید کسی سے محبت ہی نہیں کی۔“

”ہاں شاید۔“ ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔ جلال حیرت سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔

”کیوں؟“

”بہت ہی ناپائیدار رشتہ ہے۔ ذرا سی ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا اور پھر کیا حاصل ہوتا ہے محبت کرنے سے۔ جس سے محبت کرو، بیچ منجدھار میں اکیلا چھوڑ جاتا ہے۔ کیا فائدہ ایسی فضول حرکت کرنے کا۔ انتہائی احمقانہ بات ہے . . . ہے نا؟“ ٹینا نے بے ربط سے جملے بولتے بولتے اپنی آنکھیں مسل ڈالیں۔ جلال خاموشی سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ قدرے توقف سے بولا۔

”کیا تم نے کبھی کسی کو چاہا ہے؟“

”کسی سے کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”میرا مطلب ہے کسی مرد سے۔“ جلال نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

”جی نہیں۔“ وہ اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی

”کیوں؟“

”شاید اُسے اس قابل ہی نہ سمجھا۔“ اس کے ہونٹوں پر ایسی کاٹ دار مسکراہٹ تھی کہ خفت کے مارے جلال کا وجود سُلگ اُٹھا۔ ٹینا کی اس ناانصافی پر وہ احتجاجاً بولا۔

”تم سخت غلطی پر ہو۔“

”مجھے اپنی غلطیاں بہت عزیز ہیں۔“ وہ زہریلے انداز میں مسکرائی۔

”مجھے بھی ان غلطیوں میں شامل کر لو۔“ وہ زیرِ لب مسکرایا۔

”تسلی رکھیے اس قسم کی غلطی میں کبھی نہیں کروں گی۔“

”ٹینا! آخر تم ہمیشہ مجھے اذیت میں کیوں مبتلا کر دیتی ہو آخر کیوں؟“ وہ بلا آخر چیخ اُٹھا۔ ٹینا نے جلتی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھا اور کہا۔

”شاید اپنا بدلہ دوسروں سے لینے کی عادی ہو گئی ہوں۔“ جلال اس کی بات نہ سمجھ سکا لیکن وہ تو جا چکی تھی۔

وہ آج پھر حسبِ معمول کالج میں گھوم پھر رہی تھی۔ کالج آف ہو چکا تھا لیکن آج اس نے اور زیادہ دیر سے جانے کا تہیہ کر لیا وہ پوری طرح امی کو پریشان کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ویسے بھی آج کل امتحان کی وجہ سے اُن کی کلاسیں آف ہونے والی تھیں آج کا دن غنیمت تھا۔

تقریباً پورا کالج خالی ہو چکا تھا۔ وہ تنہا بیٹھی سوچوں سے نبرد آزما تھی۔ امی نے اسے ایک ایسے دُکھ میں مُبتلا کر دیا تھا کہ جہاں بیٹھتی دماغ بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا۔ یوں اتنے بڑے کالج میں تنہا بیٹھنے پر اس نے خوف سے جھرجھری لی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ وہی کالج کچھ دیر پہلے جہاں پُر شور تھا۔ اب چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ پوری عمارت آسیب زدہ لگ رہی تھی۔ مارے خوف کے اس کا بُرا حال ہو گیا خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی گیٹ پر آ کھڑی ہوئی۔ چوکیدار گیٹ بند کر کے کسی کام سے کالج کی عمارت کے اندر گیا ہوا تھا۔ ٹینا نے گھبرا کر نظر دوڑائی تو دیکھا وہ قفل نہیں لگا کر گیا تھا۔ اس نے تھوڑا سا گیٹ کھول کر باہر نگاہ کی تو دو تین لفنگے قسم کے لڑکے نظر آئے۔ اسے ابھی تک کالج کے گیٹ پر کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک سے گئے۔ ان کی سُرخ سُرخ آنکھیں دیکھ کر ٹینا کی جان نکل گئی اور ٹانگیں کانپنے لگیں۔

”کیا بات ہے جانم کس کا انتظار ہے؟“ ایک لڑکے نے اس سے پوچھا۔

”بک . . . بکواس بند کرو۔“ الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے۔

”اچھا بھئی ہم بکواس کر رہے ہیں جس کا انتظار ہے اس کی باتیں تو شہد کی طرح میٹھی لگتی ہوں گی۔“ ایک لڑکا دانت نکال کر بولا۔

مارے خوف کے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ سامنے سڑک ویران پڑی تھی۔

”مم . . . میں تم سب کو جیل میں بند کروا دوں گی۔“ اس کی پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

”ہماری بات جانے دو پہلے اپنی بات کرو۔“

ٹینا نے جلدی سے گیٹ بند کیا اور آیت الکرسی کا ورد کرنے لگی۔ اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ اتنے میں گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ باہر دیکھا تو لڑکے رفو چکر ہو چکے تھے۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی گاڑی میں بیٹھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے ساڑھے چار بج گئے تھے۔

"آج امی بہت پریشان ہوں گی۔" یہ خیال ہی اس کے اندر مسرتوں کے پھول کھلا رہا تھا۔ چہرے سے خوف غائب ہو کر خوشیاں اُمڈی پڑ رہی تھیں۔ وہ مسرت سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اندر داخل ہو کر چور نظروں سے گھر کا جائزہ لیا۔۔۔ سامنے ہی امی تیزی سے ٹہلتی ہوئی نظر آئیں۔ ٹینا پر نگاہ پڑی تو غصے سے پھٹ پڑیں۔

"کہاں تھیں اتنی دیر سے سب کو پریشان کر کے رکھ دیا۔"

"امی ایگزام ہونے والے ہیں۔ کچھ پریکٹیکلز رہ گئے تھے۔ جن کی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔" ٹینا نے اپنی خوشی دباتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو پہلے ہی پتہ تھا کہ پریکٹیکلز کا چکر ہو گا لیکن تمہارے ابّو کو کون سمجھائے۔ خواہ مخواہ پریشان ہو گئے۔ اچھے خاصے پروگرام کا ستیاناس مار دیا۔" وہ خاصی غصے میں نظر آ رہی تھیں۔

"کیسا پروگرام امی؟" اس نے انجان بن کر پوچھا۔

"بیگم منان کے گھر تھا لیکن اب خاک جاؤں گی۔" امی نے شعلہ بار نگاہوں سے اُسے دیکھا اور تیزی سے اندر چلی گئیں۔۔۔ انھیں پریشان دیکھ کر ٹینا کو بے حد خوشی کا احساس ہوا۔ وہ کتابیں ڈرائینگ روم میں پھینکتی ہوئی کچن میں پہنچ گئی۔ نانی رات کے کھانے کے لئے خانساماں کو ہدایات دے رہی تھیں اور ساتھ ساتھ مٹر بھی چھیلتی جا رہی تھیں۔ ٹینا کچن میں آئی اور چھیلے ہوئے مٹر کھانے شروع کر دیئے۔

"اے لڑکی کہاں سے آ رہی ہے تو؟" نانی نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"کالج سے آ رہی ہوں۔" اس نے بدستور مٹر کھاتے ہوئے جواب دیا۔

"اتنی دیر، تمہاری امی بہت پریشان تھیں۔ اب تم انھیں بہت ستانے لگی ہو۔"

"ہوں اپنی بیٹی کا تو خیال آ رہا ہے لیکن نواسی کا کوئی خیال نہیں۔" اس نے منہ بنا کر کہا تو نانی کی ہنسی نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"اب تم بچی تو نہیں ہو۔" نانی نے سمجھایا۔

"نانی میں بچی ہی تو ہوں۔ آپ کے لئے اور امی کے لئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔"

"جب ٹھیک ہے تو آپ یوں کیوں کہہ رہی ہیں۔" اُس نے نانی کی بات کاٹی۔

"اے لڑکی سارے مٹر کچے ہی کھا جائے گی۔"

"کیا کریں گی آپ؟" اس نے ہاتھ اور منہ چلاتے ہوئے پوچھا۔

"بھیجے میں ڈالوں گی اپنے۔"

"وہاں تو کوئی چیز ٹھہرتی ہی نہیں۔ مٹر بے چارے کہاں قیام کریں گے۔" ٹینا نے شرارت سے کہا۔

"مجھ سے مذاق کرتی ہے۔" نانی نے خفا ہو کر اسے گھورا۔

"ارے نانی آپ سے مذاق نہیں کروں گی تو کس سے کروں گی اور میرا کون ہے؟" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"اللہ سے خیر مانگ۔۔۔ کیا واہی تباہی بک رہی ہے اللہ تعالیٰ نے سب کچھ تو دیا ہے۔ ماں باپ بہن بھائی۔"

"ہوں گے۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"تیرے بھیجے میں کوئی بات نہیں ٹھہرے گی۔ بالکل ہی لاابالی ہے۔ چلو ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھاؤ۔ مجھے تو تمہاری صحت کی فکر کھائے جا رہی ہے۔"

"کیا ہوا ہے مجھے؟ اتنی ہٹی کٹی تو ہوں۔"

"سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ روز ایک وقت کا کھانا چھوڑ دیتی ہے۔" نانی بدستور فکر مندی سے بولیں۔

"ارے نانی، توبہ مجھے تو موٹاپے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"تو سوکھ کر کانٹا ہوئی جا رہی ہے کوئی فکر ہی نہیں۔"

"امی کو تو کوئی فکر نہیں۔ انھیں تو بس۔" وہ ایک دم چُپ سی ہو گئی۔

"اُسے بھی فکر ہے۔ ابھی دیکھا نہیں کتنی پریشان تھی۔"

"وہ تو اپنے پروگرام کی وجہ سے پریشان تھیں۔" ٹینا تلخی سے بولی۔

"جب بھی بولے گی۔ غلط ہی بولے گی۔ ہر دم اول فول بکتی رہتی ہے۔ چل اب کھانا کھا۔" نانی نے ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

"نانی آج تو میں یہیں کھانا کھاؤں گی۔"

ٹینا نے واش بیسن میں ہاتھ دھوئے اور نانی کی ساڑھی کے پلو سے ہاتھ صاف کرنے لگی۔

”ارے رے لڑکی کیا کرتی ہے۔ میں نماز پڑھتی ہوں۔“

”نانی کوئی بات نہیں۔ دوسری بدل لیجیے گا۔ ایمان سے آپ ساڑھی میں اتنی اچھی لگتی ہیں کہ بس۔۔۔ امی بھی نہیں ٹھہر تیں، آپ کے سامنے۔“

”اچھا اب بنا رہی ہے مجھے۔“ نانی اس کی خباثت پر مسکرائیں۔

”نہیں سچی ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اتنی پیاری تو ہیں ہماری نانی۔“ اس نے نانی کا بوسہ لیا تو وہ دھیرے سے ہنس دیں وہ آج بے حد خوش تھی۔ کچن میں کھانا کھانے کے بعد نانی نے اسے چائے پلائی۔ وہ آہستہ آہستہ ٹیبل بجاتی ہوئی گنگنانے لگی تھی۔

”بہت خوب۔“

اس نے پلٹ کر دیکھا تو سامنے ہی جلال اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ٹینا کا منہ بن گیا۔

اس نے دلکش مسکراہٹ سے دیکھا تو ایک لمحے کو ٹینا جھول سی گئی۔

”کمبخت مسکراتے ہوئے کتنا اچھا لگتا ہے۔ اُونہہ لیکن مجھے کیا؟“ اس نے سر جھٹکا۔

”کیا سوچ رہی ہیں؟“

”آپ کو بتانا ضروری ہے؟“ اس نے تیکھے سے انداز میں پوچھا۔

”میرا تو یہی خیال ہے۔“

”ضروری نہیں کہ آپ کا ہر خیال درست ہو۔“ اس نے جل کر کہا۔

”اتنا غصے میں مت رہا کیجیے۔ صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہوتا ہے۔“ جلال نے اسے چڑایا۔

”آپ میری فکر مت کریں۔“

”تمہاری فکر نہیں کروں تو بھلا اور کس کی فکر کروں گا۔“ وہ شوخی سے مسکرایا۔

”میں اتنی فالتو نہیں ہوں۔“

”فالتو۔۔۔ ارے تمہاری اہمیت تو کوئی ہم سے پوچھے۔“

”میری اور اہمیت۔“ ٹینا تلخی سے ہنس پڑی تو جلال حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ٹینا کی آنکھوں میں ایک زہر سا ابھر گیا اس کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر جلال نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

”آنٹی کہاں ہیں؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“

”اور حنا؟“

”نہیں معلوم۔“

”اردگرد کے لوگوں سے اتنی لاتعلقی اچھی نہیں ہوتی۔“ جلال نے خفگی سے کہا۔

”تعلق رکھنے سے فائدہ؟“

”اتنی آدم بیزار کیوں ہو؟“ وہ عاجز ہو کر بولا۔

”یہ آدم ہی کے رویے کا کمال ہے۔“ ٹینا نے طنزاً کہا۔ جلال نے اس کے طنز کی کاٹ محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا دکھ پہنچا ہے تمہیں آدم زاد سے؟“

”آپ کو بتانا ضروری تو نہیں ہے۔“ اس نے بے دردی سے ہونٹ کاٹے۔

”ٹینا! تم ایک دم اتنی اجنبی کیوں بن جاتی ہو؟ تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہارا یہ رویہ کتنا دل شکن ہوتا ہے۔“ جلال نے شاکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرا آپ سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اجنبی تو ہوں آپ کے لیے۔“

”اوہ خدایا یہ لڑکی مجھے پاگل کر دے گی۔“ جلال نے اپنا سر تھام لیا۔ ٹینا اسے غصے سے گھورتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

”بڑا آیا تعلق پیدا کرنے والا۔۔۔ لیکن اسے پریشان کرنے میں اتنا مزہ کیوں آتا ہے؟ اوہ خدایا میں لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کر کے اتنی لطف اندوز کیوں ہوتی ہوں؟ میرا رویہ اپنے لیے بھی اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی اتنا اذیت ناک کیوں ہو جاتا ہے؟“ اس نے الجھتے ہوئے سوچا۔

آج کل وہ ساری حرکتوں سے توبہ تائب ہو کر پوری یکسوئی سے پڑھ رہی تھی۔ اس کے فائنل ایئر کے امتحان ہو رہے تھے۔ کافی دیر سے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ وہ جھلاتی ہوئی آئی اور ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے جلال بات کر رہا تھا۔ وہ اور زیادہ جھلا گئی۔

”پلیز جلال مجھے تنگ نہ کریں۔ آپ کو علم نہیں کہ میرے ایگزام ہونے والے ہیں۔“ اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ ”کتنا پاجی ہے۔ معلوم بھی ہے کہ میرے ایگزام ہیں لیکن پھر بھی ستانے سے باز نہیں آتا۔“ وہ جھلاتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔

ٹینا کے امتحان ہو گئے تو وہ اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا سا

محسوس کرنے لگی۔ دماغ سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا لیکن ایک بات کا بے انتہا قلق تھا کہ امی نے ایک دن بھی آ کر نہ پوچھا کہ اُس کے پیپر کیسے ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں ان کا انتظار کرتی رہی لیکن انھیں نہ آنا تھا وہ نہ آئیں۔ ابو کئی بار اس سے پیپر کے بارے میں پوچھا کرتے لیکن امی نے قابلِ توجہ نہ سمجھا۔

نفرت کا ایک طوفان سا اس کے سینے میں اُٹھا۔ وہ ہونٹ دبا کر اس طوفان کو دبانے کی کوشش کرنے لگی۔ امتحان کے دنوں میں نانی نے اس کا پورا پورا خیال رکھا۔ بڑھاپے کی وجہ سے وہ کم کام کیا کرتی تھیں لیکن ٹمینا کے چھوٹے چھوٹے کام وہ اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتیں۔ اس کا وارڈ روب دیکھ کر نانی بے اختیار سر پیٹ لیتیں۔ تمام کپڑے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے ہوتے۔ ایک کپڑا نکالتیں تو تمام کپڑے آفت ناگہانی کی طرح اُوپر آ گرتے۔ نانی ابھی کپڑوں کے اس طوفان سے نبرد آزما ہوتیں کہ ٹمینا بھی پہنچ جاتی۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر بے ساختہ ہنس دیتی۔

"اے لڑکی کھڑی دانت نکال رہی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ مدد ہی کر لے۔"

"نانی اپنی مدد آپ۔" وہ چہکی۔

"بکتی ہے کمبخت۔ . . اب تو تجھے جوتے لگانے ہی پڑیں گے۔"

"ہائے قسم سے بڑی حسرت ہے جوتے کھانے کی۔" وہ بیڈ پر گرتے ہوئے بولی اور ادھ کھلی آنکھوں سے نانی کی حالت دیکھنے لگی۔

"ابھی پوری کرتی ہوں تیری حسرت۔" نانی نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے کمرے سے رفو چکر ہو گئی۔

"اللہ سمجھے اس لڑکی کو جانے کب عقل آئے گی۔ فریدہ کو لاکھ کہا ہے کہ اسے کبھی کبھار ڈانٹ دیا کرے لیکن وہ بھی نہیں سنتی۔" نانی بڑبڑاتے ہوئے اس کا وارڈروب ٹھیک کرنے لگتی۔

اُنہی دنوں حنا آپی کی شادی کا شور اُٹھ کھڑا ہوا۔ گھر میں چاروں طرف شادی کا ہنگامہ تھا۔ ٹمینا شادی کی رسموں میں پوری دلچسپی سے حصہ لے رہی تھی۔ کبھی وہ حنا آپی کے پاس ہوتی تو کبھی دیگر کاموں میں مصروف پائی جاتی۔ مینا باجی بھی آئی ہوئی تھیں۔ ان کی ڈھائی سالہ بیٹی ارم تو دو تین دنوں میں ٹمینا کی دیوانی ہو گئی تھی۔ ارم اس کی گود میں آتی تو فہد جیلس ہو کر اُسے اُتروا دیتا۔ ان دونوں کی نوک جھونک پر ٹمینا بے ساختہ ہنس دیتی۔ ایک بغل میں ارم کو سنبھالتی اور دوسرے کندھے پر فہد سوار ہو جاتا۔

"تم دونوں تو میرا بھرکس نکال دو گے۔ ارے کوئی ہے میری مدد کرنے والا؟" اس نے دہائی دی۔

"بندہ حاضر ہے۔" پیچھے سے آواز آئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ جلال سینے پر ہاتھ باندھے شرارت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کی مدد کس نے مانگی ہے؟" اس نے بڑے غصّے سے مُنہ بنالیا۔

"ابھی تو آپ خود ہی دہائی دے رہی تھیں۔"

"لیکن آپ کو نہیں پکارا تھا۔"

"نہ لیجیے ہماری مدد۔ بعد میں تو ہمیں ہی سنبھالنے ہوں گے۔" وہ زیرِ لب مُسکراتے ہوئے بولا تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"کون سنبھالنے ہوں گے؟"

"بچے اور کون۔"

"کس کے بچے؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"میرے اور آپ کے مشترکہ بچے۔" جلال نے بے باکی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو مارے شرم اور غصّے کے وہ سُرخ پڑ گئی

"شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔"

"میں تو مستقبل کی بات کر رہا ہوں۔"

"آپ ایسے نہیں مانیں گے۔ حنا آپی۔" اس نے آواز لگائی۔

"حنا تو اپنے کمرے میں بند ہیں۔" جلال نے اسے چڑایا تو وہ غصّے سے پیر پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔

شادی والے دن وہ دلوں پہ بجلیاں گرا رہی تھی۔ نیلے رنگ کے سُوٹ پر سفید کام کیا ہُوا تھا۔ سفید ہی زیور پہنے وہ دل کو چھُو لینے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ لمبے ملائم بال کمر کو چھُو رہے تھے۔ وہ بال بکھرائے اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔ جلال سامنے سے آتا دکھائی دیا تو وہ کوریڈور میں بڑے ستون کی اوٹ میں چھُپ گئی۔ وہ اس کے سامنے آ کر اُسے ستانے کے موڈ میں تھی۔ جلال کی امی جان اس کی بہت سی بلائیں لے چکی تھیں۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ جلال جا چکا ہو گا تو وہ پلٹی لیکن سامنے ہی جلال کو دیکھ کر دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اس کا سراپا دیکھ کر ٹمینا کا اپنا دل ہاتھوں سے نکلتا ہُوا محسوس ہُوا۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے مست نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔


WHITE
Beauty
TOILET SOAP
ہر روز دلکشی
ہر روز تازگی

"لگتا ہے آج تو قریب ہی بجلی گری ہے۔"

وہ گنگ سی کھڑی رہ گئی۔ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ اپنی خیریت اس میں سمجھی کہ یہاں سے بھاگ کھڑی ہو۔ لہٰذا جلدی سے پہلو بدل کر نکل گئی۔

حنا آپی کی شادی کے بعد وہ تقریباً تنہا رہ گئی۔ اب تو اور زیادہ چڑچڑی ہو گئی تھی۔ وہ سوچتی۔ اب تو میں اکلوتی لڑکی رہ گئی ہوں۔ پھر بھی امی میری جانب توجہ نہیں دیتیں۔

ایک دن اس نے بے خیالی میں نانی سے کہہ دیا۔

"نانی! امی کو مجھ سے کوئی محبت نہیں۔"

نانی نے چونک کر اُسے دیکھا۔ "یہ کس نے کہہ دیا تجھے؟"

"ایسے ہی۔ ۔ ۔ بس مجھے خیال آ گیا تھا۔"

"غلط خیال ہے تمھارا۔ فریدہ کو تم سے بے انتہا محبت ہے۔"

"لیکن انھوں نے عملی طور پر کچھ بھی نہیں کیا۔"

"عملی طور پر۔ ۔ ۔ کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"میرا مطلب ہے محبت کا عملی مظاہرہ نہیں کیا۔" ٹینا نے اُلجھ کر بتایا۔

"یہ تمھارا وسوسہ ہے۔ ٹینا تمھاری امی تم سے بے انتہا محبت کرتی ہیں۔ بھلا اپنی اولاد سے کون محبت نہ کرے گا۔ دراصل تمھاری امی ان عورتوں میں سے ہیں جو ظاہری محبت پر یقین نہیں رکھتیں۔ بس اُسے اپنے دل میں پوشیدہ رکھتی ہیں۔" نانی نے اُسے سمجھایا۔

"اولاد سے محبت پوشیدہ رکھنے کا کیا جواز ہے۔ آپ کو نہیں معلوم اس سے کتنی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ پورا وجود ہی اُمید و بیم کی سُولی پر لٹکا دیتا ہے۔ کسی بات پر یقین نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ قوتِ فیصلہ کی صلاحیت بھی مجروح ہو جاتی ہے۔ پوری شخصیت بے اعتباری کی دُھند میں گم ہو جاتی ہے۔ انسان ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اولاد سے محبت فطری ہوتی ہے اور اظہار بھی فطری ہوتا ہے۔ میں نہیں مانتی کہ کوئی جان بوجھ کر اس سے گریز کرے۔ امی کو تو سرے سے مجھ سے کوئی محبت نہیں۔"

"اس انداز میں مت سوچا کرو۔" نانی نے بڑے پیار سے سمجھایا۔

"یہ تمام احساسات میرے اندر سے اُبھرتے ہیں۔ نانی آپ نے کبھی آدھے چہرے والے لوگ دیکھے ہیں۔ آدھا چہرہ ہے اور آدھا گم۔ ۔ ۔ اپنے آپ کو ہی دھوکا دیتے ہیں۔ اپنا چہرہ ہی دیکھنے کو ترستے ہیں۔ اپنی شناخت ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ ماں کی محبت ہی تو انسان کو شناخت بخشتی ہے۔ جب ماں خوش ہو کر لوگوں سے کہتی ہے کہ میری فلاں بیٹی پڑھنے میں بہت تیز ہے۔ میری بڑی بیٹی بہت جینئس ہے۔ چھوٹی منی تو میرے بغیر سو ہی نہیں سکتی کتنی اچھی لگتی ہیں۔ مائیں ایسی باتیں کرتی ہوئی، لیکن ہمارے تو کان ترس گئے ہیں ایسی باتیں سُننے کے لئے۔" اس کی آنکھوں سے بے اعتباری جھلک رہی تھی۔ نانی کو اس کی باتوں سے خوف آنے لگا۔

"ٹینا بہت غلط انداز میں سوچنے لگی ہو۔ یہ منفی سوچیں کہیں تمھیں توڑ پھوڑ کر نہ رکھ دیں۔"

"لیکن امی کو اس کی کوئی پروا نہیں۔" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔

"آخر کیا چاہتی ہو؟"

"کیا چاہتی ہوں میں یہ جاننے کے باوجود بھی انجان ہوں۔" وہ اُداس سی ہو کر بولی تو نانی نے بے اختیار اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"میں جو تم سے اتنی محبت کرتی ہوں۔"

"نانی مجھے زندگی میں آپ سے زیادہ اور کوئی عزیز نہیں ہے۔ سچ آپ نے تو مجھے محبت کے مفہوم سے آشنا کیا ہے۔ اگر آپ بھی نہ ہوتیں تو مجھے معلوم ہی نہ ہو پاتا کہ محبت کیا شے ہے۔ کس جذبے کا نام ہے۔" اس کی پلکیں بھیگ سی گئیں۔ اپنے آنسو چھپانے کی خاطر اس نے نانی کے سینے میں سر چھپا لیا۔

اُنہی دنوں اس کی زندگی میں ہلچل مچ گئی۔ جلال نے اُسے پرپوز کیا تھا۔ امی اور ابّو کو وہ بے انتہا پسند تھا لیکن اس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر انکار کر دیا۔ اپنے آپ کو اذیت دینے کا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ اس کے انکار پر امی آگ بگولہ ہو گئیں۔

"آخر کوئی وجہ بھی تو ہو انکار کی؟"

"کوئی وجہ نہیں۔"

"ٹینا تم آج تک میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

"آپ نے سمجھنے کی کوشش ہی کب کی۔" وہ جھکی جھکی نگاہوں کے ساتھ بولی۔

"میں ہاں کیے دیتی ہوں۔ آخر بے وقوفی کی انتہا ہے۔"

"نہیں امی! آپ ایسا نہیں کریں گی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"اتنا اچھا رشتہ ٹھکرانا حماقت ہے۔ اپنے خاندان کے

لوگ ہیں۔ تم نے کبھی عقل کی بات بھی کی ہے" امی کو تاؤ آگیا۔

"اچھا ہے مجھے اپنی بے وقوفی کی سزا مل جائے" وہ آنکھوں میں آئے آنسو پیتے ہوئے بولی۔ آواز ٹوٹ ٹوٹ سی گئی۔

امی اس کی بے جا ضد کے آگے بے بس سی ہو کر رہ گئیں۔ انکار کر کے ٹینا بھی خوش نہ تھی لیکن وہ اپنے ساتھ اُن لوگوں کو بھی تنگ کر کے نہ جانے کس بات کا بدلہ چکانا چاہتی تھی۔ ابو نے ساری بات ٹینا پہ چھوڑ دی تھی۔ امی ان کے فیصلے پر تلملا سی گئیں۔

"یہ لڑکی تو ہمیں رسوا کر کے چھوڑے گی۔ آخر مینا اور رحنا بھی تو تھیں۔ مجال تھی جو انکار کرتیں لیکن اس لڑکی کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ نہ جانے کیا سودا سمایا ہوا ہے دماغ میں مزاج ہی نہیں ملتے۔ کمبخت نہ جانے کس کس پر گئی ہے؟"

وہ اپنی چیئر پر بیٹھی مسلسل سوچوں میں گم تھی۔

"مجھے انکار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ آخر اس میں جلال کا کیا قصور ہے۔ وہ کتنا پریشان ہوگا۔ اگر اسے واقعی مجھ سے محبت ہے تو یقیناً برسوں میرا انتظار کرے گا لیکن اگر وہ صرف فلرٹ کر رہا ہے تو کسی دوسری لڑکی سے بیاہ رچا کر تمام باتیں بھلا دے گا کہ یہی دستورِ زمانہ ہے تو کیا جلال بھی مجھے بھلا دے گا... وہ بھی...!" ایک درد کی لہر اُٹھی اور اُس کے پورے وجود پر چھا گئی۔

دروازہ زور سے کھلنے کی آواز آئی تو ٹینا نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے ہی جلال کھڑا سلگتی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک اُسے گھورتا رہا پھر آہستہ آہستہ اُس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

"انکار کیوں کیا تم نے؟"

"میری مرضی" اُس نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی اس ادا پر وہ تڑپ سا گیا۔

"ٹینا یہ اتنا معمولی سا مسئلہ نہیں ہے کہ تم اسے میری مرضی کہہ کر ٹال دو۔ یہ میری خوشیوں کا معاملہ ہے"

"میں آپ کی خوشی کب سے بن گئی ہوں؟" وہ ذرا تمسخر سے ہنسی۔

"جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ اپنی خوشیوں میں ہمیشہ تمہیں ساتھ دیکھا ہے۔ میں تمہارے رویے کو عام سی بات سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دیتا رہا لیکن..."

"اہمیت!" اس نے تڑپ کر جلال کی بات کاٹی "یہاں مجھے اہمیت کس نے دی ہے جس سے میں نے یہ چیز چاہی جب اس نے ہی خالی ہاتھ لوٹا دیا تو آپ سے کیا شکوہ۔ آپ بھی مت دیجئے اہمیت"

"ٹینا غلط مت سمجھو۔ تم نہیں سمجھ سکتیں کہ میری زندگی میں تمہاری کتنی اہمیت ہے۔ میں نے کبھی بھی تمہیں اپنے آپ سے جُدا نہیں سمجھا۔ زندگی کے ہر موڑ پر تمہارے ساتھ چلنا چاہتا ہوں میرے تمام جذبے تمہارے لئے ہیں لیکن تم نے انکار کر کے مجھے بے حد اپ سیٹ کر دیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی بے حس بھی ہو سکتی ہو"

"آپ مجھے سمجھے ہی کب ہیں" وہ بڑے شکست خوردہ انداز میں بولی۔

"ہاں آج تک نہ سمجھ سکا"

"اگر سمجھ بھی جاتے تو کیا فرق پڑ جاتا" ٹینا نے اداسی سے سر جھٹکا۔ اُسے دیکھتے ہوئے جلال گمبھیر لہجے میں بولا۔

"انکار کی وجہ؟"

"بظاہر تو کوئی وجہ نہیں" وہ بدستور انجان پنے سے بولی۔

"اوہ خدایا! ٹینا اتنی لاتعلقی کا مظاہرہ مت کرو کہ میں تمہیں پاگل سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں"

"آپ کو شادی ہی تو کرنی ہے۔ مجھ سے نہ سہی اور کسی سے سہی!"

"کاش کہ تم مجھ کو سمجھ سکتیں" جلال نے بے بسی سے کہا اور تیز تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔

اس کے انکار پر نانی بھی بہت خفا تھیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے انکار کیوں کیا۔ مجھے تو جلال بیٹا بہت پسند ہے"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تم نے جواب نہیں دیا"

"کیا جواب دوں؟" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی

"آخر ایسی کون سی مجبوری ہے۔ کیا کسی اور کو پسند کرتی ہو؟" نانی نے رازداری سے پوچھا تو بے ساختہ ٹینا کی ہنسی نکل گئی۔ اسے نانی کی دوستی پہ بے انتہا ناز تھا۔

"اے لو سب کی جان نکل رہی ہے اور تو ہنس رہی ہے" نانی نے ناراضگی سے اُسے گھورا۔

"آپ نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی"

"تمھاری امی بےحد ناراض ہیں۔" نانی نے جتایا۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق کیوں نہیں پڑتا۔ تم نے کبھی انہیں اہمیت ہی نہیں دی۔"

"اگر یہی بات میں ان کے لئے کہوں تو؟" اس نے تیکھی نگاہوں سے نانی کی جانب دیکھا۔

"غلط سوچتی ہو تم۔ اگر اُسے تم سے کوئی محبت نہ ہوتی تو وہ بھلا تم سے ناراض کیوں ہوتی۔ وہ تو تمھارا بھلا چاہتی ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ہونٹ کاٹ کر رہ گئی امی کی ناراضگی نے اُسے اور زیادہ اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ٹینا ان کی ناراضگی کو بےجا سمجھتی تھی کیونکہ جلال کا تعلق صرف اس کی ذات سے تھا۔ جب وہی اس سے شادی پر آمادہ تھی امی کا ناراض ہونے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ انھوں نے زندگی میں کبھی میری بات نہیں مانی۔ میں بھلا ان کی پسند کو سراہ کر ان کی حوصلہ افزائی کیوں کروں۔ انھوں نے تو ہمیشہ میرے اعتماد کو توڑا ہے۔ میری محبت کے تصور میں شگاف ڈالے ہیں محبت کی اتنی کچی بنیاد ڈالی کہ میں ابھی تک ڈول رہی ہوں۔ شکست و ریخت کے کربناک مرحلے سے گزر رہی ہوں۔

وہ دوبارہ امی کو پریشان کرنے کے حربے سوچ رہی تھی ذہنی طور پر شدید دباؤ کا شکار تھی۔ وہ سوچوں میں گم تھی کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اُس نے ریسیور اُٹھایا۔ دُوسری جانب کوئی صاحب بول رہے تھے۔

"سوری میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" ٹینا نے کہا۔

"آپ مجھے کیسے پہچانیں گی۔ آپ کو تو انسانوں کو پہچاننے کا فن ہی نہیں آتا۔"

"میں سمجھی نہیں، کون ہیں آپ؟" وہ اُلجھ سی گئی۔

"آپ کا ایک خیرخواہ۔"

"میرا خیرخواہ۔" وہ حیرت سے بڑبڑائی۔

"میرا نام رضا ہے۔ جلال کا دوست ہوں۔"

"اُوہ۔" بےاختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ "سفارش کرنا چاہتے ہیں اپنے دوست کی۔"

"غلط سمجھی ہیں آپ لیکن اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ اتنے اچھے انسان کو ٹھکرا کر آپ نے اچھا نہیں کیا۔"

"میں اپنا اچھا بُرا آپ سے بہتر سمجھتی ہوں۔ یہ بتایئے آپ کو جلال نے کہا ہے بات کرنے کو۔" وہ طنزاً بولی۔

"جی نہیں محترمہ۔ اگر جلال کو معلوم ہو جائے تو وہ سچ مچ میری کھال کھینچ لے۔"

"اچھا تو پھر آپ نے کھال کھنچوانے کے شوق میں فون کیا ہے۔" وہ تمسخر سے ہنسی۔

"میں آپ کو سیدھی راہ دکھانا چاہتا تھا۔"

"لوگوں کو سیدھی راہ دکھانا آپ کا پیشہ ہے یا مشغلہ؟" وہ بدستور تمسخر سے بولی۔

"میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ نفسیاتی کیس ہیں پاگل ہیں آپ۔"

"واٹ۔۔۔؟" وہ حیرت اور غصّے کی ملی جلی کیفیت سے چیخی۔

"مس ٹینا آپ نفسیاتی مریضہ ہیں۔ آپ جیسے لوگوں کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ آپ جلال کو ٹھکرا کر اپنی اہمیت اُجاگر کرنا چاہتی ہیں۔ اسے جتلانا چاہتی ہیں کہ آپ سب سے افضل ہیں۔ جو چاہے کر سکتی ہیں۔ حالانکہ آپ دل سے اُسے چاہتی ہیں لیکن بظاہر اُسے پریشان کر کے اپنی اندرونی کیفیات کی تسکین کرنا چاہتی ہیں لیکن میں بتا دُوں اپنی اہمیت جتانے کا بڑا گھٹیا طریقہ اپنایا ہے آپ نے۔"

وہ ریسیور تھامے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ دماغ سن ہو گیا پھر ایک دم چیخ اُٹھی۔ "شٹ اپ۔"

دوسری طرف رضا نے فون رکھ دیا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ریسیور رکھا اور پاس والی کرسی پر گر پڑی۔ پورا وجود پسینے میں نہا گیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے ماتھے سے پسینہ صاف کیا رضا کی باتیں سیدھی دل میں لگی تھیں لیکن اپنی سبکی کے احساس سے بُری طرح سُلگ اُٹھی۔ رہ رہ کر اس پر تاؤ آ رہا تھا۔ آجکل شدید تنہائی کا شکار تھی۔ نانی کو اپنے نئے ارادے سے آگاہ کیا تو وہ حیرانی سے چیخیں۔

"ٹینا کیا کہہ رہی ہے۔ پاگل ہو گئی ہے تُو؟"

"نانی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میری حالت پر شبہ ہے کیا؟" وہ مسکرائی۔

"تو مسکرا رہی ہے لڑکی اور میرے پتنگے لگ گئے ہیں۔"

"اس میں پتنگے لگنے کی کیا بات ہے۔" وہ نانی کے گھٹنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"فریدہ کو علم ہو گا تو وہ کتنی پریشان ہو گی۔"

"یہی تو میں چاہتی ہوں۔" اس نے زیرِ لب مسکرا کر سوچا نانی کی تسلی کے لئے بولی۔

"نانی وہ بھلا کیوں پریشان ہوں گی۔ انھیں کیا دلچسپی ہے مجھ سے۔"

"پھر وہی فضول بات۔" نانی نے اسے گھورا۔

"سچ ہی تو کہہ رہی ہوں۔" وہ ہنستی ہوئی بولی۔

"اللہ تجھے سمجھائے۔ کچھ ہوش کے ناخن لے۔ میں نے سنا ہے وہ بڑی خراب جگہ ہے۔ اچھے گھروں کی لڑکیاں وہاں نہیں جاتیں۔" نانی نے تفکر سے کہا۔

"اچھے گھروں سے کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"شریف گھروں کی بہو بیٹیاں۔" نانی نے سمجھایا۔

"میری بہت سی سہیلیاں کلب جاتی ہیں۔ عام سی بات ہے۔"

"پھر وہ اچھے گھر کی نہیں ہوں گی۔"

نانی کی بات سن کر وہ سوچنے لگی۔ ٹھیک کہتی ہیں نانی بھی۔ وہ تو صنوبی اور اپنے ہی خول میں بند لوگوں کی جگہ ہے کوئی کسی کو نہیں پہچان پاتا۔

"نانی آپ امی کو مت بتائیے گا۔"

"اچھے گن سیکھ رہی ہے تو۔" نانی نے اسے گھورا۔

"اُفوہ! نانی آپ تو میری ہر بات مان لیتی ہیں۔ پھر یہ بھی مان جائیے۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ میں نے کہا نا وہ اتنی بری جگہ نہیں ہے۔ بس لوگ آتے ہیں اور خوش گپیاں کر کے چلے جاتے ہیں۔"

"گھر پر بھی خوش گپیاں کی جا سکتی ہیں۔"

"گھروں میں اتنی فرصت کسے ہے۔" وہ حسرت سے بولی۔

"اگر وہ بری جگہ نہیں ہے تو لوگ اسے برا کیوں کہتے ہیں۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ لڑکیاں موئی فرنگنوں کی طرح ناچتی ہیں۔ حرام چیزیں پی جاتی ہیں۔"

"توبہ کیجیے نانی۔ . . توبہ۔" ٹمینا نے اپنے گلے پیٹے۔

"چل ہٹ ایسی کون سی بات کہہ دی جو تو یہ کر رہی ہے۔"

نانی نے آنکھیں دکھائیں تو وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

"نانی آپ کی اطلاع بالکل غلط ہے۔ وہاں یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ پھر ہر انسان کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔ بس بے چارے لوگ ہنس بول لیتے ہیں۔ یہ دنیا تو کسی کو ہنستے بولتے بھی نہیں دیکھ سکتی ہے۔"

"لیکن میں نے کہہ دیا کہ تو وہاں نہیں جائے گی۔ اگر حسنین کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا۔"

"ابو کو پتہ نہیں چلے گا۔ ہائے نانی اتنا ظلم تو نہ کریں۔" وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

"اے لڑکی تو بھی۔ سوا کر کے چھوڑے گی۔" نانی فکرمندی سے بولیں۔

"میرے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے جو آپ کو سوا کرے۔" ٹمینا نے سینہ پھلایا۔

"چل اب اپنے کرتوتوں پر نظر ڈال۔"

"اتنے برے بھی نہیں ہیں۔" وہ چہکی۔

"دوسری لڑکیاں تو ایسی نہ تھیں۔ تو نہ جانے کس پر گئی ہے۔ ہر وقت الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہے۔"

"نانی سب لوگ ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔ آپ لوگ چاہتے ہیں پوری زندگی لگے بندھے انداز میں گزر جائے۔ جیسا آپ چاہتے ہیں دوسرے لوگ اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ یہ تو ناممکن ہے نانی۔"

"پھر سب سے الگ ہونا چاہیے۔ انٹیلیکچول . . . لیکن ہمارے ماحول میں تو انٹیلیکچول لوگ مشکل ہی سے ہضم ہوتے ہیں۔"

"کہیں علیحدہ ہونے کا خبط تجھے نہ ڈوبے۔" نانی پریشانی سے سر تھامے ہوئے بولیں۔

"میری پیاری نانی کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔" اس نے نانی کا منہ چوما اور بولی۔ "ہائے نانی اتنی خوشامدیں تو آج تک میں نے کسی کی بھی نہیں کیں۔"

"اچھا تو تو یہ خوشامدیں کر رہی ہے میری۔" نانی نے خفگی سے گھورا۔

"نہیں، نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اچھا نانی اب مان بھی جائیے۔"

"اے لڑکی میں کیا کروں؟" انھوں نے پریشانی سے اپنا ماتھا پیٹا۔

"وہی جو میں کہتی ہوں۔" وہ مزے سے بولی۔

"اچھا تو کر لے جو تیرا دل چاہتا ہے لیکن الٹی سیدھی حرکتیں مت کرنا۔" بالآخر انھوں نے ہار مان کر کہا۔

گہرے کلر کے کپڑوں میں ملبوس، بالوں کو شانوں پر پھیلائے آنکھوں پر بڑا ڈن سن گلاسز لگائے حد درجہ جچ رہے تھے۔ وہ کلب میں داخل ہوئی تو بے اختیار بہت سی نظریں اس کی جانب اٹھیں اور ساکت ہو گئیں۔ بہت سے ہاتھوں میں تھمے ہوئے گلاس ایک جگہ جم گئے۔ وکی کا گروپ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"یہ قیامت آج کدھر بھول پڑی" مہمانی مسکرائی۔

"ہوں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں" وکی نے سلگتا ہوا سگریٹ بے خیالی میں ہونٹوں سے لگایا تو لب جل اٹھے۔ جلدی سے اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر جمیل نے قہقہہ لگایا۔

"بعض اوقات لوگوں کو اپنے آپ پر بالکل اختیار نہیں رہتا ہے۔"

اس کی چوٹ پر وکی خجل سا ہو کر ٹھوڑی سہلانے لگا۔ ٹمینا سب کی کیفیات سے بظاہر بے خبری ایک کونے والی چیئر پر بیٹھ گئی لیکن سب کا کن انکھیوں سے جائزہ لے رہی تھی۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اُس کا عکس ڈول رہا تھا۔ وہ زیرِ لب مسکرا دی۔ اپنی اہمیت کے احساس سے دل کے کسی گوشے میں طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ دھیرے دھیرے اسکوائش کے گھونٹ لے رہی تھی اتنے میں وکی اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"مجھے وکی کہتے ہیں۔"

"جی پھر میں کیا کروں؟" اس نے بے نیازی سے نگاہیں اُٹھا کر کہا تو وکی اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ڈوبتے بچا۔

"آپ فی الحال تو کچھ نہ کریں لیکن اتنا کرم ضرور کریں کہ مجھ سے دوستی کر لیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میری آپ سے دشمنی بھی نہیں ہے۔"

"لیکن دوستی بھی تو نہیں ہے۔"

"کیا چاہتے ہیں آپ؟" وہ بدستور بے نیازی سے بولی۔

"آپ سے دوستی۔"

وکی کی نظریں بدستور اس کے سراپے پر جمی ہوئی تھیں اُس کی نگاہوں میں نہ جانے کیا تھا کہ ٹمینا اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی۔ وکی کی نگاہوں کا انداز اسے پسند نہ آیا لیکن بظاہر وہ خوش اخلاقی سے بولی۔

"تشریف رکھیے۔"

"شکریہ!" وہ مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔

"میں سیٹھ عنایت کا صاحبزادہ ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"سیٹھ عنایت" وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ ان کا ذکر اکثر ابو سے سنا تھا۔ وہ اکثر افسوس کرتے تھے کہ سیٹھ عنایت کا لڑکا غلط صحبت کا شکار ہو گیا ہے۔

"آپ اپنا تعارف کروانا پسند نہیں کریں گی۔ آئی مین آپ کے والد کیا کام کرتے ہیں؟" وکی نے پوچھا۔

"میں کسی کے حوالے سے تعارف کروانا پسند نہیں کرتی۔ میں ٹمینا ہوں۔"

"آل رائٹ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ ٹمینا ہیں۔ آپ بہت خوبصورت ہیں۔" وکی نے کہا۔

"آئی نو۔" اس نے لاپروائی کا مظاہرہ کیا لیکن اندر ہی اندر دل کانپ کر رہ گیا۔

"یہ بھی جانتی ہیں کہ دیکھنے والا پہلی نظر میں آپ پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ آئی لو یو۔" وکی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو ٹمینا جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ کر خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورنے لگی۔ اُسے یوں گھورتا دیکھ کر وکی کی ساری خوشی چشم زدن میں کافور ہو گئی۔

"اوہ میں سمجھا تھا آپ۔" وہ گڑبڑا سا گیا۔

"غلط سمجھے تھے آپ۔" اُسے وکی پر بے انتہا غصہ آیا۔ دل چاہا تین حرف بھیج کر اُٹھ جائے لیکن اپنی اہمیت کا جو احساس یہاں آ کر ہوا تھا اُسے کس طرح فراموش کر دیتی۔ وہ احساس تو ایک نشہ بن کر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گیا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" وکی خجالت آمیز انداز میں بولا۔

ٹمینا نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس اپنی زلفیں سنوارتی ہوئی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کے یوں نظرانداز کرنے پر وکی نے دانت کچکچا کر سوچا۔ بڑی نخرے والی ہے۔ مشکل سے ہاتھ آئے گی۔ وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ کل آئیں گی؟" اس نے بے صبری سے پوچھا۔

"اگر میرا موڈ ہوا تو۔" ٹمینا نے ایک ادا سے بالوں کو جھٹکا دے کر کہا اور ہال سے باہر نکل گئی۔

"موڈ کی ایسی کی تیسی، آنا تو پڑے گا۔ وکی کو امپریس کر کے چھوڑ دینا آسان بات تھوڑی ہے۔" وہ ہاتھ ملتا ہوا اپنے گروپ کی جانب چلا گیا۔

گھر آ کر وہ پُرسکون سی بیڈ پر لیٹ گئی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ لوگوں کی دیوانگی یاد کر کے بے اختیار ہنس دی۔ وہ خود بخود مسکرا رہی تھی۔

دوسرے دن وہ پنک کپڑوں میں ملبوس دلوں پر بجلیاں گراتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔ آج اُسے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ سامنے ہی وکی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ٹمینا اُسے نظرانداز کرتی ہوئی کل والی جگہ پر آ بیٹھی۔ وہ ہال کا جائزہ لینے میں مصروف تھی کہ وکی آ دھمکا۔ اُسے دیکھ کر ٹمینا کے ماتھے پر ناگوار سی لکیریں اُبھر آئیں لیکن اخلاقاً اسے ہیلو کرنا پڑا۔

"بہت دیر کر دی آپ نے" وہ بے قراری سے بولا "آپ میرا انتظار کر رہے تھے؟"

"جی ہاں بہت بے چینی سے۔ آپ نے تو ایک ہی دن میں اپنا دیوانہ بنا دیا ہے" وہ بے تکلفی سے بولا۔

"اپنا دل و دماغ قابو میں رکھیے۔ ایک ہی دن میں دیوانہ بننا ٹھیک نہیں۔ یہاں ہزاروں خوبصورت چیزیں ہیں۔ ہر ایک کے لئے اسی طرح دیوانگی کا اظہار کرتے رہے تو بقیہ زندگی پاگل خانے میں گزرے گی۔"

اس نے طنزاً کہا تو وکی اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گیا۔

اسی لمحے رضا ہال میں داخل ہوا تو سامنے ہی ٹینا کو وکی کے ساتھ دیکھ کر ٹھٹھک سا گیا۔ آنکھوں میں حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ فکر و تردد سے بھرا چہرہ لئے اسے دیکھنے لگا۔ وہ ٹینا کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے یوں وکی کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر بہت بُرا محسوس ہوا کیونکہ وکی اچھے چال چلن کا مالک نہیں تھا۔ اپنی اچھی شکل و صورت کی وجہ سے اکثر لڑکیوں کو فریب دے دیتا تھا۔ ٹینا کو اس کے ساتھ دیکھ کر رضا سوچ میں پڑ گیا۔

"اوہ خدایا یہ لڑکی اپنے آپ کو تباہ کر دے گی۔"

وہ باقاعدگی سے کلب آ رہی تھی۔ بہت سے لوگوں سے دوستی ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں لیکن پھر بھی ان سے ہنس بول لیتی۔

وکی نے جب دیکھا کہ ٹینا آسانی سے ہاتھ آنے والی نہیں ہے اس نے ایک پلان بنایا۔ وہ حسب معمول کلب میں مختلف لوگوں کو دیکھتی پھر رہی تھی کہ وکی اپنے ساتھ ایک اسمارٹ سی لڑکی کو لئے اس کی طرف آیا۔

"ٹینا ان سے ملئے۔ یہ میری بہن نیشا ہے۔"

"ہیلو!" وہ دلکشی سے مُسکرائی۔ ٹینا بھی جواباً مُسکرائی لیکن قدرے حیرانی سے بولی۔

"مسٹر وکی آپ کی بہن کلب آتی ہیں۔ میرا مطلب ہے لوگ اچھا نہیں سمجھتے۔"

"آپ بھی تو آتی ہیں" وکی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ گڑبڑا سی گئی۔

"اوہ میری تو اور بات ہے۔"

"اور بات۔۔۔" نیشا بڑبڑائی۔

"ارے چھوڑیئے اس بات کو۔۔۔" ٹینا نے شانے جھٹکتے ہوئے بات ٹالی۔

"چلئے چھوڑ دیتے ہیں لیکن آپ کو نہیں چھوڑیں گے۔"

نیشا معنی خیزی سے مُسکرائی۔

"جی۔۔۔" وہ قدرے گھبرا سی گئی۔

"آپ ہمیں بہت اچھی لگی ہیں بلکہ بہت ہی اچھی" نیشا نے بے تکلفی سے کہا تو ٹینا نے مُسکراتے ہوئے ماتھے سے پسینہ صاف کیا تھا۔

"کبھی ہمارے گھر آیئے نا" نیشا نے دعوت دی۔

"ہاں ضرور آؤں گی۔"

"نہیں صاحب یہ ہم جیسے غریب لوگوں کے گھر کب آئیں گی" وکی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ارے نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں" وہ دھیرے سے مُسکرائی۔

"پھر کب آ رہی ہیں آپ؟"

"آئیں گے کبھی" وہ بے نیازی سے بولی۔

"نہیں بھئی باقاعدہ پروگرام بننا چاہئے۔ ممی بھی بہت خوش ہوں گی۔"

"ہاں ٹینا جی ہماری ممی پارٹیز بہت اچھے طریقے سے منانے کی عادی ہیں۔ اس معاملے میں تو وہ بالکل پسند نہیں کرتیں" وکی نے بتایا۔

"ٹینا پکنک کا پروگرام نہ بنایا جائے؟" نیشا نے اس کی رائے طلب کی۔

"پکنک۔۔۔ سوری میں کہیں دُور نہیں جا سکتی۔"

"دُور کیوں یہیں اپنے شہر میں۔۔۔ سچ مجھے ساحل سمندر پر پکنک منانے کا بے حد شوق ہے" نیشا نے کہا۔ "آپ چلیں گی نا؟"

"سوچوں گی۔"

وکی نے معنی خیز نگاہوں سے نیشا کو دیکھا۔

"بھئی سوچنا وچنا کیا۔ ہم کیا پیرس جا رہے ہیں" نیشا نے منوانا چاہا۔

"پھر کبھی سوچ کر جواب دُوں گی۔۔۔ اچھا بائے بائے۔" ٹینا دلکشی سے مُسکرائی اور ہاتھ ہلاتی ہوئی ہال سے باہر چلی گئی۔

آجکل نیشا کا زیادہ تر کام یہی تھا کہ ہر وقت ٹینا کے ساتھ لگی رہتی۔ ٹینا کو بھی بظاہر یہ لڑکی اچھی لگتی تھی۔ دُنیا کے ہر موضوع پر بے تکان بولے جاتی۔ اس کی معلومات قابل رشک تھیں۔ ٹینا اس کی ذہانت کی قائل سی ہو گئی تھی۔ وہ دُنیا کے بیشتر ممالک گھوم پھر کر آئی تھی۔ وہاں کے رسم و رواج کے بارے میں اس کی معلومات بھرپور تھیں، سیاست، معاشرت، مذہب، معاشی

حالات، غرض کہ ہر موضوع پر وہ نہایت دانشمندی سے اظہارِ خیال کرتی تھی۔ ٹینا رفتہ رفتہ اس کے ساتھ گھلتی ملتی جارہی تھی لوگوں کو رجھانے میں نیشا کو کمال حاصل تھا۔ ایک لمحے میں متاثر کرلیتی تھی۔ ایک دن وہ ٹینا سے بولی۔

"ٹینا کبھی ہمیں بھی اپنے گھر لے چلو۔"

"ہاں بالکل۔" وِکی نے بھی تائید کی۔

"اُوہ میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ میں اس شہر کی باسی نہیں ہوں۔ میں یہاں اپنے ایک انکل اور آنٹی کے ہاں آئی ہوئی ہوں۔ آپ لوگوں کو اس لئے نہیں لے جاتی کہ انھیں تکلیف نہ ہو۔" ٹینا نے بہانہ گھڑا۔

"پہلے تو تم نے کبھی یہ بات نہیں بتائی۔" نیشا نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"پہلے تم لوگوں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"آپ اس کلب تک کیسے پہنچیں؟ اور پھر تنہا ہی آجاتی ہیں۔" وِکی نے حیرت سے پوچھا تو وہ ہنس کر بولی۔

"اب میں اتنی اجنبی بھی نہیں ہوں۔ اس شہر کا چپہ چپہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ دراصل میں چھٹیاں یہیں پر آکر گزارتی ہوں۔ مجھے اس شہر سے خاص اُنسیت ہے۔ خصوصاً سمندر تو بے انتہا پسند ہے۔"

"اُوہ سمندر تو مجھے بھی بہت پسند ہے۔ ٹینا کسی دن چلیں۔" نیشا نے ایک دم کہا۔

"دیکھا جائے گا۔" اس نے بالوں کو جھٹکا دے کر کہا تو وِکی ہونٹ بھینچ کر نیشا کو دیکھنے لگا۔

"ٹینا ضرور چلنا۔ میری کمپنی تمھیں بور نہیں کرے گی۔"

"ہاں ضرور چلوں گی۔"

"سچ تمھاری کمپنی تو میں بہت انجوائے کرتی ہوں۔ وِکی بھی جائے گا۔"

"نہیں میرے پاس اتنی فرصت کہاں۔" وہ جھٹ سے بولا۔

"آپ نہیں جائیں گے۔" ٹینا حیرت زدہ سی اُسے دیکھنے لگی۔

پھر تو نیشا کے ساتھ پکنک پر جانے میں کوئی عُذر نہیں۔ کسی دن اس کے ساتھ جاؤں گی۔ اُس نے دل ہی دل میں ارادہ کیا۔

"تم بہت عقل مند ہو۔ میری سوچ سے بھی زیادہ۔"

"تھینکس سو مچ۔" وہ تھوڑا سا جھک کر مکاری سے مُسکرائی۔

نیشا نے آہستہ آہستہ ٹینا کا اعتماد حاصل کرلیا تھا۔ وہ اُسے ایک پُرخلوص اور بااعتماد لڑکی سمجھنے لگی تھی۔ نیشا نے ایک دن اسے پکنک کے لئے راضی کرلیا۔ ٹینا نے انکار مناسب نہ سمجھا۔ اُسے راضی دیکھ کر نیشا خوشی سے اچھل پڑی۔

"نیشا تم اتنی خوش کیوں ہو۔" بالآخر وہ پوچھ بیٹھی۔

"ٹینا آئی لائک یو۔۔۔ سچ میری تمام فرینڈز میں تم مجھے سب سے اچھی لگتی ہو۔ ہائے کتنا مزہ آئے گا۔ جب ہم ہاکس بے پر ننگے پاؤں گھومیں گے۔" وہ خوشی سے بھرپور آواز میں بولی۔

وِکی کار کی چابی انگلی میں گھماتا ہوا ان کے قریب آیا۔

"کیا بات ہے نیشا بہت خوش ہو؟"

"بات ہی خوشی کی ہے۔"

"مجھے بھی تو بتاؤ۔" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں ہاں سُنو۔ ٹینا میرے ساتھ پکنک پر جانے کے لئے رضامند ہوگئی ہے۔ اب بتاؤ میں غلط کہتی تھی کہ ٹینا میری بہت اچھی دوست ہے۔"

"اُوہ نو۔۔" مارے خوشی کے وِکی کے ہاتھ سے چابی نیچے گر پڑی۔

"آپ لوگ اتنے خوش کیوں ہو رہے ہیں؟" ٹینا نے حیرت سے پوچھا تو وِکی سنبھل کر بولا۔

"دیکھئے ٹینا۔۔۔ یہ نیشا آپ کو بے حد پسند کرتی ہے۔ آپ کے جانے کے بعد اتنی تعریف کرتی ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ میں اُسے چڑاتا تھا کہ ٹینا تمھارے ساتھ پکنک پر نہیں جائے گی لیکن صاحب یہ تو آپ کی دیوانی ہے دیوانی۔"

اپنی تعریف سن کر ٹینا کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک آگئی تھی لیکن ذرا سی دیر بعد وہ چمک ماند پڑ گئی اور آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا۔ دُھند میں امی کا ڈوبتا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اہمیت اور محبت کی جو چھاؤں اس نے امی سے چاہی تھی دوسروں سے پاکر ایسا لگا جیسے جلتے ہوئے صحرا میں اکیلی کھڑی ہو۔

"وِکی سچ کہہ رہا ہے ٹینا ڈیئر۔۔ تمھارے جانے کے بعد کلب میں دل ہی نہیں لگتا۔" ٹینا نے کہا تو وہ چونک پڑی اور افسردگی سے مُسکرا کر بولی۔

"بہت اہمیت دے رہی ہو مجھے۔"

"تم ہو ہی اس قابل۔"

"قابل!" وہ تلخی سے ہنس دی۔

"اچھا تو پھر تم لوگ کب جارہے ہو؟" وِکی نے استفسار کیا۔

"کل شام چھ بجے۔۔ ٹینا یہیں کلب آجائے گی۔ یہیں سے روانہ ہوں گے۔" نیشا نے بتایا۔

"گڈ . . . ویری گڈ" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

دوسرے دن وہ تیار ہو کر کلب پہنچی۔ میرون رنگ کے کپڑوں میں بہت چارمنگ لگ رہی تھی لمبے بال کمر پہ جھول رہے تھے۔ جیسے ہی کلب پہنچی نیشا نے اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس کی خوبصورتی کو بے حد سراہا۔ وہ اپنی تعریف سُن کر ہلکے سے مسکرا دی۔ اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ توقی کہیں بھی نظر نہ آیا۔

"توقی نہیں آیا آج؟"

"پپا کے ساتھ بزنس ٹرپ پہ گیا ہوا ہے۔" نیشا نے کہا۔ "اچھا چلو اب دیر ہو رہی ہے۔" نیشا کے ہاتھ میں باسکٹ دیکھ کر وہ حیرانی سے بولی۔

"اس میں کیا ہے . . .؟"

"پیٹ پوجا کی چیزیں . . . بھئی بھوکا مرواؤ گی کیا؟"

دونوں ہنستی ہوئی باہر آئیں۔

کلب کے لان میں وائٹ کلر کی ٹیوٹا کرولا کھڑی تھی۔ ٹینا آگے آگے اور نیشا پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور ابھی سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ ڈرائیور زن سے گاڑی لے اڑا۔

مارے خوف کے وہ لرز سی گئی چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا۔ پہلے پہل تو وہ کچھ نہ سمجھ سکی لیکن جب ساری بات سمجھ میں آئی تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ڈر کے مارے آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ عجیب سی حالت ہو گئی۔ چلانا چاہا لیکن گلے میں آواز پھنس کر رہ گئی کچھ نہ سوجھا تو آنسو بہانا شروع کر دیئے۔ بالآخر وہ اپنی ساری ہمت یکجا کر کے چیخی۔

"گاڑی روکو۔ کہاں جا رہے ہو تم؟ گاڑی روکو۔"

ڈرائیور نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میں کہتی ہوں گاڑی روکو۔" وہ کپکپاتی آواز میں چلائی۔

"چپ بیٹھئے، آپ اغوا ہو چکی ہیں۔"

"اغوا . . ." وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ خوف کے مارے گھگھی بندھ گئیں۔ پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔

"بکواس بند کرو۔ گاڑی روکو۔"

"اتنی ڈرتی کیوں ہیں؟ یہ سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق تو ہوا ہے۔" ڈرائیور کی طنزیہ آواز آئی۔

"تم نہیں جانتے میں کس گھرانے کی لڑکی ہوں۔ اگر تم نے گاڑی

"مر دوکی تو میں۔ ۔ ۔" ٹینا نے خوف سے زرد ہوتے چہرے کے ساتھ اُسے جھڑکی دی۔

"مجھے معلوم ہے آپ کیسی لڑکی ہیں۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں کلب کا رُخ نہیں کرتیں۔"

"اوہ خدایا میں تمھیں کیسے سمجھاؤں۔ ڈرائیور میں شریف لڑکی ہوں۔ تم یقین کیوں نہیں کرتے۔ میں تو بس۔ ۔ ۔ پلیز مجھے میرے گھر چھوڑ دو۔" وہ رو دی۔

گاڑی بدستور چلتی رہی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گاڑی میں نہیں انگاروں میں سفر کر رہی ہو۔ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ آنے والے وقت کے خیال سے ڈر کے مارے ہونٹ تک نیلے پڑ گئے اور کچھ نہ سوجھا تو ڈرائیور کو شانوں سے جھنجھوڑ ڈالا۔

"گاڑی روکو، ورنہ میں خون پی جاؤں گی تمھارا۔"

وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔ اُس کے لمبے لمبے ناخن ڈرائیور کے شانے میں پیوست ہو گئے تو اس نے ایک سسکاری بھری اور کار کی اسپیڈ ہلکی کر کے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔ ڈرائیور کو دیکھ کر ٹینا بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ حیرت سے اپنی آنکھیں مل ڈالیں۔

"آ۔ ۔ آپ؟"

"ہاں میں۔" جلال نے گاڑی روکی اور غصے سے کہا۔ "اگر میں نہ پہنچ گیا ہوتا تو تم سچ مچ اغواء ہو چکی ہوتیں۔"

"اُوہ خدایا۔" اُس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ "لیکن یہ سب کچھ کون کر رہا تھا۔ ۔ ۔؟"

"ونکی اور نیشا۔"

"لیکن کیوں؟"

"یہ تم بہتر جانتی ہو۔" جلال نے خونخوار نگاہوں سے اُسے گھورا تو وہ نظریں چُرا کر بولی۔

"نیشا ایسی تو نہیں لگتی تھی۔"

"انسانوں کو پہچاننے کے فن میں بالکل کوری ہو تم۔"

جلال نے ہونٹ کاٹ کر کہا تو وہ بے اختیار رو دی۔ ۔ ۔ پشیمانی کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ سسکتی ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ کو کیسے معلوم ہُوا یہ سب کچھ؟"

"تمھیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔" وہ انتہائی غصے میں تھا۔

ٹینا نے بے بسی سے اُسے دیکھا۔ اُسے یوں دیکھتے ہوئے پا کر اُس نے بتایا۔

"رضا نے جب مجھے بتایا کہ تم روز کلب آتی ہو تو مجھے بہت حیرت ہوئی۔ ٹینا میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم کلب کیوں آتی ہو۔ ایسی کون سی کشش ہے جو تمھیں یہاں کھینچ لائی۔ رضا نے جب بتایا کہ ونکی کے ساتھ تمھاری دوستی ہے تو میں بے حد پریشان ہو گیا۔ نیشا بھی اُسی کے گروہ کی ایک لڑکی ہے۔ میں تمھیں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس دن کے بعد میں نے اور رضا نے ونکی اور نیشا کی کڑی نگرانی شروع کر دی۔ ٹینا انسان جن لوگوں سے محبّت کرتا ہے۔ اُن سے کبھی غافل نہیں رہتا۔ انھیں کبھی برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ تم جب تک کلب نہ رہتیں ہم تمھاری حفاظت کرتے۔ میں نے کئی بار تمھیں سمجھانے کا ارادہ کیا لیکن یہ سوچ کر چپ رہ گیا کہ تم تو مجھ پر اعتماد ہی نہیں کرتیں۔ میری بات کب مانو گی۔ ونکی کی نگرانی کرتے کرتے آج ہم ایک پرائیویٹ ٹیکسی ڈرائیور کے پاس جا پہنچے۔ ونکی نے اس کی ٹیکسی استعمال کرنی چاہی۔ ڈرائیور ایک شریف آدمی تھا۔ ہم نے اسے ساری بات سمجھائی اور میں ڈرائیور کے رُوپ میں گاڑی لے آیا۔ مجھے علم تھا کہ تم آنے کی حماقت ضرور کرو گی۔"

ٹینا ہاتھوں میں مُنہ چھپائے روئے جا رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی حفاظت کے لئے جلال اتنی تکلیف برداشت کرے گا۔ مارے شرمندگی کے آنکھ نہ ملا پا رہی تھی۔ وہ خود کو اس کے آگے بہت گرا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

"میں کیا اتنا پُوچھ سکتا ہوں کہ تم نے کلب آنا کیوں پسند کیا؟" جلال نے سپاٹ نگاہوں سے پُوچھا۔

ٹینا نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور جھُکی جھُکی نگاہوں سے بولی۔

"میں یہاں محبّت اور توجہ کی تلاش میں آتی ہوں۔"

"محبّت کی تلاش میں۔" وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

"میں سمجھتی ہوں۔ ہر انسان کی زندگی میں اس کی ماں کی چاہت، محبّت اور شفقت بہت اہمیّت رکھتی ہے۔ انہی عناصر سے اس کی شخصیّت کی تکمیل ہوتی ہے لیکن میں اس لحاظ سے اُدھوری ہوں۔ اُدھوری شخصیّت کی مالک۔ ۔ ۔ میری زندگی میں ایک خلا ہے جو صرف ماں کی محبت سے ہی پُر ہو سکتا ہے، ماں کی محبّت ایک ایسا اعتماد بخشتی ہے کہ انسان زندگی کے ہر کٹھن مرحلے کو بہادری کے ساتھ پار کر جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری ماں کو مجھ سے محبّت ہے یا نہیں۔ شاید اُنھیں مجھ سے بہت محبّت ہو لیکن انھوں نے کبھی مجھے اس محبت کا احساس نہیں

دلایا۔ ماں کی آغوش میں جو تپش، جو آنچ ہوتی ہے میں آج تک اس سچ کو ترستی رہی ہوں۔ میں اعتماد کی دولت کھو چکی ہوں۔ ذہنی طور پر اتنی اُلجھ گئی تھی کہ مصنوعی دُنیا۔ ۔ مصنوعی لوگوں میں پناہ مانگی مصنوعی قہقہوں میں چھپ جانا چاہا۔ نانی نے بہت چاہا کہ میری شخصیت ٹوٹنے سے بچ جائے۔ جلال میری نانی بہت شفیق اور محبت کرنے والی ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو شاید میں پاگل ہو گئی ہوتی۔" وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولتی چلی گئی۔

"ٹینا! میں آج تک تمھیں نہیں سمجھ سکا۔ لقین کرو ہر ماں اپنی اولاد کو ٹوٹ کر چاہتی ہے لیکن ہر ماں کے اظہار کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ تم بہت حساس ہو۔ آج تک غلط سمجھتی رہیں۔ غلط معنی پہناتی رہیں۔ آنٹی نے تمھیں سمجھنے میں بہت غلطی کی۔ لیکن کیا تمھیں میری چاہت۔ ۔ ۔ میرے جذبوں پر بھی اعتبار نہ تھا؟"

وہ پشیمان سی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ جلال نے آہستگی سے کار اسٹارٹ کی۔ ٹینا انتظار کرتی رہی کہ وہ کچھ کہے گا لیکن وہ تو خاموشی سے کار ڈرائیو کرتا رہا۔ مارے حقیقت کے اس کا بُرا حال تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جلال اس سے بہت ناراض ہے۔ اس نے کئی بار بات کرنے کی کوشش کی لیکن الفاظ گلے میں اٹک سے گئے۔ اپنی بے بسی پہ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے جلال کی خاموشی دل و دماغ میں ہتھوڑے برسا رہی تھی وہ چاہتی تھی جلال اُسے بُرا بھلا کہے۔ ۔ خوب لتاڑے۔ ۔ ۔ پیٹ ڈالے لیکن وہ تو خاموشی توڑنے پر آمادہ نظر نہ آرہا تھا۔ گھر پہنچ کر جلال نے گیٹ کے باہر ہی کار روکی ٹینا سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ اُسے یوں دیکھتے پا کر جلال نے کہا۔

"گھر آگیا ہے۔"

"آپ نہیں آئیں گے؟" وہ پشیمانی سے بولی۔

"نہیں۔"

اس کا انکار سُن کر وہ ایک بار پھر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔ جلال پریشان ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔ بالآخر جھلا کر بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم رو کیوں رہی ہو؟"

"آپ نے مجھے معاف نہیں کیا اسی لئے رو رہی ہوں۔ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔" وہ زچ ہو کر بولی تو جلال کی ہنسی نکلتے نکلتے رہ گئی لیکن مُنہ پھیر کر بولا۔

"میرے معاف کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"پڑتا ہے نا۔ ۔ پلیز آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گی۔ غلط حرکتیں کر کے اس کی توبہ بھی طالب نہیں ہوں گی۔ آئندہ میں کسی کو بھی تنگ نہیں کروں گی۔" وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے بولی تو جلال کو بھی اس پہ ڈھیروں پیار آگیا لیکن بظاہر بے رُخی سے بولا۔

"افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم نے مجھ پہ اعتماد نہیں کیا۔"

"وہ تو میری بھول تھی۔" اس نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔

"لیکن تمھیں تو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں۔" وہ بھی پوری طرح تنگ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"دلچسپی ہے جبھی تو کہہ رہی ہوں۔ اب جو آپ کہیں گے وہی کروں گی۔" وہ جھکی جھکی نگاہوں سے بولی۔

"اگر پھر انکار کر دیا تو؟"

"نہیں اب انکار نہیں کروں گی۔"

"ٹینا کیا اب بھی تم اپنے آپ کو ادھورا محسوس کر رہی ہو؟" جلال نے پُرخلوص انداز میں پوچھا۔ اسے اس حد سے زیادہ حساس لڑکی پر ترس آنے لگا تھا۔ اس کے لئے دل میں محبت کی جڑیں اور گہری ہوتی چلی گئیں۔

"آج تو میں ایک نئے جذبے، ایک نئے احساس سے آشنا ہوئی ہوں آپ کی مضبوط اور توانا شخصیت نے مجھے مکمل کر دیا ہے میں آپ ہی کی شناخت چاہتی ہوں۔"

"کب؟"

"بہت جلد۔" وہ دلکشی سے مُسکرائی تو جلال بھی ہنس دیا۔



لہو پکارتا ہے

نجمہ نقوی



اگر آپ کو کوئٹہ کی وادیوں میں کوئی پگلی "مافی ـ مافی" پکارتی ملے تو سمجھ جائیے کہ یہی وہ بدبخت عورت ہے جس کا لہو اپنے لہو کو پکارتا ہے

پارٹی اپنے عروج پر تھی، رنگ و بو کا سیلاب اُمڈ رہا تھا۔ روشنیوں اور رنگوں کی بہتات تھی اور اس رنگین ہال میں وہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں چاند بن کر چمک رہی تھی۔ ارمان نے اُسے حیرت سے دیکھا۔ کائنات کا سارا حُسن اس میں سمٹ آیا تھا۔ وہ اس کے ملکوتی حُسن سے مسحور سا ہو گیا۔ ڈاکٹر سجاد نے اپنی شادی کی پانچویں سالگرہ پر زبردست پارٹی کی تھی۔ سجاد اس کا بہترین دوست تھا۔ اس کی بیوی ایک پیاری سی سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ یہ سجاد کی پسند کی شادی تھی اور ہر سال وہ اپنی شادی کی سالگرہ اسی دھوم دھام سے منایا کرتا تھا۔ ارمان سجاد کے گھر ہونے والی ہر پارٹی میں شرکت کرتا تھا مگر یہ چہرہ آج اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بنفشی ساڑھی میں ہنستے مُسکراتے چہرے کے ساتھ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ارمان نے اُسے گہری نظروں سے دیکھا اور اس کی شخصیت کا سحر اس پر چھاتا چلا گیا۔

اتنی رنگین محفل میں بھی وہ اپنے اردگرد سے بیگانہ اس کی سحر کار شخصیت میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی تمام تر اندرونی اور بیرونی توجہ اسی کی جانب تھی اور وہ اب یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے کس طرح تعارف حاصل کیا جائے۔ امی بہت دنوں سے اس کے پیچھے پڑی تھیں کہ اب وہ شادی کر لے۔ وہ خوش شکل تھا، انجینئر تھا، اچھی پوسٹ پر فائز تھا۔ اس کے لئے رشتوں کی کمی نہ تھی۔ امی نے اُسے کتنی ہی لڑکیاں دکھائیں مگر اُسے کوئی نہ جچی۔ وہ اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا لاڈلا بیٹا تھا۔ جیسے جیسے وہ بوڑھی ہو رہی تھیں۔ ان کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ شادی کر لے۔ اور اس لڑکی کو دیکھ کر بس کا وہ نام تک نہ جانتا تھا۔ اس نے سوچا تھا گھر جا کر امی سے کہہ دے گا کہ شادی کی تیاریاں کریں۔ جیسے اُسے یقین تھا کہ جس طرح اس نے پہلی نظر میں اُسے پسند کر لیا ہے۔ وہ بھی اسے دیکھتے ہی قبول کر لے گی۔ اسے خود پر حیرت تھی وہ اتنا جذباتی تو کبھی نہ ہوا تھا۔ پارٹی کے اختتام پر جب سارے مہمان رخصت ہو گئے اور صرف خاص خاص لوگ رہ گئے۔ ان میں وہ ماہ جبیں بھی تھی۔ ارمان نے تمام وقت اس پر نظر رکھی تھی اور اسے کرشمہ نہ ہوا اب تک موجود تھی اور سجاد کی بیوی نسرین سے بہت گھل مل کر باتیں کر رہی تھی۔ وہ خاموش سا ایک جانب کو کھڑا تھا۔

"بھئی ارمان کیسے اکیلے اکیلے کھڑے ہو کوئی خاص بات...؟"

سجاد نے قریب آ کر پوچھا۔ ارمان اُسے دیکھ کر مُسکرا دیا۔

"بات تو کچھ خاص ہی ہے میرے دوست۔"

"اچھا... کوئی حادثہ ہو گیا؟" سجاد نے مُسکرا کر شرارت سے پوچھا۔

"ہاں! ہو ہی گیا۔"

"کون ہے وہ نازنین؟"

"یہ نسرین بھابی سے باتیں کر رہا ہے۔"

"افشاں کو کہہ رہے ہو؟"

"افشاں ہو یا سینڈرا۔ اب وہ جو بھی ہو۔"

"کرنل حماد کی بیٹی ہے کراچی سے مائیگریٹ ہو کر کوئٹہ آئی ہے۔"

"بے غضب کی چیز۔"

"تو تم گئے ہاتھ سے" سجاد نے اونچا قہقہہ لگایا۔

"تعارف کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں نسرین کے بچپن کی سہیلی ہے۔ آؤ تمھیں اس سے ملواتا ہوں۔"

سجاد اُسے لے کر نسرین اور افشاں کے پاس آیا۔ ارمان نے قدم اُدھر کی طرف ہی بڑھا دیے۔

"آؤ، آؤ ارمان! تمھیں افشاں سے ملواؤں۔" سجاد نے کہا۔

افشاں نے باتیں کرتے کرتے چونک کر دونوں کی طرف دیکھا۔

سجاد نے بڑھ کر ارمان کا تعارف کرایا۔

"افشاں یہ میرا بہت پیارا دوست ارمان ہے۔"

"بے شک پیارا ہے۔"

وہ شوخی سے ہنسی ارمان جھینپ سا گیا۔ نسرین اور سجاد بھی ہنسنے لگے۔

"تم اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتی ہو۔"

نسرین نے افشاں کے سر پر پیار سے چپت جمائی۔

"ارمان یہ افشاں ہے نسرین کے بچپن کی سہیلی۔"

"بہت گہری سہیلی معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں ارمان بھائی! یہ میری بہت پیاری سہیلی ہے۔"

"پیاری بھی اور دلچسپ بھی۔" ارمان مُسکرایا۔

"سچ کہا آپ نے۔" نسرین نے ہنس کر افشاں کو دیکھا۔

"میرے بارے میں آپ کی رائے تو بڑی اچھی ہے۔"

افشاں نے ہنس کر کہا۔ اسی وقت... نسرین اور سجاد کو بیگم ہمدانی نے آواز دے لی۔ وہ لوگ دوسری طرف چلے گئے۔ افشاں صوفے پر بیٹھی تھی۔ اور ارمان پاس ہی کھڑا تھا۔

"بیٹھیں آپ کب تک کھڑے رہیں گے۔"

"شکریہ..."

ارمان سامنے والے صوفے پر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر مُسکراہٹ رقصاں تھی۔ چہرے پر نکھار تھا اور آنکھوں میں شوخی۔ بنفشی رنگ کی ستاروں بھری ساڑھی میں بنفشہ کی پتیوں کی طرح کومل لگ رہی تھی۔

"آپ کا صرف نام ہی جان سکی ہوں۔" افشاں نے مُسکرا کر ارمان کو دیکھا۔

"آہستہ آہستہ سب کچھ جان جائیں گی۔"

ارمان مُسکرایا افشاں ہنس دی۔ مُسکراتا ہوا نازک چہرہ اور زندگی سے بھرپور ہنسی۔

"آپ دلچسپ آدمی ہیں۔ مجھے ایسے ہی زندہ دل لوگ پسند ہیں۔"

"شکریہ..."

"مجھے یقین ہے آپ دوبارہ بھی مجھ سے ملنا چاہیں گے۔"

"اگر آپ اسے پسند کریں تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔"

کتنے یقین سے کہہ رہی تھی کہ آپ دوبارہ مجھ سے ملنا چاہیں گے کس قدر اعتماد تھا اس کے لہجے میں۔ کتنا مان تھا اُسے اپنی شخصیت پر۔

ارمان کو اس کی پُراعتماد شخصیت نے لُوٹ لیا۔ اس کی باتیں کتنی دلچسپ ہوتی ہیں۔ اس کا اندازِ گفتگو کس قدر دلنشیں ہے۔ اچھی کی سی بے تکلفی سے باتیں کرتی ہے۔ یہ خوبیاں صرف اُن لوگوں میں ہوتی ہیں جو پُراعتماد اور آسودہ ہوتے ہیں جو کسی قسم کے کمپلیکس کا شکار نہیں ہوتے جو محفلوں پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں بے شک یہ ساری خوبیاں افشاں میں موجود تھیں۔ افشاں نے پہلی ہی ملاقات میں ارمان کے دل میں گھر کر لیا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ اُسے اپنانے کا جذباتی فیصلہ کر بیٹھا۔ اس کی گاڑی آ گئی تھی جانے سے پہلے وہ ارمان کو گہری نظروں سے دیکھ کر بولی۔

"کبھی تشریف لائیے گا گھر پر۔ میں ایسا چاہتی ہوں۔"

"آپ کے گھر والوں کو تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"ارے نہیں میرے ممی پاپا بہت اچھے ہیں۔ آپ یقیناً ان سے مل کر خوش ہوں گے۔"

"آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے گھر آؤں؟"

"کیا آپ کو میری بات پسند نہیں آئی؟ آپ ایسا نہیں چاہتے؟"

"آپ نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی مس افشاں مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اس لئے کہ میں ایسا چاہتا تھا۔ آپ سے بار بار ملنا چاہتا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں۔"

"پتہ چل جائے گا۔"

وہ ایک دلنواز سی مُسکراہٹ کے ساتھ چلی اور اپنی ہیل سے کھٹ کھٹ کرتی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی اور ارمان اس کے قدموں کو گنتا رہا۔ وہ زیرِ لب آہستہ سے بڑبڑایا۔ "بڑا ہی حسین اور طرب انگیز خواب..."

پھر ایک چمکیلی سی صبح وہ ان کے یہاں جا پہنچا۔ وہ چھٹی کا دن تھا۔ پہاڑوں میں گھری وہ سرمئی رنگ کی بڑی شاندار سی کوٹھی تھی۔ گیٹ

پر کرنل حماد عثمانی کے نام کی تختی لگی تھی۔ اس نے کال بیل پہ انگلی رکھ دی۔ اندر سے کتا بڑے زور سے بھونکا۔

"واہ بھئی بڑا شاندار استقبال ہوا۔"

وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔ چند لمحوں بعد چوکیدار نے گیٹ کھولا۔

"افشاں بی بی ہیں گھر پہ؟" ارمان نے پوچھا۔

"بالکل ہیں جی آپ تشریف لائیں۔"

وہ چوکیدار کے ساتھ اندر ہولیا۔ برآمدے کے پاس رک کر بولا۔

"افشاں بی بی سے کہو ارمان آئے ہیں۔"

"جی بہتر حضور۔"

تھوڑی دیر بعد افشاں کسی الہڑ لڑکی کی طرح بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ ارمان کو دیکھ کر کھل اٹھی۔ سادہ سے پرنٹڈ شلوار سوٹ میں اتنی کیوٹ لگ رہی تھی اور اپنی عمر سے کہیں کم بھی۔

"آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر آئیں۔ ممی بھی ہیں اور پاپا بھی۔" خوشی سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ افشاں کے ہمراہ اس کے شاندار ڈرائینگ روم میں آگیا۔ افشاں اسے بٹھا کر اپنے ممی پاپا کو بلانے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد کرنل حماد اپنی شاندار پرسنلٹی کے ساتھ اس کے سامنے تھے۔ اس نے ادب سے انہیں سلام کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ... افشاں کی ممی پاپا اور چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ بیٹھا۔ بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ سب ہی خوش مزاج اور ہنس مکھ تھے۔ زندہ دلوں کی محفل تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے اندازہ ہوگیا کہ خاصی آزاد خیال فیملی ہے روشنیوں اور رنگوں کے دلدادہ لوگ تھے۔ اس نے محسوس کیا۔ افشاں اپنے ممی پاپا کی بے حد لاڈلی ہے۔ سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے اس کا سب پر حکم چلتا تھا۔ تھوڑی سی ضدی اور خود سر بھی تھی۔ دو گھنٹے وہ ان کے ساتھ رہا اور بہت اچھا وقت گزارا۔ جانے کے لئے اٹھا تو کرنل حماد نے پھر آنے کے لئے کہا افشاں کے چھوٹے بھائی بہن بھی اصرار کرنے لگے کہ وہ دوبارہ یہاں ضرور آئے اور آتا رہے۔ اتنے پرخلوص لوگوں سے مل کر اسے بے حد خوشی ہوئی اور جب افشاں اسے باہر تک خدا حافظ کہنے آئی تو ارمان نے سینے کی باڑھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پلٹ کر افشاں سے کہا۔

"افشاں اگر میں اپنی امی کو تمہارے یہاں بھیجوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟"

افشاں کے چہرے پہ دھنک ہی رنگ بکھر گئے۔ مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ ارمان کو دیکھ کر مدھم لہجے میں بولی۔

"بڑی خوشی سے بھیجئے۔"

"شکریہ افشاں۔"

اس نے آہستہ سے افشاں کا ہاتھ دبایا اور پلٹ کر اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ دوپہر کے کھانے پر امی نے اسے بے حد خوش دیکھ کر پوچھا۔

"آج میرا بیٹا بڑا خوش نظر آرہا ہے بھئی کیا بات ہے؟"

"آپ کو خوش کرنے والی بات ہے امی۔" وہ ہنس کر بولا۔

"کچھ پتہ تو چلے تو کونسی خوشی دے رہا ہے مجھے۔"

"امی میں نے آپ کے لئے بہو پسند کرلی ہے۔ آپ کو رشتہ لے کر جانا ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے۔ شکر ہے خدا کا۔ تجھے کوئی پسند تو آئی۔ ورنہ میں تو سمجھتی تھی کہ پوتے کو گود میں کھلانے کی خواہش لئے ہی دنیا سے چلی جاؤں گی۔"

"اب تو آپ خوش ہیں۔"

"بہت بیٹے۔"

پھر دوسرے ہی ہفتے اس نے اپنی امی کو افشاں کے گھر پیغام لے کر بھیج دیا جو افشاں کی مرضی کے مطابق فوراً ہی قبول کرلیا گیا اور پھر چند ماہ بعد افشاں دلہن بن کر اس کے گھر کے آنگن میں اتری۔ اور بہاریں انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھیں۔ ارمان کو یقین نہ آتا تھا کہ... سپنے یوں پورے ہوجائیں گے۔ ہر طرف اجالے ہی اجالے بکھر گئے تھے۔ ارمان نے اپنی ساری محبتیں اس پر نچھاور کردی تھیں۔ سرشاری کے یہ لمحات بڑے مسحور کن تھے۔ افشاں بہت خوش تھی۔ ساری روح اس کی محبتوں سے سرشار ہوگئی تھی۔ ساری تشنگی سارا پیار ساری آرزوئیں مکمل ہوگئی تھیں۔ دونوں کے دل بے پایاں محبت سے لبریز تھے۔ زندگی بہاروں کا روپ بن گئی تھی۔

شام کو ارمان آفس سے آتا تو افشاں کو اپنا منتظر پاتا لبوں پر مدھ بھری مسکراہٹ لئے وہ اس کے سواگت کو برآمدے تک آجاتی۔ خوشیوں کی دھنک نے اس کے چہرے پر رنگ ہی رنگ بکھیر دیئے تھے۔ ہوش میں بھی مدہوشی کی ایک کیفیت تھی۔ وصل کی گھڑیوں میں سرشار ہوجانے کی کیفیت تھی۔ تقریباً روز ہی دونوں باہر گھومنے نکل جاتے۔ لمبی ڈرائیو کرتے اور پھر کسی ہوٹل کے خوابناک سے ماحول میں بیٹھ کر ڈنر لیتے۔ اگر کبھی باہر نہ جاتے تو گھر میں ہی ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے۔ ہنسی قہقہے گھر کی فضاؤں میں گونجتے رہتے۔ امی جانی... بہت خوش تھیں ان کے سونے گھر میں بہاروں نے ڈیرے ڈال لئے تھے۔ در و دیوار مسکرایا کرتے۔ ارمان ہنی مون منانے کے لئے سوئٹزرلینڈ جانا چاہتا تھا۔ مگر ان دنوں افشاں کی طبیعت بہت گری گری رہنے لگی تھی۔ اسے چکر آیا کرتے کچھ کھانے پینے کو دل نہ چاہتا۔ ارمان پریشان ہوا تھا۔ اسے ایک ماہر لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور اس نے انہیں

ثانی کہ اُن کے یہاں ننھا مہمان آنے والا ہے۔ ارمان کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی اس کے دل میں خوشی ایک الوہی اُجالا بن کر جگمگا نے لگی۔ افشاں تمام راستے روتی رہی۔ وہ ابھی بچے کی خواہش مند نہ تھی۔ وہ اسے سمجھاتا رہا۔

"تم پاگل ہوگئی ہو جو اتنی بڑی خوشی پا کر بھی رو رہی ہو۔"

"مجھے نہیں چاہیے بچہ وچہ"

"بچے سے ہی تو ہماری زندگی مکمل ہوگی جاناں۔"

وہ بڑی ترنگ میں تھا۔ مگر افشاں کا موڈ آف تھا۔ بھڑک کر بولی۔

"مصیبت ہوتے ہیں یہ بچے ساری آزادی سلب کر لیتے ہیں۔ میں ابھی ایسی بیڑی نہیں پہنوں گی۔"

"تم تو بالکل پاگل ہو افشی! پھول سا بچہ گود میں آئے گا نا تو خوشی سے ناچی پھرو گی۔"

"مجھے نہیں ہے شوق بچوں کا۔ رہ گئے ہیں یہ گوشت کے لوتھڑے۔"

ارمان اس کی نادانی پر ہنس دیا۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں سجا لی تھیں۔ امی کو پتہ چلا تو دعا کے لئے اُن کے ہاتھ خدا کے حضور اُٹھ گئے۔ انھیں اتنی بڑی دولت سے نوازنے والا تھا۔ افشاں نے رات کا کھانا بھی نہ کھایا منہ لپیٹ کر سو رہی۔ اور ارمان اس کے بچپنے پر ہنستا رہا۔ افشاں کی طبیعت مسلسل خراب رہی۔ الٹیاں اور چکر پیچھا نہ چھوڑتے وہ بیزار ہوگئی۔ تنگ آ کر رونے بیٹھ جاتی، نہ کھانا ٹھیک سے کھایا جاتا نہ کہیں تفریح کو جا سکتی تھی۔ یہ سب کچھ اُسے بہت برُی مصیبت لگ رہا تھا۔ اکثر ارمان سے بھی اُلجھ پڑتی۔ وہ پیار سے اُسے سمجھاتا رہتا۔ بہت تسلیاں دیتا۔ خوشیوں کا احساس دلاتا مگر افشاں کا موڈ بگڑا ہی رہتا۔ چڑ جاتی۔

"تمہیں یہ سب کچھ ہو تو پتہ چلے۔"

اور ایسی بے تکی بات پر ارمان قہقہہ مار کر ہنستا۔ افشاں اس کے ہنسنے سے اور چڑ جاتی، خفا ہو جاتی، بات کرنا چھوڑ دیتی۔ ارمان کے پیار سے مناتا رہتا۔ اُسے احساس تھا کہ افشاں نے آزاد رہ کر زندگی گزاری ہے۔ والدین نے کبھی اس پر کوئی پابندی نہ لگائی تھی۔ ہر کام اس نے ہمیشہ اپنی مرضی سے کیا۔ وہ تفریح پکنک پارٹیوں کی دلدادہ تھی۔ اس کی ڈھیروں سہیلیاں تھیں جن کے ساتھ وہ آزادانہ گھومتی پھرتی تھی۔ اس لئے اب آنے والا بچہ افشاں کو مصیبت لگ رہا تھا۔ مگر وہ یہ سوچ کر بالکل مطمئن تھا کہ افشاں اپنے پہلے بچے کو دیکھے گی تو خوشی سے کھل اُٹھے گی۔ ساری تکلیفیں بھول جائے گی مگر یہ کیسا بچہ ہوا نرس نے اس کے پہلو میں بچے کو لٹایا تو اس نے اسے دیکھا بھی نہیں بلکہ.. چیخ اٹھی۔

"لے جاؤ اس مصیبت کو یہاں سے۔"

ارمان حیران رہ گیا۔ یہ کیسی عورت ہے جس نے اپنی کوکھ سے ایک وجود کو جنم دیا اور دیکھا تک نہیں۔ وہ اسے مصیبت کہہ رہی ہے۔ ماں بن کر تو عورت کتنی مقدس ہو جاتی ہے۔ اس کے قدموں تلے جنت آباد ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کیسی عورت ہے؟ وہ اداس ہو گیا۔ نام رکھنے کے سلسلے میں بھی افشاں نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ ارمان نے اپنی مرضی سے اس کا نام منان رکھا اور مانی کہہ کر پکارتا۔ پانچ دن افشاں اسپتال میں رہی۔ بچہ نرسوں کے پاس رہا۔ گھر آ کر بھی اس نے بچے کو گود میں نہ لیا بلکہ امی کی گود میں ڈال دیا۔ انھوں نے ننھی سی جان کو سینے سے لگا لیا۔ ارمان کو سخت مایوسی ہوئی اور وہ پہلی بار افشاں پر خفا بھی ہوا مگر اس نے کوئی اثر نہ لیا یہی کہتی رہی کہ یہ مصیبت مجھ سے نہ سنبھالی جائے گی۔ ارمان بے حد دل برداشتہ ہو گیا۔ خوشگوار ازدواجی تعلقات کے بیچ بدمزگی کا یہ پہلا پتھر تھا۔

امی ہی مانی کو سنبھالتی تھیں۔ افشاں تو پلٹ کر بھی اس کی طرف نہ دیکھتی۔ ارمان آفس سے آ کر مانی میں لگ جاتا۔ اُسے اپنا پھول سا بچہ بہت عزیز تھا۔ ارمان کی توجہ مانی کی طرف دیکھ کر افشاں دوبارہ شادی سے پہلے والی افشاں بن گئی جس کی ڈھیروں سہیلیاں تھیں جو پکنک اور پارٹی کی دلدادہ تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ اس کا زیادہ وقت گزرنے لگا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ شاپنگ کرتی۔ اپنے لئے چیزیں خریدتی۔ ارمان کے لئے بھی کچھ نہ کچھ لے لیتی مگر مانی کے لئے اس نے ایک جھنجھنا بھی نہ خریدا تھا۔

ارمان اُسے سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا مگر اس کی روش نہ بدلی۔ اُسے اپنی سہیلیوں سے ہی فرصت نہ تھی۔ مانی امی کی گود میں پلتا رہا۔ ایسے مقام پر آ کر ارمان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ افشاں سے اُسے بے پناہ محبت تھی لیکن جس نہج پر وہ زندگی گزار رہی تھی وہ ارمان کو قطعی پسند نہ تھا۔ افشاں نے جو رویہ اختیار کر رکھا تھا وہ ارمان کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ اس نے بچوں کی سائیکولوجی پر بحث کرتے ہوئے افشاں کو سمجھانا چاہا۔

"جو بچے ماں کے پیار سے محروم ہوتے ہیں وہ ہمیشہ کمپلکس کا شکار رہتے ہیں۔ ان کی صحیح نشوونما نہیں ہوتی اور وہ زندگی کے ہر میدان میں پیچھے رہتے ہیں۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارا بچہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں پیچھے رہے اور ہمیشہ احساس کمتری کا شکار رہے؟"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے بچوں سے قطعی دلچسپی نہیں ہے وہ ایک بوجھ ہوتے ہیں جو زندگی کو انجوائے نہیں کرنے دیتے۔"

یہ تھا افشاں کا جواب۔ ارمان بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ اس کے

دل پر بھاری بوجھ سا آن گرا۔ اب کہنے کو کیا رہ گیا تھا۔

احساسِ فرض فنا ہوگیا تھا

احساسِ ذمے داری ختم ہوگیا تھا

ممتا کا خون ہوگیا تھا

رشتوں کا تقدس پامال ہوگیا تھا۔

امی خاموش تماشائی بنی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ انھیں افشاں کی طبیعت کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا۔ اگر وہ کچھ بولیں گی تو اس کا الٹا ہی اثر ہوگا۔ نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ اپنے بیٹے کی پریشانیوں کا انھیں دکھ تھا۔ وہ کس قدر بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ آفس میں سارا دن سر کھپانے کے بعد گھر آتا تو مانی میں لگ جاتا۔ افشاں ایسے وقت میں اکثر گھر سے باہر ہی ہوتی گھر میں بیٹھ کر وہ اپنی شام برباد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ سیر سپاٹے میں مصروف ہوتی۔ اکثر مانی ماں کے لئے مچل جاتا۔ ارمان سے سنبھالے نہ سنبھلتا مگر ممتا کے سوتے تو خشک ہو چکے تھے۔ مانی سال بھر کا ہوا تھا گول مٹول سا اتنا پیارا بچہ تھا کہ دیکھنے والے بے اختیار پیار کئے بنا نہ رہتے۔ مگر افشاں کے دل میں ممتا کا کوئی جذبہ نہ جاگا۔ اس کی مصروفیات بدستور قائم تھیں۔ اس شام ارمان آفس سے واپس آیا تو امی نے بتایا کہ مانی کو تیز بخار ہے۔ ارمان تڑپ گیا۔ بے اختیار مانی کو گود میں لے کر پیار کرنے لگا وہ بخار میں جل رہا تھا۔ ارمان نے اسی وقت ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا اور مانی کو دکھایا۔ وہ دوا لکھ کر اور سردی سے بچاؤ کی تاکید کر کے چلا گیا۔ ارمان اپنے بیٹے کو گود میں لئے بیٹھا رہا۔ اس کی صورت تکتا رہا۔ افشاں تقریباً آٹھ بجے واپس آئی۔ دو تین پیکٹ سنبھالے ہوئے۔

"ہیلو ارمان... اوہ گاڈ آج تو بہت تھک گئی کتنی ہی دکانیں پھری تب مطلب کی چیز ملی۔ دیکھو تمہارے لئے کتنی پیاری جرسی لائی ہوں۔"

افشاں نے ایک پیکٹ کھول کر جرسی ارمان کی طرف اچھال دی۔ ارمان نے جرسی ایک طرف کو رکھ دی افشاں برا مان گئی۔

"اتنی پیاری جرسی لائی ہوں تمہارے لئے اور تم نے دیکھی تک نہیں۔ یہی قدر ہے میری لائی ہوئی چیزوں کی۔"

"مانی کو بہت تیز بخار ہے افشاں!"

"تو ڈاکٹر کو دکھایا ہوتا مجھ سے کیا کہہ رہے ہو؟"

اپنے اندر اٹھتے طوفان کو دبا کر وہ بڑے پرسکون انداز میں بولا۔

"ایسے وقت میں مانی کو تمہاری ضرورت ہے افشاں۔"

"میں کیا کرلوں گی؟ ڈاکٹر تو دیکھ گیا ہے۔"

"ایسے میں بچے کو ماں کے پیار اور ممتا کے گداز کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"مجھ سے ایسی دقیانوسی باتیں نہ کیا کرو۔ آج کل تو بچے آیاؤں کے پاس پلتے ہیں کسے اتنی فرصت ہے کہ انھیں سنبھالتا پھرے اور مجھے تو یوں بھی کوئی انٹرسٹ نہیں ہے ننھے ننھے گوشت کے لوتھڑوں سے۔"

"کبھی اپنے اندر جھانک کر دیکھنا افشاں۔"

"اچھا بور نہ کرو پہلے ہی تھکی ہوئی ہوں۔ چلو کھانا کھاتے ہیں"

"تم کھالو، میری گود میں مانی ہے۔ میں اسے بے آرام نہیں کرنا چاہتا۔"

"تمہیں معلوم ہے رات کا کھانا میں تمہارے بغیر نہیں کھاتی۔ ایک ننھے سے بچے کی خاطر میری خواہش کو ٹھکرا رہے ہو۔"

"مانی سوگیا ہے۔ اسے بہت تیز بخار ہے۔ اگر گود سے اتاروں گا تو جاگ کر رونے لگے گا تم کھانا کھالو مجھے یوں بھی پریشانی کی وجہ سے بھوک نہیں ہے۔"

افشاں کا موڈ آف ہوگیا۔ ایک جھٹکے سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ارمان کے دل پر بوجھ سا آن گرا۔ افشاں نے مانی کو دیکھنے تک کی زحمت گوارہ نہ کی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور جھک کر مانی کو پیار کرنے لگا۔ افشاں کھانا کھا کر آئی اور لدھی پھدی سی بستر پر لیٹ گئی۔ ارمان مانی کو گود میں لئے بیٹھا تھا۔

"لائیٹ آف کرو مجھے نیند آرہی ہے۔"

"مانی اندھیرے میں گھبرائے گا افشاں۔"

"تو اسے لے کر دوسرے کمرے میں چلے جاؤ مجھے سونا ہے۔"

ارمان کے دل پر پتھر سا آن گرا۔ شکوہ بھری آنکھوں سے افشاں کو دیکھ کر آہستہ سے بولا۔

"تم کیسی ماں ہو افشاں! تمہارا بچہ بیمار ہے اور تم نے اسے دیکھا تک نہیں۔"

افشاں لحاف سے منہ نکال کر بھڑک اٹھی۔

"ایک تو مجھے اتنی جلدی ماں بنا دیا اوپر سے مجھ ہی کو برا بھلا کہہ رہے ہو۔"

"ہاں قصور میرا ہی ہے۔"

ارمان مانی کو لے کر اٹھتا ہوا بولا۔ جانے ضبط کی کن منزلوں سے گزر کر اس نے یہ بات کہی تھی۔ لائیٹ آف کی نائیٹ بلب جلایا اور مانی کو لے کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ امی نے خلاف معمول دوسرے کمرے میں روشنی دیکھی تو ادھر ہی چلی آئیں۔

"کیا بات ہے بیٹے! تم اس کمرے میں کیوں آگئے؟"

"افشاں سونا چاہتی ہے لائیٹ آف کروادی اور اندھیرے میں


سیاہ، لانبے، گھنے
اور چمکیلے بال
جاذبِ نظر
بنا دیتے ہیں...
ویوینول
بالوں کو گرنے
اور سفید ہونے
سے روکنے والی دوا
ویوینول بالوں کو لانبا، گھنا اور چمکیلا ہی نہیں بناتا بلکہ بالوں کی دوسری بیماریوں مثلاً بالوں کا وقت سے پہلے سفید ہونا، کمزور ہو کر گرنا، بالوں میں خشکی کی وجہ سے خارش رہنا، بالوں کی چمک ختم ہو جانا، دماغی کمزوری، بھول، سر چکرانا اور سر کا درد جیسی شکایتوں کو دور کر کے آپ کی عمر دس سال کم ظاہر کرتا ہے
ویوینول بالوں کا قدرتی اور سائنٹفک علاج ہے۔
اسٹاکسٹ
خان برادرز آسٹریلیا بلڈنگ میکلوڈ روڈ، لاہور
الحبیب دواخانہ بوہڑ بازار راولپنڈی
عصمت میڈیسن کمپنی خیبر بازار، پشاور
رشید میڈیکل اسٹور بازار دیگاں والا گوجرانوالہ
نودار الادویہ کچہری روڈ، ملتان
اکبر اسٹور آرام باغ کراچی
مرکزی میڈیکل اسٹور آرچر روڈ، کوئٹہ
ڈیسنٹ کیمسٹس تحصیل بازار جہلم
خواجہ اسٹور ایمپریس مارکیٹ۔ صدر، کراچی
نذر علی اینڈ کمپنی فقیر کا پڑ، حیدرآباد
مصطفیٰ کمال اینڈ سنز پاکستان چوک، لاڑکانہ
رحمان دواخانہ صادق بازار، رحیم یار خان
قدیمی یونانی دواخانہ۔ ملتان
Nasrullah 1988

مانی پریشان تھا اس لئے میں ادھر آگیا۔"

"بیٹا میں اُسے کچھ اس لئے نہیں کہتی کہ میں ساس ہوں میری بات اُسے بُری لگے گی۔ تم ہی اُسے سمجھاؤ۔ وہ کیسی ماں ہے جسے اپنے جگر کے ٹکڑے سے پیار نہیں۔"

"بہت سمجھایا ہے امی! مگر وہ اپنی روش بدلنے پر آمادہ نہیں۔ خاموش ہوگیا ہوں ضدی سی لڑکی ہے بات بڑھ نہ جائے پہلے ہی کونسا سکون ہے۔"

"خدا اُسے عقل دے۔ لاؤ مانی کو مجھے دے دو اور تم بھی سو جاؤ۔ صبح آفس جانا ہے۔"

"نہیں امی، رہنے دیں۔ مانی کے ساتھ شاید رات بھر جاگنا پڑے پہلے ہی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ دن بھر تو آپ سنبھالتی ہیں اُسے۔ جائیں سو جائیں میں مانی کی دیکھ بھال کروں گا۔"

"بخار کچھ ہلکا ہوا؟"

"ہاں دو خوراکیں دے چکا ہوں بخار ہلکا ہوگیا ہے مگر بے چینی بہت ہے۔"

"خدا اُسے صحت دے اور تمہیں سکون۔"

امی اُداس چہرہ لئے چلی گئیں۔ ارمان تمام رات مانی کو گود میں لئے بیٹھا رہا۔ اُسے اپنے بیٹے سے بے انتہا پیار تھا۔ وہ بچہ جو ماں کے پیار سے محروم تھا۔ باپ کو بہت عزیز ہوگیا تھا۔ صبح تک مانی کا بخار اتر گیا۔ ارمان مانی کو امی کے حوالے کرکے بوجھل ذہن کے ساتھ آفس چلا گیا۔ مناسب دیکھ بھال اور دوا علاج سے مانی چند روز میں اچھا بھلا ہوگیا۔ ارمان کی جان میں جان آئی۔ مانی کا غسل صحت بھی منایا تھا اور اُس کی پہلی سالگرہ بھی آ رہی تھی دونوں کام امی کے مشورے سے ایک ہی دن انجام پانے تھے۔ سالگرہ سے ایک دن پہلے ارمان نے افشاں سے کہا۔

"کل مانی کی سالگرہ ہے۔"

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی نیل پالش لگا رہی تھی۔ مڑ کر ارمان کو دیکھا۔ چند لمحے دیکھتی رہی پھر شانے اچکا کر لاپروائی سے بولی۔

"تو میں کیا کروں؟"

ارمان کے دل پر چوٹ سی لگی۔ یہ کیسی ماں ہے اس کا بچہ ایک سال کا ہوگیا۔ کل اس کی پہلی سالگرہ ہے اور یہ کتنی لاپروائی سے کہہ رہی ہے کہ میں کیا کروں۔ ایسے میں تو مائیں خوشی سے پھولی نہیں سماتیں بیٹے کو پیار کرتے نہیں تھکتیں۔ اُن کے لئے دُعائیں مانگا کرتی ہیں اور افشاں...!

ارمان نے سالگرہ سے ایک دن پہلے خود ہی ساری تیاری کر

رات کو دیر تک جاگ کر مانی سے کھیلتا رہا۔ دوسرے دن ہال کو رنگین غباروں اور جھنڈیوں سے بڑی خوبصورتی سے آراستہ کیا۔ افشاں حسب معمول ہر شے سے لاتعلق تھی۔ ارمان نے اس سے درخواست کی تھی کہ شام وہ سالگرہ کی تقریب میں ضرور شریک ہو۔ اس نے حامی بھر لی تھی۔

"بہت بہت شکریہ افشاں۔"

ارمان کے لہجے میں درد کرب بھی تھا اور طنز کی کاٹ بھی۔ افشاں نے اس کے لہجے پر کوئی توجہ نہ دی جلدی جلدی تیار ہوکر باہر جانے کی تیاری کرتی رہی۔ شام بڑی رنگینیاں لے کر آئی۔ ارمان نے اپنے سب ہی ملنے والوں کو مدعو کیا تھا۔ اسمارٹ اسمارٹ سے مرد بنی سنوری خوشبوئیں بکھرتی عورتیں رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس بچے۔ روشنی میں ہر شے جگمگا رہی تھی۔ مانی سُرخ دھاریوں والا بابا سوٹ اور ٹوپا پہنے بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ ہر کوئی اسے پیار کر رہا تھا۔ افشاں ایک طرف کو اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ میز پر تحفوں کا ڈھیر لگ گیا تھا... افشاں نے بھی اجنبیوں کی طرح رسم پوری کرنے کو چند تحائف دے تھے۔ مانی نے ارمان کا ہاتھ پکڑ کر کیک کاٹا اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا ارمان کا دوست فہد کھٹا کھٹ تصاویر اتار رہا تھا۔ پُرتکلف دعوت کے بعد جب سب مہمان رخصت ہوگئے تو ارمان نے افشاں سے کہا۔

"مانی کو سالگرہ کا پیار بھی نہ دو گی۔"

"کیوں نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"لو..." ارمان نے مانی کو افشاں کی گود میں دے دیا۔ اس نے مانی کو لے کر اس کے گال پر پیار کیا۔ اسی لمحے مانی نے پیشاب کر دیا۔ اور افشاں کا ایک بھرپور چانٹا اس کے گالوں پر جا پڑا۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ ارمان تڑپ اٹھا افشاں پھٹ پڑی۔ اپنی قیمتی ساڑھی جھٹکتے ہوئے بولی۔

"کمبخت نے اتنی قیمتی ساڑھی کا ستیاناس کر دیا۔ کل ہی خریدی تھی ممی نے اس ذلیل کی سالگرہ میں پہننے کو۔ بیڑہ غرق کرکے رکھ دی۔"

"تم نے اُسے مارا کیوں؟" ارمان کو بے انتہا غصہ آیا۔

"دیکھ نہیں رہے ہو۔ اس نے میری ساڑھی خراب کر دی۔"

"بچے سے زیادہ عزیز ہے تمہیں اپنی ساڑھی۔ آئندہ اگر اس پر ہاتھ اُٹھایا تو اچھا نہ ہوگا۔"

"مجھے دھمکی دے رہے ہو۔"

افشاں کی آنکھوں سے انگارے نکلنے لگے۔ ارمان مانی کو لے کر پیار کرتا ہوا۔ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ افشاں کپڑے تبدیل کرتے ہوئے پیچ و تاب کھاتی رہی آج پہلی مرتبہ ارمان نے اس ننھے سے بچے کی خاطر

مجھے اس انداز میں بات کی مجھے دھمکی دے رہا تھا۔ کیا سمجھتا ہے خود کو اور یہ سب اس ذہین لڑکے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اسے مانی سے اور بھی نفرت محسوس ہوئی جس کی وجہ سے ارمان نے شادی کے بعد پہلی مرتبہ اس سے سخت لہجے میں بات کی تھی۔ مانی پر اسے اتنا غصہ آیا کہ دل چاہا اس کے گال تھپڑوں سے سرخ کر دے۔ دو دن تک افشاں نے ارمان سے بات نہ کی پھر ارمان کو ہی ہار ماننی پڑی۔ اس نے افشاں کو منایا۔

کچھ دن اور بیتے مانی اب سارے گھر میں دوڑتا بھاگتا پھرتا تھا۔ اس کی معصوم ہنسی گھر میں گونجا کرتی۔ پھر ایک دن غضب ہی ہو گیا۔ مانی نے افشاں کی ڈریسنگ ٹیبل سے کتنی ہی پرفیوم کی شیشیاں گرا کر توڑ ڈالیں۔ افشاں نے اسے بری طرح پیٹ ڈالا۔ ننھا سا بچہ سخت ہاتھوں کی مار برداشت نہ کر سکا خوب چیخ چیخ کر رو دیا اور پھر اسے بخار ہو گیا۔ اس دن افشاں اور ارمان میں اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا۔ افشاں روٹھ کر اپنے پاپا کے گھر چلی گئی۔ ارمان کا ذہنی سکون تباہ ہو گیا۔ نہ وہ مانی کو کچھ سمجھا سکتا تھا۔ ابھی وہ بہت چھوٹا تھا اور نہ ہی افشاں کو وہ چھوڑ سکتا تھا۔ کچھ بھی ہو وہ اس کی محبت تھی اور اب بھی وہ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔ زندگی اسے عجیب دوراہے پر لے آئی تھی۔ اتنی کے کہنے پر وہ افشاں کو منا کر لے آیا۔ مگر وہ اب بہت دکھی دکھی سا رہنے لگا تھا۔ افشاں جب تک گھر میں ہوتی ارمان مانی کو اس کے پاس نہ جانے دیتا۔ اس کا کمرہ بند رکھتا پھر بھی مانی بچہ ہی تھا افشاں کے کمرے میں گھس جاتا چیزیں خراب کرتا اور بری طرح پٹتا۔

یہ آئے دن کا تماشہ تھا۔ مانی افشاں کا کپڑا میک اپ کا سامان یا کوئی دوسری چیز خراب کر دیتا تو افشاں بڑی بے دردی سے اسے پیٹ ڈالتی اور پھر افشاں اور ارمان کے درمیان جنگ ہو جاتی۔ ان ہی دنوں افشاں پر انکشاف ہوا کہ وہ پھر سے ماں بننے والی ہے۔ اس کے غصے کی انتہا نہ رہی بغیر ارمان کو بتلائے اپنی ایک دوست لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی اور اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ ارمان کو پتہ چلا تو ایک لفظ بھی کچھ نہ کہا اسے۔ حالات پہلے ہی خراب ہو چکے تھے۔ مانی پٹ پٹ کر چار سال کا ہو گیا۔ اب وہ افشاں کے سامنے سے بھی کترا تا تھا۔ اسے دیکھ کر سہم جاتا۔ اپنی دادی اماں کی گود میں چھپ جاتا یا اپنے ابو کے سینے میں منہ چھپا لیتا۔ ارمان کا دل ایسے میں ڈوب ڈوب جاتا۔ اس قدر شریف مضبوط اور باحوصلہ ارمان وقت کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ افشاں سمجھنے اور سمجھانے کی منزلوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ ہمیشہ اپنی من مانی کرتی۔

ارمان نے اپنا کمرہ علیحدہ کر لیا تھا۔ اپنے ساتھ ہی مانی کو سلاتا۔ امی کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی جوڑوں میں درد کے ساتھ ساتھ ہائی بلڈ پریشر بھی تھا۔ مانی دادی سے بہت مانوس تھا۔ اب تو وہ اسکول بھی جانے لگا تھا ارمان نے اسے نرسری میں داخل کرا دیا تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ دادی کے کمرے میں کھیلتا رہتا۔ افشاں کی مصروفیات بدستور تھیں۔ ارمان آفس سے سیدھا گھر آتا اور پھر باپ بیٹے ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے رہتے یا پھر سیر کو چلے جاتے۔ ایک دن پھر مانی سے ایک غلط حرکت ہو گئی۔ افشاں اپنی ممی کا سویٹر بن رہی تھی۔ اون سلائیاں چھوڑ کر فون سننے اٹھی تو مانی نے موقع غنیمت جان کر سارا سویٹر ادھیڑ ڈالا۔ افشاں فون کر کے آئی اور سویٹر کا یہ حشر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بھاگتے ہوئے مانی کو پکڑ کر بری طرح پیٹ ڈالا۔ بچے کے گال سرخ ہو گئے۔ اس کے تڑپ تڑپ کر رونے کی آواز سن کر ارمان جلدی سے اپنے کمرے سے نکلا اور مانی کو افشاں کے ہاتھوں سے چھڑایا۔

"تمھیں رحم نہیں آتا ننھی سی جان کو اس بری طرح مارتے تم ماں نہیں ڈائن ہو۔ ایک دن تمھاری دعائیں بھی نارسا ہو جائیں گی افشاں۔"

افشاں بڑبڑاتی ہوئی پیر پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے اور افشاں قصوروار مانی کو سمجھ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ارمان اسے برا بھلا کہتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو مانی کا گلا گھونٹ دیتی۔ ارمان اب مانی کو اور بھی بچا بچا کر رکھنے لگا۔ ہر دم اسے سمجھاتا رہتا کہ ممی کے پاس نہ جایا کرے۔ ان کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا کرے۔ ماں بیٹے میں فاصلہ بڑھتا ہی گیا۔ ایک دن مانی بڑی معصومیت سے ارمان سے پوچھنے لگا۔

"ابو میرے دوستوں کی ممی تو انھیں بہت پیار کرتی ہیں پھر میری ممی مجھے کیوں پیار نہیں کرتیں؟"

"محبت بانجھ ہو گئی ہے بیٹا!"

ارمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے مانی کی محرومی کا احساس تھا۔ ماں کی محبت بچے کی کتنی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ دن گزرتے رہے، وقت چلتا رہا۔ مانی بڑا ہوتا گیا اب وہ آٹھ سال کا ہو گیا تھا۔ افشاں کی مصروفیات میں کمی آ گئی تھی۔ اس کی تمام سہیلیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں اور اب وہ دو دو، تین تین بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔ وہ اتنی مصروف ہو گئی تھیں کہ افشاں سے اب ان کی بہت کم ملاقات ہوتی۔ افشاں ہی ان کی طرف جایا کرتی اور انھیں گھرداری اور بچوں میں الجھا دیکھ کر اپنے اندر ایک کمی سی محسوس کرتی وہ سب اپنے بچے کو کتنا عزیز رکھتی تھیں۔ بچوں پر جان چھڑکتیں۔ انھیں گود میں لے کر کھل اٹھتیں۔ نہ اپنے قیمتی کپڑوں کا خیال رہتا نہ میک اپ کا۔ ہنس ہنس کر ان کی شرارتوں کے قصے سناتیں۔ ایسے میں افشاں کا احساس محرومی اور بھی بڑھ جاتا اس

کا بچہ تو اس سے کتنا دُور دُور رہا کرتا تھا۔ ضرورت کے سوا بات نہ کرتا۔ دادی یا باپ کے پاس ہی رہتا۔ افشاں بلاتی بھی تو وہ دوسری طرف بھاگ جاتا، سہم جاتا اس کی صورت دیکھ کر۔ اپنے گال پر کھائے ہوئے طمانچوں کا درد وہ اب تک محسوس کرتا تھا۔

ایسے میں افشاں جھنجلا جاتی۔ کبھی غصے سے بھر جاتی۔ اکثر راتیں بے خواب رہنے لگیں۔ اپنی سہیلیوں کو بچوں سے پیار کرتے دیکھ کر اس کے اندر جیسے کوئی سوئی ہوئی شے بیدار ہو گئی تھی۔ ولولے اور جوش کا ایک ریلا سینے میں مچلتا مگر اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتی۔ مانی اس کے سائے سے بھی بھاگتا تھا۔ کبھی وہ پاس بلاتی تو ابو ابو کہہ کر باپ کے کمرے میں بھاگ جاتا جیسے وہ اس کی ماں نہ ہو ڈائن ہو جو اُسے کھا جائے گی۔ افشاں کو قریب پا کر وہ بُری طرح سہم جاتا۔ رونے چیخنے لگتا اور افشاں کا چہرہ زرد پڑ جاتا۔ اپنے اندر اُٹھتی بے تحاشہ چیخوں کو بمشکل روک پاتی۔ ستم یہ کہ جانے کیا خرابی ہو گئی کہ بعد میں کوئی اور بچہ نہ ہوا۔ چیک اپ کے بعد معلوم ہوا کہ اب وہ کبھی کسی اور بچے کو جنم نہ دے سکے گی۔ اس دن افشاں کو یوں لگا جیسے وہ جہنم کے شعلوں میں گم گئی ہو۔

گرتی پڑتی گھر آئی ارمان نے اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے افشاں، بہت پریشان نظر آ رہی ہو؟"

"میری کوکھ بانجھ ہو گئی ہے۔ ارمان اب میں بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی اور مانی مجھ سے دور بھاگتا ہے۔ میں کسے اپنا بچہ کہوں؟"

"جو بویا ہے وہ کاٹو افشاں، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کبھی تم نے یہ سوچنے کی زحمت گوارہ کی کہ مانی تم سے کیوں دُور بھاگتا ہے؟"

"ہاں ہاں... تم تو مجھ ہی کو الزام دو گے۔ چلے جاؤ یہاں سے مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔"

وہ پھُوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ارمان اُسے روتا چھوڑ کر ڈولتے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گیا مانی بیٹری سے چلنے والی ٹرین چلا رہا تھا۔ اس نے مانی کو اپنے پاس بلایا۔

"جی ابو...!"

"مانی اپنی ممی سے تم بات نہیں کرتے ہو؟"

"وہ میری ممی نہیں ہیں۔ ممی ایسی نہیں ہوتیں۔ وہ تو مجھے مارتی رہتی ہیں جب کہ میرے دوستوں کی ممی انھیں بہت پیار کرتی ہیں۔ میری کوئی ممی نہیں ہے۔"

"ایسا نہیں کہتے بیٹے، وہ تمھاری ممی ہیں۔ جاؤ اُن کے پاس۔"

"نہیں نہیں نہیں۔"

مانی سُرخ چہرہ لئے اپنے کھیل میں لگ گیا۔ ارمان بے بسی سے اُسے دیکھتا رہا۔ شام کے وقت وہ مانی کو لے کر لان میں آ گیا اور دونوں باپ بیٹے فٹ بال کھیلنے لگے۔ افشاں کھڑکی میں کھڑی دونوں کو کھیلتے دیکھ رہی تھی۔ سینے میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا وہ اپنے کمرے سے نکلی بھاگتی ہوئی مانی کی طرف بڑھی مانی نے جو اُسے اپنی طرف آتے دیکھا تو ارمان کی گود میں چھپ گیا۔

"مجھے بچایئے ابو! مجھے بچایئے۔"

"میرے پاس آؤ مانی۔" افشاں پُکاری۔

"نہیں نہیں آپ ماریں گی۔"

"میں کیا ہر وقت تجھے مارتی رہتی ہوں کیا میں ڈائن ہوں بول؟"

اور افشاں نے غم و غصے اور بے بسی کے عالم میں مانی کو ارمان کی گود سے کھینچ کر پیٹ ڈالا۔ اور روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

"ابو اس عورت کو گھر سے نکال دیں یہ مجھے بہت مارتی ہے۔" مانی روتا ہوا بولا۔ ارمان نے دُکھے دل سے مانی کو گلے لگایا۔

"ایسا نہیں کہتے بیٹے وہ تمھاری ممی ہیں تم سے بہت پیار کرتی ہیں۔"

"نہیں ابو وہ مجھے مارتی ہیں۔ میں اُن کے پاس کبھی نہ جاؤں گا۔ آپ بھی اُن کے پاس نہ جایا کریں وہ آپ کو بھی ماریں گی۔ وہ بہت خراب ہیں۔"

مانی کے آنسو کسی طرح نہ رُک رہے تھے۔ ارمان اُسے بہلا پھُسلا کر باہر لے گیا۔ افشاں دریچے میں کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی۔ مانی کے آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔ جانے ہی کتنی دیر وہ دریچے میں کھڑی رہی اندھیرے اس کے بہت قریب سمٹ آئے تھے۔ دِل درد کے بگولوں میں لرزاں تھا۔ دل پر جانے کتنا درد کتنا غبار اور کتنی دُھند تھی۔ بے اختیار اس کا دِل مچلا وہ اپنے بچے کو اپنی... باہوں میں سمیٹ کر بے تحاشہ پیار کرے تاکہ دِل پر چھایا سارا غبار چھٹ جائے۔ اگر مانی مجھے نہ ملا۔ مجھ سے یونہی بھاگتا رہا تو یہ کائنات کتنی سونی ہو جائے گی۔ اس کی مانگ کا سیندور اُجڑ جائے گا۔ مانی میرا بیٹا میرا لال... ایک بار صرف ایک بار آ کر میرے سینے سے لگ جاتا کہ میرے سینے میں بسی آگ ٹھنڈی پڑ جائے۔ تنہا کمرے کی دُنیا کتنی ویران تھی۔ یہ تنہائی اس کا مقدر بن گئی تھی۔ وہ تنہائی کے بھڑکتے الاؤ میں جل رہی تھی۔ اس کی کربناک سسکیاں کمرے کے اُداس ماحول میں لرزاں تھیں۔

امی کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ وہ پلنگ سے لگ گئی تھیں۔ مانی اسکول سے واپس آتا تو دادی کی خدمت میں لگ جاتا۔ اُسے اپنی دادی سے بے حد پیار تھا۔ اُن کے چھوٹے موٹے کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے کرتا۔ افشاں امی کے کمرے میں آتی تو وہ کمرے سے

چلا جاتا کہیں جا کر چھپ جاتا۔ ایسے میں افشاں کا دل لہو کے آنسو روتا۔ پھر جب تک وہ کمرے سے چلی نہ جاتی مانی دادی کے کمرے میں نہ آتا۔

ایک دن امّی کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ ارمان کو آفس جانا ضروری تھا۔ مانی نے اسکول سے چھٹی کر لی دادی کی خدمت میں لگا رہا۔ ارمان آفس جاتے جاتے افشاں کو تاکید کر گیا تھا کہ امّی کا خیال رکھے۔ وہ امّی کے کمرے میں آئی تو مانی سہم کر بھاگنے لگا۔ افشاں نے اُسے زبردستی پکڑ لیا۔ وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرنے لگا۔ افشاں کو غصہ آ گیا غم و غصے کی شدت سے بے قابو ہو کر اس نے مانی کو بُری طرح مارا۔

"مجھ سے بھاگتا کیوں ہے کیا میں تجھے مار ڈالوں گی۔ بول بول"۔

مانی روتا ہوا خود کو چھڑا کر باہر بھاگ گیا۔ افشاں امّی کی گود میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

"امّی میرا بچہ مجھ سے اس طرح دُور بھاگتا ہے جیسے میں اُس کی دشمن ہوں۔ امّی مانی میرا ہے، مانی میرا ہے۔"

"اب میں تجھے کیا کہوں۔ بیٹی! تیرا بچپنا تھا جو تو بچے سے بھاگتی تھی اور اب وہ تجھ سے بھاگتا ہے۔"

"آپ مانی کو سمجھائیں امّی ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

"رو نہیں میری بیٹی میں تجھے تیرا بچہ دلاؤں گی۔"

مگر امّی افشاں کو اس کا بچہ نہ دلا سکیں۔ اچانک رات کو اُن کے دماغ کی رگ پھٹ گئی اور وہ دوسرے جہان چلی گئیں۔ دس سالہ مانی تڑپ تڑپ کر رو دیا اور پھر بیمار پڑ گیا۔ افشاں کو تو وہ اپنے کمرے میں ہی نہ آنے دیتا تھا۔ ارمان نے آفس سے چھٹی لے لی۔ مانی کو بخار تھا اپنے ابو سے لپٹ کر کہنے لگا۔

"ابو... دادی امّاں مر گئیں۔ آپ آفس چلے جایا کریں گے۔ اب ممی مجھے اکیلا پا کر بہت ماریں گی۔ ابو آپ مجھے اپنے ساتھ لے جایا کریں۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

"نہیں بیٹے، وہ تمہاری بہت اچھی سی ممی ہیں وہ تمہیں... ماریں گی نہیں تم اُن کے پاس جایا کرو وہ تمہیں پیار کریں گی۔"

"نہیں نہیں... وہ مجھے ماریں گی وہ مجھے بہت مارتی ہیں۔ آپ انہیں گھر سے نکال دیں ابو! نہیں تو... نہیں تو وہ مجھے مار ڈالیں گی۔"

"مانی بیٹے تم بات کو سمجھو بیٹے! تم اُن کے پاس جانے لگو گے تو وہ تمہیں نہیں ماریں گی۔"

"نہیں نہیں... میں اُن کے پاس نہیں جاؤں گا۔"

مانی سہم کر اپنے ابو کی گود میں چھپ گیا۔ ارمان کے لئے ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اُلجھن کسی طرح سلجھتی ہی نہ تھی۔ مانی ماں کے پاس جانے کو بالکل تیار نہ تھا۔ افشاں کو دیکھ کر اس کا چہرہ ڈر کے مارے سفید پڑ جاتا اور افشاں تھی کہ مانی کے لئے تڑپ رہی تھی۔ ارمان کی سمجھ سے باہر تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کا ذہنی سکون غارت ہو گیا تھا۔ افشاں شروع سے مانی کو مارتی آئی تھی اور مانی کے دل میں مار کا ڈر اور سہم اس قدر بیٹھ گیا تھا کہ وہ افشاں کو اپنے قریب دیکھ کر چیخنے لگتا، رونے لگتا۔ ارمان سے حالات سنبھالے نہ سنبھل رہے تھے۔ افشاں کی حالت الگ غیر تھی۔ اپنی خالی گود دیکھ کر وہ رویا کرتی۔ بچے کے ہوتے ہوئے بھی وہ بن بچے کی تھی۔ اور یہ صدمہ اُسے مارے ڈال رہا تھا۔ وہ ممتا کے پل صراط سے گزر رہی تھی۔ ارمان کو اس کے دکھ کا اندازہ تھا۔ مگر وہ کچھ کرنے سے قاصر تھا۔

مانی اچھا ہو گیا تو ارمان آفس جانے لگا۔ مانی صبح اسکول چلا جاتا۔ اور واپس آ کر اپنے کمرے میں گھس کر اندر سے کنڈی لگا لیتا۔ بھوکا پیاسا شام تک کمرے میں بند رہتا۔ ارمان کے آنے پر ہی وہ دروازہ کھولتا۔ یہ صورتِ حال ارمان کے لئے بہت تکلیف دہ تھی۔ اس نے مانی کو بہت سمجھانا چاہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس جایا کرے مگر وہ یہ بات سُننے پر ہی تیار نہ تھا۔ اب مجبوراً ارمان یہ کرنے لگا تھا کہ آفس جانے سے پہلے مانی کے کمرے میں کھانے پینے کی چیزیں رکھ دیتا۔ تاکہ بچہ بھوکا تو نہ رہے۔ ارمان آفس چلا جاتا اور مانی اسکول سے واپس آ کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتا اور افشاں بولائی بولائی سی سارے گھر میں پھرا کرتی۔ رویا کرتی، تڑپا کرتی۔ اس کے آنسو خالی گود میں گرتے رہتے تقدیر پہ ہنسا کرتی۔ ایک دوپہر افشاں مانی کے انتظار میں برآمدے میں ہی ٹہل رہی تھی وہ اسکول سے آ کر اپنے کمرے میں جانے لگا تو افشاں نے اُسے آواز دی۔

"مانی...!"

اس نے پلٹ کر دیکھا اور افشاں کو دیکھ کر زرد پڑ گیا۔

"میرے پاس آؤ مانی۔"

"نہیں نہیں...!"

وہ اپنے کمرے کی طرف ڈر کر بھاگا۔ افشاں نے بھاگ کر اُسے پکڑ لیا۔ مانی بُری طرح مچلنے اور چیخنے لگا۔ افشاں نے اُسے بہت سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ مسلسل چیختا رہا خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا ایسے میں ہمیشہ کی طرح افشاں پر جنون سوار ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے مانی کو بُری طرح پیٹ ڈالا۔ وہ روتا ہوا باہر بھاگ گیا۔ افشاں بھی وہیں برآمدے میں بیٹھ کر رونے لگی۔ تپتی دوپہر میں وہ برآمدے میں بیٹھی روتی رہی۔ مانی کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کدھر بھاگ گیا۔ شام کو ارمان کی کار گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھی تو گیٹ کے قریب لگے

نیم کے درخت کے اُوپر سے مانی کی آواز سُنائی دی۔

"ابو...!"

"ارے مانی تم درخت پر چڑھے بیٹھے ہو؟"

مانی روتا ہُوا درخت سے نیچے اُترا

"کیا بات ہے بیٹے؟"

"ابو... آج ممی نے مجھے بہت مارا ہے۔"

"کیوں بیٹے؟"

"پتہ نہیں۔ ابو میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

"پھر کہاں رہو گے؟"

"دوسرے گھر میں چلئے۔ یہاں ممی مجھے بہت مارتی ہیں۔ مجھے اُن سے بہت ڈر لگتا ہے ابو!"

"میں اُنھیں سمجھا دوں گا بیٹے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

ارمان نے مانی کو گود میں بھر کر ڈھیروں پیار کیا۔

"آپ نے کچھ کھایا بیٹے؟"

"نہیں ابو... میں بہت بھوکا ہوں۔"

ارمان کا دل دُکھ گیا۔ اس نے مانی کے کپڑے بدلوائے اُسے کھانا کھلایا۔ مانی کھانا کھا کر تھکا تھکا سا بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ تب ارمان کچھ سوچ کر افشاں کے کمرے میں آیا۔ وہ اُجڑی اُجڑی سی بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں سوچ رہی تھیں اور ہونٹوں پہ پپڑیاں جم رہی تھیں

"افشاں تم نے پھر مانی کو مارا ہے۔"

"پھر وہ میرے پاس کیوں نہیں آتا؟"

"اس طرح تو وہ تم سے اور دور بھاگے گا۔ تم اُسے مارا مت کرو"

"تم باپ بیٹوں نے میرے خلاف محاذ بنا لیا ہے۔ مجھے پاگل سمجھتے ہو تم دونوں... تم نے مانی کو مجھ سے چھینا ہے۔ میرے پاس نہیں آنے دیتے اُسے۔ میرے خلاف اُسے بھڑکاتے رہتے ہو۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"افشاں بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"تم چلے جاؤ یہاں سے میں کچھ سننا نہیں چاہتی چلے جاؤ یہاں سے۔"

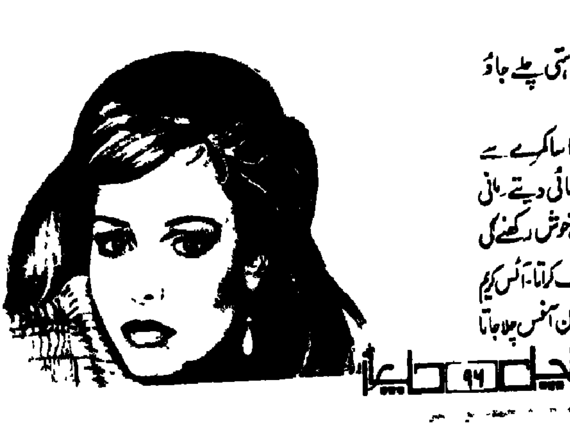
وہ بھیگے چہرے کے ساتھ دھاڑی۔ ارمان لٹا لٹا سا کمرے سے باہر نکل گیا۔ گھر کا سکون کہیں کھو گیا تھا۔ ہر طرف نوحے سُنائی دیتے۔ مانی کے ہونٹوں کی ہنسی روٹھ گئی تھی۔ ارمان اُسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ آفس سے آتا تو اُسے سیر کرانے لے جاتا، شاپنگ کراتا۔ آئس کریم کھلاتا جب تک ارمان پاس رہتا مانی بہلا رہتا۔ صبح ارمان آفس چلا جاتا مانی روکتا ہی رہ جاتا پھر اس وعدے پہ جانے دیتا کہ وہ جلد آ جائے گا۔ مگر ارمان کبھی اپنا وعدہ پُورا نہ کر سکا آفس سے جلد اُٹھنا ممکن نہ تھا۔ واپس آتا تو مانی کو اپنے کمرے میں بند پاتا۔ افشاں اپنے کمرے میں نڈھال پڑی ہوتی یہ تھا گھر کا ماحول جس نے ارمان کا ذہنی سکون چھین لیا تھا۔

ابھی ایک قیامت اور باقی تھی۔ ایک صبح ارمان آفس گیا تو پھر زندہ گھر نہ آ سکا۔ اس کی کار کا ٹرک سے اس بُری طرح ایکسیڈنٹ ہُوا کہ وہ موقع پہ ہی ختم ہو گیا۔ اس کی نعش گھر آئی تو افشاں غم کے مارے سکتے کے عالم میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ مانی اپنے ابو کی لاش سے لپٹ کر بُری طرح رو دیا۔ محلّے والوں نے افشاں کی ممی کو خبر کی وہ اور گھر والے بھاگے بھاگے آئے جوان بیٹی کی بیوگی پر وہ غم سے نڈھال تھیں۔ ارمان کے دُور کے رشتے دار تھے وہ بھی آئے اور مغرب سے پہلے پہلے ارمان کو سفید کفن میں لپیٹ کر اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔

گیارہ سالہ مانی اپنے کمرے میں بیٹھا زرد چہرے کے ساتھ سوچ رہا تھا۔

"دادی اماں مر گئیں۔ ابو بھی مر گئے۔ اب ممی اکیلا پا کر مجھے خُوب ماریں گی۔ کوئی بچانے والا نہ ہو گا۔ پھر کیا ہو گا۔ ممی تو مجھے مار ڈالیں گی۔ کتنی نفرت سے مارتی ہیں... بھاگ جاؤ مانی بھاگ جاؤ۔ ورنہ ممی تمھیں بہت مارا کریں گی۔ بھاگ جاؤ اس گھر سے بھاگ جاؤ... بھاگ جاؤ۔"

اور مانی چپکے سے اس گھر سے بھاگ گیا۔ اُسے بھاگے کافی دن بیت گئے۔ افشاں بیٹے کی جُدائی میں پاگل ہو گئی۔ اگر آپ کو کوئٹہ کی وادیوں میں کوئی پگلی مانی مانی... پُکارتی ملے تو سمجھ جائیے گا کہ یہی افشاں ہے۔ اور لہو لہو کو پکار رہی ہے





جو چیز جہاں چاہی رکھ دی اور بھول گیا۔ وہ بے جان چیزوں کو رکھ کر بھول جانے کی عادت سے خائف تھی کہ وہ اُسے بھی کہیں رکھ کر نہ بھول جائے ۔ کیا اُس کا خوف درست تھا ——— ؟

"روما، نومی، ریما، دیکھو بیٹا کون آیا ہے؟" منذر صدیقی خوشی میں اونچی آواز میں پکارتے ایک ایک کمرے میں گھوم رہے تھے۔ تینوں بیٹیاں ہڑبڑا کر اپنے اپنے کمرے سے نکل آئیں کہ آخر آج ڈیڈی ہوا پا گھر سے کون سا نیا جانور پکڑ لائے کہ یوں بے اختیار ہو کر نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں۔ وہ تینوں جب باہر آئیں تو منذر صدیقی کے پاس ایک نوجوان کھڑا تھا، دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، ورزشی جسم، بہترین تراش کا نیلگوں سوٹ، جو اس پر بہت سج رہا تھا اور لبوں پہ ہلکا ہلکا تبسم۔

"ارے یہ تو۔۔۔ یہ تو ابریز ہیں" تبریز انکل کے صاحبزادے تینوں بہنوں نے ایک دم کہا تو روما اور نومی بھاگ پڑیں۔

"ارے ابریز بھائی آپ۔۔۔ یہاں؟"

وہ چہکیں۔ وہ مسکرا کر نفی میں سر ہلانے لگا تو سبھی مسکرا دیئے اور ریما وہ جانے کیوں روما اور نومی جیسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہ کر سکی۔ غالباً اس پر بڑی ہونے کا احساس غالب آگیا تھا۔ تبھی تو ابریز آنکھ دبا کر روما سے اسی کی بابت کچھ کہہ رہا تھا اور منذر صاحب اپنی بیگم کی بابت پوچھ رہے تھے۔

"کہاں گئیں تمہاری ممی۔ انہوں نے تو اس کو ہمیشہ بیٹا سمجھا ہے اور یہ ہیں کہ اپنا گھر ہوتے ہوئے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں" پھر کسی کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بیگم کی تلاش میں نکل گئے اور ابریز ریما کی جانب بڑھ گیا۔

"السلام علیکم!" لبوں پر شوخ سی مسکان لئے وہ بولا تو ریما بھی جواباً "وعلیکم السلام" کہہ بیٹھی۔ چھوٹی بہنیں ہنس دیں اور ابریز بمشکل خود کو سنجیدہ رکھ پایا۔

"آپ تو یوں اجنبیت کا مظاہرہ کر رہی ہیں جیسے ہم قطعاً اجنبی ہوں" وہی بولا۔

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ اندر تشریف رکھیے میں ذرا کچن تک ہو آؤں۔ فرمایئے کیا پئیں گے، چائے، کافی یا کولڈ ڈرنکس؟"

"میرا خیال ہے گرمی ہے کچھ ٹھنڈا منگوا لیجئے" وہ کمرے میں جانے سے پہلے بولا تو ریما فوراً کچن کی جانب چل دی مگر تعاقب میں اک بھنچا بھنچا قہقہہ ضرور سنا۔

"ہونہہ! گویا پرانی عادت اب تک گئی نہیں" ریما نے جل کر سوچا اور کچن میں داخل ہو گئی۔ خانساماں جانے کہاں تھا۔ اس نے خود ہی اورنج اسکواش بنا لیا۔ جب اسکواش بن چکا تو کسی کام سے چوکیدار اندر آگیا۔ ریما نے اسی کو آواز دے لی۔

"رحیم بخش! یہ چیزیں ڈرائنگ روم میں پہنچا دو اور یہ احمد خان کہاں گیا ہوا ہے؟ آتے تو اسے کہنا کہ آج کھانا پرتکلف ہو اور وہ ہدایات کے لئے فوراً مجھ سے مل لے"

"جی بی بی!" وہ جانے سے قبل بولا تو وہ بھی کچن سے نکل کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی جہاں ابریز، ممی، ڈیڈی سے باتوں میں مگن تھا۔ وہ بھی مسکرا کر روما کے قریب جا بیٹھی۔ نومی اسکواش شروع کرنے لگی تھی۔

جب وہ رات گئے جانے کو اٹھا تو اس نے بھی اخلاقاً کہہ دیا۔

"ابریز صاحب! گھر ہوتے ہوئے ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں۔۔۔؟"

وہ اسے غور سے دیکھتا ہوا مسکرا دیا "میں انکل اور آنٹی سے کہہ چکا ہوں"

"کیا۔۔۔؟"

"یہی کہ کرکٹ ٹیم کے ساتھ آپ کے شہر میں آنا ہوا ہے یہاں ہم لوگ مہمان ٹیم سے ایک نمائشی میچ کھیلنے والے ہیں"

"ہونہہ، تو ابھی تک وہ کرکٹ کا شوق بھی موجود ہے۔ وہ پھر جل بھن گئی۔

"اب آپ بچے نہیں رہے۔ انکل بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان کا ہاتھ بٹایئے اور یہ گیند بلے کا کھیل ختم کیجئے"

وہ جواب میں کچھ نہ بولا۔ بس مسکرا کر گڈ بائی کہہ کر نکل گیا۔ ساتھ ہی گھر کے باقی افراد بھی اور وہ بکھری چیزیں سمیٹنے کو وہیں رک گئی۔ کشن ٹھیک کئے۔ ایش ٹرے جو سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھری تھی اسے صاف کیا۔ پھر ڈائننگ روم میں آئی تو وہاں اس کا رومال موجود تھا۔ سفید براق صاف و شفاف رومال۔

"توبہ، اتنا بڑا ہو گیا مگر چیزوں کو بھولنے کی عادت نہیں گئی" وہ بڑبڑائی اور رومال اٹھا کر نکل گئی۔

"اس کی یہی عادت ہے۔ جہاں جاتا ہے کچھ نہ کچھ بھول آتا ہے" کمرے میں آکر وہ پھر بڑبڑائی اور اس کا رومال دراز میں رکھ دیا۔

آجکل انگلینڈ کی کرکٹ ٹیم آئی ہوئی تھی اور پورے شہر میں بس یہی خبر گشت کر رہی تھی کہ ابریز بہت اعلیٰ کھیل رہا ہے۔۔۔ گھر میں بھی یہی چرچا تھا۔ روما اور نومی ہر وقت

ٹی وی کے سامنے بیٹھی ہیں اور میچ چل رہا ہے۔

وہ کسی کام سے ٹی وی لاؤنج میں آئی تو نومی چیخی۔

"آپی! دیکھئے تو اپنے ابریز بھائی کتنے جارحانہ انداز میں سٹنگ کر رہے ہیں۔"

"ہونہہ کوئی خاص تو نہیں۔ وہ تو بس انگلینڈ کا بولر اچھی گیند نہیں پھینک رہا ورنہ انھیں آؤٹ ہوتے صدیاں بیت جائیں۔"

وہ جلدی سے نکل گئی اور بہنوں کا منہ بن گیا۔ "پتہ نہیں آپی کو ابریز بھائی سے کیا دشمنی ہے۔ کبھی نہیں سراہتیں۔" نومی بولی اور روما ہنس دی۔ . . اور اس کے کان میں جا گھسی۔

"اصل میں آپی گھمنڈ کا شکار ہیں۔ انھیں پتہ ہے کہ ابریز بھائی شروع سے انھیں پسند کرتے ہیں۔ اس لئے انھیں نخرے دکھاتی ہیں۔"

"مگر اس وقت تو وہ یہاں نہیں تھے۔"

"اسکرین پر تو موجود تھے نا۔"

روما کی بات پر زبردست قہقہہ ابھرا اور دونوں بہنیں پھر شوق سے میچ دیکھنے لگیں۔

میچ سے فارغ ہو کر وہ منذر صاحب کے ہاں اس شام پھر چلا آیا۔ آج سفید پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس تھا قمیص کی آستینیں الٹ رکھی تھیں اور اس کے مضبوط بازو بالوں سے بھرے ہوئے بالکل برہنہ تھے۔ اتفاق سے ریما لان میں تھی۔ وہ وہیں آیا۔ وہ مسکرایا تو اخلاقاً ریما بھی مسکرا دی۔

"پوچھیں گی نہیں کہ اتنے دن کیوں نہیں آیا؟"

"مجھے معلوم تھا۔"

"کیا ۔۔۔؟"

"یہی کہ آپ مصروف تھے۔" وہ جھک کر ایک گلاب کی کلی توڑنے لگی۔

"تو آپ نے ٹی وی پر میچ دیکھا ہوگا؟" ابریز جیسے یک دم خوش ہو گیا۔

"ایسی فضول چیزیں میں نہیں دیکھتی۔ پھر اتنا وقت کس کے پاس ہوتا ہے کہ سارا دن . . ." وہ کلی توڑ کر اب لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ ابریز اس کا ساتھ دینے لگا۔

"تم بالکل نہیں بدلیں۔ آج بھی ہمیشہ کی طرح کرکٹ سے الرجک ہو حالانکہ یہ اتنا دلچسپ گیم ہے کہ ..." وہ یہیں تک پہنچا تھا کہ ریما نے اسے بڑے زور سے گھورا اور اپنی بےزاری کا اظہار چہرے کے تاثرات سے کیا۔ وہ مسکرا کر چپ ہو گیا پھر بولا۔ "لاؤ یہ کلی تمھارے بالوں میں لگا دوں۔"

"جی نہیں شکریہ۔" وہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔

"اس جمعے کو ون ڈے میچ ہو رہا ہے۔ تم سب لوگ اسٹیڈیم آنا۔"

وہ پھر غصے میں پلٹی تو ابریز شرارت سے اپنی گدی سہلانے لگا اور ریما تاؤ میں آ گئی کیونکہ وہ سدا سے یونہی اسے جلاتا آیا تھا۔ جانتا تھا ریما کیا کچھ پسند کرتی ہے اور کیا کیا چیزیں اُسے سخت ناپسند ہیں۔ وہ انہی نفرت شدہ چیزوں کا ذکر کر کے اُسے بڑی معصومیت اور انجان پنے سے جلایا کرتا۔

اس بار اس سے تقریباً دو سال بعد ملاقات ہوئی تھی کیونکہ اسی کرکٹ کے سلسلے میں وہ زیادہ تر باہر ہی رہا تھا۔ اس کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا کب اُٹھ کر لندن، پیرس، آسٹریلیا وغیرہ چل دے گا۔ آج کل وہ چار ماہ بعد سری لنکا سے لوٹا تھا مگر اتنے سفر کرنے کے بعد بھی اور اتنا عرصہ وطن سے دُور رہ کر بھی ابریز آج بھی اچھی طرح جانتا تھا وہ کیا پسند کرتی ہے اور کس کس کے ذکر پر اس کی خوش اخلاقی کافور ہو جاتی ہے۔

"میرا خیال ہے اندر چلتے ہیں۔" کن انکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد ریما نے تجویز پیش کی تو اس نے بھی قدم بڑھا دیئے اور اس کے ساتھ ساتھ چلتا اندر چلا آیا حسب معمول گھر کے سبھی افراد نے تھوڑی ہی دیر میں ریما کو جیسے سبھی بھول گئے۔ وہ ہنس ہنس کر اپنی مصروفیات گنوا رہا تھا۔ پھر جب منذر صاحب اور ان کی بیگم بچوں کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے تو وہ ترچھی نگاہ رسالہ دیکھتی ریما پر ڈال کر قدرے اُونچی آواز میں بولا۔

"آج تو روما غضب ہو گیا۔ جونہی میں کسی کام سے مارکیٹ گیا تو لوگوں کا ایک ہجوم میرے گرد جمع ہو گیا تھا۔ ہر طرف ابریز دولت کے نام کی مالا جپی جا رہی تھی۔ میرے لئے شاپنگ عذاب بن گئی۔ لوگ آٹوگراف لے رہے تھے۔ ایک آدمی نے غالباً فیلو کا سامان خریدا تھا اس نے وہی آگے کر دیا اور میں نے دستخط

ردیئے اور پھر رومال! ایک بے انداز حسین لڑکی وہاں آ گئی سادا ہجوم مجھے بھول کر اسے دیکھنے لگا... اور وہ... وہ ہجوم چیرتی مجھ تک آئی اور بولی: "آٹو گراف آج اتفاق سے گھر رہ گئی۔ مجھے پتہ ہوتا کہ آپ یہاں مل جائیں گے تو ضرور لاتی۔ بہرحال، یہاں کچھ لکھ دیجئے۔ گھر جا کر آٹو گراف پر نقل کر لوں گی۔ میرے بھائی ہوزاڈ میں نمبر دن ہیں۔ ہر شخص کے سائن پلک جھپکتے میں نقل کر سکتے ہیں۔ بس انہی کی مدد لوں گی۔ لیجئے" اور۔ اس نے اپنی ہتھیلی وا کر دی۔ خوب صورت صحت مند بھری بھری گلابی ہتھیلی۔ وہ لٹتے ہجری آواز میں بولتا گیا: "لوگوں میں بے چینی پھیل گئی اور میں وہ ہتھیلی دیکھ کر دم بخود سا ہو گیا... کیونکہ آج تک کسی نے یوں آٹو گراف نہ لیا تھا۔ بہرحال، میں نے اس پیاری سی ہتھیلی پر ایک ننھا سا فقرہ لکھا اور سائن کر دیئے۔ لڑکی نے تعجب سے مٹھی بند کر لی اور ہجوم میں غائب ہو گئی۔"

نومی اور رومانہنس رہی تھیں۔ وہ خود بھی کافی مسرور تھا۔ ریمانے یہ سب سنا اور دیکھا تو جل بھن کر رسالہ پٹخ دیا اور قہر بھری نگاہ ابریز پر ڈال کر نکل گئی۔ عقب میں ح سمجھ لیا ہی دل جلانے والا قہقہہ محل اٹھا تھا۔ وہ پاگل ہو گئی۔ جا کر اس کا وہ رومال اٹھایا جو وہ پچھلی بار یہاں دل گیا تھا اور لا کر اس کے آگے پٹخ دیا۔

"اوہ تو یہ یہاں تھا اور میں وہاں تلاش کرتا رہا۔ خواہ مخواہ رومالوں کا نیا پیکٹ خریدنا پڑا۔ بھئی پتہ نہیں کیوں ہر جگہ کچھ نہ کچھ بھول جاتا ہوں اور یہاں اس گھر میں بہت قیمتی چیز بھول بیٹھا ہوں۔"

"وہ کیا ابریز بھائی؟"

روما اور نومی نے پوچھا اور ابریز عجیب سے انداز ریما کو دیکھنے لگا۔ تو بہ کیسی شرارت بھری نگاہ تھی وہ۔ سیانی ہو گئی اور ابریز سگریٹ سلگا کر لبوں میں لگا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے چل دی تو ابریز دبے قدموں تعاقب میں گیا اور سارا دھواں چند فٹ کے فاصلے کی پشت پر چھوڑ کر تیزی سے قریبی صوفے پر جا بیٹھا جب ریما کے شانوں سے ہوتا اس کے نتھنوں سے تو وہ طیش میں پلٹی مگر وہ بڑی معصومیت سے آنکھیں صوفے پر نیم دراز سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اس دی پر ریما کا دل ہولے سے دھڑکا مگر اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کی فوری ناکہ بندی کے بعد وہ بڑی شان سے اسے ڈانٹ رہی تھی۔ یعنی دل کو... اس کی حرکت پہ! وہ تو کھلا بھی گئی کیونکہ ابریز کی آنکھیں بند تھیں تو کیا ہوا۔ نومی اور روما تو بڑی کڑی نظروں سے لبوں پہ مسکان دبائے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ریما نے ایسے میں تیزی سے کھسک جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

اگلی بار وہ ہفتے کے روز ون ڈے میچ سے فارغ ہو کر آیا اور آتے ہی کچھ تلاش کرنے لگا۔ وہ مسکرا دی۔

"آپ کچھ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر اپنے پارکر قلم کی تلاش ہے تو میں ابھی لا دیتی ہوں مگر اس وعدے پر کہ آئندہ اپنی چیزیں خود سنبھالیں گے۔"

اور ابریز شوخی سے ٹکٹکی باندھے اسے تکنے لگا۔

"آخر کیوں ہر جگہ چیزیں بھول جاتے ہیں؟" وہ اس کو یوں دیکھنے پر بڑبڑا کر طیش میں آ گئی تو ابریز نے مسکین سی صورت بنائی۔

"ہر جگہ تو نہیں۔ بس یہیں کچھ نہ کچھ بھول جاتا ہوں شاید اس لئے کہ یہاں جو چیزیں رہ جاتی ہیں۔ وہ مجھے دوبارہ مل بھی جاتی ہیں۔ تم میرے جاتے ہی انھیں سنبھال کر رکھ لیتی ہو۔ شکریہ!"

وہ آخری فقرے پر پھر بڑبڑائی اور جلال میں آ گئی۔

"کیا کیا؟"

"کک... کچھ نہیں۔ چلو آنٹی یا انکل سنبھال کر رکھ دیتے ہوں گے۔ اس لئے کہ روما اور نومی تو ایک دم نکمی ہیں۔" وہ خوفزدہ ہونے کی ایکٹنگ کرنے لگا اور ایک بار پھر اس کا یہ روپ ریما کے دل میں ہلچل مچانے لگا۔ اس لئے کہ وہ جانتی تھی وہ ایسا ڈرپوک ہرگز نہیں ہے۔ اس سے تو گھر میں سبھی ڈرتے ہیں۔ اکلوتا بیٹا جو ہوا، دو بہنیں ہیں۔ روما اور نومی کی ہم عمر۔ ان کی تو جان جاتی تھی۔ بات کرتے ہوئے گھبراتی تھیں اور یہ لارڈ صاحب سینہ اکڑائے گھوما کرتے اور یہاں ریما کے سامنے بات بات پہ سہم جانا تو محض یہ اس کی اداکاری تھی۔ شرارت تھی۔

ایمان سے میں آجکل بہت اداس ہو رہا ہوں۔"

ابریز نے ایک دم موضوع بدلا تو وہ بھی چونک کر بولی۔

"کیوں۔ خیریت ہے؟"

"میچ ختم ہو چکے ہیں۔ انگلینڈ کی ٹیم پرسوں واپس جا

رہی ہے۔"

"اس کے جانے سے جناب اُداس کیوں ہیں؟ انہیں تو جانا ہی تھا۔"

"اُداسی ان کے جانے کی نہیں اپنے جانے کی ہے۔"

بات کہہ کر وہ فوراً رُخ موڑ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہُوا اور اس کی بات اور اس کے لہجے نے بے چاری ریما کا یہ حال کیا کہ وہ اس سے نظر بھی نہ ملا پائی۔ وہ پلٹا تو وہ لب بھینچے مُسکرا دی اور اس کے گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے۔ ابریز بے خود سا ہو گیا۔

"یہ اُداسی ایک عارضی وقفہ ہے۔ کرکٹ کا سیزن شروع ہو چکا ہے۔ انگلینڈ کی ٹیم چلی گئی تو کیا ہوا۔ کوئی اور ٹیم آ جائے گی یا آپ لوگ کہیں چلے جائیں گے۔ پھر یہ اُداسی ختم ہو جائے گی۔"

اس کی بے خودی پہ ریما بھی شرارت سے بولی۔ حالانکہ وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے مگر وہ بے تعلق سی نظریں جھکائے اس سویٹر کی طرف متوجہ ہو گئی جو اس نے آج ہی شروع کیا تھا۔

"میرا خیال ہے تم اتنی بے وقوف نہیں ہو جتنی نظر آنے کی کوشش کر رہی ہو۔" وہ بھنچی آواز میں دھاڑا تو وہ سکون سے مُسکرا دی۔ آج تک وہ جلاتا آیا تھا۔ پھر ریما آج یہ موقعہ کیسے ضائع کر دیتی۔

"گھومنے چل رہی ہو۔"

"کیوں؟"

"بس دل چاہ رہا ہے۔ میں آنٹی سے بھی پوچھ آیا ہوں اب چلو۔" وہ دھونس سے بولا اور ریما ہنس دی۔ اب یہ کسی پُر فضا مقام پہ لے جا کر اظہارِ تمنا کرنا چاہتا ہے۔ ہائے بے چارا۔

"تیار تو ہو جاؤں۔" وہ شریر ہو رہی تھی۔

"نہیں ــــ کوئی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی اچھی لگ رہی ہو۔"

وہ کسی قدر چبا چبا کر لفظ ادا کر رہا تھا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اسی طرح انگلیوں سے بال سنوارتی اس کی گاڑی میں جا بیٹھی۔ یوں اُسے ستانے کو بولی۔ "کیا بات ہے۔ آج رومانا اور نومی کو ساتھ نہیں لیا۔۔۔ وہ دونوں بھی گھوم آتیں۔"

وہ چڑ کر اُسے گھورنے لگا اور تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"موسم تو خراب ہو رہا ہے۔ کہیں بارش ہی نہ ہو جائے۔"

وہ اب بھی چُپ تھا اور گاڑی بھاگ رہی تھی تقریباً ایک گھنٹہ سفر کے بعد گاڑی ایک خوبصورت جھیل کے کنارے رُکی اور عقب میں پہاڑی سلسلہ پھیلا ہُوا تھا جس پہ سبز جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

"اب کیا یہ پہاڑ سر کرنے ہیں یا میں یہیں کہیں بیٹھ جاؤں۔۔۔؟" مُسکراہٹ دبا کر وہ بولی تو وہ دھم سے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ہر طرف گھاس تھی۔ سرسبز گھاس۔۔۔ مگر جہاں وہ دھم سے گرا تھا وہاں جھاڑ پھونس ہی اُگا ہُوا تھا۔ وہ جل کر فوراً اُٹھا اور ریما مُسکرا دی۔۔۔ ابریز کھسیا گیا۔

"کیسی خوبصورت جھیل ہے اور آس پاس کیسے پیارے پھول کھلے ہوئے ہیں۔"

"کوئی خاص نہیں۔ میرے شہر میں اس سے عمدہ عمدہ تفریح گاہیں ہیں۔ جہاں بیٹھ کر انسان سلیقے سے کسی سے کچھ کہہ سکے۔"

وہ بناوٹی ناراضگی کا مظاہرہ کرنے لگی۔

"کیا؟ آپ میرے اتنے حسین شہر کو بُرا کہہ رہے ہیں۔ یہ علاقہ تو بلوچستان کا دل ہے اور لوگ دور دور سے یہاں آتے ہیں۔ سیاحوں کے دل اٹک جاتے ہیں۔ ذرہ ذرہ ان کے کیمروں میں محفوظ ہو جاتا ہے اور آپ جو اس دیس کے باسی ہیں اپنے وطن کے ایسے پیارے خطے کا مذاق اُڑائیں گے۔"

"ارے بھئی لاحول ولا قوۃ ــــ بھلا میں شہرِ محبوب کا تمسخر اُڑاؤں گا۔ مرنا ہے مجھے؟" پھر شرارت سے ریما کا ہاتھ پکڑ کر وہیں اس جھاڑ پھونس پہ بٹھلانے لگا۔ "تشریف رکھیے مجھے کچھ کہنا ہے۔"

"مجھے بھی۔۔۔" وہ وہاں سے اُٹھتی ہوئی بولی اور وہ ہنس پڑا۔ "اب خدا کے لیے وہ گانا مت شروع کر دینا۔ پہلے تم، پہلے تم والا۔"

پھر وہ سیٹی پہ کوئی شوخ سی دھن بجانے لگا اور ریما اکتانے لگی کہ آخر جو کچھ کہنے کو اتنی دُور آیا ہے کہہ کیوں نہیں دیتا۔ بڑی دیر بعد وہ جھجکتے جھجکتے بولا۔ "میں اسی جمعہ کو واپس

جانا چاہوں۔"

"اتنی جلدی!" وہ ویں تھم سی گئی۔

"ہاں۔ بُرا ہو میری اس سیلانی طبیعت کا۔ ایک جگہ دل ہی نہیں لگتا۔"

"پھر تو یہ چند دن ہمارے ہاں گزار لیجئے۔" وہ اچانک کہہ بیٹھی۔

"شکریہ۔ انکل اور آنٹی بھی یہی کہہ رہے تھے مگر مجھے خود ہی کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اصل میں والدین کا بگڑا ہوا بچہ ہوں۔ سلیقہ نام کو نہیں۔ اسی لئے کسی کے ہاں رہنے کی بجائے ہوٹل میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ خیر یہ تو غیر ضروری باتیں ہیں وہ بات تو رہ ہی گئی جس کے لئے میں یہاں آیا تھا۔"

"میرے شہر میں یا اس جھیل پر؟" ریما پھر شریری ہو گئی کیونکہ دل کا عجب عالم تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ابریز کو کیا کہنے کی جلدی ہے اور اس میں وہ سب سننے کی تاب ہی نہ تھی۔ جانے وہ سب کسی سے سُن کر کیا ہوتا ہو اور یہ... یہ بے ایمان پل بھر میں وہ گلال دیکھ کر میرے دل کا عالم جان جائے۔

اُس نے سوچا اور بات بدل دی۔ ابریز تاؤ کھانے لگا۔

"میں بڑی مشکل سے وہاں تک آتا ہوں جہاں آنا چاہتا ہوں مگر تم پھر بھٹکا دیتی ہو۔"

"تو کیا ہوا جو مزہ بھٹکنے میں ہے وہ منزل پر پہنچ جانے میں کہاں۔ پھر منزل پر تو انسان پہنچ ہی جاتا ہے۔ ایسی جلدی کیا ہے۔" وہ خود پر قابو پا کر بولی مگر عجب بے خود کر دینے والے جملے تھے۔ ابریز یہ سب سُن کر مسرور ہو گیا اور مسکرا کر سگریٹ کا لمبا سا کش لگا کر دھواں اس کے چہرے پر چھوڑ دیا۔

"گویا مجھے دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تم تو سب کچھ بن کہے جان گئی ہو۔ ایمان سے ریمی۔ اظہارِ تمنا کا مجھے بالکل سلیقہ نہ تھا۔ اچھا ہوا تم نے مجھے اس مشقت طلب کام سے بچا لیا۔ جانے کتنے بھونڈے طریقے سے دل کا حال بتاتا... اور تم بیٹھی ہنستیں۔"

وہ مشکور تھا، مسرور تھا اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ریما مسکرا دی۔

"میں تو اب بھی ہنس رہی ہوں۔"

"وہ ہنسی اور ہوتی ہے یہ ہنسی اور ہے۔"

"یہ ہنسی اور کیوں ہے بھلا۔"

"یہ... یہ تمہارے اقرار کی خوشی ہے۔ ویسے شکریہ! تم نے میرے برسوں کے جذبات کا مان رکھ لیا۔ اب ممی کو جواب دینا آسان ہو جائے گا۔ میں جاتے ہی ممی پاپا کو بھیجوں گا۔ اب تنہا نہیں جیا جاتا۔ ایمان سے ریمی میرے سارے دوست اپنی بیگمات کے ساتھ ہوتے ہیں اور میں جل بھن کر انہیں کوسنے لگتا تھا۔ تمہارا رویہ بھی تو بہت حوصلہ شکن ہوتا تھا۔ بولو! مجھے کوئی امید کیوں نہیں بندھائی تھیں۔ بیچ بھنور میں کیوں چکرانے کو چھوڑ رکھا تھا؟"

وہ اس کے بہت قریب آ گیا... تو ریما کا سارا لہو اس کے چہرے پر سمٹ آیا اور وہ لڑکھڑا کر اس سے دور ہو گئی۔

"پیچھے ہٹو، بلکہ واپس چلو۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔" وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ابریز نے بھنوئیں اٹھا کر اسے غصے سے گھورا۔

"واپس تو جانا ہی ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ جب تمہارے شہر میں ہوں اب روز تم سے ملوں، تمہارے ساتھ گھوموں پھروں اور اس وادی کے چپے چپے پر ہمارے نقش پاثبت ہو جائیں۔"

"ایسی فالتو نہیں ہوں جناب۔ آخر ممی ڈیڈی بفضل خدا آنکھیں رکھتے ہیں۔ وہ دونوں کیا سوچیں گے۔"

"وہی جو ایسے میں انہیں سوچنا چاہیئے۔ پھر جونہی میری ممی آئیں گی تو آنٹی کو بن پوچھے تمہارے فیصلے کا علم ہو جائے گا اور فوراً مبارک سلامت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔" ابریز ہنس پڑا۔

"ہوش میں تو ہیں۔ کیا اتنی بھاری ہوں میں کہ ممی ڈیڈی ایک دم سر سے اتار پھینکیں گے۔" وہ بُرا مان کر بولی۔

"اس میں منہ بنانے کی تو کوئی بات نہیں کیونکہ ہر شریف آدمی جوان بیٹی کو ایک بارِ گراں سمجھتا ہے اور جیسے ہی اس کی حسب منشا رشتہ آتا ہے تو اس بوجھ کو اپنے داماد کے کندھوں پر ڈالنے میں ذرا سی تاخیر پسند نہیں کرتا... محترمہ آجکل اچھے رشتے رہے کہاں ہیں، لڑکوں کی ایک بڑی تعداد محض آوارہ گردی کرتی ہے۔ کمانے دھمانے سے انہیں۔۔ کیا۔ نہیں اور طالب علمی کا سنہرا زمانہ وہ لڑکیوں

کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ضائع کر دیتے ہیں۔ ایسے میں لڑکیاں کتنا بوجھ بن گئی ہیں۔ یہ صرف لڑکیوں کے والدین جانتے ہیں تم اندازہ نہیں کر سکتیں کیونکہ تم محض بیٹی ہو!" وہ سنجیدگی سے کہتا پھر شرارت سے اس پر جھکا اور بولا۔

"اور والدین کے اس کرب کو تو ابھی تم سمجھ ہی نہیں سکتیں! کیونکہ یہ وقت تم پر آج سے بیس، پچیس برس بعد آئے گا۔"

وہ جھینپ مٹانے کو جلدی سے گاڑی کی جانب بڑھ گئی تو ابریز بھی مسکراتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر چلا آیا اور راستے میں بولا۔

"کل پھر تمھیں میرے ساتھ آنا ہوگا۔ بلکہ جمعہ تک میں روز تمھارے سنگ گھومنا چاہوں گا۔ یاد رہے گا نا۔۔؟ ہر شام۔۔"

ریما نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ ابریز کی عقابی نگاہیں، ورزشی جسم اور مسکراتا چہرہ، بس ایک ہی بات کے منتظر تھے کہ وہ کب اقرار میں گردن ہلاتی ہے جبکہ ریما چپ تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

"سچ کہا ہے کسی نے عورت کی خاموشی میں اس کی رضامندی پنہاں ہوتی ہے۔"

وہ پھر بھی چپ رہی مگر اگلی شام جب وہ اسے لینے آیا تو پتہ چلا ریما گھر پر نہیں ہے اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی ہوئی ہے پیر کی شام بھی وہ نہیں ملی مگر جب منگل کی صبح وہ ان کے ہاں پہنچا تو خوب بارش ہو رہی تھی اور موسم از حد خراب تھا۔ وہ سب سے مل کر ریما کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ اسے دیکھ کر شرارت سے مسکرا دی اور ابریز جھنجھلا رہا تھا۔

"میں دو دن سے خوار ہو رہا ہوں۔ لگاتار آ رہا ہوں کچھ احساس ہے؟"

وہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔

"پھر جب میں نے اس روز کہہ دیا تھا کہ۔۔۔ روز تمھارے ساتھ گھومنا چاہتا ہوں پھر بھلا تمھیں سہیلیوں کے ہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ بگڑا۔

"ایک ضرورت تھی۔"

"کیا۔۔؟" وہ دھاڑا۔

"وہ یہ کہ کبھی کبھی ویسا نہیں ہوتا جیسا کہ کہا جاتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ کھل کر بات کرو۔"

"مطلب یہ کہ ہر بار عورت کی خاموشی میں اقرار پنہاں نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ موقع تو اس کی زندگی میں بس ایک بار آتا ہے اور تبھی لمحہ بھر کی خاموشی سے کہا جاتا اس کے پروانۂ غلامی پر دستخط کر دیتا ہے مگر ساری زندگی عورت چپ نہیں رہتی۔"

"معلوم ہے مجھے اور اب اٹھو۔"

"ارے پاگل ہو گئے ہیں۔ باہر اتنے غضب کی بارش ہو رہی ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ اتنا دلکش تو موسم ہو رہا ہے۔"

"آرام سے بیٹھ جائیے۔ اور سنائیے کیا پئیں گے؟" ریما نے پوچھا تو وہ ٹک تو گیا مگر کھانے پینے سے انکار کر دیا۔

"ابھی آنٹی نے پکوان کھلائے ہیں۔ لہٰذا کسی شے کی بھی خواہش نہیں۔ ہاں البتہ اب شادی ناگزیر ہو چکی محترمہ۔ میرا خیال ہے جمعہ کا بھی کیا انتظار۔۔۔ میں آج ہی ممی کو فون کر دیتا ہوں۔ وہ فوراً چلی آئیں گی اور جمعہ تک جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ سبھی کچھ ہو جائے گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" وہ بہت شوخی سے اس کی رائے طلب کر رہا تھا۔ ریما کا جی چاہا کہ چیخ کر کہے "تمھارے دماغ میں کوئی خلل واقع ہو چکا ہے۔ تبھی تو آج ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو" مگر یہ سب اس نے اتنی مدھم آواز میں کہا جسے سرگوشی کہا جا سکتا ہے۔ وہ پھر مسکرا دیا۔

"فی الحال تو حیرت ہے مگر ڈر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مرض زور پکڑتا جائے گا۔" وہ بڑے رازدارانہ انداز میں اس کے کانوں کے قریب بولا۔

"اچھا۔۔ اس سے قبل کہ آپ کا یہ مرض مزید جذباتی بن جائے۔ آپ چلتے پھرتے نظر آئیے۔ توبہ عجیب آدمی ہیں۔ جب دیکھو یہیں دھرے ہیں۔ کبھی کوئی ڈھنگ کا کام کاج کیجئے۔ ورنہ محض ایک بیٹسمین ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ پاپا صاف انکار کر دیں گے۔"

"کیا۔ یعنی آج تم دھکے دے کر نکالو گی۔ واہ۔ ابھی جا کر آنٹی کو بتاتا ہوں کہ ان کی صاحبزادی مہمانوں کی کتنی عزت افزائی کرتی ہے اور رہ گئی میری بے کاری۔۔۔ تو یہ بھی تمھاری زیادتی ہے۔ دو ماہ سے کرکٹ کھیل کھیل کر کچھ مر

نکل گیا اور آپ فرماتی ہیں بے کار ہوں۔ ویسے اگر ہوں بھی تو اس سے آپ کی صحت پہ کیا اثر پڑتا ہے۔ میرے پاپا کا لمبا چوڑا بزنس، بینک بیلنس، ان کی کوٹھیاں، بنگلے آخر کس کے لیے سا بدولت ہی کے پھر بھلا۔۔۔"

"ہونہہ شیخی۔ وہ سب تو انکل کی محنتوں کا صلہ ہے۔ آپ نے اس میں کیا اضافہ فرمایا" وہ منہ بنا کر ایک کتاب اٹھاتی ہوئی بولی۔

"اب میرا پڑھنے کا موڈ ہے۔ فوراً غائب ہو جائیے ورنہ مجھے لاحول ولا پڑھنا پڑے گی۔"

کیا لاحول ولا۔ کیا میں شیطان ہوں جو۔۔۔؟" وہ آنکھیں کھول کر بولا۔

"ارے شیطان کے بھی دادا ابا ہیں۔ بس اب ایک منٹ میں" اس نے چٹکی بجائی تو اسے اٹھنا ہی پڑا۔

"بس ذرا تمہارا لحاظ کرتا ہوں۔ ورنہ کسی کی سننے والا ہرگز نہیں ہوں۔"

"احسان مت جتائیے" وہ اسے کمرے سے نکال کر دروازہ بند کرتی ہوئی بولی اور ابریز بڑبڑاتا ہوا آگے چل دیا۔

"توبہ کیسا حسین موسم اور کیسی غضب کی رت تھی مگر اس نامعقول لڑکی نے سب غارت کر دی۔"

پھر واقعی ابریز نے ریما کے شہر سے جاتے ہی شادی کے لئے یوں جلدی مچائی کہ ممی پاپا اور بہنوں کو گھن چکر بنا دیا اور آخر کار صرف ڈیڑھ ماہ کی مختصر سی مدت میں ریما اس کے پاس تھی اور وہ ٹھاٹ سے مووی بنانے میں مگن تھا۔ لال جوڑے میں لپٹی ریما کے لئے اٹھنا بیٹھنا حرام تھا اور وہ خوب چہل کر رہا تھا۔ ساری رات اسی ہنگامے میں گزار کر صبح اس نے دروازے کے باہر تختی لگا دی کہ انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے وہ لوگ سونا چاہتے ہیں تو ریما جھنجھلائی سٹپٹائی اور پھر بولی؛

"لوگ کیا کہیں گے؟"

"لوگوں کی فکر مت کرو۔ اب تو یہ سوچو کہ میں کیا کچھ کہتا ہوں" اس نے شوخی سے کہا تو وہ شرم سے سرخ ہو گئی اور ابریز ہنستا ہوا اس کے چہرے پر جھک آیا۔ دونوں کے لب متبسم تھے اور انداز بہکے بہکے سے۔ زندگی کا یہ ڈرامائی سا موڑ کتنا خوشگوار اور حسین تھا۔ دونوں کو ہی اعتبار نہ آ رہا تھا۔ ابریز نے برسوں آج کے دن کے لئے سپنے دیکھے تھے جو آج حقیقتوں میں ڈھل کر مسکرا رہے تھے۔

شام ڈھلے جب وہ کمرے سے نکلا تو بے حد مسرور تھا۔ اسے کزنز اور دوستوں نے گھیر لیا۔

"یہ کیا بداخلاقی تھی ہم تو دروازہ توڑنے والے تھے رات کیا کم تھی کہ تم سارا دن بھی بھابی کے پاس بیٹھے رہے؟" شوخ سا طیب اس کی کھال کھینچ رہا تھا۔

وہ بس شرارت سے مسکراتا رہا۔ دوست چھیڑتے رہے۔ آخر میں وہ بولا "پہلے لو جو رات میں نے اس بے چاری کا ہاتھ بھی چھوا ہو۔ میں تو ساری رات مووی بناتا رہا اور وہ پریشان ہوتی رہی۔"

"گویا تمہیں اس حسین رات سے زیادہ مووی کی پڑی ہوئی تھی جو زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔" رحمان گرجا۔

"وہ رات آتی ہے مگر دبے پاؤں گزر جاتی ہے جبکہ میں نے اسے چپکے چپکے گزرنے کی بجائے قید کر لیا ہے۔ اب ساری زندگی اسی رات کی سندرتا کو دیکھوں گا اور کل کی یاد تازہ کروں گا۔ جناب ہم نے کل رات کا لمحہ لمحہ پابہ زنجیر کر لیا ہے۔" وہ سینہ اکڑائے ہنس رہا تھا۔ دوست بھی ہنس دیئے۔

"ویسے تم لوگ کہاں ہنی مون منانے جا رہے ہو؟" سلمان بھائی نے پوچھا تو ابریز کچھ ہنس دیا۔

"ابھی سوچا نہیں ہے۔ پھر بیگم سے پوچھے بغیر کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"لو یہ بھی بیگم کو پیارے ہو گئے۔ کتنے گھمنڈی ہوتے تھے یار۔ کچھ تو شرم رکھو اپنی۔۔۔!"

طیب کی آواز پر پھر زوردار قہقہہ ابھرا۔

ہنی مون کا سہانا زمانہ ان لوگوں نے یورپ میں گزارا اور ہر جگہ سے ابریز کچھ نہ کچھ ریما کے لئے خرید لیتا۔

"پسند آئیں چیزیں؟" ہوٹل آ کر وہ پوچھتا۔

"بہت۔۔۔ اتنی خوبصورت، اتنی پیاری ہیں کہ" وہ سرشار سی بولتی اور ابریز ہنس دیتا۔

"ہمارا کیا پوچھتی ہیں محترمہ۔ ہماری پسند ایسی ہی غضب کی ہوتی ہے۔ آکاش کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی۔" وہ شوخ سا ہو کر اسے گھورتا تو ریما چونک کر مسکرا دیتی۔

"ہونہہ۔۔۔ پھر شیخی۔"

"شیخی نہیں۔۔۔ یہ حقیقت ہے۔ تم سب سے اعلیٰ ہو۔ سب سے ارفع ہو۔ بالکل آفاقی سی شے!"

وہ ہنستا جاتا اور ریما کے چاروں طرف خوشیوں کی پھوار سی برستی جاتی مگر پھر بولی جیسے سمجھا رہی ہو۔

"بار بار اظہار مت کیا کریں کیونکہ جو جذبے دل کی عمیق گہرائیوں میں ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ حسین ہوتے ہیں۔"

"اتنی دعاؤں کے بعد تو ملی ہو۔ ورنہ کیسے یقین تھا کہ میں بچ پن تمہیں پالوں گا اور تمہارے دل میں بھی اتر جاؤں گا۔ اس پر کہتی ہو کہ اپنی خوشیوں کا اظہار بھی نہ کروں۔"

ابریز ایک دم بگڑ گیا تو ریما مسکرا دی۔

"اچھا بابا ضرور کریں مگر پلیز ۔۔ کم کم!"

"عجیب عورت ہو۔ عورتیں تو اپنی تعریف کروانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی ہیں۔"

"مگر میں لفظوں کے ذریعے جذبوں کی تقدیس کو متاثر کرنا اچھا نہیں سمجھتی۔ پھر اب تم وہی نوعمر سے کھلنڈرے سے لڑکے نہیں رہے۔ شادی کے بعد آدمی ذمے دار ہو جاتا ہے اُسے ریزرو رہنا چاہئے۔ پُر وقار انداز میں بات چیت کرنی چاہئے۔ فلمی ہیرو کی طرح ڈائیلاگ بولتے مرد مجھے زہر لگتے ہیں ابریز آپ اچھے ہیں۔ بہت اچھے مگر۔ ۔ ۔ میری پسند قدرے مختلف ہے۔ مجھے شوخ اور شرارتی نوجوانوں کی نسبت مدبر، سنجیدہ اور بردبار مرد اچھے لگتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے میں بھی محض تمہاری خاطر خود پر سنجیدگی اور متانت کا خول چڑھا لوں۔"

ابریز بچوں کی طرح روٹھ گیا تو وہ بھی سرکتی ہوئی اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"اُف وہ ۔۔ کیا اب عورتوں کی طرح روٹھو گے؟"

وہ اسی طرح چپ بیٹھا رہا اور پھر پرے کو سرک گیا۔

لندن میں حسبِ معمول موسم خوب سرد تھا اور ابریز نے گرم مفلر گلے میں لپیٹ رکھا تھا۔ پھر جھک کر سگریٹ سلگایا اور ریما اسے منانے کے طریقے سوچنے بیٹھ گئی۔ نظر بچا کر اُسے دیکھا پھر جلدی سے سگریٹ چھین لی۔ جواب میں ابریز نے بڑے زور سے اُسے گھورا، اور دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا تو وہ جھنجھلا کر تیسرا سلگانے لگا۔ حسبِ سابق ریما نے پھر مسکرا کر جھپٹا مارا مگر اس بار سگریٹ تو اس کے ہاتھ نہ آیا۔ بلکہ ریما کا ہاتھ ہی ابریز کے ہاتھ لگا۔ جسے وہ غصے میں مسل رہا تھا، دبا رہا تھا۔ لمحہ بھر کو ریما کا چہرہ سُرخ ہوا مگر

اس کی مسلسل بے وجہ خفگی سے وہ بھی روٹھ بیٹھی۔

"واقعی کسی نے سچ کہا ہے کہ اتنا مت روٹھو کہ منانے والا روٹھ جائے۔" وہ حسبِ عادت ہنس دیا۔ ریما بھی مسکرا دی۔

"یہ بھی تمہاری زیادتی۔ ایک طرف تو کہتی ہو کہ سنجیدگی اور متانت اچھی لگتی ہے اور جب کوئی سنجیدہ بننے چلے تو روٹھنے لگتی ہو۔"

"ہونہہ۔ ۔ ۔ سنجیدہ۔ ۔ سنجیدگی اور خفگی میں اچھا خاصا فرق ہوتا ہے۔" ریما بگڑ گئی۔

"کوئی بھی نہیں۔ مجھے تو خفیف سا فرق بھی محسوس نہیں ہوتا۔ یہ بردبار لوگ خواہ مخواہ بیزار سے بیٹھے ہوتے ہیں۔ شاید ان لوگوں کو کسی سے بھی سروکار نہیں ہوتا سوائے اپنی بے زاری اور جھنجھلاہٹ کے۔"

"ایک تو آپ میری ذرا سی بات بھی نہیں مانتے۔" وہ جھینپ مٹانے کو بگڑ گئی۔

"اتنا جھوٹ تو مت بولو کہ جب سے شادی ہوئی ہے میں تو جیسے تمہارا خادم بن کر رہ گیا ہوں۔ سونا، جاگنا، کھانا پینا حتیٰ کہ پہننا تک تمہاری مرضی سے ہوتا ہے۔ مجھے مفلر وغیرہ قطعاً پسند نہیں مگر تمہاری خوشی کی خاطر یہ پھندا پہنے بیٹھا ہوں۔ مجھے مٹیالے اور مردہ رنگ پسند نہیں مگر تمہاری مرضی کے خلاف میں شوخ لباس استعمال نہیں کر سکتا۔ توبہ ترس گیا ہوں۔" وہ کہتا رہا اور ریما مسکراتی رہی۔

"چار دن کی حکومت ہے۔ پھر ہمیں کون پوچھے گا۔"

"یہ پھر ایک تازہ ترین جھوٹ ہے کیونکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارے اقتدار کا سورج ہمارے دل میں کبھی غروب نہیں ہوگا۔"

"وہ جو آپ میاں بھلکڑ ہیں۔ ہر جگہ کچھ نہ کچھ بھول جاتے ہیں۔ کون جانے زندگی کے کس موڑ پر بندی کو بھی بھول بھال جائیں۔"

وہ بڑی ادا سے بولی اور جواب میں وہ بس اُسے تکتا رہ گیا۔

"پڑ گئے نا سوچ میں؟"

"اوں، ہوں۔ جواب بہت آسان ہے مگر پھر تم کہو گی کہ مرد بار بار اظہار کرتے اچھے نہیں لگتے۔ انھیں سنجیدہ و

متین ہونا چاہیے، بردبار و پُروقار ہونا چاہیے اور جانے کیا کیا ہونا چاہیے۔"

ریما مسکرادی تو وہ بھی کھلکھلا کر ہنس دیا پھر شرارت سے بولا۔ "اب یہ کہو کہ مَردوں کو یوں اُونچے اُونچے فلک شگاف قہقہے بھی نہیں لگانا چاہیے۔ بلکہ دھیمے دھیمے انداز میں اور وجاہت بھری شخصیت کا انسان دولہا بن گیا۔ ۔ مگر تم۔ ۔ ۔ تم دن میں بیس بار مجھے تم کہہ کر مخاطب کرتی ہو۔" وہ مصنوعی خفگی کے اظہار کے لئے آنکھیں دکھا رہا تھا۔ وہ سہم سی گئی۔

"معاف کر دیں۔ بس کبھی کبھی خیال نہیں رہتا۔ ویسے یہ اچھا جواز ہے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی عزت کرنی چاہیے۔"

ابریز کرسی سے اُٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھا۔ بہت سنجیدہ سا اور یہی عالم ریما کا تھا۔ تبھی جانے کب ابریز کے ہاتھ بڑھے اور ریما ہنستی ہنستی بے حال ہو گئی اور مسہری پر بکھر بکھر گئی مگر وہ مسکراہٹ دبائے گدگدی کئے جا رہا تھا۔

"پلیز! اور مت ہنسائیں۔"

وہ ہانپ رہی تھی اور ہنسی کی زیادتی سے آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"سہم کیوں جاتی ہو۔ میری مصنوعی خفگی کا اعتبار کیوں کر لیتی ہو۔۔۔؟" ابریز کی آنکھوں میں پیار کا اتھاہ سمندر تھا اور وہ اس کی گہرائیوں میں ڈوب سی گئی۔

شاید ایسے ہی شریک حیات کے اس نے سپنے دیکھے تھے ایسے ہی ٹوٹ کر چاہنے والے شوہر کی تمنا کی تھی۔ جو مقدر سے اسے مل بھی گیا تھا۔

"اچھا جناب۔۔۔ اب واپس کب جانا ہے۔ ہم لوگ تین ماہ سے باہر ہیں۔ اب تو گھر یاد آ رہا ہے۔"

"میرے ہوتے ہوئے بھی۔ جب گھر والا ساتھ ہو تو گھر کو یاد کرنے کی کیا ضرورت!"

"اب کچھ کام دھام شروع کریں۔ کب تک بیچارے انکل محنت کرتے رہیں گے۔ پلیز ابریز۔ بہت دن ہو گئے اب تو گھر چلو۔"

"اسے سب کچھ ہو گا۔ کھیلنا ویلنا سب بند اور گھر جاتے ہی پاپا سے کہوں گا کہ بس اب آپ آرام کریں اور اپنی بہو بیگم کو خدمت کا موقع دیں۔" وہ ہنسا۔

"اور بیٹے کو گیند بلا دے کر آسٹریلیا، انگلینڈ، فرانس یا جرمنی بھیج دیں۔" وہ جھنجھلائی۔

"ایمان سے کھیل کی تو بالکل چھٹی سمجھو۔ اب تو اپنے سارے شوق بیس پچیس برس بعد پورے کروں گا۔ جب تم اپنے ایک ہونہار سپوت کی امّاں جان بن جاؤ گی۔" وہ فطری شگفتگی سے بولا تو ریما کا چہرہ پھر لال ہو گیا۔

"پھر تو میرا بیٹا کرکٹ کھیلے گا۔ ۔ ۔ اور میں اسے سکھایا کروں گا۔ اس کا کوچ بن جاؤں گا۔"

"چلو بس کرو اور واپسی کا بندوبست کرو۔"

"بہتر محترمہ۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا تو وہ مسکرادی، اور پھر ٹھیک ایک ہفتے بعد وہ لوگ واپس آ گئے۔

سوئٹزرلینڈ سے واپسی کے بعد ابریز واقعی انکل تبریز کا بزنس سنبھال چکا تھا، اور آجکل بڑی سنجیدگی اور متانت سے پاپا کی ہدایات کے مطابق اسے چلا رہا تھا۔ ہر صبح ناشتے کی ٹیبل پر تبریز انکل اسے ہدایات دیتے۔ یہ کرنا ہے وہ کرنا ہے۔ اس سے ملنا۔ اس کو خط لکھنا۔ وہاں آرڈر دینا اور فلاں سے مال وصول کرنا اور شام کو آ کر وہ پاپا کو پوری رپورٹ دیتا۔ ہر کام کی رپورٹ اور پوری تفصیل سے ہر بات سمجھاتا۔ تبریز صاحب ہنس دیتے۔

"بھئی میرا یہ بھلکڑ بیٹا تو خوب جا رہا ہے۔ وہی کچھ کرتا ہے جو کچھ کہا جاتا ہے۔"

"اور چند ماہ بعد آپ کو ہدایات دینے کی بھی ضرورت نہ رہے گی پاپا۔ ۔ ۔ پھر میں آپ کو یہ تکلیف بھی نہیں دوں گا۔"

"ویری گڈ۔۔۔ دیکھا بیگم! میرا بیٹا شادی کے بعد کیسا عقل مند ہو گیا ہے۔ ساری تفریحات بھول بھال کر کتنا فرض شناس ذمہ دار ہوتا جا رہا ہے۔"

تبریز صاحب بیگم سے مخاطب ہوئے اور بہنیں شوخی سے بھائی اور بھابی کو تکنے لگیں۔

پھر واقعی وہ بزنس میں کچھ یوں الجھا کہ اپنا آپ بھی بھولتا چلا گیا۔ صبح کا گیا رات گئے لوٹتا اور ریما کا دل ہونے والے کسی آنے والے ناخوشگوار واقعے کے احساس

سے رزنے لگا۔

"اتنی دیر ابریز۔ دیکھو گیارہ بج رہے ہیں۔" اس کے بیڈ پر گرتے ہی وہ جھنجلا کر اٹھ بیٹھی اور ٹائم پیس کی طرف اشارہ کیا۔

"تو کیا کروں ایک پارٹی آئی ہوئی تھی۔ اس سے ملنا تھا۔" وہ بگڑ کر بولا اور بتی بجھا کر سونے کی کوشش میں آنکھیں موندلیں۔ تب اس اندھیرے میں وہ بولی:

"اور کل۔۔۔ کل بھی آپ بارہ بجے پہنچے۔"

"جنید صاحب کو کل آنا تھا مگر آئے نہیں۔ اصل میں ان سے لمبا سودا طے ہونا ہے۔ لہٰذا مجھے ان کا انتظار کرنا پڑا۔"

"اچھا تو کھانا کھائیں گے؟"

"اوں، ہوں۔ جنید صاحب کے ساتھ کھا چکا ہوں بس اب چپ رہو اور مجھے سونے دو۔ توبہ آج تو بہت تھک گیا ہوں۔" وہ اتنی تلخی سے بولا کہ ریما کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی۔ اس بزنس میں الجھ کر وہ یونہی کئی ماہ سے اسے نظر انداز کر رہا تھا۔

"سو گئے ابریز؟"

وہ چپ تھا۔ شاید سو ہی گیا تھا۔ وہ پھر قدرے زور سے بولی۔

"ابریز۔۔"

"ہوں۔"

"سو گئے کیا؟"

"نہیں تو۔۔" وہ الجھ سا گیا تھا۔ تبھی تو اک جھلاہٹ تھی اس کی آواز میں۔

"تم۔۔۔ تم شاید مجھے ابھی سے بھولنے لگے ہو ابریز حالانکہ ہماری شادی کو ابھی سال بھی نہیں ہوا۔"

"اُفوہ۔ سونے دو گی یا نہیں۔"

"اچھا۔ سو جاؤ۔"

اس کی بے زاری کے خیال سے وہ بولی اور خود بھی دل مسوس کر لیٹ رہی تھوڑی دیر بعد کمرے میں ابریز کے خراٹے گونجنے لگے اور وہ اس الجھن میں گم تھی کہ آخر کس لئے مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ ابریز کچھ بدل سا گیا ہے۔ میری ہی خواہش پر اس نے انکل کا بزنس سنبھالا ہے ورنہ وہ تو بہت لاپرواہ اور سیلانی سا آدمی تھا۔ تفریحات کا دلدادہ اور کھیلنے کا شوقین۔ اب اسے کرکٹ سے بھی لگاؤ نہ رہا تھا حالانکہ چند ماہ قبل کرکٹ میں اس کی جان اٹکی ہوئی تھی اور اب کئی بار کرکٹ بورڈ نے بلوایا مگر ہر بار اس نے انکار کر دیا۔ "اب کھیلنے کے لئے میرے پاس وقت نہیں رہا رحمان صاحب۔ اب میں ایک ذمے دار آدمی ہوں اور بے پناہ مصروفیات رکھتا ہوں۔" وہ بہت سنجیدگی سے کہتا فون بند کر دیتا۔

سینکڑوں فون اس کے پرستاروں کے آتے جن میں زیادہ تعداد لڑکیوں کی ہوتی۔ ریما ہی وہ فون ریسیو کرتی تھی اور ہر بار کافی تلخی سے جواب دیا کرتی۔

"پلیز! رانگ نمبر!"

ان دنوں وہ یوں بھی امید سے تھی وہ آنے والے کے سپنے دیکھنا چاہتی مگر ابریز نے اس کی حالت ابتر کر دی تھی۔ وہ تو یوں بزنس کے سلسلے میں گرا تھا کہ وہاں سے برآمد ہونے کی امید نظر نہ آتی۔ وہ کبھی کہتی بھی کہ آج ذرا جلدی گھر آجانا مجھے ڈاکٹر تک جانا ہے۔ تو وہ بڑھ کر ڈاکٹر کو فون کر دیتا۔ "وہ گھر آکر تمہیں چیک کر جائے گی اتنی گرمی میں تم کہاں جاؤ گی۔"

وہ بڑی خوبصورتی سے بہانہ بناتا، اور ریما کا دل رو دیتا۔ بے ایمان۔۔۔ میں۔۔۔ میں تمہارے ساتھ کچھ وقت دن کے اجالوں میں بھی گزارنا چاہتی ہوں۔ تمہارے ساتھ ہنسنا چاہتی ہوں، گھومنا چاہتی ہوں۔ مگر وہ فون کر کے اپنی موٹر میں بیٹھتا۔ پھر اس کی صورت رات گئے ہی نظر آتی۔ تم کہاں چلے گئے ہو ابریز۔ تمہاری وہ محبت کیا ہوئی جو تم دن میں سینکڑوں بار دہرانا اپنا فرض سمجھتے تھے اور جسے تم اپنا خدا کہتے تھے۔ تم نے۔۔۔ تم نے تو مجھ سے یقین چھین لیا۔۔ اور میرے اعتماد کو جھنجھوڑنے لگے۔۔۔ آخر کیوں۔۔۔ کیوں میری خوشیاں لوٹ رہے ہو۔۔۔ کیوں میری تمنا کے نازک نازک پھول پتی پتی کر کے بکھیر رہے ہو۔ میں تمہیں کتنی پیاری تھی۔ تمہیں یہ بات یاد کیوں نہیں آتی۔ تم تو ہر بات میں میری قسم اٹھانے لگے تھے پھر۔۔۔ پھر۔۔۔"

وہ بے سدھ سی بستر پر جا گری اور جب لیڈی ڈاکٹر آئی تو بولی۔ "مسز ابریز۔۔۔ پلیز! آپ خوش رہا کریں۔۔۔ یوں بیزار بیزار رہیں گی تو بچے کی صحت پر اثر پڑے گا۔"

وہ تلخی سے ہنس دی اور ڈاکٹر ضروری ہدایات دے کر چلی

تی اور اگلی صبح وہ پوچھ رہا تھا۔
"کل ڈاکٹر آئی تھیں؟"
"جی ـــ"
"پھر کیا کہا انھوں نے ـــ؟"
وہ چپ رہی۔
"بولو ـــ جواب دو۔"
"کیوں بہت جلدی ہے کیا۔ کہیں جانا ہے؟" وہ چڑ گئی اور ابریز اُسے گھور کر رہ گیا۔
"ہے تو چھٹی کا دن مگر بے چارے مالکان کی کب چھٹی ہوتی ہے۔ ان کے لئے تو سینکڑوں جھنجھٹ ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ اور نہیں تو آجکل کچھ ہڑتالوں کا ہی چکر چل گیا ہے۔ پتہ نہیں ان چھوٹے لوگوں کو ہڑتالوں اور جلوسوں کا اتنا شوق کس لئے ہوتا ہے۔ اپنا بھی نقصان کرتے ہیں اور فرم کا بھی نقصان ہوتا ہے۔"
"کیا کہتے ہیں وہ لوگ بھلا؟" یوں پریشان دیکھا تو ریمل نے بڑے خلوص سے پوچھا۔
"وہی پیسہ کہ ہماری تنخواہ بڑھاؤ۔" وہ طیش میں بولا۔
"وہ لوگ بھی کیا کریں۔ اتنی مہنگائی ہے اور غریب لوگوں کے لئے جینا عذاب ہے۔"
"تو اپنے مطالبات وہ لوگ ذرا سلیقے سے بھی تو پیش کر سکتے ہیں۔ یہ کیا کہ ذرا ذرا سی بات پر کام بند کر کے بیٹھ جائیں۔"
"تو کیا مطالبات آپ تک نہیں پہنچے تھے تحریری شکل میں۔"
"نہیں۔ ۔ ۔ بس گیا تو پتہ چلا کہ آدھے ملازمین غائب ہیں۔ پوچھا کیوں تو جواب ملا جی انھوں نے ہڑتال کر دی ہے۔" وہ بڑبڑ کرتا رہا تھا۔
"پھر اب کیا ہوگا؟"
"ہونا کیا ہے۔ ۔ ۔ بھوکے مریں گے تو خود ہی کام پر آجائیں گے۔"
"اور جو انھوں نے توڑ پھوڑ کی تو؟" وہ سہم گئی۔
"تو ایک ایک کو اندر بند کرا دوں گا۔ پہلے ہی میری فرم کا ہر ملازم دوسرے اداروں سے زیادہ تنخواہ پاتا ہے۔ اب تو ایک پیسہ نہیں بڑھاؤں گا۔"
"خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ ۔ ۔ تم یہ تو بتاؤ ڈاکٹر صاحبہ کیا بولیں؟"
وہ جھجک سی گئی۔ پہلے اس سے خفا تھی۔ اس لئے اکھڑی اکھڑی رہتی تھی مگر آج اس سے بات چیت کی تو اس کی الجھنوں کا اندازہ کر کے ساری خفگی دُور ہو گئی۔ واقعی بے چارے مرد بڑی محنت طلب زندگی گزار کر عورتوں کو آسائشیں بہم پہنچاتے ہیں۔ خود بے آرام رہتے ہیں، اور ہمیں آرام دیتے ہیں۔ آسودگی بخشتے ہیں۔
"بولو نا، کیا کوئی سیریس بات ہے؟" وہ پریشان سا پوچھ رہا تھا تو وہ نظریں چرا کر بولی۔
"نہیں تو۔ بس ٹھیک ہے۔ ۔ وہ یہ کہہ گئیں کہ میں خوش رہا کروں۔"
"تو خوش نہیں ہو کیا؟ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کیوں خوش نہیں ہو؟"
"نہیں نہیں۔ ۔ ۔ میں تو خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں۔" وہ جلدی سے بولی اور ابریز مسکرا دیا۔
"اچھا اب میں تو چلوں گا۔ ذرا بڑے صاحب سے ملنا ہے۔ کچھ مشورے کرنا ہیں۔"
وہ اٹھا تو وہ پھر بولی۔ "سنیئے۔"
"ہوں۔" وہ اس کی جانب مڑا۔ "کیا بات ہے؟"
"کل سے امی آئی ہوئی ہیں۔"
"معلوم ہے مجھے۔"
"وہ مجھے لینے آئی ہیں۔"
"مگر کیوں؟"
ابریز کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔
"بس روایتی انداز میں سوچ رہی ہیں۔ کہتی ہیں پہلی زچگی ان کے ہاں ہوگی۔"
"پھر تم نے کیا کہا؟"
"میں کیا کہتی۔ ۔ ۔ فیصلہ تو آپ کریں گے یا آنٹی اور انکل۔ ۔ ۔"
"پھر مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ ممی جو فیصلہ کریں گی ہمیں بھی پتہ چل جائے گا۔ اجازت دیں تو چلی جانا۔"
اس جواب پر ریما کا دل پھر مچل اٹھا۔ "اجازت دیں تو چلی جانا۔" گویا خود اسے تو اس کی رتی برابر پرواہ نہیں اور آنے جانے سے کوئی سروکار نہیں۔ ریما دل ہی دل میں خفا ہو گئی اور یونہی خفا خفا سی اگلے روز ممی کے ساتھ

کوئٹہ چلی گئی۔

ابریز نے کوئٹہ پہنچتے ہی فون کرنے کو کہا تھا مگر ریحانہ نے ناراضگی کے فون بھی نہ کیا۔

اسے سوئے تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا تو مندی مندی آنکھوں کے ساتھ ممی اسے جگا رہی تھیں۔

"کیوں کیا بات ہے ممی ۔۔۔؟" وہ اتنی رات گئے جگانے پر چونک کر اٹھ بیٹھی۔

"بیٹا ابریز کا فون آیا ہے۔ تمہیں پوچھ رہا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ اب رات کے بارہ بجے محترم گھر پہنچے ہوں گے اور پھر فون کیا ہوگا۔" وہ جل بھن کر رہ گئی۔

"ان سے کہہ دیں ممی میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ فکر نہ کریں۔"

"بیٹا خود کہہ آؤ۔۔۔ وہ تم ہی سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

اب ممی سے وہ کیا کہتی۔ انھیں سونے کا کہہ کے وہ فون کے پاس آگئی اور آتے ہی دھاڑی۔ "یہ وقت ہے فون کرنے کا۔ دوسروں کو بے وقت تکلیف دیتے ہیں۔ ممی بے چاری اٹھ کر میرے کمرے تک آئیں اور ان کی نیند خراب ہوگئی۔"

"تو تم نے فون کیوں نہ کیا۔ میں نے کہا بھی تھا۔"

"ہونہہ میری تو پرواہ نہیں میرے فون کا بڑا خیال ہے۔" وہ پھر جل بھن گئی۔

"بولو نا۔۔۔ ٹھیک ٹھاک تو پہنچ گئیں۔ میں بہت پریشان تھا کیونکہ اس بار تم گئی ٹرین سے ہو۔"

"میں اچھی بھلی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں اور آرام سے سو جائیں۔ مجھے بھی بہت نیند آرہی ہے۔" وہ اسی لاتعلقی و بے زاری سے بولی تو ابریز نے فون فوراً ہی بند کر دیا۔

مگر اگلے روز صبح دس بجے کے قریب اس کا فون آیا۔

"میں رات کو فون کروں گا۔ تم فون اپنے کمرے میں رکھ لینا۔ اصل میں میں نہیں چاہتا کہ انکل، آنٹی یا کسی کی بھی نیند خراب ہو۔"

بڑے وقار اور تمکنت سے وہ بولتے ہوئے کہہ رہا تھا وہ ایسے ہی انداز میں بات کرنے والے لوگوں کو پسند کرتی تھی جن کی گفتگو میں چھچھورپن نہ ہو، جن کے انداز میں نفاست ہو اور بیان دھیما دھیما ہو مگر ابریز کی بات تو جاہی تھی کیسا شوخ اور چلبلا پن تھا۔ اس میں اسی لئے اس کا یہ رکھ رکھاؤ اور متانت اس کے دل میں اندیشے جگا دیتی اسے لگتا، ہو نہ ہو ابریز بدل چکا ہے اور اس سے اب محض نباہ کرنے کی کوشش میں ہے۔

"تم پھر چپ ہو۔ کم گوئی اچھی صفت ہے مگر مکمل خاموشی دوسروں کو الجھا دیتی ہے۔"

ابریز کی دلکش آواز پھر ماؤتھ پیس سے ابھری تو وہ جیسے خیالوں کے نگر سے نکل آئی۔

"جی بہتر ۔۔۔"

"کیا جی بہتر ۔۔۔" ابریز ہنس پڑا۔ بھلا بھرپور ہنسی تھی اس کی آواز میں۔

"جی کہ میں رات کو فون اپنے کمرے میں رکھ لیا کروں گی۔"

"تھینکیو۔۔۔ اچھا بائے۔۔۔ رات کو میں رنگ کروں گا۔"

وہ گم صم سی بستر پر گر گئی اور سوچوں کے نگر میں بھٹک گئی۔ آخر ابریز کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ۔۔۔ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ وہ تکلیف دہ انداز میں بڑبڑائی۔ تبھی نومی اور روما آگئیں۔ اور اسے سوچوں کے نگر سے کھینچ لیا۔

اب تقریباً ہر رات ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ابریز کا فون آتا اور وہ اس وقت تک لازماً جاگا کرتی تھی۔ آج پھر وہ بڑی متانت سے کہہ رہا تھا۔

"یار کام بہت زیادہ ہے۔ ورنہ تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔"

"کام تو چلتے رہتے ہیں۔ آپ چند روز کے لئے آجایئے۔ یہاں موسم بہت اچھا ہے۔"

وہ بے خودی سے کہہ بیٹھی تو ابریز کی بہت خوبصورت ہنسی ابھری۔ پھر ایک آہ بھر کر وہ بولا۔ "کام چلتے نہیں چلائے جاتے ہیں اور میں آتو جاؤں مگر چند روز کے لئے نہیں محض چند گھنٹوں کے لئے آسکتا ہوں۔"

"پھر کب آرہے ہو؟ چند گھنٹوں کے لئے ہی۔"

"فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وقت ہوا تو اچانک آجاؤں گا۔"

"اور ہاں میں چاہوں گا جس روز میں تم سے ملوں تم وہ پیازی فرنچ شفون کی ساڑھی پہننا۔ بہت خوبصورت ہے وہ۔"

اور ریما پوچھ ہی نہ سکی کہ کیا میں خوبصورت نہیں؟

"اور ساتھ میں وہ سیٹ جو میں نے تمھیں پیرس سے لاکر دیا تھا۔"

وہ تلخی سے مسکرادی۔

"آپ تو بہت بھلکڑ ہوا کرتے تھے ابریز مگر آج پتہ چلا کہ آپ تو میری پہنی ہوئی چیزیں بھی یاد رکھنے لگے ہیں۔"

"تو کیا یہ طنز کا موقع ہے۔ خواتین تو خوش ہوتی ہیں کہ جن کی خاطر وہ بنتی سنورتی ہیں۔ وہ انھیں ان کے تمام حوالہ جات کے ساتھ یاد رکھیں۔ ۔ ۔ اور یوں بھی ریما چیزوں اور انسانوں میں فرق ہوتا ہے۔ میں اپنا رومال، قلم، لائٹر یا چھتری وغیرہ بھول سکتا ہوں مگر تمھیں نہیں۔" وہ بڑے عرصے بعد واشگاف لفظوں میں اپنے جذبوں کا اظہار کر رہا تھا۔ لمحہ بھر کو ریما کا دل خوش ہوا مگر پھر بھی وہ اس خفگی کو بھول نہ سکی۔ جو کوئٹہ آنے سے قبل اس کے دل میں اتری تھی۔

پھر اسی ہفتے وہ چلا آیا مگر محض چار گھنٹے کے لئے۔ وہ خوش ہوگئی۔ وہ کہنے کے مطابق بالکل اچانک آیا تھا۔ ریما نے اس کے آنے کی خبر سنتے ہی پیازی ساڑھی نکالی اور وہ پہن کر اس کی من پسند جیولری بھی پہنی۔ اب وہ بالکل تیار تھی اور سبک انداز میں ہولے ہولے وہ ڈرائنگ روم میں آگئی۔ لمحہ بھر کو سامنے صوفے میں دھنسے ابریز کی نگاہیں اس پہ جمیں۔ پھر "ہیلو ہیلو" کے تبادلے کے بعد وہ منذر انکل سے باتوں میں مگن ہوگیا۔ وہ ابریز کے عین سامنے بیٹھی تھی مگر اس نے دوسری نگاہ اس پہ نہیں ڈالی بلکہ منذر صاحب، ان کی بیگم، نومی اور روما ہی سے باتوں میں مشغول رہا۔ ممی نے ریما کو آنکھ سے اشارہ بھی کیا کہ وہ اوپر اپنے کمرے میں چلے جائیں مگر وہ جھینپ کر رہ ہی رہ گئی۔ روما خاطر تواضع کرتی رہی اور وہ بزنس کی بابت انکل سے باتیں کرتا رہا۔ باتوں باتوں میں اس نے منذر صاحب کو یہ بھی بتادیا کہ وہ کوئٹہ بھی بزنس کے سلسلے میں آیا تھا سوچا آپ لوگوں سے بھی ملتا جاؤں۔ ریما کا سارا حلق کڑوا ہوگیا تو وہ اس سے ملنے نہیں آیا تھا بلکہ بزنس ٹور تھا یہ۔

وہ جل بھن کر کھڑی ہوگئی اور ممی کہہ رہی تھیں "جاؤ بیٹا! تم نو بجے کی فلائٹ سے واپس جارہے ہو۔ کچھ دیر اوپر جاکر آرام کرلو۔"

اس کے جاتے ہی ابریز اٹھا اور ریما کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ جلی بھنی اپنے زیورات اتار رہی تھی۔ وہ اس کی پشت پہ پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے۔ اتنی جلدی کیوں زیور اتار رہی ہو ابھی میں نے تمھیں دیکھا کب ہے۔"

وہ تڑپ کر پلٹی۔ وہ ویسا ہی بیگانہ بیگانہ لگ رہا تھا کیونکہ سنجیدگی کا بت بنا کھڑا تھا۔ یہ فقرے کہتے وقت نہ تو اس کے لبوں پہ مسکان تھی۔ نہ آنکھوں میں شوخیاں۔

افوہ۔ ۔ ۔ یہ تو۔ ۔ ۔ یہ تو بالکل بدل گیا۔ یہ۔ ۔ ۔ یہ وہ والا ابریز کب ہے جو میری ایک ایک ادا پہ قربان ہو جاتا تھا، جس نے میری ایک ایک ادا کی مووی بنائی تھی اور اس پر اپنی جذبوں بھری سہاگ رات وار دی تھی یہ تو۔ ۔ ۔ یہ تو کوئی بالکل اجنبی سا آدمی ہے جسے میں نہیں جانتی۔

وہ بوٹ کے تسمے کھول کر سیدھا ہوا اور پھر بستر پر دراز ہوگیا۔

"دروازہ تو بند کردو۔ بچیاں نہ آجائیں۔" تو یہ فقرہ کہتے وقت وہ کیسا بڑا سا مرد لگ رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے جاکر دروازہ بند کر آئی تو اس نے دوسرا حکم نافذ کیا۔

"اور کھڑکیوں کے پردے بھی برابر کردو۔ میں روشنی میں تو بالکل نہیں سو سکتا۔"

وہ کھڑکی کے پردے برابر کر آئی۔ ۔ ۔ مگر ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ سورج باہر اپنی آب و تاب سمیت موجود تھا۔ اس لئے اندھیرے کا تو سوال ہی نہ تھا۔

"اب ذرا یہاں آؤ۔ ۔ ۔ میرے قریب۔ ۔ ۔ سر میں شدید درد ہے اور میری انگلیاں تک بہت تکلیف میں ہیں۔ پوروں تک درد اتر آیا ہے۔"

وہ بیڈ کے کنارے آبیٹھی اور اس کے خوبصورت ہاتھ اس کی پیشانی پہ چلے گئے۔ سر دبا کر ہٹی تو وہ سوچ چکا تھا مگر اسے یاد رہا کہ اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں بھی تھکن تھی۔ وہ ایک ایک انگلی کو دبانے لگی اور ساری تھکن پوروں تک آکر باہر نکلنے لگی مگر جب وہ دونوں ہاتھ دبا کر اٹھنے لگی تو اچانک سوئے ہوئے ابریز کا بازو اٹھا اور

اس کے گرد حمائل ہو گیا۔ یوں کہ پھر سارے ہی لمحے مُسکرا دیئے۔

"اتنی خفا خفا کیوں ہو؟"

ابریز کی سرگوشی اس کے اندر تک اُتر گئی۔ وہ لب ہونٹ چبانے لگی۔

"بولو نا۔۔۔ دیکھو میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے اور یوں بھی آج شاید میں تمہیں فون نہ کر سکوں۔"

وہی رُعب و دبدبہ تھا آواز میں جس سے بے گانگی کی بو آتی تھی۔

"میں کسی سے خفا نہیں ہوں۔" وہ اس کی بانہوں کا حلقہ توڑنے لگی۔

"اچھا۔۔۔" وہ دھیرے سے مُسکرا دیا پھر اسی سنجیدگی سے بولا۔ "یہ اچھی بات ہے۔ یوں بات بے بات خفا ہونے والی عورتیں مرد کو اچھی نہیں لگتیں۔ ہاں ایک اور خبر ہے۔ کرکٹ بورڈ نے پھر مجھے یاد کیا ہے۔ اگلے ماہ ہماری قومی ٹیم انگلینڈ جا رہی ہے اور مجھے بھی اس میں شرکت کرنا ہو گی۔ میں نے سوچا کہ مُنہ کا ذائقہ بدلنے کو اس بار کھیل ہی لوں۔ یوں بھی خود پہ جبر کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ میں نے کئی ماہ خود پہ پابندی رکھی کہ اب ذمہ دار مرد ہوں۔ یہ کھیل دل مجھے زیب نہیں دیتے مگر آخر کار میرے اندر کے اس شریر لڑکے نے مجھے مجبور کر دیا اور میں ان لوگوں سے اقرار کر بیٹھا۔"

ریما کے نتھنے پھولنے لگے اور بھوئیں تن گئیں۔

"تم پھر ناراض ہو رہی ہو۔ بزنس کی فکر نہ کرو۔ پاپا ماشاءاللہ صحت مند ہیں۔ پھر ان کی ساری زندگی اسی فیلڈ میں گزری ہے۔ وہ سب سنبھال لیں گے۔"

"اور۔۔۔ اور میں۔۔۔ میں جو۔۔۔" وہ کہہ نہ سکی کہ اب پیدائش کا وقت قریب ہے اور وہ اس سے دور جا رہا ہے۔

"تم۔۔۔ ہاں تمہاری فکر تو ہے مگر بہر حال تم اپنے گھر میں ہو اور ممی پاپا بھی تمہاری خبر گیری کو آتے جاتے رہیں گے۔"

"لیکن آپ۔۔۔" وہ اُلجھی۔

"میں۔۔۔ مگر میں کیا کروں گا بس خُدا وہ گھڑی بخیریت گزار دے۔ میں صرف دُعا کر سکتا ہوں۔ میں جب بھی فارغ تب بھی کرتا۔ وہاں ہوں گا تو بھی کروں گا مگر یاد ہے مجھے بیٹا چاہئے جسے میں بڑے ہو کر کرکٹر بنانا ہے۔"

آخری فقرہ اس نے شوخی سے کہا تو ریما خوشی سے بے حال ہو گئی کیونکہ مہینوں بعد اُسے لگا جیسے اس لمحے واقعی وہ وہی ابریز تھا۔ جسے وہ جانتی تھی جو اس کے لئے قطعاً اجنبی نہ تھا۔ بے گانہ نہ تھا۔

اور جب وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ اُٹھ بیٹھا تھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنا حلیہ ملاحظہ فرما رہا تھا۔ پھر بال سنوارے، پرفیوم اسپرے کی اور اس کی جانب پلٹ آیا۔

"اچھا خُدا حافظ۔۔۔" وہ بولا مگر ریما کی پلکیں نم ہو گئیں۔

"اتنی سی دیر کے لئے آئے ہیں کہ۔۔۔"

"ملنا ہی تھا نا۔۔۔ کئی دنوں میں بھی مل لیتا اور چند گھنٹوں میں بھی مل لیا۔ اچھا اب خُدا حافظ۔ شاید انگلینڈ جانے سے قبل میں پھر آؤں۔"

وہ نم آنکھوں سے اُسے تکتی رہی تو وہ ہولے سے مُسکرا دیا۔

"منہ بسورنے کی کیا بات ہے۔ میں جاتے ہی فون کر لوں گا اور روزانہ تو کرتا ہوں۔" اس نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبا دیئے پھر سگریٹ کا دھواں اس پہ چھوڑتا باہر نکل گیا۔ آٹھ بجے اسے چلے جانا تھا کیونکہ نو بجے جہاز جانے والا تھا۔ ساڑھے سات بجے ہی رات کا کھانا کھا لیا گیا جس کے بعد منذر صاحب اپنی ہی گاڑی میں اسے ایئرپورٹ چھوڑنے گئے۔ ممی، بچیاں اور ریما بھی ساتھ ہی تھیں۔ ممی ماشاءاللہ بھاری بھر کم تھیں اس لئے وہ عورتوں کی جگہ گھیرتی تھیں۔ تب روما ہی بولی تھی۔

"آپی آپ تو آگے ہی بیٹھ جائیں۔"

والدین کے سامنے ابریز کے ساتھ بیٹھتے وہ جھجکی مگر رات کا وقت تھا۔ وہ اگلا دروازہ کھولنے لگی تو ابریز آگے سرک کر اس کے لئے جگہ بنانے لگا اور وہ ہوا کے جھونکے کی صورت اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ ابریز کا ایک بازو اس کی کمر کے گرد حمائل تھا اور ریما کو لگ رہا تھا۔ جیسے سارے جسم پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ پیچھے سے آنٹی نے کچھ کہا تو ان کی بات کا جواب دینے کو ابریز نے چہرہ گھمایا اور اس کا چہرہ ریما

کے شانوں اور بالوں سے مس کرتا رہا۔

"سیدھے ہو کر بیٹھیں نا!" وہ بوکھلا کر بولی تو وہ مسکرا کر سیدھا ہو گیا۔ پھر ٹھیک نو بجے اس کا جہاز فلائی کر گیا تو وہ لوٹے۔ اس کے بعد بھی اس کے فون آتے رہے مگر وہی احساس بیگانگی لئے ہوئے اور وہ بے شدھ سی نڈھال سی خود سے پوچھا کرتی۔ "ابریز مجھے اپنے اپنے سے کیوں نہیں لگتے۔ آخر کیا ہوا ہے کہ احساس بیگانگی نے میری عقل گھما دی ہے اور عجیب سی خلش کو جگا دیا ہے۔ ہر دم میرے اندر اندیشوں کے ناگ سر اٹھائے رہتے ہیں۔ پھنکارتے رہتے ہیں اور میں کوشش کی باوجود ان کا سر نہیں کچل سکتی۔"

آج رات پھر حسب معمول اس نے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے فون کیا۔ وہ سب کچھ بھول کر ابریز کی آواز کانوں کے راستے دل میں اتارتی رہی جو کہہ رہا تھا۔

"میں کل انگلینڈ جا رہا ہوں۔ تم نے اخبارات میں پڑھا ہی ہو گا کہ ہماری ٹیم۔ . . ."

"جی . . ." وہ اداس ہو گئی۔

"اداس مت ہو۔ میں وطن میں نہیں ہو گا تو کیا ہوا تم خدا کے فضل سے اپنوں میں ہو۔ میں ممی پاپا کو بھی سمجھا کر جاؤں گا کہ میرے پیچھے تمھیں کسی شے کی تکلیف نہ ہو اور میری کمی محسوس نہ ہو۔ مجھے تمھاری بہت فکر رہے گی ریما۔ اپنا خیال رکھنا۔ وہاں جا کر بھی میں تم سے فون پر رابطہ قائم رکھوں گا۔ اگر تم اس حالت میں نہ ہوتیں تو یقیناً اس بار تمھیں ساتھ لے کر جاتا۔"

وہ جواب میں بالکل چپ رہی۔ ابریز ہی بولتا رہا۔ اور وہ سنتی رہی۔

"بھئی تم بھی تو کچھ کہو۔" بڑی دیر بعد اسے اس کی مسلسل خاموشی کھٹکی تو بولا۔

"کیا بولوں . . . ؟" وہ بہت افسردہ تھی کہ کیسے نازک وقت میں وہ اسے تنہا چھوڑ کر اتنی دور جا رہا تھا۔

"کیا اتنی بیگانگی اور بے توجہی تمھیں زیب دیتی ہے؟" وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھ نہ سکی۔ وہ بولنے پر اسے اکسا تا رہا تو وہ سسک پڑی۔

"عورت تخلیق کے کرب سے گزرتی ہے تو موت وحیات کے درمیان معلق ہوتی ہے ابریز ایسے میں اس کی خواہش ہوتی ہے کہ شوہر اس کے قریب ہو۔ وہ قریب ہوتا ہے تو اسے تکلیف کا اتنا احساس نہیں رہتا۔"

"افوہ . . . کتنی بار تمھیں سمجھایا ہے کہ یہاں رہ کر بھی تو کیا کروں گا۔ اس کرب سے تو صرف عورت ہی گزرتی ہے اور مرد بس دعا کر سکتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں روز فون کروں گا اور آنٹی سے کہہ جاؤں گا جس وقت تم اس کرب سے گزرو مجھے فوراً خبر کریں۔ میں . . . میں وہیں بیٹھا تمھیں ڈھارس دوں گا۔ اچھا اب خدا حافظ صبح گیارہ بجے کی فلائٹ سے ہم لوگ جا رہے ہیں۔ تم خیال رکھنا اپنا۔ اور افسردہ بھی مت ہونا۔"

"جی ـــ" وہ ناراض سی بولی اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

اگلے روز وہ قومی ٹیم کے ساتھ انگلینڈ چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد بھی حسب وعدہ اس کے فون آتے رہے۔ ہفتے میں ایک بار وہ ضرور فون کرتا تھا۔ جبکہ آج وہ تخلیق کے کرب سے گزری تو پھر اس کا فون آ گیا کیونکہ ریما کی ممی اسے موقع پر ہی فون کر چکی تھیں . . . اور اب وہ اس کی ڈھارس بندھا رہا تھا۔ ممی نے سسکتی کراہتی ریما کے کان سے فون لگا رکھا تھا اور آواز آ رہی تھی۔ "ہمت کرو ڈیئر۔ حوصلہ کرو۔ خدا کو یاد کرو وہی تمھیں حوصلہ دے گا . . . ہمت دے گا۔ سوچو تو اتنی سی اذیت کے بعد خداوند کریم ہمیں ایک پیارے پیارے اعزاز سے نوازنے والا ہے۔ تم شکر کرو کہ آج ہم دونوں کی زندگی میں یہ وقت آیا ہے اور کچھ دیر بعد ہماری رفاقتوں اور چاہتوں کا ثمر ملنے والا ہے۔"

وہ اپنی تکلیف بھول کر آواز کے سحر میں گم ہو گئی اور واقعی کچھ دیر بعد ان کی زندگی میں ایک پیاری پیاری کلی شامل ہو چکی تھی۔ ٹرنک کال کا وقت کبھی کا ختم ہو چکا تھا اور ابریز بچی کی پیدائش سے ابھی بے خبر تھا۔ روتی کراہتی اور سسکتی ہوئی ریما نے بڑی تکلیف میں ممی کو پکارا۔

"اسے خبر کر دیں ممی۔ وہ وہاں بے چین ہو گا۔"

"ٹھیک ہے ڈیئر۔ ابھی خبر کر دیتے ہیں۔"

گھنٹہ بھر بعد ممی آئیں تو اس نے پوچھا۔

"وہ . . . وہ کیا بولے ممی . . . وہ خوش ہوئے ـــ؟"

"بیٹے ابھی رابطہ ہی قائم نہ ہو سکا خیر تھوڑی دیر بعد

سو ہنی رابطہ قائم ہوا تو۔۔"

اگلے روز جب وہ ذرا سی نیند کے بعد بیدار ہوئی تو یہی پوچھ رہی تھی۔

"نہیں بیٹے! وہ کہیں گیا ہوا تھا۔ ابھی تک وہ بے خبر ہے۔ غالباً کسی میچ کے سلسلے میں اسے جانا پڑا۔۔۔"

"مگر اسے خود فون کرنا چاہیے تھا۔ مجھے پوچھنا چاہیے تھا زندہ ہوں یا۔۔۔" وہ رو پڑی اور ممی اسے حوصلہ دینے لگیں۔

"وہ پردیس میں ہے بیٹا اور پردیس میں بڑی الجھنیں ہوتی ہیں۔ پھر وہ وہاں پابند ہے۔"

"وہ کہیں بھی ہوتا مجھے پوچھ سکتا تھا۔"

"رات اتنی دیر تک تو وہ باتیں کرتا رہا۔ تمھیں حوصلہ دیتا رہا۔ اتنا تو یہاں بیٹھے مرد بھی نہیں کرتے۔ نومی کی پیدائش کے وقت تمھارے پاپا گھر نہیں تھے مگر۔۔۔"

"سارے مرد ایک دم بے وفا اور بے رحم ہوتے ہیں ممی عورت ان بے ایمانوں کی خاطر موت اور زندگی کی کربناک کشمکش میں الجھ جاتی ہے مگر۔۔ مگر انھیں احساس تک نہیں ہوتا وہ۔۔۔ وہ وہاں بیٹھا عیش کر رہا ہوگا اور میں۔۔ میں۔۔۔"

تبھی فون کی گھنٹی بجی ممی نے بھاگ کر ریسیور اٹھایا دوسری طرف واقعی ابریز تھا۔

"ریما کا کیا حال ہے آنٹی؟ اور۔۔۔ اور۔۔" وہ غالباً پوچھنا چاہ رہا تھا۔ وہ بیٹے کا باپ بنا ہے یا بیٹی۔

"اور۔۔۔ اور کیس ہوا یا نہیں۔۔۔؟"

"سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا بیٹا۔ اب ماشاءاللہ تم ایک بیٹی کے باپ ہو۔ ریما بخیریت ہے اور بچی بھی بفضلِ خدا بہت پیاری اور صحت مند ہے۔"

ممی مسکراتی ہوئی کہتی رہیں۔

"ذرا۔۔۔ ذرا ریمی کو فون دیجئے۔ میں اس سے بات کروں گا۔"

"ضرور۔۔۔" وہ فون بیٹی کے پاس لے گئیں اور مسکرا کر بولیں۔ "ابریز کا فون ہے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" انھوں نے ریسیور اس کے کان سے لگا دیا تو ابریز کی آواز ابھری۔

"کیسی ہو ڈیئر۔ میں تمھاری طرف سے بہت بے چین تھا خدا کا شکر کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا۔ بس ایک بات کا افسوس ہے کہ میں یہاں تمھارے پاس نہ تھا۔ ورنہ اپنی بیٹی کو فوراً دیکھ لیتا۔ کیسی ہے وہ؟"

"بہت پیاری ہے۔"

"واقعی۔۔۔ تو گویا تمھاری تصویر ہوگی۔"

"نہیں وہ غالباً آپ پر پڑی ہے۔"

"پھر تو ونڈرفل۔۔۔ بلکہ بہت ونڈرفل۔" اس نے قہقہہ لگایا اور ریما کی تکلیف جیسے بھاپ بن کر اڑ گئی۔

"بہت خوش ہیں؟"

"ہاں۔ بس خوش ہوں۔ بہت خوش تو تب ہوتا جب تم بیٹے کو جنم دیتیں اور جسے میں کرکٹر بناتا۔"

"توبہ۔۔۔ یہ کرکٹ کبھی آپ کے ذہن سے محو نہیں ہوتا؟" وہ الجھ کر بولی۔

"کچھ لوگ پیدائشی اللہ لوگ ہوتے ہیں جیسے مولانا وغیرہ کچھ پیدائشی ادیب ہوتے ہیں اور کچھ شاعر۔۔ کچھ بزنس مین جو ہر دم ننانوے کے چکر میں رہتے ہیں اور میں۔۔۔ میں شاید پیدائشی کرکٹر ہوں۔ کچھ عرصہ تمھاری خوشی کی خاطر اس کھیل سے دور رہا تو بہت رنجیدہ رہا۔"

"ساری عمر تو انسان کرکٹ نہیں کھیل سکتا نا بھاگ دوڑ کا یہ کھیل تو بس جوانی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔"

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ بیٹا ہو جاتا۔۔۔ تب میں اس کی شکل میں اپنی نصف زندگی اسی خوشی میں گزارتا۔"

"آپ کو بیٹی کی پیدائش پر دکھ ہے؟" ڈرتے ڈرتے ریما نے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"ارے نہیں، بیٹیاں بھی خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔ مگر بیٹا ہو جاتا تو اور ہی بات تھی۔ خیر! ابھی کون سا ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔ بیٹا پھر سہی۔" وہ شریر ہو گیا اور ریما کے چہرے پر حجاب آلود مسکراہٹ بکھر گئی۔

اب ہفتہ پندرہ دن بعد ابریز کا فون آیا کرتا۔ کبھی انگلینڈ سے، کبھی آسٹریلیا سے اور آج وہ ویسٹ انڈیز میں تھا۔ جہاں سے وہ ہر پندرہ دن بعد فون کر رہا تھا مگر پھر اچانک اس کے فون آنے کا وقفہ طویل ہونے لگا تو وہ پھر چونکی اور اخبارات میں بھی عجب افواہیں آ رہی تھیں کہ لڑکیاں ہر جگہ ابریز کے پیچھے بھاگتی دیکھی گئی ہیں۔

اس کا منہ پھول گیا اور دل میں ناراضگی اور خفگی کی پھوار برسنے لگی۔

اس کے دو ماہ بعد کہیں ابریز وطن لوٹا تو وہ اب بھی اپنے والدین کے ہاں موجود تھی اور ابریز جو کئی ماہ بعد وطن آیا تھا۔ آجکل سنجیدگی سے اپنے بزنس کی طرف متوجہ تھا اس دوران میں وہ صرف ایک بار کوئٹہ آیا تھا۔ غالباً اسے لینے کے لئے مگر ریما ان افواہوں کی وجہ سے اس سے سخت خفا تھی۔ اور چاہتی تھی کہ وہ اسے باقاعدہ منائے اور اس کی غلط فہمیوں یا افواہوں کی تردید بھی کرے مگر وہ آیا تو اس نے اس کی ناراضگی کا قطعاً نوٹس نہ لیا بلکہ بڑی دھونس سے بولا،

”تیار ہو جاؤ گھر نہیں چلنا؟“

وہ اس لہجے پر سرتاپا جل اٹھی۔ کیا اتنے عرصے بعد شوہر یونہی ملتا ہے؟

اسی خفگی میں وہ تیار نہ ہوئی۔ اس کا ارادہ تھا اب وہ اس وقت تک اس کے ساتھ نہ جائے گی جب تک وہ اپنی خطاؤں کی معافی نہیں مانگ لیتا۔ جبکہ وہ معافی تو درکنار اُسے کبیدہ خاطر دیکھ کر خفگی کی وجہ جاننے کا بھی روادار نہ تھا۔ بلکہ بڑی دھونس سے بولا۔

”اتنا اکڑتی کس بات پر ہو۔ کون سا بیٹے کو جنم دے کر بیٹھی ہو کہ میں تمھارے نخرے سہوں گا اور میں گھر نہیں تھا تو کیا ہوا۔ کیا تمھارا فرض نہ تھا۔ جب ممی تمھیں لینے آئیں تو ان کے ساتھ گھر چلی جاتیں مگر تمھیں گھر بار سے کیا۔ ٹھاٹ سے آنٹی کے گھر رہ رہی ہو! آخر کیوں ممی کے ساتھ جانے سے انکار کیا تھا؟“

وہ بتا نہ سکی کہ ان دنوں اخبارات میں بڑے دھڑلے سے اس کی بابت افواہیں آ رہی تھیں۔ اسی غصے میں وہ اس کے گھر نہیں گئی تھی۔

”اب بھی چلنا ہے یا نہیں؟“ وہ گرجا تو ریما کی آنکھوں میں بھی بجلیاں بھر گئیں۔

”اس طرح لے جائیں گے تو کبھی نہیں جاؤں گی“ وہ دکھ کی تیز دھار سینے میں اتارتی ہوئی بولی۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ یہیں رہو۔ وہاں بھی کسی کو تمھاری ضرورت نہیں“ ریما کے انکار نے ابریز کو مشتعل کر دیا تھا اور تب اسی وقت وہ واپس چلا گیا جبکہ وہ دکھ کے تیز ترین احساس کے ساتھ سسک پڑی۔

اور آج اس بات کو پورے بیس دن گزر چکے تھے ممی پاپا اور بہنیں بار بار پوچھ رہی تھیں کہ آخر ابریز اُسے ساتھ کیوں نہیں لے گیا۔ جواب میں وہ سرتاپا آگ بن جاتی۔

”مت لیں اس کا نام۔ نفرت ہے مجھے اس سے“

”بات کیا ہوئی تھی بیٹا۔ ہمیں بتاؤ۔ ہم ابریز کو سمجھانے کی کوشش کریں گے“

”سمجھنے سمجھانے کا وقت گزر چکا ڈیڈی۔ انھیں میری ضرورت نہیں ہے مگر یہ نہ سمجھیں کہ میں اس بے ایمان کے فراق میں مری جا رہی ہوں۔ مجھے خود اس کی ضرورت نہیں رہی“

دن گزرنے لگے۔ ممی پاپا نے بہت کوشش کی کہ ابریز سے رابطہ قائم کریں مگر وہ ہر بار منع کر دیتی۔

”اگر آپ لوگوں نے میری بابت اس سے کوئی بات کی تو میں اپنی بچی کو لے کر کہیں منہ کالا کر جاؤں گی۔ ہونہہ اسے میری ضرورت نہیں ہے۔ نہیں ہے تو نہ سہی۔ یہاں بھی کسے اس کی ضرورت ہے۔ ۔ ۔“

”وہ ایسا نہیں ہے بیٹے۔ ہم اُسے شروع سے جانتے ہیں“ پاپا نے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بھڑک اٹھی۔

”کسی کو جاننے کا دعویٰ مت کیجئے ڈیڈی۔ کبھی مجھے بھی یہ دعویٰ تھا کہ ابریز کو شاید مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ میں اسے جانے کیا کچھ سمجھ بیٹھی تھی مگر وہ ۔ ۔ ۔ وہ بہت گھٹیا، بہت کمتر نکلا“ وہ رو دی۔

”تمھیں شاید غلط فہمی ہوئی ہے! ورنہ“

”غلط فہمی ۔۔ اخبارات کا کہا غلط ہو سکتا ہے مگر جو لفظ خود اس کی زبان سے ادا ہوئے انھیں کون جھٹلا سکتا ہے“

”وہ آج بھی تنہا ہے۔ حالانکہ اسے وطن آئے دو ماہ ہو چکے۔“ ممی نے تاویل پیش کی۔

”آپ کیا اس کا پیچھا کرتی ہیں ممی کہ وہ کیا کچھ کرتا ہے اور کہاں کہاں جاتا ہے۔ سوچیں ممی جب ایک مرد کئی ماہ بعد بیوی سے ملے اور یہ کہے کہ چلنا ہو تو چلو ورنہ اسے بھی اس کی ضرورت نہیں تو ۔ ۔ ۔ تو ایسے مرد کو آپ کیا کہیں گی۔ دھوکے باز، فراڈی اور مکار نا۔ ۔ تو ابریز بھی یہی

کچھ ہے۔ وہ بہت تھوڑا عرصہ میرا رہا تھی۔ پھر وہ بدلتا چلا گیا۔ مہوش کی پیدائش سے بہت پہلے وہ مجھ سے دُور جا چکا تھا۔"

"مگر وہ تمہیں روز فون کرتا تھا۔"

"یہ محض ڈھکوسلا تھا۔ وہ مجھے اور غالباً خود کو بھی دھوکا دیتا تھا۔" وہ تلخی سے ہنس دی۔ "پلیز اب اس کا نام بھی مت لیجئے گا۔ مجھے اس کے نام سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔"

بچی اب چھ سات ماہ کی ہو چکی تھی اور جوں جوں اس کی عمر بڑھ رہی تھی۔ منذر صاحب اور ان کی بیگم کا دُکھ بھی بڑھ رہا تھا۔ بیاہی بیٹی گھر میں بیٹھی تھی اور داماد دوبارہ لینے نہ آیا تھا۔ دُکھ کی کٹاری کلیجے کے پار اُتر جاتی۔ وہ نہیں تو اس کے والدین بھی تو نہ آئے تھے بلکہ اپنی بچیوں کی شادیاں طے کرتے پھر رہے تھے اور بہو کی پرواہ ہی نہ تھی۔ اس پر خاندان بھر میں یہ افواہ عام تھی کہ آجکل تین چار لڑکیاں ایک ساتھ ابریز پر جان دے رہی ہیں اور وہ انہی کے ساتھ دیکھا جاتا ہے یہ خبریں ریما تک بھی آ رہی تھیں اور اس کا دل کٹ سا جاتا تھا۔ جی چاہتا بھاگ کر جائے اور ابریز کو ان چڑیلوں کے چنگل سے چھڑا کر اپنے دل میں پھر قید کر لے۔ آخر وہ میرا گھر ہے۔ ابریز میرا شوہر ہے۔ اس پر میرا بہت حق ہے کیونکہ وہ مہوش کا باپ بھی تو ہے۔ کیا ہوا جو جھگڑ کر وہ دوبارہ نہیں آیا اور والدین اور بہنوں کو بھی آنے سے روک دیا! آخر میں خود بھی تو وہاں جا سکتی ہوں نا وہ... وہ گھر میرا ہی تو ہے۔"

مگر پھر وہ دُکھ کے ساتھ روتی روتی سہم سی جاتی۔ یوں بے قدری کے ساتھ جانا اسے اچھا ہی نہ لگتا تھا۔ اگر چلی بھی جاتی تو کب ممکن تھا کہ وہ ضرور اسے گھر میں رہنے کا حق دیتا!

"پھر بھلا بے عزت ہونے کا فائدہ؟" وہ افسردہ سی سوچتی۔ "ذرا سی بات پر ناراض ہو کر سارے ناطے توڑ لئے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ بچی جو محض چند ماہ کی ہے۔ اس کا اس گھر پر حق ہے۔ وہ اس کے باپ کا گھر ہے مگر بے چاری نے اب تک اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ میں ہر ہر لمحہ تمہاری منتظر رہی۔ خواہ اُوپر اُوپر سے والدین کے سامنے اپنی نفرتوں کا اظہار کرتی رہی مگر ابریز اپنی مہوش کے باپ کا میں ہر لمحے انتظار کرتی ہوں کہ جانے کب میں تمہیں اچانک یاد آ جاؤں! مگر پھر دُکھ کے ساتھ ہنس پڑتی ہوں کہ تمہاری یادداشت ایسی اچھی کہاں۔ تم تو ایک دم بھلکڑ ہو۔ ذرا ذرا سی چیز بھول جاتے ہو۔ آفس جاتے وقت کتنا اودھم مچاتے تھے۔ بالکل بچوں کی طرح!"

اب وہ اتنے ماہ سے اس سے دُور تھی اور اس کی منتظر تھی مگر وہ تو جیسے اسے یہاں چھوڑ کر بھول بیٹھا تھا وہ اس کی اندر ہی اندر ہی منتظر تھی جبکہ وہ نت نئی عورتوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ دُبلی پتلی اسمارٹ،

اور حسین عورتوں کے پیچھے اور ممی جو کبھی کلب کی جان ہوا کرتی تھیں، آجکل بیٹی کے دکھ میں گھر کی اسیر ہوگئی تھیں۔ انھیں تعویز گنڈوں پر کبھی اعتماد نہ تھا مگر آجکل بیٹی کی خاطر عاملوں کے پیچھے بھاگ رہی تھیں اور دن رات اللہ اللہ کیا کرتیں۔ لمبے لمبے وظائف کرتیں کہ اب دعا کے سوا ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ وضع دار خاتون تھیں۔ عزت رکھتی تھیں اور خود داماد سے نہ کہہ سکتی تھیں کہ ان کی بیٹی کو آ کر لے جائے۔ ریما کی ہلدی کی طرح زرد صورت دیکھتیں تو ان کا اپنا دل کٹ جاتا۔ ریما کو اب تو اپنی چھوٹی سی بچی کی بھی پرواہ نہ رہتی تھی۔ اسے بھی بھول بیٹھی تھی کہ اس کی صورت دیکھ کر تو وہ بے ایمان شدت سے یاد آتا تھا اور تب وہ اسے دوما اور نومی پر ڈال کر خود کو تنہا جینے کی عادی بنانے کی کوشش کیا کرتی۔

ادھر ابریز کی بہنوں کی شادیوں کی تاریخ بھی طے ہوگئی اور رسمی انداز میں انھیں بھی شادی کا کارڈ بھیج دیا گیا۔ منذر صاحب تڑپ اٹھے۔ ایسے میں تو انھیں خود آ کر ریما کو لے جانے کی بات کرنی چاہیئے تھی مگر وہاں سے صرف بذریعہ ڈاک شادی کارڈ بھیجا گیا تھا جو ان کے زخموں پر نمک چھڑک گیا۔ گویا اس گھر کو واقعی ان کی بیٹی کی ضرورت نہیں۔ منذر صاحب نے جل کر سوچا اور اسی وقت وہ اپنے بیگ میں دو جوڑے رکھ کر داماد کے ہاں جانے کو تیار ہوگئے۔

وہاں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں منذر صاحب گھر میں چہل پہل دیکھ رہے تھے اور ان کا لہو کھول رہا تھا۔ تیز قدموں سے وہ اندر گئے۔

"تبریز صاحب کہاں ہیں؟" انھوں نے ابریز کے والد کے بارے میں پوچھا تو ملازم انھیں تبریز عالم کے پاس لے گیا۔ تبریز صاحب منذر صدیقی کو دیکھ کر شرمسار ہوتے پھر اٹھ کر استقبال کیا۔

"آئیں بھائی صاحب۔ یہاں بیٹھئے۔"

"میں بیٹھنے نہیں آیا۔ یہ کارڈ واپس کرنے آیا تھا ہم میں سے کوئی فرد اس شادی میں شریک نہیں ہوسکتا۔۔۔" وہ گرجے۔

"آپ بیٹھیں تو۔۔۔ اس نالائق نے تو میری ناک کٹوا دی منذر بھائی۔۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

"یہ آپ لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں حتمی بات چیت کے لئے ابریز سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے یہاں بلوالیں۔" وہ لاتعلق سے لہجے میں بولے تو تبریز صاحب التجا کرنے لگے۔

"اس کے منہ نہ لگو منذر۔۔ وہ بہت خود سر ہوگیا ہے مگر یقین کرو میں اور تمہاری بھابی اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"جو شخص اتنی مدت میں کچھ نہ سمجھ سکا ہو اس سے میں مزید کیا توقع رکھوں۔ میں سمجھ چکا ہوں۔ تم لوگ اس رشتے کو باقی نہیں رکھنا چاہتے۔ اسی لئے میں ابریز سے حتمی بات کرنے آیا ہوں۔"

دو گھنٹے بعد کہیں ابریز گھر آیا تو اسے آتے ہی منذر صاحب کا پیغام مل گیا اور وہ جھجکتا ہوا ان تک آیا۔ داماد کو دیکھ کر منذر صاحب کا خون کھول اٹھا اور وہ بمشکل قدرے نارمل انداز میں بولے۔

"میں جانتا ہوں تم میری بیٹی کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے لہٰذا تم اسے آزاد کردو۔"

یہ ایک مجبور باپ تھا جو بیٹی کے لئے آزادی چاہتا تھا اور خود اپنے منہ سے طلاق مانگ رہا تھا۔ ابریز چونکا اسے اپنی سلمٰی پھپھو یاد آگئی جنھیں عین جوانی میں طلاق مل گئی تھی اور اس گھر میں صف ماتم بچھ گئی تھی۔ پھپھو نے طلاق کے بعد ساری خوشیاں خود پر حرام کرلی تھیں اور خدا کی جانب رجوع کرلیا تھا اور اب وہ کسی سے بھی نہیں ملتی تھیں۔ کوئی آئے کوئی جائے انھیں دنیا کے کسی دھندے سے سروکار نہ تھا۔ ابریز کے ذہن میں پھپھو کے چہرے کے ساتھ ہی ریما کا چہرہ ابھرا تو وہ لرز سا گیا۔ تب ہی اسی لمحے وہ پلٹا اور کمرے سے نکل گیا۔

منذر صاحب گرجنے لگے "اسے بلاؤ تبریز عالم۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ میری بچی جوان جہان ہے۔ میں اس کی تباہ و برباد حالت نہیں دیکھ سکتا۔ طلاق کے بعد تم لوگ اپنی بچی کو لے آنا اور میں بھی اس غریب کا کہیں گھر بسانے کی کوشش کروں گا۔"

تبریز عالم منذر صاحب کی خوشامد کرنے لگے "سمجھنے کی

کوشش کرو۔ وہ . . . وہ ریما بیٹی سے الرجک نہیں۔ وہ . وہ جانے کیوں اُلجھا ہُوا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم دونوں میں کیا بات ہوئی مگر اتنا جانتا ہوں کہ وہ ریما سے ناراض یا متنفر نہیں۔"

"بہلا وے مت دو۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ تنگ آ کر میں خود طلاق طلب کر وں۔ اس لئے کہ میری بیٹی کا حق مہر پانچ لاکھ ہے۔" منذر گرجے۔

"وہ بے ایمان ہے، خود سر ہے، تند خو ہے مگر بے غیرت نہیں۔ میں جانتا ہوں بات کچھ اور ہے ورنہ . . . ورنہ ان دونوں میں تو بہت محبت تھی۔ بہت پیار تھا۔"

"تم مرد ہو، میں بھی مرد ہوں اور ہم دونوں جانتے ہیں تبریز عالم کہ ہم مردوں کا پیار کتنا سطحی ہوتا ہے۔ خدا کے لئے اب اسے بلواؤ۔ وہ کہاں گیا ہے۔ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا۔ اگر اسے میری بیٹی کے ساتھ نہیں رہنا تو بخدا اسے طلاق دے دے۔ اسی میں ہم سب کی نجات ہے۔"
پھر منذر خود باہر نکل گئے اور ہر ایک سے ابریز کی بابت پوچھنے لگے مگر کسی کو بھی ابریز کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ منذر صاحب کا موڈ اور خراب ہو گیا اور وہ تبریز صاحب پر اور ان کی بیگم پر غصہ نکالنے لگے۔

"وہ . . . وہ مجھے پریشان کر رہا ہے۔ ذلیل کر رہا ہے۔ مانا کہ اس کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں مگر میں . . . میں جلدی گھر جانا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ وہاں میری بیوی اور بچیاں تنہا ہیں۔"

تبریز اور ان کی بیگم منذر صاحب کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں تھے اور وہ گرج رہے تھے۔

"یہ آپ دونوں مجھے آخر کیا سمجھانا چاہتے ہیں۔ مانا کہ ایک انتہائی غلطی کر چکا کہ اس بے قدر لڑکے کے ہاتھ میں اپنی بچی کا ہاتھ دے بیٹھا تو اب اس غلطی کی تلافی بھی مجھی کو کرنی ہے اور آپ دونوں مجھے سمجھانے پر تل گئے ہیں۔ جیسے میں ناسمجھ بچہ ہوں۔ سمجھانا تھا تو بیٹے کو سمجھاتے جس نے ہم سب کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ تم دونوں بھی بیٹی والے ہو۔ اور اب انھیں بیاہنے چلے ہو۔ خدا نہ کرے تم پر میرے والا وقت آئے۔ میرے دل کی آگ کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کی بیٹی اُجڑ کر گھر بیٹھی ہو۔"

دوسرے دن تک جھگڑا جاری رہا کہ بالکل اچانک دوپہر کو ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے تبریز عالم، ان کی بیگم، بچیوں اور منذر صدیقی نے حیرت سے دیکھا۔ دروازے میں ابریز کھڑا تھا۔ اس کی گود میں بچی تھی اور قریب ہی ریما کھڑی تھی۔ سر جھاڑ، منہ پھاڑ جبکہ وہ ہاتھ میں پکڑا اس کا سُوٹ کیس زمین پر رکھ رہا تھا . . . اور مسکراتا ہُوا "السلام علیکم" کہہ رہا تھا۔

سبھی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ پورا گھر انھیں دیکھ کر مسرور ہو گیا۔ ابریز کی بہنیں بھاگ کر ریما اور بچی سے لپٹ گئیں۔ جبکہ تبریز عالم ان کی بیگم اور منذر صدیقی بھی دبے دبے انداز میں مسکرا کر ان کے قریب چلے گئے تھے۔
ملگجے لباس میں ملبوس بکھرے بالوں والی ریما کو ساس کے بعد سُسر نے پیار کیا۔ پھر منذر صاحب نے بھی اسے بانہوں میں بھر کر کلیجے میں سمو لیا۔

"دیکھا منذر بھائی۔ میں نے کہا تھا کہ میرا بیٹا تند خو ضرور ہے۔ بے سمجھ اور بے غیرت نہیں۔ طلاق دینے والا مرد میری نظروں میں کمینہ اور بدذات ہوتا ہے۔ صد شکر کہ میرا بیٹا ایسا نہیں، اور تم . . . تم کل سے جھگڑ رہے ہو کہ میری بیٹی کو آزاد کر دو . . . بولو . . . آزادی خوبصورت



ہے جیا بیٹی کی قید۔"

"اپنے گھر کی خوشیوں میں قید بلکہ پابہ زنجیر بیٹیاں ہی اچھی ہوتی ہے۔" منذر نے پھر مسکرا کر اپنی بیٹی کی پیشانی چوم لی۔

"جاؤ پہلے جا کر نہالو۔ ۔ کپڑے بدلو۔ ۔ ۔ اور پھر یہاں آجاؤ۔ ہم لوگ تمہارے ساتھ ہی کھانا کھائیں گے۔ ۔" وہ جلدی سے مڑ گئی مگر اس کے چہرے پر اب بھی خفگی تھی اور ابریز بھی سوچوں میں گم تھا۔

"آپ دونوں خوش نہیں بھیا؟" ابریز کی بہن صائمہ دونوں کو غور سے دیکھ کر بولی تو وہ چونک کر ہڑبڑا کر مسکرا دیا۔

"نہیں تو۔ ۔ ۔ میں تو بہت خوش ہوں۔"

"تو کیا بھابی خفا ہیں۔ ۔ ۔ ؟" صائمہ نے پوچھا۔

ابریز چپ ہو گیا تو منذر بولے۔ "نہیں نہیں وہ بھلا کیوں خفا ہو گی۔ اُسے تو خوش ہونا چاہیئے کہ آخر کار وہ اپنے گھر آ گئی۔"

"تو اور کیا۔ ۔ ۔ خفا ہوتی تو وہ ابریز کے ساتھ کیوں آتی۔" بیگم تبریز مسکرائیں اور پوتی سے پیار کرنے لگیں۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تبریز بولے۔

"چلو انکل سے معافی مانگو۔ تم نے انھیں بہت پریشان کیا۔ ۔ ۔"

"آپ کو یاد ہے انکل میں۔ ۔ ۔ میں تو انھیں لینے گیا تھا آپ کے ہاں مگر۔ ۔ ۔ مگر آپ کی بیٹی نے خود آنے سے انکار کر دیا تھا۔" وہ افسردہ سا بولا۔

"چلو جو بھی ہوا تھا۔ سب بھول کر اب معافی مانگو۔" بیگم تبریز نے کہا تو وہ اُٹھ کر منذر صاحب کے قدموں میں جھکنے لگا۔

"نہیں نہیں۔ ۔ ۔ تم تو داماد ہو۔ ۔ ۔ بھتیجے ہو۔ ۔ ۔ تم۔ ۔ ۔ تم بھلا کیوں پاؤں چھوتے ہو۔" منذر نے تڑپ کر اُسے بانہوں میں بھر لیا۔

"مگر تنازعہ کیا تھا بھیا۔ آپ نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔" صائمہ نے پوچھا۔ ابریز پھر افسردہ سا مسکرا دیا۔

"کچھ نہیں۔ ۔ ۔ بس جانے کس بات پر تمہاری بھابی خفا تھیں۔ مجھے تو خود اب تک پتہ نہیں چلا۔"

"خفا ہوتیں تو آتی کیوں؟"

"آئی تو اس لئے ہے کہ میں منذر انکل کے ایکسیڈنٹ کی فرضی داستان سنا کر لایا ہوں۔ نوی اور روما تک کو علم نہیں بس آنٹی اصلیت جانتی ہیں۔"

"تو گویا انکل کو سلامت باشد دیکھ کر وہ اور بھی ناراض ہوں گی۔ آخر آپ بھابی کو چکر کیوں دیتے ہیں۔ ۔ ۔ ؟ لگتا ہے کہ کسی ایسے ہی چکر و کر سے آپ نے انھیں ناراض بھی کر رکھا ہے۔"

صائمہ! [illegible] گویا نے دخل نہیں دیا۔ اب جب وہ گھر آ چکی ہے تو یہ خفگی بھی خود ہی ختم ہو جائے گی۔

کھانے کے لئے وہ آ گئی۔ اس وقت اس کے لانبے بال پشت پر لہرا رہے تھے اور اس نے انگوری رنگ کا شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ جس میں کافی پیاری لگ رہی تھی۔ ابریز نے کن اکھیوں سے دیکھا اور تبریز صاحب نے بیٹے کی یہ چوری پکڑ کر زیر لب مسکراتے ہوئے درگزر کر دی۔ بیگم تبریز نے ملازموں سے کہہ دیا تھا کہ کھانا گرم ہو گیا ہو تو لگا دو اور اب ملازم مستعدی سے کھانا دوبارہ لگا رہے تھے۔ پھر ابریز سر جھکائے چپ چاپ کھانے میں مگن تھا اور ریما ساس نندوں کی باتوں کا جواب ہولے ہولے مگر مختصر ترین لفظوں میں دے رہی تھی۔ کھانے کے بعد منذر صاحب اُٹھے اور اپنا بیگ سنبھالنے لگے۔

"ارے آپ اتنی جلدی جا رہے ہیں؟" تبریز صاحب بولے۔

"ہاں بیٹی کے لئے رہائی مانگنے آیا تھا مگر اُسے خوشی کے حصار میں قید کر کے جا رہا ہوں اور یہ ابریز بھی تو گھر بھر کو پریشان کرا آیا ہے۔"

"وہ تو میں فون کر چکی انکل۔ آنٹی اور نوی بہت خوش ہیں۔" نائمہ بولی۔

"پھر بھی بیٹا مجھے جانا ہی چاہیئے۔ کل سے آیا ہوں۔ گھر کی خبر لوں جا کر۔"

ان لوگوں نے بھی زیادہ مجبور نہیں کیا اور منذر شام ڈھلے ریما کو دعائیں دیتے اس گھر سے رخصت ہو گئے۔ نائمہ اور صائمہ ریما کے ارد گرد تھیں۔ پوتی دادی کی بانہوں میں تھی اور رات کے کھانے کے بعد بھی انھوں نے اُسے پاس سلا لیا۔ وہ اٹھانے کو گئی تو بیگم تبریز مسکرا دیں۔

"تم جاؤ بیٹا! یہ میرے پاس ہی سویا کرے گی۔"

"مگر۔۔۔"

"اگر مگر کچھ نہیں۔"

"اتنے ماہ تک تم نے تنہا اُسے پالا پوسا۔ اب ہماری باری ہے۔ جاؤ تم جاکر آرام کرو۔"

اتنی محبت سے وہ کہہ رہی تھیں کہ ریما کا دل بھر آیا کتنے ماہ تک وہ اس محبت سے دُور رہی تھی اور اس بے ایمان کے کارن جو شام سے مظلوم بنا گھر میں گھوم رہا تھا اور بہنیں اس کی حالت پر ہنس رہی تھیں۔ صائمہ نائمہ اُسے سبھی چھیڑ رہی تھیں۔

"بھابی۔۔۔ بھیا کو دیکھیں تو۔۔۔ کیسے بھیگی بلی بنے ہوئے ہیں۔ معاف کر دیں نا انھیں۔"

وہ کن انکھیوں سے دیکھتی ابریز واقعی بہت افسردہ سا بیٹھا تھا اور حاضر غائب کی کیفیت اس پر طاری تھی۔ اس نے جیسے بہنوں کی چھیڑ چھاڑ سُنی ہی نہ تھی۔۔۔ اور چُپ چاپ سگریٹ سُلگا لیا تھا۔ تبھی نائمہ نے شرارت سے بھتیجی کو اُس کی گود میں ڈالا تو لمحہ بھر کو وہ چونکا پھر افسردگی سے ہنس دیا تھا۔

اس وقت بھی تینوں بہن بھائی ڈرائنگ رُوم میں تھے اور بہنیں ہنس رہی تھیں۔

"اتنا ڈر رہے ہیں توبہ۔۔۔ یہ بھابی اور ڈر ذرا بھی تو آپ پر نہیں سج رہا بھیا۔ بھئی جاکر خوب دھونس سے بھابی سے کہیں، چلو مجھے معاف کر دو! اور بھابی بچاری ڈر کے دیوار سے جا لگیں گی۔" صائمہ کی یہ شوخیاں ابریز کو بھی ہنسا گئیں۔ "اب اتنی بھی ڈرپوک نہیں وہ۔۔۔"

وہ ڈرائنگ رُوم کی کھڑکی میں لمحہ بھر کو رُکی پھر اپنے کمرے میں چلی گئی، وقت ہولے ہولے سرکنے لگا۔ اس نے تنگ آکر بتی بجھا دی مگر دروازہ بند نہیں کیا۔ اب اندھیرا کئے وہ ابریز کی منتظر تھی مگر وہ آکر نہ دیتا تھا۔ تب پونے ایک تک اس کی آنکھ بھی لگ گئی کہ بتی جلی اور روشنی میں ایکدم اس کی آنکھ بھی کھل گئی۔ ابریز خوفزدہ سا ہوگیا۔ پھر خواہ مخواہ ایک کتاب اُٹھالی۔ ریما کا جی چاہ رہا تھا چیخ کر کہے کہ مجھے سونے دیں اور بتی بجھا دیں مگر خفگی کی وجہ سے وہ تو سارے راستے اس سے نہیں بولی تھی مگر یہ احساس ضرور تھا ابریز بہت تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ کل سے سفر میں تھا اور آج بھی خوب سفر کیا تھا۔ اس پر یہ ناراضگی۔ وہ تھک کر جیسے چور ہوگیا تھا

ایک وقت تھا جب وہ تھکتا تو اوندھا لیٹ جاتا تھا اور اُسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ تب وہ جاتی اور بڑی محبت سے اس کی کمر دابنے لگتی۔ وہ اوندھا لیٹا کتاب پڑھتے جاتا اور وہ اِدھر اُدھر کے قصّوں سے اُسے بور کرتی تھی۔ ابریز ہوں ہاں میں جواب دیئے جاتا اور وہ کمر دبائے جاتی۔ حتیٰ کہ وہ سیدھا ہوجاتا اور کتاب پھینک کر اُسے دیکھنے لگتا۔ صبح کے وقت تو ہر روز وہ اس کی کمر دبا کر بستر سے اُٹھا یا کرتی۔ محض اس لئے کہ وہ جو ہی جاگے کا ماذ۔ بد گ تیا و۔ تو دس بجے تک سوئے جاتا اور اب وہ تھکا ہارا تھا مگر وہ نظریں چرا رہی تھی اور بات چیت دونوں کے لئے مشکل ہو رہی تھی۔ ابریز کی نگاہیں کتاب پر تھیں مگر دماغ کہیں اور تھا جب کہ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ تھک کر ریما نے کروٹ بدل لی تو اس نے بھی کتاب رکھ دی۔ پھر بتی بجھا دی اور ہولے سے لیٹ گیا۔ وہ بیڈ کے دوسرے سرے پر تھی اور درمیان میں اڑھائی تین فٹ کا فاصلہ صدیوں پر محیط تھا۔ تب ابریز نے ہمت کی اور اس فاصلے کو ختم کر دیا۔ اب وہ اس کے بالوں میں منہ چھپائے کہہ رہا تھا۔ "ریما!"

ریما نے سُنا اور اسے اپنے قریب محسوس بھی کیا مگر دم سادھ لیا۔ ہلی جلی تک نہیں۔

"سو گئیں کیا؟" وہ اب بھی چُپ تھی۔

"میری خطائیں ہی گنوا دو تاکہ مجھے صفائی پیش کرنے میں آسانی ہو جائے۔" وہ کہتا گیا جیسے اسے پتہ ہو کہ وہ جاگ رہی ہے۔

"کیا بالکل نہیں بولو گی؟ مگر بولنا نہیں تھا تو ساتھ کیوں آئی تھیں۔ رہ گئیں ہوتیں وہیں۔ میں بھی جی ہی لیتا۔۔۔"

اُس کی آواز بھرّانے لگی۔

"تمھیں پتہ ہے تمھاری ساری خفگی بالکل بلاجواز ہے میں نے کوئی خطا نہیں کی ریما۔ میری جان۔۔۔ میں نے زندگی میں بس ایک عورت کی خواہش کی۔ اس کی تمنا کی اور وہ۔۔۔ وہ تم ہو۔ صرف اور صرف تم۔۔۔!"

"میں تمھیں نہیں جھٹلاؤں گی اس لئے کہ جانتی ہوں تمھیں بھولنے کا مرض ہے۔" وہ تلخ ہوگئی اور اسے خود سے پرے دھکیل دیا۔ وہ مُسکرا دیا۔

"تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔ میں اگر گھر میں چیزیں رکھ رکھ کر بھولتا تھا تو کیوں اور میں اپنا فطری چلبلا پن

بھولا تو کیوں؟ تم کچھ نہیں جانتیں ریما۔ میری جان، تمھیں یاد ہے شادی کے بعد جب ہم لوگ ہنی مون کے لئے یورپ گئے تو تم نے کہا تھا کہ تمھیں میچور، کم گو، پُروقار اور ڈیلسنٹ سے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ تب میں رفتہ رفتہ خود کو سنجیدگی و متانت کے خول میں بند کرنے لگا۔ بُردباری کا لبادہ اوڑھ لیا مگر محض اس لئے کہ میں تمھیں اچھا لگنا چاہتا تھا جسے تم میری بے گانگی اور بے توجہی پر محمول کرتی رہیں۔"

"ہونہہ۔۔۔" وہ تلخی سے بولی۔ "اور وہ جو اخبارات نے آپ کی مصروفیات پر سینکڑوں صفحات سیاہ کئے۔۔۔ وہ۔۔"

"وہ۔۔۔ وہ تو بس صحافیوں کا فرض سمجھ لو۔ مشہور لوگوں کے اسکینڈل بنانے کا ان صحافیوں کو پُرانا خبط ہے۔ جس کی لپیٹ میں میں بھی آگیا تھا۔ مانتا ہوں کہ باہر گیا تو ہر جگہ عورتیں اور لڑکیاں میرے تعاقب میں رہیں مگر میں تو صرف تمھارے ہی پیچھے تھا نا۔"

"جب ممّی مہوش کی پیدائش سے قبل لینے آئیں تو۔۔ تو یہ کیوں کہا تھا کہ ممّی اجازت دیں تو چلی جانا۔ مجھے روکا کیوں نہیں تھا؟"

"اسی خطا کے جرم میں تو اتنی طویل سزا بھی سہہ لی۔ کتنا عرصہ تم سے جُدا رہا اور کیسے خود پر اور اپنے نفس پر جبر کرتا رہا۔ تم کیا جانو مگر جانے کیوں ان دنوں بُردباری کا بھوت سوار تھا مجھ پر۔۔۔ میں ممّی پاپا کا مطیع اور فرمانبردار بیٹا بننے کے خواب دیکھ رہا تھا مگر تمھارے جاتے ہی ممّی سے کتنا لڑا یہ صرف ممّی جانتی ہیں۔ بے چین ہو کر ہر رات تمھیں فون کرتا تھا کیونکہ تمھاری آواز سُنے بغیر مجھے نیند ہی نہ آتی تھی۔"

"اور جب گھر گئے تھے مجھے لینے تو اتنی دھونس اور رعونت سے کیوں آنے کو کہا تھا کہ میں جل بھُن کر خود آنے سے منکر ہوگئی اور آکر۔۔۔ آکر عورتوں کے چکر میں پھنس گئے۔ مجھے سب خبر ہے کس کس کے ساتھ گھومتے تھے۔" وہ گرجی تو ابریز ہنس پڑا۔

"یہاں اپنے شہر میں آکر تو اس لئے لڑکیوں کے پیچھے پھرتا تھا کہ تم خود بَو کھلا کر گھر چلی آؤ۔ مجھ سے لڑو جھگڑو مگر میرے پاس آجاؤ۔"

"ہونہہ خود چلی آؤ۔ سارے راستے تو بند کر دیئے تھے اتنے بے گانہ بن گئے تھے کہ اپنے لگتے ہی نہ تھے۔ ہر قدم پر مجھے ناراض کر دیتے تھے۔" ابریز پھر ہنس پڑا۔

"اصل میں ریمی جان۔۔۔ میں تمھیں ڈھیر سارا ناراض کر کے منانا چاہتا تھا۔ تم مُنہ پھلا کر بہت اچھی لگتی تھیں نا۔" اس نے ایک دم بتی جلا دی تو لحظہ بھر کو دونوں کی آنکھیں چندھیا گئیں پھر ابریز تو مُسکرادیا اور وہ یونہی خفا خفا سی لائٹ آف کرنے کو کہہ رہی تھی۔

"بالکل نہیں۔ اب یہ لائٹ ساری رات جلے گی اور میں مووی بناؤں گا۔ تمھاری خفگی کی مووی۔" وہ ہنستا ہوا بستر سے اُٹھا۔

"یہ مت سمجھو کہ میں نے تمھیں معاف نہیں کیا ہے۔" وہ گرجی اور وہ شوخی سے تھینکیو کہہ بیٹھا۔

"معاف کرنے کے بعد کی مووی بنانے کی تمنا بھی نہیں۔ پھر تو تم وہی عام سی ریما بن جاؤ گی جسے میں نے اچھی طرح دیکھ رکھا ہے۔"

وہ ہنستا رہا اور مووی بناتا گیا۔ ریما کے چہرے پر ایک رنگ آتا تو دوسرا جاتا تھا مگر ابریز کو پرواہ ہی نہ تھی۔ پورا ایک گھنٹہ یونہی گزر گیا تو تین بج رہے تھے۔ اس نے اُٹھ کر بتی بجھائی اور اوندھا لیٹ گیا۔

"ایمان سے بہت تھک گیا ہوں۔" وہ بولا تو خفا خفا ریما اُٹھ بیٹھی اور اس کے ہاتھ بلاارادہ اس کی کمر پر جا پہنچے۔

"اُوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے خود کو تھکا لیتے ہو۔ پھر میری نیند حرام کرتے ہو۔۔۔" وہ خفگی سے بولی تو ابریز مُسکرادیا۔

"دن بھر سوئیں گے جانم۔ رات سونے کے لئے تھوڑی ہوتی ہے۔" وہ شریر ہو کر اُسے جانے کیا یاد کرا رہا تھا۔ ریما نے غصے میں اس کی کمر میں چٹکی کاٹ لی۔

"ہائے مر گیا۔ کیسی ظالم ہو توبہ۔" وہ ہنستا ہوا سیدھا ہونے لگا مگر اس نے پھر اُسے اوندھا کر دیا اور کمر دبانی چلی گئی۔

رہنے بھی دو اے دیں دارو، یہ حور و ملائک کی باتیں
انسان ہو تم، انسان ہوں میں، انسان کی مجھ سے بات کرو



سکینہ میاں جی کے پاس بیٹھی اُن کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ اُس کی چھوٹی بیٹی طلعت بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

"امی... ابو کی گاڑی آئی ہے؟"

"تمھاری مس آگئیں؟" سکینہ نے اُلٹا سوال کر دیا۔

"مس نہیں آئیں۔ ابو نے مجھے اور عائشہ کو لینے کے لیے گاڑی بھیجی ہے۔"

"کس لیے...؟" سکینہ نے اُلجھ کر پوچھا۔

"وہیں سے کربلا جائیں گے۔"

"تو آج مس شیریں سے نہیں پڑھو گی؟"

"پتہ نہیں... یہ تو انھوں نے نہیں بتایا۔"

سکینہ کسی سوچ میں ڈوب گئی تو میاں جی نے آہستہ سے کہا۔

"بیٹی! یہ فرض تمھارا ہے۔ تم بچیوں کو ساتھ لے جا کر اُن کی مطلوبہ چیزیں خریدو۔"

"تو پھر ہم جائیں...؟" طلعت نے اُن کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

"امی کے ساتھ نہیں جاؤ گی؟ انھیں بھی ساتھ لے چلو۔" میاں جی نے کہا۔

"امی کو تو تیار ہونے کے لیے ابھی کتنا ہی وقت چاہیے۔ اور ڈرائیور بہت جلدی میں ہے۔ کہتا ہے صاحب نے کہا تھا بہت جلدی آجانا..." طلعت نے مُنہ بنا کر کہا۔

"ٹھیک ہے تم لوگ چلی جاؤ۔" سکینہ نے کہا تو طلعت بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ خوشی کے مارے اُس کی بُری حالت تھی۔ سکینہ اسے یوں اُچھلتے کودتے اور شور مچاتے ہوئے دیکھ کر مُسکرا دی۔

"بیٹی... اب تم خود یہ کام سنبھال لو۔ میری بات مانو۔ یہ خوشیاں تمھارے لیے ہیں۔ انھیں اپنا لو۔" میاں جی نے پیالی واپس رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا کروں... میاں جی وہاں گاؤں میں کتنا اچھا تھا۔ چادر لپیٹ کر چلی بھی جاتی تو کوئی نظر بھر کے نہ دیکھتا۔ سب کو پتہ تھا کہ میں کون ہوں، کس گھر سے ہوں۔ آنکھیں نیچی رکھتے۔ بہن بہن کہتے زبان سوکھتی تھی اُن سب کی۔ مگر یہاں یہاں... کا کیا بتاؤں؟ میاں جی جو ایک دو بار میں گئی تو بس تماشا بنی۔ بازاروں میں اس طرح رش ہے کہ جیسے سارا مال مفت تقسیم ہو رہا ہو۔ دکانوں میں تو روشنی سے دن کا گمان پڑتا ہے اور اُس پر یہ کہ جیسی کوئی چادر لپیٹے آبھی جائے تو لوگ یوں دیکھتے ہیں جیسے چڑیا گھر کی کوئی چیز ہو۔" سکینہ اپنی بات پر خود ہی ہنس پڑی۔

"اور بھی تو عورتیں ہیں، ضرورت کے لیے سب نکلتی ہیں۔ بس اپنا آپ ٹھیک رکھو۔ کسی سے کیا لینا دینا۔" میاں جی نے نظر جھکا کر آہستہ آہستہ کہا۔

"میاں جی! آپ بہت بدل گئے ہیں۔" سکینہ حیرانی سے کہنے لگی۔

"بس بیٹی... انسان کی حیثیت ہی کیا ہے۔ ہر وقت زمانے کی زد میں رہتا ہے۔ اسے بدلنا پڑتا ہے، بدلنا چاہیے۔ تم بات کو سمجھ تو سکتی ہو، مگر سمجھنا چاہتی نہیں ہو۔"

سکینہ خاموش ہو گئی۔ میاں جی اُٹھ کر پچھلے برآمدے میں جانے لگے تو سکینہ نے آواز دی۔

"میاں جی! آج مسجد نہ جائیں۔ آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں بیٹے! کچھ نہیں ہوتا۔"

"دیکھیں میاں جی! خود آپ تو اللہ کے سامنے کسی اور کی کوئی بات سُنتے ہی نہیں۔ اور مجھے کہتے ہیں۔" سکینہ مُسکرا کر بولی۔

میاں جی پلٹ کر اُسے دیکھنے لگے۔ پھر لوٹ آئے۔ اور اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"اچھا بیٹی، نہیں جاتا۔ طبیعت تو میری خراب ہے۔ مگر میں تیرے کہنے کے واسطے رُک رہا ہوں۔ شاید تو بھی میرا یہ قرض کبھی لوٹا دے۔"

"آپ بہت ہوشیار ہیں میاں جی! شہر آکے آپ کو بھی دُنیاداری کی باتیں کرنا آگئیں۔" سکینہ نے ہنس کر نیچی آواز میں کہا۔ میاں جی نے نہیں سُنی۔ وہ جا چکے تھے۔

سکینہ اُٹھ کر بچوں کی پھیلائی ہوئی چیزیں سمیٹنے لگی۔ لڑکیوں کا کمرہ ٹھیک کیا پھر لاؤنج میں آگئی۔ خواہ مخواہ ہی ٹھیک جگہوں پر رکھی چیزوں کو

اُٹھا کر اِدھر اُدھر کیا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ ابھی تو اُن لوگوں کو گئے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ سورج غروب ہونے میں کچھ دیر تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اسی طرح جس طرح شیریں بیٹھتی تھی۔

اُسے شیریں بہت اچھی لگتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ تھی ہی اچھی۔ بہت خوب صورت تو نہ تھی مگر بنتی بہت تھی۔ کوشش اپنے آپ کو لئے دیئے رہتی۔ خوبصورت لباس پہنتی۔ بڑے اسٹائل سے بال بناتی۔ میک اپ کرتی ہوگی مگر اس طریقے سے کہ پتہ نہ چلتا۔ بس وہ خوبصورت لگتی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر دھیمے دھیمے لہجے میں باتیں کرتی تو آنکھوں میں روشنی سی بھر جاتی۔ عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہوتا۔ کسی بہ ساس کا بل.. چاہتا تو وہ تھوڑا سا وقت سکینہ کو بھی دیا کرے۔ سکینہ کبھی خود سے جا کر اس کے پاس بیٹھ جاتی تو اُسے بچیوں کو پڑھانے کا سلسلہ روک دینا پڑتا۔

مگر سکینہ اب ایسا نہ چاہتی تھی۔ شیریں کے پڑھانے سکھانے کی وجہ سے اُن بچیوں میں نمایاں فرق محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ انہیں... انگریزی بولنا سکھا رہی تھی۔ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا۔ غرض ہر چیز اور ہر کام پر وہ توجہ دیتی تھی تو پھر سکینہ کو اُن کا وقت ضائع کرنے کا کیا حق تھا۔

شیریں آنے کے بعد سکینہ کو عبدالکریم کا فقط ایک ہی کام تو پسند آیا تھا کہ اس نے بچیوں کی خاطر شیریں کو ملازم رکھا تھا۔ اسے بچیوں کا کتنا خیال تھا۔ اور جس دن اس نے کہا تھا کہ کیا وہ پسند کرے گی کہ اُن کی کہانی دہرائی جائے۔ اور بچیاں اپنی زندگی میں ناکامی کا منہ دیکھیں تو بس اسی روز سے سکینہ نے اپنے دل و دماغ میں اُٹھنے والے اندیشوں کو دبا دیا تھا۔ ہر حالت میں وہ اپنی بیٹیوں کی بہتری چاہتی تھی۔ اُن کا سکھ، اُن کا اچھا مستقبل اُسے بہت عزیز تھا۔

بیٹیوں کی خاطر تو اس نے شیریں کو بھی برداشت کیا تھا۔ اور پھر جب برداشت کر ہی لیا تھا تو وہ اُسے اچھی لگنے لگی تھی۔ اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ شیریں کی دوست بن جائے۔ اُسے اپنے دل کے سارے زخم دکھا دے۔ اُسے بتائے کہ وہ لوگ کیا تھا، کیا بن گئے، اور اب سکینہ کو بھی عبدالکریم کیا بنانا چاہتا ہے؟

وہ شیریں سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں... اپنے معاملے میں۔ اُسے کیا کرنا چاہیے؟ کس راستے پر چلنا چاہیے۔ وہ تھک گئی ہے۔ تنہا چلتے چلتے۔ تنہا رہتے رہتے اُکتا گئی ہے۔ اس کا کوئی بھی تو نہیں ہے۔ نہ یہاں اور نہ وہاں گاؤں میں۔ کچھ اپنوں کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا اور کچھ اپنے اُسے چھوڑ گئے ہیں۔ وہ کیا کرے؟ وہ شیریں سے یہ ساری باتیں پوچھنا چاہتی تھی۔ اُسے ہمراز بنانا چاہتی تھی کہ وہ ٹھنڈی میٹھی باتیں کرنے والی لڑکی جانے اُسے کیوں اعتماد کے قابل نظر آتی تھی۔ اپنی اپنی سی لگتی تھی۔ اِسی لیے وہ اُسے مزید اپنے قریب کرنا چاہتی تھی۔

ایک دم ہی اس کی نظر ٹی۔وی پر جا پڑی۔ اُس نے کبھی آج تک اپنے لئے ٹی۔وی نہ لگایا تھا۔ وہ اِن چیزوں کو اچھا نہ سمجھتی تھی۔ مگر ابھی ابھی اُسے ایک دم ہی خیال آگیا کہ اس کے گھر والے جب بیٹھ کر کوئی پروگرام دیکھتے ہیں تو کتنا خوش ہوتے ہیں سب۔ ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوشی میں شریک ہو جاتے ہیں اُس وقت۔ مگر وہ اُن لمحوں میں بھی اُن میں نہیں ہوتی۔ اگر کبھی ہوتی ہے تو اپنے دھیان میں مگن کسی کام میں مصروف رہتی ہے۔ اور کبھی کبھی نظر اُٹھا کر ٹی۔وی پر ڈال لیتی ہے۔ جب وہ سب آپس میں اُس پروگرام کے متعلق باتیں کر رہے ہوتے ہیں تو اُسے کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ ہر بات کرنے والے کی صرف شکل دیکھ کر رہ جاتی ہے۔ کوئی اس سے بات نہیں کرتا۔ سب جانتے ہیں کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا، کچھ نہیں سُنا۔ وہ اُن میں شامل ہی نہیں ہے۔

یہی تو دُکھ کی بات ہے کہ وہ اُن میں سے ہو کر بھی اُن میں شامل نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ قطعی نہیں ہونا چاہیے۔ مگر ایسا ہوتا رہتا ہے۔

سکینہ نے اُٹھ کر ٹی۔وی لگا دیا۔ یہ وقت بچوں کے پروگراموں کا تھا۔ اور کارٹون فلم ہی چل رہی تھی۔ سکینہ غور سے دیکھنے لگی۔ اُسے گو سمجھ نہ آ رہی تھی۔ مگر اتنا تو کوئی بچہ بھی سمجھ سکتا تھا۔ اور پھر وہ غور سے فلم دیکھنے لگی۔ اُسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ہنسی بھی آ رہی تھی۔ وہ مُسکرانے لگی۔ کبھی کبھی ہنس بھی پڑتی۔ اکیلی ہی، تنہا ہی۔ فلم ختم ہو گئی۔ اس نے سوچا۔ ایسے پروگرام تو وہ بھی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھ ہی سکتی ہے۔ جب بچے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں تو ماں باپ کے کاموں میں کوئی دلچسپی انہیں نہیں ہوتی مگر اُن کے کہنے پر وہ اس میں دلچسپی پیدا کر لیتے ہیں۔ اُن کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگتے ہیں پھر وہ بڑے ہو جاتے ہیں تو اسی سلوک کی ماں باپ سے توقع کرتے ہیں۔ تب ماں باپ کو بھی اُن کا ساتھ دینا چاہیے۔ اُن کے کاموں میں اُن کے مشاغل میں دلچسپی لینی چاہیے۔ پھر اِس میں تو کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ شاید اسی صورت میں وہ اُن سے قریب ہو جائے۔ اُن میں شامل ہو جائے۔ شاید اِسی طرح وہ اپنی کھوئی ہوئی مسرتیں حاصل کر لے۔

سکینہ دُعا مانگنے لگی۔ الٰہی میری کھوئی ہوئی خوشیاں مجھے لوٹا دے۔ میں تنہائی کا دُکھ برداشت نہیں کر سکتی۔ تنہا تو بس تُو ہی رہ سکتا ہے۔ الٰہی

مجھے ہمت دے کہ میں اپنے اور بچوں کے راستوں کے درمیان تیسرا راستہ بنا سکوں۔ جن پر ہم سب مل کر چلیں۔

اذان کی آواز کے ساتھ ہی سکینہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ٹی۔ وی کو بند نہیں کیا بلکہ آہستہ کر دیا۔ بچے لوٹنے والے تھے۔ انھیں گھر کے دروازے کے باہر ہی سے گھر کے اندر کی رونق کا احساس ہونا چاہیئے۔ اس خوشی، اس تبدیلی کا اُن پر یقیناً خوشگوار اثر ہوگا۔ اس نے ملازم کو چائے کے ساتھ کچھ بنانے کو کہا۔ اور نماز کے لیے چل دی۔

●●

خوشی تھی کہ کریم صاحب کی آنکھوں سے شروع ہوئی تو ہونٹوں پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ انھوں نے مس شیریں سے درخواست کی تھی کہ وہ اُن کے ساتھ بچیوں کے لیے شاپنگ کرنے چلیں۔ اور شیریں نے بڑی خوشی سے مان بھی لیا تھا۔

کریم صاحب بچیوں کو لے کر ہی مس شیریں کے گھر پہنچے تھے۔ اتنی عقل تو اُن میں بھی تھی کہ اکیلے اُسے لینے نہ جا سکتے تھے۔ پہلی بار انھوں نے شیریں کا وہ چھوٹا سا دو کمروں کا فلیٹ دیکھا تھا۔ جہاں وہ اپنی ماں بھائی اور دو چھوٹی بہنوں کے ساتھ رہتی تھی۔ کار کے ہارن کی آواز پر شیریں خود ہی باہر آ گئی۔ اور بڑے اصرار سے انھیں اندر لے گئی۔ وہ اپنی امی کے ساتھ اُن سب کا تعارف کرانا چاہتی تھی۔ کریم صاحب بچیوں سمیت اندر چلے گئے۔

چھوٹے چھوٹے دو کمرے مناسب سامان کے ساتھ بڑے قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ کریم صاحب نے تنقیدی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تو انھیں اپنے گاؤں والے گھر کی یاد آ گئی۔ وہ بھی اسی طرح کم سامان کے ساتھ صاف ستھرا سا گھر والوں کے سلیقے اور سفید پوشی کا بڑا خوبصورت نمونہ ہوا کرتا تھا۔ جہاں پر سکینہ اپنے آپ کو اس گھر کی رانی تصور کیا کرتی تھی۔

کریم صاحب کے دل کو تکلیف سی محسوس ہوئی۔ بعض یادیں خوشگوار ہونے کے باوجود کتنی تلخ ہوتی ہیں۔ وہ سکھ، وہ محبت اب اُن کے پاس نہیں تھی۔ جب ایسے ہی ایک گھر میں وہ آیا کرتے تھے تو سکینہ کھل اٹھتی۔ اُن کے جوتوں کے تسمے تک کھولنے کو تیار ہوتی۔ ایک ایک چیز، ایک ایک بات کا یوں دھیان رکھتی۔ جیسے وہ نازک سے کانچ کے بنے ہوں، کسی ٹھیس، کسی تکلیف سے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہو۔ وہ تو وہی تھے۔ اسی طرح تھے۔ پر سکینہ وہ نہ رہی تھی۔ وہ سکھ، وہ محبتیں بھی کہیں کھو گئی تھیں۔

"میری امی سے ملئے...!" شیریں کی آواز پر کریم صاحب نے چونک کر دیکھا۔ سامنے کھڑکی کے آگے چھوٹے سے تخت پر اس کی امی بیٹھی تھیں۔ صاف ستھری سی، نکھری ستھری، محبت اور شفقت کے تمام جذبوں سے بھری آنکھیں کریم صاحب پر گاڑے وہ انھیں دیکھ رہی تھیں۔

"آیئے کریم صاحب...! بیٹھیے۔"

کریم صاحب سلام کرتے ہوئے جلدی سے اُن کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ شیریں کی امی دونوں بچیوں کو پاس بلا کر پیار کرنے لگیں۔

"شیریں ان کی بہت تعریف کرتی ہے۔ اور ان ہی کی کیا وہ تو آپ سب کی بہت تعریف کرتی رہتی ہے۔"

"یہ خود بہت اچھی ہیں۔ اچھے لوگ سب کو اچھا ہی سمجھتے ہیں۔" کریم صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"اُسے خاص طور پر آپ کے میاں جی بہت پسند ہیں۔ کہتی ہے کہ آپ کے گھر میں انسان کے روپ میں ایک فرشتہ موجود ہے۔ اُن کی بہت برکت ہے۔"

"جی جی...!" کریم صاحب مسکرا دیئے۔

شیریں کی دونوں بہنوں نے باری باری آ کر سلام کیا۔ اور میز پر چائے لگانے لگیں۔

"ارے چائے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو دفتر میں سارا دن چائے ہی پیتا رہتا ہوں۔"

"مگر دفتر اور گھر کی چائے میں تو بڑا فرق ہوتا ہے۔" شیریں کی امی نے مسکرا کر کہا۔

"وہ تو جی ٹھیک ہے۔ مگر بدقسمتی سے صرف ایک ہی ہوتا ہے۔"

"بی بی...! یہ تو دوپہر کے کھانے کی جگہ چائے ہی پیتے رہتے ہیں۔" شیریں نے مسکرا کر کہا۔

"ایسا نہ کیا کریں۔ ابھی تو آپ نوجوان ہیں، پتہ نہیں چلتا۔ ذرا سی عمر ڈھلنے پر ان چیزوں کا نقصان ظاہر ہونے لگتا ہے۔" اس کی امی نے متانت سے کہا۔

"کئی بار ارادہ کیا کہ گھر جا کے کھانا کھایا کروں بس کام کی مصروفیت میں نکلنا ہی نہیں ہوتا اور دفتر میں اکیلے کھانا کھانا میرے لئے ناممکن ہے۔"

"بیگم کے ساتھ کھانے کی عادت ہوگی نا؟" شیریں کی امی نے مسکرا کر پوچھا تو کریم صاحب ایک دم گڑبڑا کر رہ گئے۔

"جی نہیں، جی ہاں... بس کچھ ایسا ہی ہے؟"

"اچھا ہے بہت اچھا ہے۔ ایسی باتوں سے گھر کا سکون چین قائم رہتا ہے۔ مگر دوپہر کے کھانے کی ضرور کوئی نہ کوئی صورت نکال لیجئے۔" شیریں کی امی نے کبابوں کی پلیٹ کریم صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"مگر... آپ تو پوچھنے ہی نہیں دے رہیں نا۔ مجھے پتہ ہے آپ کو بھوک لگی ہوئی ہے۔"

"اچھا... آپ یہ بھی جانتی ہیں۔" کریم صاحب نے ہنس کر اپنی پلیٹ میں دو کباب رکھ لئے۔

شیریں کی دونوں بہنیں بھی وہیں بیٹھ گئی تھیں۔ اور کریم صاحب ان سے اُن کی تعلیم وغیرہ کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ ایک ابھی میٹرک میں تھی اور دوسری ایف۔ ایس۔ سی کر رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں شرماتی شرمائی سی اُن کے سوالوں کے جواب دے رہی تھیں۔

"بیٹی! چائے بناؤ کریم صاحب کے لئے۔" شیریں کی امی نے کہا تو شیریں اُٹھ کر چائے بنانے لگی۔ اور کریم صاحب کو ایسے لگا جیسے اس چائے جیسی لذیذ چیز اُنھوں نے کبھی نہ پی تھی۔ گرم چائے کا ایک گھونٹ بھرتے ہی بولے۔

"چائے تو واقعی بہت اچھی ہے۔ کیا یہ کوئی خاص قسم کی چائے ہے؟"

"بالکل عام سی چائے ہے۔ بس جو کام بھی مل جل کر خوشی کی باتیں کر کے کیا جائے۔ وہ ہی اچھا لگتا ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ گھر کی چائے کے ساتھ دفتر کی چائے کا کیا مقابلہ۔" شیریں کی امی نے مسکرا کر شفقت بھرے انداز میں کہا۔

"بی بی... یہ تو اندر ہی نہ آ رہے تھے۔ میں نے سوچا آپ سب کی ملاقات بہت ضروری ہے۔" شیریں بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔

"ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ اندر آ گئے۔ دل تو میرا بھی بہت چاہتا تھا۔ مگر میں ٹھہری بیمار اور معذور۔" شیریں کی ماں نے قدرے افسردگی سے کہا۔ تو کریم صاحب نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔

"خیریت... کیا تکلیف ہے آپ کو؟"

"بس معذوری ہی سمجھئے۔ جوڑوں کے درد کی مریضہ ہوں۔ میری تو دُنیا ہی یہ دو کمرے ہیں اور میرے لئے تو یہ بھی بہت بڑے ہیں۔ چلنا پھرنا جو دشوار ہے۔"

"اوہ...!" کریم صاحب جو ابھی ابھی مسکرا رہے تھے۔ ان کی تکلیف دیکھ کر ایک دم بُجھ کر رہ گئے۔

"بی بی... پلیز آپ اس طرح اپنے کو معذور نہ کہا کریں۔" شیریں نے اپنی ماں کے گلے میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔

"معذوری تو ہے بیٹی! کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

کریم صاحب اُن کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ اُن کے چہرے پر ابھی تک سوگوار سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

کریم صاحب کے دل میں ایک دم اُن کی عزت دوچند ہوگئی۔ کتنے عظیم لوگ ہیں یہ۔ جانے کس طرح گزارا ہوتا ہے ان کا۔ مگر چہروں پر مسکراہٹ ہے۔ اخلاق بہترین ہیں۔ جدوجہد میں لگے ہیں۔ مگر شکایت کا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں۔ پھر آہستہ سے بولے

"اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کو بی بی کہہ لوں؟"

"ضرور جی... آپ ضرور کہئے۔ میں تو سب کے لئے بی بی ہوں۔ میری بہنیں اور بھائی بھی مجھے بی بی کہتے تھے۔ بچے بھی بی بی کہنے لگے۔ آپ کا دل چاہے تو آپ بھی کہئے۔ میرے لئے تو یہ محبت کا لفظ ہے۔ اپنائیت کا لفظ ہے۔ آپ کی اس سے زیادہ اور کیا عنایت ہوگی کہ آپ مجھے کسی رشتے سے بلائیں۔" شیریں کی امی آبدیدہ سی ہوگئی تھیں۔ مسکرا بھی رہی تھیں اور مشکور بھی ہو رہی تھیں۔ باقی سب اُن دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

"تو بی بی... آپ کو جب کبھی کوئی ضرورت پڑے مجھے نہ بھولئے گا۔ کبھی بھی نہ بھولئے۔ اس طرح جس طرح آپ اپنے بہن بھائیوں یا بیٹے بیٹیوں کو نہیں بھولتیں۔ کبھی بھی تکلف نہ کیجئے گا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ اُن سب کے ساتھ میں بھی آپ کو بی بی کہتا ہوں۔ اور یہ محبت اور اپنائیت کا اظہار ہے۔"

"اللہ آپ کو سدا سکھی رکھے۔ زندگی کی ہر نعمت دے ہر خوشی دے۔ آمین۔" بی بی دُعائیں دینے لگیں۔

"میرا خیال ہے دیر ہو رہی ہے۔ دکانیں بند ہی نہ ہو جائیں۔" شیریں نے دخل در معقولات کیا۔ تو سب اپنے اپنے خیال سے چونک اُٹھے۔

"ہاں! ہمیں اب چلنا چاہیئے۔ اور بی بی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ دیر ہو گئی تو میں خود مس شیریں کو ساتھ آ کر چھوڑ جاؤں گا۔"

"اللہ حافظ ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔" شیریں کی امی نے نرمی سے کہا۔ کریم صاحب نے شیریں کی دونوں بہنوں کو بٹوے میں سے پانچ سو روپے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"میں ہمیشہ ایسی غلطی کر جاتا ہوں کہ اپنے ساتھ کچھ لانا بھول جاتا ہوں۔ اپنی پسند کی کوئی سی چیز لے لینا۔"

"سر۔۔۔! یہ بہت زیادتی ہے، بہت زیادہ ہیں یہ۔۔۔" شیریں نے جلدی سے کہا۔

"پلیز! مس شیریں آپ چپ رہیئے۔ یہ میری بہنوں اور بچیوں کی طرح ہیں۔ اس معاملے میں کوئی بھی نہ بولے۔"

"میں تو بول سکتی ہوں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔" شیریں کی امی نے مسکرا کر پوچھا۔

"اس معاملے میں تو آپ کو بھی نہیں بولنا چاہیئے۔ یوں آپ حکم کر سکتی ہیں۔" کریم صاحب نے آہستہ سے کہا۔ تو وہ چپ ہو گئیں۔ پھر وہ عائشہ اور طلعت کو لے کر خدا حافظ کہتے ہوئے باہر آ گئے۔

شیریں کو شہر کے سب سے مہنگے اور بڑے شاپنگ سینٹر میں جانے کا اتفاق تو ہوا تھا۔ مگر بس یونہی وہ اپنی ساتھی ٹیچر لڑکیوں کے ساتھ صرف دیکھنے ہی کو آیا کرتی تھی۔ ایک ایک دکان پر سجی چیزیں دیکھتیں۔ اور نئے نئے فیشنوں پر غور کرتیں۔ اور آگے نکل جاتیں۔ اچھی طرح جانتی تھیں کہ عام دکانوں سے دگنی نہیں تو ڈیڑھ گنا ضرور ہی زیادہ قیمتیں لگی ہوتی ہیں یہاں۔

لو اب وہ کریم صاحب کے ساتھ بڑی سی ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھ کر یہاں خریداری کرنے آئی تھی۔ خریداری کرنا بھی نشے کی طرح لطف دیتا ہے۔ جیب میں رقم ہو تو دکانوں پر جانا، چیزوں کو پسند کرنا اور خرید لینا۔ بڑا خوبصورت اور تسکین بخش کام ہے۔

اور شیریں کو تو یوں بھی یہ سب کچھ بہت پسند تھا۔ اس کا خواب تھا یہ سب۔ اپنے خوابوں کی تکمیل کے لئے تو وہ اتنی جدوجہد کر رہی تھی۔ اسکول میں ہی سروس کرتی۔ اور پھر اب پارٹ ٹائم بھی، وہ ہر حال میں اپنے رہنے سہنے کے اسٹینڈرڈ کو اونچا کرنا چاہتی تھی۔ شاید کوئی دن اس کی زندگی۔۔ میں ایسا آ ہی جائے۔ جب وہ لوگ بھی بڑے لوگوں کی صف میں شمار ہونے لگیں۔

کریم صاحب نے دروازہ کھول کر اُسے باہر نکلنے کو کہا۔ دونوں بچیاں اندر بیٹھی رہیں۔ تو شیریں نے جلدی سے پوچھا۔

عائشہ، طلعت کیا ہمارے ساتھ نہیں جائیں گی؟

"میرا خیال تھا ایک چکر لگا لیں۔ مطلوبہ چیزیں مل گئیں تو پھر ان کو بلا کر ان کی پسند پوچھ لیں گے۔"

سر۔۔۔! اگر ساتھ چلیں تو بہتر نہیں ہے۔ کم از کم دکانوں پر کھڑے ہوتے، آتے جاتے چیزوں کی خرید و فروخت سے کچھ تو واقف ہوں۔" شیریں نے کہا تو کریم صاحب نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شیریں اُن کے ساتھ چلتے ہوئے گھبرا رہی ہو۔ پھر انہیں ایک دم سکینہ یاد آ گئی! وہ اُن کے ساتھ کہیں آئی تھی۔ مگر کس طرح، کس حالت میں۔۔۔؟ صرف اتنا سوچتے ہی اُن کو پسینہ آ گیا۔ شیریں اُنہیں خاموش دیکھ کر جلدی سے بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے، ہم پہلے دیکھ لیتے ہیں۔ پھر ان کو لے جائیں گے۔" اُس کا خیال تھا کہ کریم صاحب بچیوں کو بہت زیادہ پھرانا نہیں چاہتے۔ بعض مردوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ زیادہ نکلنا پسند نہیں کرتے۔ اور کوئی بات اگر کریم صاحب کو پسند نہ ہو۔ وہ شیریں کو بھی پسند نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے اُس نے خود ہی جھک کر عائشہ طلعت کو بتایا اور کریم صاحب کے ساتھ چل پڑی۔

کریم صاحب کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ شیریں کتنی عقلمند ہے۔ ذہین اور سمجھدار۔ دل کی بات کو زبان پر آنے سے پہلے چہرے پر سے ہی جان لیتی ہے۔ ایسے جیون ساتھی کے ساتھ زندگی گزارنا کتنا سہل ہوتا ہوگا۔ کاش! سکینہ بھی ایسی ہی سمجھدار ہوتی۔ اور پھر۔۔۔ پھر یہ شیریں ہے جو۔۔۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے والا کتنا خوش نصیب ہوگا!

شیریں بڑے مزے سے دکانوں میں جھانکتی پھر رہی تھی۔ آگے آگے وہ اور اُس کے پیچھے کریم صاحب! وہ دکان میں داخل ہوتی، مختلف کاؤنٹرز پر جاتی۔ چیزیں دیکھتی اور آگے چل دیتی۔ پیچھے ہی پیچھے کریم صاحب بھی اُس کی تقلید میں وہی کچھ کرتے۔

شیریں اتنے بڑے اسٹینڈرڈ کی دکانوں میں پھرنے کا لطف لے رہی تھی۔ جانتی تھی کہ اُس کی خریداری کے لئے وافر رقم موجود ہے۔ ذرا سا اشارہ کرے گی۔ اور مطلوبہ چیز پیک کر دی جائے گی۔ نہ کوئی بھاؤ بنانا پڑے گا۔ نہ زیادہ قیمت لگ جانے کا اندیشہ ہوگا۔ اور یہ اعتماد کتنا سکون بخش ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ تو اس وقت صرف شیریں ہی لگا سکتی تھی۔ اس لئے وہ چاہتی تھی کہ اچھی چیز خریدے۔ اپنی دی جانے والی رقم کے بدلے میں ایسی چیز ملے کہ دل تو خوش ہو۔

کریم صاحب اس کے ساتھ پھرنے میں ہی عجیب سے لطف و سرشاری میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انھوں نے سکینہ کے ساتھ ایک بار شاپنگ کرنے کے بعد دل سے اس خواہش کو نکال دیا تھا کہ وہ بھی کسی خوبصورت، باوقار خاتون کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے بازاروں میں، سڑکوں میں یا شاپنگ سینٹروں میں کبھی پھر بھی سکتے ہیں۔ کبھی مل کر زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز بھی ہو سکتے ہیں۔ اور آج اچانک ہی انھیں بڑے بھرپور طریقے سے یہ نعمت حاصل ہو گئی تھی۔ بچیوں کی چیزیں لینے سے پہلے ان کا دل اپنی چیزوں کے لئے مچل اٹھا تھا۔ ایک جگہ خوبصورت ملبوسات دیکھ کر وہ رک گئے تو شیریں نے آہستہ سے کہا۔

"یہاں بچوں کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"جانتا ہوں۔ مگر ہمارے کام کی چیزیں تو ہیں۔ اگر لینے کی اجازت ہو تو لے لوں۔" کریم صاحب نے شرارت سے کہا تو شیریں جھینپ گئی۔

"ضرور لیں سر... بلکہ آپ بتائیں میں آپ کی مدد کروں گی۔"

"پہلی بات تو یہ کہ یہاں کھڑے ہو کر مجھے سر نہ کہیں تو اچھا ہے۔ تماشا بن جاؤں گا۔" کریم صاحب نے جھک کر شیریں کے کان میں کہا تو وہ ایک دم سرخ ہو گئی۔

"سوری... اچھا لینا کیا ہے؟"

"یہ بھی آپ کو ہی فیصلہ کرنا ہے کہ کیا لینا ہے جو چیز سب سے خوبصورت آپ کو لگے۔ وہ پیک کرالیں۔" کریم صاحب نے بے نیازی سے کہتے ہوئے چاروں طرف نظر ڈالی تو شیریں حیرت سے انھیں دیکھنے لگی۔ انسان کے پاس پیسہ ہو تو اسی طرح ہو۔ تاکہ زندگی کا مزا بھی آئے۔

سیلز مین ان کے قریب آ کر سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"سر کیا دکھاؤں...؟"

شیریں نے کئی چیزوں کے نام لے دیئے۔ عوامی سوٹ، سوئیٹر، جرابیں، رومال اور نہ جانے کیا کیا۔ اور ایک کی بجائے دو تین سیلز مین ان کی خدمت کو بڑھے۔ ایسے اچھے گاہک کم ہی ہوتے ہیں جو صرف خریداری کے لئے آتے ہیں، ضرورت کے لئے خریداری نہیں کرتے۔ اور سیلز مین سے زیادہ گاہک کو اور کون جانتا ہے۔

کریم صاحب اور شیریں بڑی دلچسپی سے خرید و فروخت کر رہے تھے۔ شیریں نے ان کے لئے جدید ترین اسٹائل کے کئی سوٹ خرید ڈالے تھے۔ اور اب وہ بڑے انہماک سے ان کے ساتھ میچ کر کر کے جرابیں رومال اور دوسری چیزیں خرید رہی تھی۔ وہ تو صرف اسے خریدتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ کتنی توجہ سے ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھتی چیک کرتی پھر پیک کرنے کو کہتی۔

یونہی ادھر ادھر دیکھتے ان کی نظر خوبصورت شالوں پر جا پڑی۔ ایک دم ہی ان کا دل چاہا کہ وہ شالیں بھی خریدیں۔ مگر کس کے لئے؟ دل کے کسی چور گوشے سے آواز اٹھی۔

"ظاہر ہے کہ سکینہ کے لئے ہی خریدی جا سکتی ہے۔" دماغ نے مشورہ دیا۔ مگر دل تو اس پر آمادہ نہ ہو پا رہا تھا۔ وہ ان کی بیوی تھی۔ جیون ساتھی بھی ان کے بچوں کی ماں تھی۔ پھر بھی پھر بھی ایک خاموش معاہدہ فریقین کے درمیان ہمیشہ رہا کرتا ہے۔ اچھی گزر بسر کے لئے اتنا سب کچھ بھی کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک الگ تعلق کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک انڈر اسٹینڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں میاں بیوی ایک دوسرے کی ضرورت بنتے ہیں۔ دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ چاہتے ہیں اور ایک دوسرے میں رچ بس جاتے ہیں پھر وہ الگ نہیں ہوتے۔ علیحدہ رہ نہیں سکتے۔ سب کچھ ایک ہے۔ اس وقت تک کے لئے کہ حکم الٰہی ان میں سے کسی کو الگ کر دے۔ اور کریم صاحب کو تو زندگی بھر وہ انڈر اسٹینڈنگ میسر ہی نہ آئی تھی۔ جس کے بعد وہ سکینہ کے ساتھ ایک ہو سکتے۔ رچ بس سکتے۔ پھر وہ دل سے کس طرح ایک ایسے فرد کے لئے کوئی چیز خریدیں جو بے ساختہ پسند آئی ہو۔ وہ چیز تو ایسے فرد کو دی جاتی ہے۔ جسے بے ساختہ پسند کر لیا گیا ہو۔ ______ اسی طرح ایک بار انھوں نے ٹینا کے لئے فر کوٹ خریدا تھا۔ اور بہت سی چیزیں تھیں۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ ٹینا کے لئے کچھ خریدیں۔ اس کو کچھ تو ایسی چیز دیں کہ وہ بھی عرصہ تک انھیں یاد رکھے۔ مگر رضی صاحب کو یہ بات پسند نہ آئی تھی۔ پھر اس کے بعد انجام بھی کچھ اچھا نہ ہوا تھا۔ کریم صاحب اپنی سوچوں سے کھو گئے۔ اسی لمحے شیریں ان کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولی۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ کچھ غلط چیز تو نہیں خرید لی میں نے؟"

"غلط تو کچھ نہیں خریدا گیا۔ کمی ضرور رہ گئی ہے۔" کریم صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"آپ بتادیں، وہ بھی لے لیتے ہیں۔" شیریں نے اُن کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ کریم صاحب نے سیلزمین کو اشارہ کیا تو اُس نے اُن کے سامنے بہترین شالوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ شیریں چکرا کر رہ گئی۔

کس کو پسند کرے۔ اور کس کو ناپسند یہاں تو ایک سے ایک نفیس اور اعلیٰ کوالٹی کی شال تھی، وہ جانتی تھی کہ یہ شالیں وہ سکینہ کے لئے خریدنا چاہتا ہے۔ مگر وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ سکینہ اور ان گرم چادروں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ سوائے اِس کے کہ وہ ایک بہت امیر آدمی کی بیوی ہے اور امیر لوگوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ دُنیا کی ہر چیز، ہر لباس پہن سکتے ہیں۔ چاہے وہ اُن کو جچے یا نہ جچے۔ ایک بار شیریں کا دل چاہا کہ وہ سکینہ کی مناسبت سے کوئی سی چادر پسند کر دے۔ مگر آگے ہی لمحے اُس نے اپنے دل کی بات کی خود ہی تردید کر دی۔

دوسروں کے لئے چیز پسند کرتے ہوئے بھی اپنی پسند کو مدِنظر رکھنا چاہیئے اور یہاں تو پیسہ بھی اُن ہی کا ہے۔ کیوں نہ وہ بہترین چیز کا انتخاب کرے۔

پھر اُس نے یہ سب سوچ کر اُن تمام شالوں میں سے بہترین شالوں کا انتخاب کر لیا۔ کریم صاحب مسکرا دیئے۔

"کمال ہے! اُن ہی پر میری بھی نظر تھی۔ مگر میں آپ کی پسند جاننا چاہتا تھا۔" شیریں کچھ نہ بولی۔ بس مسکرا کر رہ گئی اور کریم صاحب نے تینوں چادریں پیک کرنے کو کہا۔

"یہ تینوں چادریں ایک ہی قسم کی ہیں۔ الگ الگ قسموں اور رنگوں کی لیں۔" ناں شیریں نے تینوں ان کو دکھایا۔

"وہ پھر لے لیں گے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آئندہ خریداری کے لئے بھی تو کچھ چیزیں رہ لیں۔ سب چیزوں کی شاپنگ کر لیتے ہیں۔" کریم صاحب مسکرانے لگے۔ شیریں نے انکھیوں سے دیکھا۔ کتنا امیر آدمی تھا۔ اُس کا دل مسوس کر رہ گیا۔

کچھ لوگ کھڑے کھڑے اتنی شاپنگ کر لیتے ہیں۔ بغیر ضرورت کے محض تسکینِ طبع کے لئے ہی۔ اور کچھ ضروریاتِ زندگی کو ترستے رہ جاتے ہیں۔

کریم صاحب نے تمام سامان گاڑی میں رکھوایا اور بیٹیوں کو لے کر آ گئے۔ شیریں اُن کے لباس خریدنے میں اتنی ہی دلچسپی لے رہی تھی جتنی اِس سے پہلے کریم صاحب کے لئے لے رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ بچیوں کے لئے اپنی ہی طرح کے ملبوسات خریدے جائیں۔ زیادہ نہیں، تو کم از کم دو ہی۔ مگر شیریں نے اُنہیں روک دیا۔

"ایسے لباس میں بچیاں ہرگز خوش نہ ہو سکیں گی۔ ذرا سی بڑی ہو جائیں تو اپنی مرضی اور خواہش سے پہنیں گی۔ ہم اُس لباس سے بہتر لباس خریدیں گے۔ آپ دیکھتے تو جائیں۔"

اور پھر شیریں نے شرقی طرز کے بہترین ملبوسات کا ڈھیر لگوا لیا۔ عائشہ، طلعت یوں خوش تھیں گویا دُنیا جہان کی نعمتیں اُن کے سامنے ہوں۔ سب ہی پیارے پیارے ملبوسات، کُرتے، شلواریں، پاجامے، جیکٹیں، نئے نئے فیشنوں کے کپڑے۔ خود کریم صاحب بھی ایک ایک چیز کو پکڑ کر بہت تعریف کرتے۔ اُنہیں تو اب پتہ چل رہا تھا کہ عورتوں کے بھی اتنے خوبصورت لباس ہوتے ہیں۔ نہ کبھی سکینہ نے کوئی فیشن کیا تھا۔ نہ فیشن ایبل بن پائی اور نہ ہی اُنہیں کچھ اندازہ تھا۔

وہ مسز رضی کو دیکھ دیکھ کر ہی نثار ہوتے رہتے تھے۔ یہی سمجھتے تھے کہ لباس پہننے کا سلیقہ مسز رضی پر ختم ہے۔ صرف وہ ہی جانتی ہیں کہ کیسے اپنے آپ کو خوبصورت بنایا جا سکتا ہے۔ یہاں آ کے اُنہیں معلوم ہو رہا تھا کہ بہت سی عورتیں اِس فن سے واقف ہوتی ہیں لیکن اُن کے پاس خوبصورت آنکھ نہیں ہوتی۔ وہ یہ سب کچھ نہیں جانتی تھی اور اِسی وجہ سے وہ بھی اِن سب باتوں سے ناواقف تھے۔

شیریں، عائشہ طلعت سے پوچھ پوچھ کر اُن کی پسند کی چیزیں خریدتی جا رہی تھی۔ نہ صرف کپڑے بلکہ اور ایسی تمام اشیاء جو اس عمر کی لڑکیاں شوق سے پہنتی ہیں۔

کریم صاحب بل ادا کرتے رہے۔ شیریں اُن کے پاس کھڑی رہی۔ اور بچیاں اپنی اپنی چیزیں سمیٹ کر خود ہی گاڑی کی طرف چل گئیں۔ وہ خوش تھیں۔ ایسے ہی جس طرح اُن کو دُنیا جہان کی انوکھی نعمتیں مل گئی ہوں۔ اور اُنہیں اِس طرح خوش دیکھ کر پہلی بار کریم صاحب کو اندازہ ہوا کہ خوشی والدین کو کیا دیتی ہے۔ بچیوں کی وجہ سے بننے والا بل گو خاصی بڑی رقم کا تھا۔ مگر کریم صاحب کو محسوس تک نہ ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے طلعت کے چہروں پر وہ خوشی آج دیکھ لی تھی۔ جو اِس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔

وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ ساری مسرتیں اُنہیں دینے میں سکینہ ناکام رہی تھی۔ باوجود اُن کی ماں ہونے کے اِس بات سے ناآشنا تھی کہ بچوں کی خوشی

کیسے حاصل کی جاتی ہے۔ یہ نہیں سوچتے تھے کہ اگر سکینہ انھیں یہ خوشی نہ دے سکی تو انھوں نے بھی کب ایسی کوئی کوشش کی تھی کہ بچوں کی خوشی کو حاصل کرنا چاہا تھا۔ کب بچوں کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔

اور آج بھی... آج بھی وہ بچوں کی ضرورت کے لئے نہ آئے تھے۔ وہ تو اپنے اندر کی کسی طلب کے تحت یہ سب کچھ کر رہے تھے ... ——— اپنے اندر کو تسکین دے رہے تھے۔ شیریں کے ساتھ گھوم پھر کر، شاپنگ کرنے میں انھوں نے لطف حاصل کیا تھا۔ اور یہ موقعہ بھی اُن کے بچوں نے انھیں فراہم کیا تھا۔ اب بھی جتنی خوشی انھوں نے بچوں کو دی تھی۔ اس سے زیادہ خوشی اور تسکین پہنچانے کا باعث تو اُن کے لئے خود بچے بن گئے تھے۔ مگر جب انسان صرف اپنے اندر کی باتیں سنتا ہے۔ اپنے اندر کی ضرورتیں ہی سمجھتا ہے تو پھر کسی دوسرے کی بات، کسی دوسرے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

"اب کدھر چلنا ہے؟" کریم صاحب نے گاڑی کے پاس کھڑے ہو کر سوال طلب نظروں سے شیریں کو دیکھ کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب گھر ہی چلنا چاہیئے۔" شیریں نے دبے سے لہجے میں کہا۔

"اوہ... نہیں، اتنا وقت کہاں ہوا ہے۔ مجھے تو پتہ ہی نہ چلا۔" کریم صاحب نے چونک کر گھڑی دیکھی۔

"دکانیں بند ہو چلیں۔" شیریں نے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔

"میرا خیال ہے آج کچھ جلدی بند ہو رہی ہیں؟" کریم صاحب قدرے حیرت اور بے چارگی سے بولے۔

"بالکل وقت پر بند ہو رہی ہیں۔ کیا کچھ لینا باقی رہ گیا ہے؟" شیریں زیر لب مسکراتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"میرا ارادہ بچوں کو ہیئر ڈریسر کے پاس لے کر جانے کا تھا۔" کریم صاحب بھی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولے۔

"اس کے لئے تو آج وقت بہت کم ہے۔ یوں بھی بیگم صاحبہ سے پوچھنا ضروری ہے۔ غالباً وہ کٹے ہوئے بال پسند نہیں کرتیں۔" شیریں نے دبے سے لہجے میں کہا۔

"وہ تو سب کچھ بھی پسند نہیں کرتیں۔" کریم صاحب نے قدرے کڑوے لہجے میں کہا۔

"پھر بھی یہ کپڑے پہنائیں یا نہ پہنائیں اُن کی پسند پر منحصر ہے نا، مگر بال ایک دفعہ کٹ جائیں تو پھر..." شیریں نے آہستہ سے کہا تو عائشہ جلدی سے بولی۔

"بس میڈم، امی کہتی ہیں۔ اچھی بچیاں بال نہیں کٹواتیں۔"

"مجھے تو ایسے بال اچھے لگتے ہیں جیسے مس کے ہیں۔" طلعت نے جلدی سے شیریں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ طلعت بالکل اپنے مطلب ہی کی ہے۔" کریم صاحب نے زیر لب مسکرا کر کہا تو شیریں جھینپ گئی۔

"آپ کو اور کیا کیا اچھا لگتا ہے؟" شیریں جھینپ مٹانے کی خاطر طلعت کی طرف مخاطب ہو گئی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر اُسے اپنی پسند کی وہ تمام چیزیں گنوا رہی تھی جو آج انھوں نے خریدی تھیں۔ عائشہ بھی اُس کی طرف دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی مگر اُس کی خوشی میں ہلکے ہلکے ڈر، خوف کا عنصر موجود تھا۔ یہ ساری باتیں اُسے اچھی بھی لگ رہی تھیں مگر ان سے وہ خائف بھی نظر آتی تھی۔ سکینہ کا رنگ عائشہ پر گہرا تھا۔ جبکہ طلعت ابھی چھوٹی تھی۔

گاڑی رکی تو شیریں نے چونک کر باہر دیکھا۔ وہ گھر کے سامنے تو نہ رکے تھے۔ وہ تو اب ایسے ہوٹل کے سامنے تھے۔ جس کے اندر جانے کا خواب شیریں نے سدا دیکھا تھا۔ مگر تعبیر ہنوز ادھوری تھی۔ حیرت اور مسرت سے اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

کریم صاحب گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑے تھے۔ شیریں جھجک کر جلدی سے اُتر آئی۔ لکنت زدہ لہجے میں آہستہ سے بولی۔

"اس جگہ تو ہمیں کوئی کام نہ تھا شاید۔"

"کام تو پیدا کئے جاتے ہیں۔ اور پھر اتنی محنت، اتنی سر دردی کے بعد ایک کپ کافی کا بھی نہ ملے تو کیا فائدہ؟"

"اوہ...!" شیریں صرف اسی قدر کہہ کر رہ گئی۔

کریم صاحب نے دونوں بیٹیوں کو بھی باہر آنے کو کہا۔ اور اُن تینوں کے آگے چل دیئے۔

اس جگہ پر شیریں کا بھی وہی حال تھا جو عائشہ، طلعت کا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شیریں جوان اور سمجھدار تھی۔ اپنی حیرت کو چھپانا جانتی تھی۔ اپنے آپ کو اسی طرح ظاہر کر رہی تھی۔ جیسے کہ اُس کے لئے یہ جگہ نئی نہیں ہے۔ اور بچیاں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اپنے ارد گرد کے ماحول سے

متاثر تھیں۔

بے آواز قدموں سے دبیز قالینوں پر چلتے ہوئے وہ ایک ٹیبل پر آن کر بیٹھ گئے۔ دبی دبی گہرے رنگوں کی روشنیاں ہال میں دور تک پھیلی ہوئی میزوں کو بالکل واضح نہ کر رہی تھیں۔ میزوں پر بیٹھے لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ کوئی پیالی یا چمچ بھی ہلاتا تو آواز آنے لگتی۔ ہلکی ہلکی موسیقی کی لہریں دیواروں سے نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔

عائشہ، طلعت ایک ایک چیز کو دیکھتیں اور اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکتیں۔ مگر کچھ پوچھ بھی نہیں رہی تھیں۔ اس لئے کہ انھوں نے زندگی بھر کبھی اپنے باپ سے ضرورت سے زیادہ باتیں ہی نہ کی تھیں۔ اُن کی ماں نے اُنھیں یہی بتایا تھا کہ بس اتنی ہی باتیں کرتے ہیں۔ جتنی ضرورت ہو۔ اور پھر باپ سے تو ایسی بھی نہیں کرتے۔ یوں بھی جن بچوں میں جتنا زیادہ اعتماد ہوتا ہے۔ اتنے زیادہ سوالات اُن کے ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ اور وہ کر بھی ڈالتے ہیں۔

یہ بچیاں تو بس ایک ایک چیز کو صرف دیکھ رہی تھیں۔ اپنے اردگرد پھرتے ہوئے خوش لباس ویٹر، میزوں پر بیٹھے آہستہ آواز میں باتیں کرتے ہوئے ماڈرن لوگ، دیواروں سے نکلنے والی خوبصورت موسیقی کی ہلکی ہلکی لہریں۔ سب کچھ ہی اُنھیں حیرت زدہ کرنے کو کافی تھا۔
اس پر جب ویٹر نے اُن دونوں کے سامنے آئس کریم لاکر رکھی تو طلعت تو واقعی اُچھل پڑی۔ لمبے لمبے خوبصورت گلاس اوپر تک آئس کریم سے بھرے ہوئے تھے۔

"ابّو! اتنی بہت سی آئس کریم...؟" طلعت نے چونک کر پوچھا تو کریم صاحب مسکرا دیئے۔ وہ بھی اِس ماحول کی مناسبت سے دبے دبے لہجے میں بول رہی تھی۔

"کھاؤ... اب میں تم لوگوں کو اکثر یہاں لایا کروں گا۔"

"سچ... پھر کب آئیں گے؟"

"بہت جلدی... آج تو ساری آئس کریم کھاؤ نا۔"

طلعت آئس کریم پر جھکی تو شیریں نے نیپکن اُٹھا کر اُس کے سامنے اچھی طرح ڈال دیا۔ پھر اُسے آئس کریم کھانے کا طریقہ بتانے لگی۔ عائشہ نے بھی غور سے دیکھ کر اُسی طرح کھانا شروع کر دیا۔ کریم صاحب نے اپنے اور شیریں کے لئے کافی منگوائی تھی۔ پھر وہ کافی پیتے ہوئے چپکے چپکے شیریں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ شیریں بھی بڑی دلچسپی لے رہی تھی۔ ہال کی سرگوشیوں میں اُن کا اضافہ ہو گیا تھا۔

اُنھیں گھر پہنچتے پہنچتے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ کریم صاحب آج رضی صاحب کے گھر نہ جا سکے تھے۔ ورنہ اُن کی محفل تو روزانہ وہیں جمتی تھی۔ وہیں پینے پلانے کا بندوبست بھی ہوا کرتا تھا۔ اور آج کریم صاحب کو یاد بھی نہ آیا تھا کہ انھوں نے کہیں جانا بھی ہے۔

اُن کی غیر موجودگی میں رضی صاحب کا دوبار فون آ چکا تھا۔ اور ہر بار ملازم نے یہی جواب دیا تھا کہ وہ ابھی تک نہیں آئے۔ سکینہ کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ اب اُسے بہت بُرے بُرے خیال آ رہے تھے۔ اور اُس نے اُن چاروں کی زندگی کی دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں۔ کریم صاحب اُس کے شوہر تھے۔ اُس کا سہاگ تھے۔ اُن کے حالات خراب تھے تو کیا ہوا۔ اُن کے دم سے ہی تو ساری خوشیاں تھیں۔ ساری زندگی تھی پھر بچیاں تھیں۔ اُس کے گھر کی رونق، اُس کی زندگی۔ وہ تصور میں بھی نہ لا سکتی تھی کہ اُنھیں کچھ ہو۔ اور پھر شیریں تھی۔ جس کے متعلق اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اُسے اپنی دوست۔ اپنی غمگسار بنائے گی۔ اُس کے ساتھ سارے دُکھ سُکھ بیان کر کے اُس سے پوچھے گی کہ وہ کیا کرے؟ کیا کرے کہ اُس کی زندگی میں خوشی داخل ہو سکے۔ کیا کرے کہ اُس کے دن اور راتیں آباد ہو جائیں۔ اُس کے گھر کی وہ رونقیں لوٹ آئیں۔ جو پتہ نہیں کہاں روٹھ کر چلی گئی ہیں۔

اب تو میاں جی بھی عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر گھر آ گئے تھے۔ اور باہر برآمدے سے ہی ملازم کو آوازیں دے رہے تھے۔ سکینہ بھاگ کر خود چلی گئی۔

"کیا بات ہے، میاں جی کیا بات ہے؟"

"یہ عبدالکریم ابھی نہیں آیا کیا...؟" میاں جی پریشانی سے پوچھ رہے تھے۔

"بس میاں جی آتے ہی ہوں گے۔ آپ اندر آ کے لیٹ جائیے...؟" سکینہ نے اُن کے ہاتھ سے چھڑی اور ٹوپی پکڑتے ہوئے کہا۔

"بچیاں بھی تو ساتھ گئی ہیں نا؟" میاں جی نے پوچھا۔

"جی میاں جی... ! پر فکر کی کوئی بات نہیں۔ آجائیں گے۔"
"آ تو جائیں گے ہی... !" میاں جی کسی سوچ میں ڈوب کر بولے۔
سکینہ نے میاں جی کو لان کی طرف جاتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔
"آپ کے آرام کا وقت ہے میاں جی! میں جو انتظار کر رہی ہوں۔"
"یہ بھی آرام ہی ہے۔ کرسی پر بیٹھوں گا۔ کونسی محنت کر رہا ہوں۔" میاں جی نے نیم تاریک حصے میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔
"میں بھی آپ کے پاس بیٹھتی ہوں۔"
"میری چھڑی اور ٹوپی اندر رکھ آؤ۔"
"جی اچھا... !" سکینہ دونوں چیزوں سمیت اندر چلی گئی۔
میاں جی نے اطمینان سے سامنے بچھی کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر رکھ لیں۔ اور آنکھیں موند کر گنگنانے لگے۔

کیسے دن تھے، کیسی راتیں، کیسی باتیں گھاتیں تھیں
کیا بالک ہے پہلے پیار کا سندر سپنا بھول گیا
کیا ہے تیرا، کیا ہے میرا، اپنا پرایا بھول گیا...

اور پھر کیا ہے تیرا، کیا ہے میرا۔ کی رٹ جانے کتنی دیر اور لگی رہتی کہ سامنے دیوار پر تیز روشنی پڑنے سے وہ چونک اٹھے۔ اور مڑ کر دیکھنے لگے۔ چوکیدار نے باہر کی تمام بتیاں جلا دی تھیں اور اب بھاگ کر گیٹ کھول رہا تھا۔
میاں جی نے ایک دم اطمینان اور سکون کی ٹھنڈی سی لہر اپنے اندر اترتی محسوس کی۔ اور زیر لب بڑبڑائے۔
"الٰہی تیرا شکر ہے۔"
وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آہستہ قدموں سے ان ہی کی طرف بڑھے۔ مگر ابھی ان سے کافی فاصلے پر ہی تھے کہ انھیں رک جانا پڑا۔
کریم صاحب، دروازہ کھولے شیریں کو باہر آنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ وہ اپنے کپڑے سمیٹتے ہوئے آہستہ سے باہر نکل آئی۔ اس کے ساتھ ہی عائشہ اور طلعت اپنی اپنی چیزیں سمیٹے اندر کو بھاگیں۔ کریم صاحب دھیمی آواز سے شیریں کو کچھ کہہ رہے تھے۔ اور وہ مسکرا کر جھینپے جھینپے لہجے میں انھیں جواب دے رہی تھی۔ کریم صاحب کی آنکھوں میں وہ جوت جل رہی تھی جو آج سے پہلے میاں جی نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس دن بھی نہیں جس دن وہ عبدالکریم کو بیاہنے جا رہے تھے۔ اور اس دن بھی نہیں جس دن عبدالکریم نے پہلی بار سکینہ کے ساتھ آن کر انھیں صبح کا سلام کیا تھا۔ اور انھوں نے زندگی بھر کے لئے انھیں ماں اور باپ بن کر دعائیں دے ڈالی تھیں۔
انھوں نے آنکھوں کو مسل ڈالا کہ وہ اس بڑھاپے میں انھیں فریب دے رہی تھیں۔ تب ہی اسی لمحے کریم صاحب نے اپنا ہاتھ شیریں کے کندھے پر رکھ کر کچھ کہا۔ تو وہ محجوب سی اندرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے پیچھے کریم صاحب بھی اندر کی طرف بڑھے۔ پھر رک گئے۔ شیریں بھی رک گئی تھی۔ دونوں کوئی بات کر رہے تھے۔
میاں جی کو ایسے لگا۔ جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے ہلکی ہلکی سی دھند چھاتی جا رہی ہے۔ عجیب سی سفیدی چاروں سو پھیل رہی ہے۔ انھوں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف بڑا عجیب بڑا خوبصورت اجالا پھیل گیا تھا۔ میاں جی نے مچاتی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند ستارے سب کچھ موجود تھا۔ پھر یہ گھٹن سی کیوں ہو رہی تھی۔
"اوہ خدایا! تیرا شکر ہے... کہ۔"
میاں جی شاید کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ شاید وہ اپنے بیٹے کو پکارنا ہی چاہ رہے تھے۔ پر ان کی آواز نہ نکل رہی تھی۔ انھوں نے گھبرا کر پھر دروازے کی طرف دیکھا۔
شیریں دروازے کے بیچ میں پہنچ چکی تھی۔ اور اس کا لہراتا ہوا دوپٹہ قوس قزح کے رنگوں جیسا خوشنما لگ رہا تھا۔ مگر اس کا ایک کنارا شاید زمین کو چھو رہا تھا جسے کریم صاحب نے جھک کر اٹھا لیا تھا۔ میاں جی کو لگا آسمان زمین پر جھک گیا ہے۔ جہاں قوس قزح کے رنگ ہیں۔ خوشبو ہے اور میاں جی زمین پر جھکتے چلے گئے۔

سکینہ نے تو صرف اِسی قدر دیکھا تھا کہ شیریں ہنستے مُسکراتے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اور اُس کے پیچھے عبدالکریم جو اُس کا شوہر تھا۔ ہاتھ میں شیریں کے دوپٹے کا پلو پکڑے ہوئے اندر آ رہا تھا۔ اِس سے زیادہ وہ نہ دیکھ سکی تھی اور نہ دیکھ سکتی تھی۔ اُس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا سا آنے لگا تھا۔ اُس نے سہارا لینے کو ہاتھ بڑھایا تو دروازے کا ہینڈل ہی اُس کے ہاتھ میں آ سکا۔ وہ کتنی دیر گم سم کھڑی تھی۔ پھر پتہ نہ چلا۔ بس عائشہ، طلعت کی آوازوں نے اُسے چونکایا۔ وہ ہاتھوں میں ڈھیروں پیکٹ تھامے اُس کے پاس کھڑی تھیں۔ خوشی کے مارے چہرے لال اور آواز دل میں لرزش تھی۔

"امّی! یہ دیکھئے۔ امّی یہ دیکھئے۔ میرا دوپٹہ، میرے کپڑے... میرا یہ، میرا وہ..." چہکے جا رہی تھیں۔

سکینہ کے کانوں میں تو فقط سائیں سائیں کرتے سناٹوں کی آوازیں تھیں۔ ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ، سنسناہٹ کا احساس تھا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش میں تھی۔ دل کو بہلاوے دینے کی سعی کر رہی تھی کہ اُس نے کچھ نہیں دیکھا۔ جو کچھ دیکھا فقط اتفاق تھا، بس اتفاق۔ وہ دونوں اِس طرح کے نہیں ہیں۔ اُسے دونوں پر اعتبار تھا۔ وہ اپنے اعتبار کو بچانا چاہ رہی تھی۔

"توبہ... امّی آپ تو کچھ دیکھ ہی نہیں رہیں۔ میں میاں جی کو دکھاؤں گی۔ کہاں ہیں میاں جی؟" طلعت نے چیخ کر کہا تو عائشہ بھی بولی۔

"میاں جی اپنے کمرے میں تو نہیں ہیں۔ میں تو انہیں دکھانے کے لئے گئی تھی؟"

"باہر ہوں گے..." طلعت اُچھل کر باہر کی طرف بھاگی۔

"امّی! کیا بات ہے؟" عائشہ نے ماں کی طرف دیکھ کر آہستہ سے پوچھا۔

"پانی، پانی۔" سکینہ فقط اتنا ہی کہہ سکی۔

ٹی۔ وی لاؤنج سے ٹی۔ وی چلنے کی آواز آنے لگی تھی۔ کریم صاحب نے سب سے پہلے آتے ہی ٹی۔ وی آن کیا تھا۔ شیریں بھی وہیں تھی۔

سکینہ کو ٹی۔ وی کی آواز بے حد بُری لگی۔ اُس کا دل چاہا وہ چیخ کر کہہ دے کہ بند کرو اس ٹی۔ وی کو۔ یہ اس کا گھر ہے۔ جو چیز اس کو پسند نہ ہوگی۔ اس کا اِس گھر میں کیا کام؟ مگر نہیں یہ سب کچھ وہ تو نہ کہہ سکتی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو اُس نے اِن سب باتوں کی خواہش کی تھی۔ پھر اِس گھر کی مالک وہ اکیلی تو نہیں ہے۔ وہ تو بس مسافر ہے، مالک تو نہیں لگتی۔ مالک تو ایسی ہوتی ہے۔ ایسی کہ...

اُسے عبدالکریم کا شیریں کے دوپٹے کے کونے کو پکڑنا یاد آ گیا۔ مگر دل بے ایمان۔ اِس مثال پر راضی نہ ہوتا تھا کہ مالکن تو ایسی ہی ہوتی ہے۔

"امّی! پانی پی لیں۔"

سکینہ نے پانی لا کر دیا۔ مگر تب ہی طلعت بھاگی بھاگی اندر داخل ہوئی اور باہر ہی سے چلّائی۔ "ابّو! ابّو... میاں جی باہر گرے ہوئے ہیں۔"

سکینہ تڑپ کر اُٹھی اور اپنی تکلیف بھُول بھال کر باہر کی طرف لپکی۔

"کیا ہُوا، کیا ہُوا؟"

"امّی! وہ اُدھر... باہر میاں جی زمین پر لوں... پڑے ہیں۔" طلعت ہاتھوں، انگلیوں اور آنکھوں کے اشاروں سے بتا رہی تھی۔

سکینہ جب تک باہر پہنچتی اُس سے پہلے کریم صاحب اور شیریں میاں جی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ شیریں نبض پر ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ سے دل کی دھڑکنیں شمار کر رہی تھی۔ کریم صاحب نے پریشانی سے اُن کے سر کو ہاتھوں پر اُٹھا لیا تھا۔ اور سکینہ کھڑی اُنھیں دیکھ رہی تھی۔

ملازم بھی آ گئے تھے۔ اور وہ سب اُنھیں اُٹھا کر اندر لے گئے تھے۔ سکینہ بھی برستی آنکھوں سے اُن سب کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی تھی۔

دونوں بچّیاں روتے ہوئے اس سے پوچھے جا رہی تھیں۔

"میاں جی کو کیا ہو گیا؟ کیا ہو گیا؟"

کریم صاحب فون پر اپنے فیملی ڈاکٹر کو بُلا رہے تھے۔ شیریں میاں جی کے سرہانے جُھکی ہوئی مسلسل اُن کی نبض دیکھتی جا رہی تھی۔ اور سکینہ اُن کے پلنگ کے کپڑے کو پکڑے زمین پر دو زانو بیٹھی میاں جی کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔

چند منٹوں کے اندر ہی اندر ڈاکٹر آ گیا اور میاں جی کا معائنہ شروع ہو گیا۔ سکینہ، شیریں اور بچّیاں پلنگ سے پرے ہٹا دی گئیں۔

سکینہ نے نظر اُٹھا کر بھی شیریں کی طرف نہ دیکھا تھا۔ جب کہ شیریں مسلسل اُسے تسلّی اور دلاسے دیئے جا رہی تھی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اُسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میاں جی کو کچھ نہیں ہُوا، ٹھیک ہو جائیں گے۔

مگر سکینہ اُن کی ایک بات بھی نہیں سُن رہی تھی وہ بس سوچ رہی تھی کہ میاں جی نے انہیں گاڑی میں سے اُترتے دیکھا ہوگا۔ اور پھر اندر آنے تک بھی دیکھتے

ہے ہوں گے۔ تب ہی یہ سب کچھ ہُوا ہوگا۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑے نہ رہ سکے ہوں گے۔

وہ تو ابھی جوان تھی، صحت مند تھی، سب کچھ دیکھ اور محسوس کر کے بھی اپنے قدموں پر کھڑی تھی۔ میاں جی بوڑھے ہیں۔ اُن کے اندر تو پہلے سے ہی ٹوٹ پھوٹ مچی ہے۔ وہ کیسے اتنا کچھ برداشت کر سکتے ہیں۔

"میاں جی کو دِل کا دورہ پڑا... ہے۔" ڈاکٹر کی آواز بے حد آہستہ تھی۔ پھر بھی اُن دونوں نے سُنی۔

"اُنھیں ہسپتال لے چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے..." کریم صاحب نے سر ہلا کر کہا۔

تب ہی اُن ہی لمحوں میں میاں جی کو ہوش آ گیا۔ اُنھوں نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ دیکھتے رہے پھر آہستہ سے بولے۔

"ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔"

"آپ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ اب کیا حال ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے اپنائیت سے پُوچھا۔

"اگر ہسپتال نہ لے جاؤ گے تو اچھا ہو جاؤں گا۔" میاں جی نے آہستہ سے کہا۔ اُنھیں شروع سے ہسپتال میں داخل ہونے سے چڑ تھی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے۔

"مجھے کبھی ہسپتال مت لے جانا۔ میں اپنے گھر پہ ہی مرنا پسند کروں گا۔" سکینہ کو اُن کی بات یاد آ گئی تو وہ قریب آ گئی۔ اُسی طرح جس طرح پہلے بیٹھی تھی۔ زمین پر دو زانو ہو کر میاں جی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ پر میاں جی ابھی تک ڈاکٹر کی طرف متوجّہ تھے۔

"اگر صرف ایک دو دن کے لئے ہی ہسپتال لے جائیں تب تو ٹھیک ہے نا؟" ڈاکٹر صاحب مُسکرا کر پُوچھ رہے تھے۔

"یہاں ایک دو لمحوں کا اعتبار نہیں تم ایک دو دِن کی بات کر رہے ہو۔" میاں جی سوگواری سے مُسکرا دیئے۔

"ایسا تو نہ کہیں میاں جی۔" کریم صاحب نے جلدی سے کہا تو میاں جی نے نظریں گھما کر اُن کی طرف غور سے دیکھا۔ اور کہنے لگے۔

"میں نے تو کچھ کہنا چھوڑ ہی دیا ہے میاں عبدالکریم۔ جیسی آپ سب لوگوں کی مرضی۔"

"نہیں نہیں۔ میاں جی کو ہسپتال نہ لے جائیں۔ اِن کے دل میں وہاں کا بڑا خوف ہے۔" سکینہ نے جلدی سے کہا۔

کریم صاحب کا منہ بن گیا۔ اور ابھی وہ کچھ کہنے والے ہی تھے کہ ڈاکٹر خود ہی بول اُٹھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں باقی آلات لے کر یہیں آ جاؤں گا۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بیگم صاحبہ کا خیال غالباً صحیح ہے۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب! جو احتیاط اور علاج ہسپتال میں ہو سکتا ہے۔ وہ یہاں تو نہیں..." کریم صاحب اُلجھ کر کہنے لگے۔

"بجا ارشاد ہے۔ مگر میاں جی اگر ہسپتال سے خوفزدہ ہیں تو کیا فائدہ؟ وہاں کبھی ٹھیک نہ ہو سکیں گے۔ اور پھر آپ تو گھر پر بھی اتنا خرچ کر سکتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے سر! گھر پہ زیادہ احتیاط ہوگی۔" شیریں بھی قریب آ کر آہستہ سے بولی تو کریم صاحب کو خاموش ہو جانا پڑا۔

میاں جی نے سب کچھ سُن لیا تھا۔ مُڑ کر دیکھ بھی لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے باہر نکلتے ہی اُنھوں نے سکینہ کی طرف دیکھا۔ بہت دیر دیکھتے رہے۔ وہ سفید چادر سے حسبِ معمول سر ڈھانپے ڈبڈبائی آنکھوں سے میاں جی کا ہاتھ ہاتھوں میں لئے دُعائیں مانگ رہی تھی۔

میاں جی نے ہاتھ بڑھا کر سکینہ کے سر سے چادر کو کھینچنا چاہا۔ جانے اِس لمحے بھی اُس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ سکینہ کے سر سے چادر کھینچ کر اُن کے ہاتھ میں آ گئی۔ میاں جی سختی سے بڑبڑائے۔

"اُتار دو، اُتار دو اِسے۔ سفید چادر کو اُتار دو۔ کیوں پہن رکھی ہے تم نے۔ اِس دُنیا میں آ کر دُنیا سے الگ رہنا چاہتی ہو۔ بھُول جاؤ۔ بھُول جاؤ سب کچھ۔ جس زمانے میں... جس وقت میں تم پیدا ہوئی ہو۔ اُسی کا احترام کرو۔ میری بات کو سمجھو، سکینہ سمجھو۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔"

سکینہ لمحے بھر کو پیچھے ہٹ گئی۔ خوف سے اُس کی آنکھیں پھٹ جانے کو تھیں۔ چادر سر سے ڈھلک کر آدھی میاں جی کے ہاتھ میں اور آدھی زمین پر آ رہی تھی۔ میاں جی سکینہ کی طرف دیکھ رہے تھے جو بے چارگی سے پھٹی پھٹی ویران آنکھوں سے اُنھیں تک رہی تھی۔

"میری بچی... ! تو تنہا رہ جائے گی۔ تنہا رہ گئی ہے۔" میاں جی کے لب لرزنے لگے تھے۔ اور اُنھوں نے ہاتھ سے چادر کا کونہ چھوڑ کر وہی ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیا تھا۔

سکینہ نے دونوں ہاتھوں سے چادر کو پکڑ لیا تھا اور اب پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہی تھی۔ گھٹنوں پر کھاسر کبھی پلنگ کی پٹی سے ٹکراتا تو

کبھی پیچھے ہٹ جاتا۔ چادر کے کھینچنے سے اس کے بال بھی بکھر گئے تھے۔
عائشہ دوسرے کمرے سے بھاگ کر آئی تھی اور اپنی ماں کے ہاتھوں سے اس کی چادر لے کر اس کے اوپر ڈال رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ماں کو اس حالت میں روتے بلکتے سامنے لوگ دیکھیں۔ شیریں پہلے تو دور کھڑی سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہی۔ پھر جلدی سے قریب آکر میاں جی کو دیکھنے لگی۔

مگر میاں جی اب بے ہوش نہیں ہوئے تھے۔ ہوش میں ہی تھے۔ آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اور چپ چاپ لیٹے تھے۔
تھوڑی دیر بعد کریم صاحب اندر آگئے۔ ان کے ساتھ ملازم بھی تھے۔ کریم صاحب میاں جی کے کمرے کی چیزوں کی ترتیب بدلوانے میں مصروف ہوگئے۔ یہ کرسی یہاں سے اٹھا دو۔ یہ میز یہاں پر رکھ دو۔ یہ کرو، وہ کرو۔ ڈاکٹر صاحب۔ اپنے ضروری آلات کے ہمراہ تھوڑی دیر کے بعد پہنچنے والے تھے۔ اس لئے ان کی ہدایت کے مطابق وہ کمرے کو خود ہی درست کروا رہے تھے۔
انھوں نے سکینہ کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر نہ تو اس کے قریب ہی گئے تھے اور نہ اسے چپ کرانے کی کوشش کی تھی پھر طلعت نے اس کے پاس آن کر لبسورتے ہوئے کہا تھا۔
"ابو! امی کیوں رو رہی ہیں۔ میاں جی کو کیا ہوگیا ہے؟"
"میاں جی ٹھیک ہیں بیٹے! بالکل ٹھیک ہیں تم اپنی امی کو ان کے کمرے میں لے جاؤ۔ ابھی ڈاکٹر صاحب آجائیں گے تو ان کے رونے پر ناراض ہوں گے۔"
طلعت پھر سکینہ کے پاس آگئی تھی۔ عائشہ بھی دوسری طرف بیٹھی تھی۔ دونوں نے سکینہ کو کندھے سے ہلا ہلا کر پکارنا شروع کر دیا تھا۔
"بیٹے! شور ہوتا ہے۔ ایسے مت کرو۔" کریم صاحب جھلا کر بولے۔
شیریں اٹھ کر سکینہ کے پاس آگئی۔ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور آہستہ سے پکارا۔
"مسز کریم۔ میری طرف دیکھئے۔"
اور نہ چاہنے کے باوجود سکینہ سر اٹھا کر شیریں کی طرف دیکھنے لگی۔
"آپ کے رونے سے میاں جی کو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ ان کے لئے بڑا مضر ہے یہ سب کچھ۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے اپنے کمرے میں چلی جائیے۔ آئیے میں آپ کو لے چلوں۔"
سکینہ نے ایک نظر میاں جی کی طرف دیکھا پھر کریم صاحب کی طرف... جو دروازے کی طرف منہ موڑے کھڑے تھے اور آہستہ سے اٹھ گئی۔ دونوں بچیاں بھی ماں کے ساتھ ساتھ چلی گئیں۔ کریم صاحب ان کی طرف دیکھ نہیں رہے تھے مگر متوجہ ضرور تھے۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچیں تو وہ جلدی سے راستہ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ سکینہ نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ چند لمحے سکینہ دیکھتی رہی۔ وہی آنکھیں تھیں، وہی روشنی تھی۔ دل میں اتر جانے والی آنکھیں۔ دل میں اتر جانے والی روشنی۔ مگر یہ کیسی روشنی تھی جو عبدالکریم کی زندگی کی راہوں کو روشن نہ کر سکی تھی۔ یہ کیسی روشنی تھی جو سکینہ کی آنکھوں میں تو تھی۔ پر اس کے راستوں کے اندھیروں کو سوا کر کے بھی روشنی ہی تھی۔ یہ روشنی کہاں بکھرے گی؟ کب بکھرے گی؟
کریم صاحب نے گھبرا کر نظریں نیچی کر لیں۔ وہ کبھی بھی زیادہ دیر تک سکینہ کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ پہلے پہل وہ سمجھا کرتے تھے کہ رعب حسن ہے۔ آنکھوں کے حسن کے چرچے انھوں نے بہت سنے تھے۔ تجربہ بھی ہوگیا تھا۔ مگر پھر وہ جیسے جیسے دولت کے پیچھے بھاگنے لگے۔ ان آنکھوں سے خائف رہنے لگے۔ اور اب... بہت عرصے سے یہ آنکھیں اپنے مقابلے میں بہت زیادہ روشن لگنے لگی تھیں۔ ان کی اپنی آنکھیں انھیں برداشت نہ کر پاتیں۔ اور اب اس وقت۔ جانے ان آنکھوں میں کیا تھا کہ ان کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوگئی۔ انھوں نے چاہا۔ کاش انھیں اس وقت کوئی سہارا دے۔ پلٹ کر وہ جلدی سے شیریں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شیریں نے ان کی طرف دیکھا۔
"آپ یہیں ٹھہریئے پلیز!" کریم صاحب نے جلدی سے کہا۔
"ابھی آتی ہوں۔ آپ کی مسز کو کمرے میں پہنچا آؤں۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔" کریم صاحب کمرے میں تنہا رہ گئے تو میاں جی کے قریب آن کر بیٹھ گئے۔ میاں جی نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔
"میاں عبدالکریم! کیسے ہیں آپ؟"

"میں تو ٹھیک ہوں میاں جی آپ بتائیں کیا حال ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے بیٹا جی۔ اللہ کا بڑا شکر ہے۔"

"زیادہ تکلیف تو نہیں؟"

"میاں عبدالکریم! یہ تکلیف تو کوئی تکلیف نہیں۔ اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ خود دُور کر دے گا۔ اصل تکلیف تو وہ ہوتی ہے جو دُنیا والے دیتے ہیں۔ وہ ضرور مشکل ہوتی ہے۔ اُس کی پوچھو۔"

کریم صاحب کو ایسے لگا جیسے اُن کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ ایک دم سے کہنے لگے۔

"آپ زیادہ باتیں نہ کریں میاں جی! بس چُپ چاپ لیٹے رہئے۔"

میاں جی اُن کی طرف دیکھتے رہے پھر آنکھیں موندلیں۔ کریم صاحب چُپ چاپ بیٹھے اپنے آپ کو دیکھ رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے اب تک کی ایک ایک بات۔ ایک ایک یاد بن کے اُن کے دل و دماغ پر چھاتی جارہی تھی۔ اور اب اُنھیں سکینہ کا رونا بے معنی نامعلوم ہورہا تھا۔ وہ میاں جی کی بہو سے زیادہ بیٹی تھی۔ میاں جی کی شہ پر ہی تو وہ سب کچھ کر گزرتی تھی۔ اُن ہی کے سہارے پر تو وہ اتنی مضبوط تھی۔

میاں جی کا سہارا نہ رہا تو سکینہ ٹوٹ جائے گی۔ بکھر جائے گی۔ اتنے وقت کی گزاری رفاقتیں کریم صاحب کے دِل میں گداز پیدا کرنے لگیں۔ اُنھیں سکینہ پر ترس آنے لگا۔ تب ہی میاں جی نے پھر آنکھیں کھول دیں۔

"میاں عبدالکریم! بہت دن گزر گئے۔ آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا تھا۔ روز انتظار بھی کرتا رہا۔ پر ملاقات نہ ہوسکی کبھی اکیلے میں۔"

"تو میاں جی آپ نے مجھے کہا ہوتا۔" کریم صاحب تڑپ کر بولے۔

"میاں آپ کو پتہ ہے۔ زیادہ کہنے کہلانے کا میں قائل نہیں ہوں۔"

"کیا بات تھی؟ میاں جی اب بتلایئے۔" کریم صاحب اُن پر جھکتے ہوئے بولے۔

میاں جی دو چار منٹ اُن کی طرف دیکھتے رہے۔ کمزور لمحوں میں بھی تقدیر ہی کا ہاتھ سب پر حاوی رہتا ہے۔ ورنہ انسان تو ٹوٹ پھوٹ جائے۔

"میاں! میں تو کریم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اب تو میرے پاس صرف میرا عبدالکریم ہی ہے۔ اور پھر رخصت کے لمحوں میں ایک دوسرے کا دِل تو بُرا نہیں کرتے نا۔"

"میاں جی!" کریم صاحب تڑپ کر بولے۔ "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ خُدا کے لئے ایسا نہ کہیں۔ آپ تو میاں جی میرے بہت کچھ ہیں۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے بیٹے جی! ایسے ہی ہوتا ہے۔ اور کیا پتہ کتنی اور ہے۔ میں تو بس یونہی کہہ رہا تھا۔" میاں جی نے مُسکرا کہا۔ مگر اپنی آنکھوں کے گوشوں سے بہنے والے پانی کو محسوس نہ کر سکے۔ جسے اُن کے عبدالکریم نے چُپکے سے اپنی اُنگلی کی پوروں میں جذب کر لیا تھا۔

کئی لمحے پھر گزر گئے۔ اندر باہر ہر طرف سناٹا تھا۔ کریم صاحب کا دل چاہ رہا تھا۔ وقت یونہی تھم جائے تو وہ اُسی طرح اپنے باپ کے لئے بیٹھے رہیں۔ بیٹھے رہیں اور حقِ خدمت ادا کرتے رہیں کہ جسے آج تک اُنھوں نے اپنی بجائے اپنی بیوی سے ادا کروایا تھا۔ اب جب کہ دو منٹ وہ میاں جی کے پاس آن بیٹھے تھے تو اُنھیں محسوس ہوا تھا کہ ماں باپ کے پاس تو کتنے ہی جہان آباد رہتے ہیں۔ محبّتوں اور شفقتوں کے سمندر ٹھاٹھیں مارتے رہتے ہیں۔ کیسے کیسے وہ اولاد کی دِل شکنی نہیں ہونے دیتے کہ اُنھیں تکلیف ہوگی۔ کریم صاحب کو گزری عُمر کا افسوس ہونے لگا۔

جب یہ طے رہا کہ سب کا انجام ایک ہی ہے۔ ایسا ہی ہے تو پھر کیوں غافل ہوئے ہم۔ یوں ہم نے اِس جنّت کو بھلا دیا۔ کیوں ہم نے ان محبّتوں کی قدر نہ کی۔ اُنھیں تنہا کیوں چھوڑ دیا۔ بڑھاپے کے دُکھ تنہا سہنے کو۔ جب کہ بچپن کی تکلیفیں اُنھوں نے ہم سے مل کر کاٹی تھیں۔

کریم صاحب نے اپنے بہتے آنسو صاف کئے تو میاں جی نے پھر اُن کی طرف دیکھا۔ کریم صاحب کو یوں لگا کہ میاں جی مسلسل اُنھیں ہی دیکھ کر محسوس کر رہے ہیں۔ کھلی آنکھوں کے ساتھ بھی اور بند آنکھوں سے بھی۔

"میری ایک بات تو مان ہی لیجئے، عبدالکریم؟"

"ایک بات نہیں۔ میاں جی دس ہزار باتیں کہیں۔" عبدالکریم نثار ہو کر بولا۔

"یہ گھر... یہ آرام و آسائش... یہ سب کچھ میری سکینہ کا ہے۔ اسی کا رہے گا۔ جب تک وہ خود اس دنیا میں ہے۔ یہ سب میری اولاد اس کی امانت ہے۔ اسے ہاتھ نہ لگنے دے گا۔ اس کے بعد آپ آزاد ہیں میاں عبدالکریم۔"

"میاں جی! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" عبدالکریم کا دل ہول کر رہ گیا۔ ایک دم ہی وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ میاں جی نے کیا کہہ دیا تھا۔ اپنے سے الگ کر دیا اُسے۔ اپنے اور سکینہ سے... پھر اس گھر سے۔ تو کیا وہ... کیا وہ جانتے ہیں، سب کچھ جانتے ہیں... اور یہی بات انھیں کرنا تھی۔ اس کا دل چاہا وہ چیخ چیخ کر رو دے۔

"کیوں ایسا کہا آپ نے میاں جی۔" عبدالکریم گڑگڑا کر رہ گیا مگر اس کی آواز اس کا لہجہ بے مدد کو تھا۔ جیسے وہ خود بھی نہ چاہتا ہو کہ میاں جی اس کا یہ سوال سن لیں اور پھر کوئی ایسا جواب دیں جو وہ نہ سن سکے۔

میاں جی جیسے بند آنکھوں سے بھی اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اُسے ہی سن رہے تھے۔ آہستہ سے بولے۔

"وہ اپنے زمانے اور اپنے لوگوں سے بچھڑ کر غلط مقام پر آ گئی ہے۔ بیٹا! آئے ہوئے لوگوں کو لوٹایا تو نہیں جا سکتا۔ ان کی عزت کی جاتی ہے۔ قدر کی جاتی ہے۔ اور... انتظار کیا جاتا ہے جب تک کہ قدرت خود ہی کچھ نہ کچھ فیصلہ نہ کر دے۔"

کریم صاحب نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ جانے میاں جی کیا کہنا چاہتے تھے۔ وہ کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا۔ لیکن میاں جی تو ایسے لگتے تھے۔ جیسے سو رہے ہوں۔ اطمینان سے آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ تب ہی ہلکی سی آہٹ ہوئی اور شیریں اندر داخل ہوئی۔ قریب آئی اور میاں جی کے بستر کے دوسری طرف کرسی پر بیٹھ گئی۔ میاں جی نے ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ پھر بند کر لیں۔

"اب کیسی حالت ہے؟"

"ٹھیک ہیں۔ بالکل ٹھیک ہیں۔" کریم صاحب نے کہا۔

"آپ کی مسز کا تو بہت برا حال ہے۔" مس شیریں نے کہا تو کریم صاحب نے جلدی سے منہ پہ انگلی رکھ کے اُسے چپ ہو جانے کو کہا پھر خود ہی بولے۔

"ہم سب کے لئے اُس کا اس طرح رونا بہت اجنبی ہے۔ وہ بہت مضبوط حوصلے اور برداشت کی مالک ہے لیکن میاں جی نے اسے بہو سے زیادہ بیٹی سمجھا ہے۔ اسی لئے اُس کی حالت اتنی ابتر ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ میاں جی اب بہت بہتر ہیں۔"

"اُن کے رونے سے بچیاں بے چاری بہت پریشان ہو رہی ہیں۔" شیریں نے فکرمندی سے کہا۔ مگر کریم صاحب چپ ہو کر رہ گئے وہ کہہ بھی کیا سکتے تھے۔

دونوں بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ میاں جی اگرچہ ہوش میں تھے مگر آنکھیں بند کئے چپ چاپ لیٹے تھے ایک دو بار کریم صاحب نے انھیں آواز دی۔ تو وہ صرف ہنکارا بھر کے رہ گئے۔ اُن کی طرف دیکھا نہیں۔ اور پھر کریم صاحب نے بھی سمجھا کہ وہ شاید بات کرنے سے گریزاں ہیں۔

بہت دیر گزر جانے پر کریم صاحب آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھ کر شیریں کے قریب آن بیٹھے۔ اور آہستہ آواز میں اُس کے ساتھ باتیں کرنے لگے میاں جی نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ بے چین سے نظر آنے لگے تھے۔ کریم صاحب واپس اپنی جگہ پر آ گئے۔

"کیا بات ہے میاں جی؟"

"کچھ ٹھیک نہیں دل۔" میاں جی نے قدرے دکھائی سے کہا تو کریم صاحب پریشان نظر آنے لگے۔

"کیا کہیں تکلیف ہے؟"

"تم کیسے سمجھو گے؟ سکینہ کہاں ہے؟" میاں جی کمرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے بولے۔

"اُسے تو ابھی ابھی شیریں اُس کے کمرے میں چھوڑ کر آئی ہے۔"

"کیوں...؟" میاں جی الجھ کر بولے۔

"میں ابھی بلا لاتی ہوں۔" شیریں جلدی سے اُٹھ گئی تو میاں جی اُسے دروازے تک جاتے ہوئے دیکھتے رہے

"بہت اچھی لڑکی ہے یہ! بے حد خلوص والی۔ غریب لوگ ہیں مگر عزت دار فیملی سے تعلق ہے۔ آپ کے لئے اس طرح پریشان ہوتی ہے جس طرح اپنے اپنوں کے لئے ہوتے ہیں۔" کریم صاحب نے شیریں کے جانے کے بعد کہا مگر میاں جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب وہ کھلی...

آنکھوں سے چھت کو گھور رہے تھے۔

اسی اثنا میں باہر گاڑی کے رُکنے کی آواز سُنائی دی۔ کریم صاحب جلدی سے دروازے تک گئے۔ اور باہر دیکھنے لگے۔ ڈاکٹر اپنے مخصوص آلات اور اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ گاڑی سے اُتر رہا تھا۔

میاں جی کے ہسپتال نہ جانے کی خواہش کا سب سے زیادہ احترام سکینہ نے ہی کیا تھا۔ اور پھر ان کا فیملی ڈاکٹر اُن سب سے اچھی طرح واقف بھی تھا۔ اُس نے میاں جی کے کمرے کو کوشش کر کے حتی الامکان حد تک ہسپتال ہی کا کمرہ بنا دیا تھا۔ ہر قسم کی ضرورت کی چیزیں منگوالی گئی تھیں۔ اور پھر دولت کے سامنے کسی رکاوٹ کا بھلا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نے دن رات میاں جی کے پاس ایک نرس کی موجودگی کو ضروری سمجھا تھا۔ اور اس کے لئے وہ پرائیویٹ ہسپتالوں میں فون کر کر کے کسی نرس کا انتظام کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ محض اتفاق ہی تھا کہ ہر چیز کا انتظام ہو جانے کے بعد بھی ابھی تک کوئی نرس کا بندوبست نہ ہو سکا تھا۔

تب ہی شیریں نے آکر ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ وہ تھوڑا بہت یہ کام کر سکتی ہے۔ اگر کسی اور کا انتظام نہیں ہو سکتا تو وہ میاں جی کے پاس رہے گی۔

"مگر آپ یہ کام کس طرح کریں گی۔ اِس کے لئے تو تجربہ ہونا چاہیئے۔ آپ کو پتہ ہے کہ میاں جی کو دل کی تکلیف ہوئی ہے"۔

"تجربہ تو مجھے نہیں ہے۔ بس تھوڑی سی ٹریننگ لی تھی۔ جسے بھولی نہیں ہوں"۔

"کب ٹریننگ لی تھی؟"

"ایف۔ اے کے بعد بہت جنون ہوا تھا کہ نرس بن جاؤں۔ مگر سال ڈیڑھ سال گزرنے پر پتہ چلا کہ نہیں بن سکتی"۔ شیریں نے بتایا۔

"کیوں نہیں بن سکیں؟"

"اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے۔ اِس لئے پھر بی۔ اے میں داخلہ لیا تھا"۔

"اگر رات میں کسی وقت میاں جی کو کسی قسم کی تکلیف ہوئی تو کیا کریں گی؟" ڈاکٹر نے پوچھا تو شیریں ایک دو لمحے کو چُپ ہو گئی۔ پھر بتانے لگی کہ ایسی حالت میں اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ ڈاکٹر اور کریم صاحب غور سے سُنتے رہے۔

"میرا خیال ہے کہ مس شیریں ایک اچھی نرس بھی ہیں"۔ کریم صاحب مُسکرا کر بولے۔ اُن کے چہرے پر ایک دم خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"اچھی نرس تو ہم تبھی کہتے اگر یہ نرسنگ کا پُورا کورس کرتیں۔ گوارا کر سکتی ہیں۔ مگر پہلے چوبیس گھنٹے میں اپنا ایک آدمی بھی یہیں چھوڑ دوں گا۔ وہ ٹرینڈ ہے۔ مس شیریں کے ساتھ مل کر سب کچھ سنبھال لے گا"۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"میں صرف اِس لئے کہہ رہی ہوں کہ آپ کو اِس وقت کوئی نرس نہیں مل رہی۔ جب تک کسی کا انتظام نہیں ہوتا۔ میں سنبھال لوں گی۔ اس لئے... اس لئے کہ میاں جی میرے لئے بہت محترم ہیں۔ میرے باپ کی طرح۔ اور پھر اتنے نیک اور اچھے انسان کی دعا نہ لینا تو بدنصیبی ہی ہے۔ شاید اِن کی دُعائیں میرے کام آجائیں..."۔ شیریں نے دلگداز لہجے میں کہا تو ڈاکٹر اور کریم صاحب دونوں چُپ ہو گئے۔

اور پھر شیریں نے میاں جی کی خدمت میں دن رات ایک کر دیئے۔ ایسے لگتا تھا وہ انسان نہیں۔ کوئی مشین ہے جو ہر وقت بیمار میاں جی کی خدمت میں حاضر رہتی ہے۔ یا پھر انسان کے رُوپ میں کوئی فرشتہ کہ جس کا کام اپنے مالک کی خدمت گزاری کے علاوہ کچھ نہیں۔

سکینہ بار بار آتی۔ چُپ چاپ میاں جی کے پاس بیٹھ جاتی۔ اُن کو دیکھتی رہتی۔ اور پھر جب اُسے اپنے آپ پر قابو نہ رہتا تو سسکیاں لیتے ہوئے بھاگ جاتی۔

جب وہ بیٹھی ہوتی۔ تب بھی میاں جی خاموش پڑے رہتے۔ اور جب وہ چلی جاتی تو بھی میاں جی چُپ ہی رہتے۔ ایسے لگتا تھا جیسے اُن کے بولنے کی حس ہی مفقود ہو گئی ہو۔ یا الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہو اور یا پھر کہنے کو اب کوئی بات ہی نہ رہی ہو۔

اور سکینہ چاہتی تھی کہ وہ کچھ بولیں۔ کچھ کہیں۔ کوئی ایسی بات کہ جسے سُن کر سکینہ کو تقویت کا احساس ہو۔ تحفظ اور سکون ملے۔ مگر... میاں جی کھلی آنکھوں سے اُسے دیکھتے تھے۔ سُنتے تھے۔ مگر سکینہ کے نصیب کی طرح خاموش تھے۔

باقی آئندہ



خاموش آنسو

رابعہ شوکت علی

جیل میں آہ وزاری کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور وہ خاموشی آنسوؤں کے ساتھ لرزاں چلی جا رہی تھی۔ نظریں جھکائے، پیٹھ موڑے، کہیں اُس کے آنسوؤں کا نذرانہ کوئی دیکھ نہ لے۔

سولہ سال تک ننگے پاؤں مزاروں پر حاضریاں دیں۔ درباروں پر منتیں مانی، تعویذ گنڈے کرائے گئے اور اس طویل ازدواجی زندگی کے بعد منشی فضل الحق کے چھوٹے سے گلشن میں کوئی کلکاریوں کی آواز نہ سُنی گئی۔ دونوں میاں بیوی تھک ہار کر مایوس ہونے تو رب العزت نے ان دونوں میاں بیوی کے چہرے پر بہار دکھائی۔ اُن کی برسوں کی مُراد بر آتی نظر آئی۔ منشی فضل الحق کی بیوی اُمید سے تھی پھر سردیوں کی ایک سخ رات چیخوں اور سسکیوں کے شور میں جب زینت بی بی نے پھول جیسا بچہ جنم دیا۔ تو دونوں.. میاں بیوی کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ منشی فضل الحق کا تو یہ حال تھا کہ پاؤں رکھتے کہیں تھے اور پڑتے کہیں تھے۔ پُورے علاقے سے مبارک اور سلامتی کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ ویسے بھی ریاست بہاولپور میں منشی فضل الحق کی بہت جان پہچان تھی۔ اُس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کیا اور اپنے ننھے کا نام گلزار رکھا۔

گلزار کی تربیت بڑے ناز اور نخرے سے ہو رہی تھی کہ تقدیر نے ایک امتحان لینا چاہا اور گلزار کی ماں اُسے چار سال کا چھوڑ کر اِس جہانِ فانی سے چلی گئی۔ منشی فضل الحق اپنی شریکِ حیات کی جُدائی کا کاری زخم برداشت نہ کر سکے اور ساری ساری رات گلزار کو سینے سے لگائے آنسو بہاتے رہتے تھے۔ اُن کے لیے ویسے بھی طرح طرح کے مسائل کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک باپ کتنا ہی مشفق سہی لیکن جب اُسے ایک ماں کی ذمّے داریاں سنبھالنا پڑیں تو اُس کا جینا حرام ہو جاتا ہے۔

بچپن ایک سنہری دَور ہوتا ہے جس کی یادیں بھی حسین اور پیاری ہوتی ہیں اور انسان بار بار یہ خواہش کرتا ہے کہ کاش وہ لمحات پھر واپس آ جائیں۔ گلزار کا یہ دَور ختم ہُوا تو اُسے مڈل اسکول بہاولپور میں داخل کرا دیا گیا۔ ویسے بھی اُس کو تعلیمی ماحول بہت پسند تھا کیونکہ گھر کی سنسان دیواریں اور آنگن اُس کو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں کیونکہ اُس کا ماحول ہی ایسا تھا اور ماحول انسان پر ہمیشہ اثر انداز رہتا ہے۔ وقت محوِ پرواز تھا اور گلزار اُن دنوں نویں کلاس میں تھا کہ صدر معلّم کا ہرکارہ کا ہشو اُن کے گھر آیا اور گلزار کے والد کو بُلا کر لے گیا اور وہ اُس کے ساتھ چلے گئے۔ گلزار اُس وقت اسکول کا کام کر رہا تھا۔ جب منشی فضل الحق واپس آئے تو اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر گلزار نے سوال کر دیا۔

"کیا ہُوا پدر؟"

منشی فضل الحق نے کہا "میں ریٹائرڈ ہو گیا ہوں اور یہ کوارٹر خالی کرنا ہے کیونکہ نیا معلّم کل پرسوں تک آ رہا ہے۔"

اب گلزار کی تعلیم اور پرورش کا مسئلہ اور مستقبل کے اتنے سارے مسائل منشی فضل الحق کی سوچ کا محور بن گئے۔ مگر پہلے مکان ضروری تھا جس میں سر چھپاتے۔ اس کے علاوہ منشی فضل الحق کو گلزار کے مستقبل کی سوچ کھائے جا رہی تھی۔ بہر کیف مکان کا مسئلہ چمن آرا نے حل کر دیا۔ چمن آرا گلزار کی ہم جماعت تھی مگر اُس نے آٹھویں جماعت تک گلزار کے ساتھ پڑھا تھا اور وہ گلزار سے محبت کرتی تھی اور گلزار بھی اُس پر دل فریفتہ تھا۔ چمن آرا ایک قصائی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ چمن آرا چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ اس کی کُھلی زلفیں اور دمکتا ہُوا چہرہ قیامت ڈھا رہا تھا جیسے یہ حُسن ایک ایسی کشش تھی جو گلزار کو بہا لے جا رہی تھی۔ حُسن کی دیوی اور قدرت کا شاہکار تھی۔ چمن آرا کا بھرا بھرا جسم غزالی آنکھیں۔ صاف شفاف چمکتا رنگ۔ دراز قد۔ وہ صحرا میں کِھلا گلاب تھی جس کی خوشبو سے سارا صحرا مہک اُٹھا تھا۔ تب اُس کی زندگی میں باہر کی دُنیا کا بھنورا اُس کا رس چوسنے کے در پے تھا۔ آخر کار محبت میں دونوں اس طرح بندھ گئے کہ جس طرح وہ کُھل نہ پائیں گے۔

میٹرک کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی منشی فضل الحق نے گلزار کو اختیار دے دیا کہ نتیجہ نکلتے ہی اپنی ملازمت کی تلاش میں وادی کشمیر کا رُخ کر لینا کیونکہ وہاں مہاراجوں کے ہاں ملازمت مل جاتی ہے۔ دُوسرے ہی دن اُس کا نتیجہ نکلا تو وہ کامیاب قرار دیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اُس نے تیاری کرنی چاہی مگر جانے سے پہلے وہ اپنے پیار کو اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔ اُسی رات چمن آرا کو پیغام بھیجا کہ میں وادیٔ کشمیر میں ملازمت کے سلسلے میں جانا چاہتا ہوں تو اُسے یہ خبر پا کر یُوں لگا جیسے کوئی چیز اُس کے سر پہ لگی ہو۔ بالآخر ملاقات ایک درخت کے نیچے رات کو ہُوئی۔ گلزار نے اُس کو صاف لفظوں میں کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں دل و جان سے اور کرتا رہوں گا اور تم جانتی ہو کہ میں دل کی گہرائی سے تمھاری پُوجا کرتا ہوں اور میں وطن واپسی پہ تم سے شادی کروں گا۔ اتنی دیر تک تم میری امانت ہو اور یہ جان لو کہ اگر میری امانت میں خیانت ہُوئی تو میں جیتے جی مر جاؤں گا۔ شادی کا نام سُنتے ہی اُس کو ایسے لگا کہ جیسے وہ بلندیوں پہ پرواز کرنے لگی ہو۔ اُس کے ہونٹ کپکپائے گلزار نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا کہ تم میرا آئیڈیل ہو۔

جب صبح گلزار وادی کشمیر جانے لگا تو چمن آرا کی حالت آپے سے باہر ہو گئی۔ اُس کو محبت کے درد کی ایک کاری ٹیس لگی تو وہ سوچوں میں گُم ہو گئی۔ اُس نے ایک کراہ کے بعد اپنی پیشانی کا پسینہ ہاتھ سے صاف کیا۔ موسم سرما کی سرد ہواؤں میں وہ باہر کھڑی اپنے محبوب کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ سرد ہوائیں اُس کے جسم میں سرایت کر رہی تھیں۔ شدید سردی اور ابر آلود موسم کی وجہ سے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور اُس کا دل انجانے خوف سے تھر تھرا رہا تھا۔

گلزار سے اپنے والد کی جدائی اور پیار سے محرومی برداشت نہ کی جا رہی تھی وہ انجانی راہوں پر نہ معلوم منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ وہ نہ جانے کتنی گلیوں اور بازاروں کو عبور کرتا رہا اور اب وہ اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اولے بھی پڑ رہے تھے گویا ایک طوفان تھا جو دنیا میں برپا تھا اور ایک طوفان اس کے دل میں بھی برپا تھا۔ آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ بارش سے پناہ لینے کے لئے وہ فوراً پاس کھڑی ریل گاڑی کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ ریل گاڑی کے ڈبے میں چند مسافر بیٹھے اونگھ رہے تھے اور بارش رکنے کا انتظار کر رہے تھے کہ گاڑی نے سیٹی بجا کر سفر کا آغاز کر دیا۔ وہ گومگو کی حالت میں سوچتا رہ گیا کہ اترے یا نہ اترے۔ ابھی وہ اسی کشمکش میں تھا کہ ریل گاڑی فراٹے بھرنے لگی اور وہ کچھ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ شاید یہ میرے لئے اچھا سفر ہو اور ملازمت سے مستفید ہو جائے۔ وہ کچھ اور سمٹ کر بیٹھ گیا اور ایک چھوٹی سی چادر اپنے اوپر پھیلا لی مگر سردی تھی کہ اس کے جسم کو چھوڑ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اجنبی اور ناآشنا لوگوں میں چپکے سے دبکا بیٹھا تھا جیسے اگر وہ بولا تو لوگوں کو اس کی موجودگی کا علم ہو جائے گا۔ سب لوگ اپنے دھیان میں بیٹھے تھے۔ کوئی اونگھ رہا تھا تو کوئی سگریٹ کے دھوئیں میں اپنے غم ہلکے کر رہا تھا۔ سچ ہے کہ دل کی دنیا ویران ہو تو ہر طرف ویرانی نظر آتی ہے۔

اس کو یہ ماحول بڑا سوگوار لگ رہا تھا۔ شاید وہ لوگ اسے عام مسافر سمجھ کر نظر انداز کر رہے تھے لیکن گلزار کو ایسے لگا جیسے سب کی نظریں اس پر لگی ہوں اور ان لوگوں کی سوالیہ نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی ہوں۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کے پاس تو ٹکٹ بھی نہیں ہے۔ ریل گاڑی اپنی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ پھر اچانک ایک جھٹکا لگا تو ریل گاڑی رک گئی تو وہ سرائے عالمگیر ریلوے اسٹیشن تھا وہاں سے اس کو ریل گاڑی بدلنا تھی۔ وہ ٹکٹ لے کر جابہ ایکسپریس میں بیٹھ گیا اور اچانک ریل گاڑی چل پڑی چند گھنٹوں کے بعد وہ جاتلاں ریلوے سٹیشن پر اترا۔ وہی اس کی منزل مقصود تھی۔ جاتلاں شہر کی روشن روشن گلیاں اور بازاروں کی چکاچوند روشنیاں اسے کچھ پراسراری لگیں۔ خدا خدا کر کے رات گزری۔ وہ خالی پیٹ اور بھوک سے نڈھال تھا... صبح سورج کی پہلی کرن پھوٹی تو سویرا ہونے کا احساس ہوا۔ اسی دن گلزار کو ایک بڑے تاجر نے اپنا سیکرٹری مقرر کر لیا۔ پھر آہستہ آہستہ گلزار اس تاجر کا بااعتماد آدمی بن گیا مگر تنخواہ قلیل ہونے کی وجہ سے وہ اس نوکری کو چھوڑنے کے چکر میں پڑ گیا کیونکہ ان دنوں مہاراجہ صلابت خان کا محل بن رہا تھا۔ اس کو ایک پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت تھی گلزار یہ نوکری وطن سے واپسی پر کرنا چاہتا تھا۔

اس نے ملازمت اختیار کرتے ہی چمن آرا کو خط لکھا: "میری روح قرار، میری زندگی ویران اور تنہا سی تھی۔ یہاں ان ویران اور تنہا تنہا لمحوں میں تمہاری باتیں، تمہارے جسم کی خوشبو کچھ اس طرح رچ بس گئی ہے کہ مجھے اپنے اردگرد تمہاری محبت کے ترانے سنائی دیتے ہیں۔ میرے خوابوں میں بسنے والی میں اس دن کا انتظار کروں گا جب ملاقات کا سماں ہوگا اور ہم ایک دوسرے سے گلے ملیں گے۔
تمہارا گلزار۔"

اس خط کا جواب چمن آرا نے بہت ہی جلد دیا۔ "اے میری جان۔ یہ خط تمہیں اپنے کمرے میں بیٹھ کر لکھ رہی ہوں۔ باہر چاندنی کے ساتھ ساتھ تمہارے خط کی مہک بھی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ مہک مجھے ایسا سکون بخش رہی ہے جس کی مجھے کب سے تلاش تھی۔ میری ساری سوچیں ایک دائرے میں سمٹ گئی ہیں۔ تمہارے خط کی تحریر میں ڈوب کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تمہارے دل کی دھڑکن بہار کی شنائی ہے۔ تمہاری۔ صرف تمہاری چمن آرا۔"

خطوط کا یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ سال کے بعد اچانک رک گیا۔ گلزار نے بہت خط لکھے لیکن جواب سے محروم رہا۔ اس کو کیا معلوم کہ اس کی محبت قتل ہو گئی ہے۔ وہ بہت پریشان حال تھا۔ چمن آرا کی تصویر اس کے سامنے رہتی اور وہ چاہتا تھا کہ... اڑ کر چمن آرا تک پہنچ جائے۔ چمن آرا کی شادی اس کے آنے سے پہلے کوئی چار ماہ قبل مہاراجہ صلابت خان سے ہو گئی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی نے مہاراجہ سے اچھی خاصی رقم لے کر چمن آرا کو فروخت کر دیا تھا۔

گلزار نے گھر آنے سے پہلے وادی کشمیر سے کافی تحائف خریدے تاکہ وہ اپنے محبوب کو دے۔ مگر وہ گھر پہنچتے ہی پریشان ہو گیا کیونکہ چمن آرا اسے ملنے نہ آئی تھی اور وہ بے چین تھا۔ بہت انتظار کے بعد گلزار سے نہ رہا گیا تو اس نے اپنے والد فضل الحق منشی سے پوچھ ہی لیا کہ چمن آرا اسے ملنے نہیں آئی۔ منشی فضل الحق نے جواب دیا کہ بیٹے اس کی شادی ہو گئی ہے۔ شادی کا نام سنتے ہی اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ منشی فضل الحق بولے جا رہا تھا کہ چمن مہاراجہ صلابت کی مہارانی بنی ہے لیکن گلزار کے الٹے پلے کچھ نہ پڑ رہا تھا۔

گلزار پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا جس امید کے سہارے وہ آج تک زندہ تھا۔ وہ ٹمٹماتا دیا جس کی لو سے وہ اپنی زندگی میں روشنی کئے ہوئے تھا۔ وہ آج بجھ چکا تھا۔ وہ انتہائی دل برداشتہ ہو

چکا تھا۔ وہ آٹھ روز تک خاموش رہا۔ وہ ہر وقت خاموش خاموش نگاہوں سے فضاؤں کو گھورتا رہتا تھا۔ وہ ٹھوکر کا نشانہ بن چکا تھا۔ اُس کو ایسے لگا جیسے ملاح نے کنارہ دکھا کر خود ہی لوٹ لیا ہو اور کشتی بھی ڈبو دی ہو۔

گلزار کو جب بھی چمن آرا کی یاد آتی تو وہ دھاڑیں مار مار کر روتا۔ اُس کے موٹے موٹے آنسو اُس کے گالوں کا نصف لیتے۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ آخر کار والد کا واحد سہارا ہونے کے ناطے دل پر پتھر رکھ دیا اور زندگی گزارنے کی ٹھان لی۔ منشی فضل الحق نے گلزار کی شادی اپنے دوست منشی عالم دین کی اکلوتی بیٹی ساجدہ سے کر دی لیکن گلزار کو اس شادی سے سکون نہیں مل رہا تھا۔ اُس کی بیوی اُس ساری کہانی سے واقف تھی۔ گلزار رات کو سوتے میں بھی چمن آرا، چمن آرا پکارتا رہتا تھا۔ گلزار اپنے آپ کو کسی بہت ہی تاریک جگہ قید سمجھتا تھا۔ جیسے ایک کنواں سا ہو اور اُس کی دیواروں میں بے شمار اندھیری کھڑکیاں اور روشن دان ہوں اور وہ سخت ذہنی تکلیف میں مبتلا رہتا تھا۔

چھٹی گزارنے کے بعد گلزار سیدھا جموں شہر پہنچا۔ وہ مہاراجہ صلابت خان کو نہیں جانتا تھا کہ یہ وہی مہاراجہ ہے جس نے چمن آرا کو بیاہا ہے۔ وہ تو بے خبر تھا۔ وہ جموں شہر پہنچتے ہی مہاراجہ صلابت سے ملا۔ مہاراجہ صلابت اُس کی قابلیت کو بھانپتے ہوئے محل کا دیوان مقرر کرنے پر رضامند ہو گیا اور خود جزیرہ گھوڑی پہل چلا گیا۔۔۔ کیونکہ اُس کی بیوی وہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ گلزار نے کبھی یہ خواہش نہ کی تھی کہ اُس کی مالکن کا نام کیا ہے۔ وہ بے خبر تھا۔

مہاراجہ صلابت خان نے یہ محل اپنی نئی بیگم کے نام سے منسوب کیا تھا، چمنستان محل۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اطلاع ملی کہ مہاراجہ اور مہارانی کل آ رہے ہیں۔ محل کے تمام نوکر اور دیوان محل کی صفائی میں لگ گئے۔ دوسرے دن صبح چوکیدار نے کہا کہ بیگم صاحبہ آ گئی ہیں اور مہاراجہ اپنی زمینوں کی طرف چلے گئے ہیں۔ گلزار بھی اپنے کمرے سے نکلا تو ہوش گم ہو گئے۔ یہ تو چمن آرا تھی۔ اُسے ایسا لگا کہ برف کا تودہ اُس کے سر پر آ گرا ہو اور وہ اُس کے نیچے دب گیا ہو۔ ہر طرف سے جیسے پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ یہ بیگم صاحبہ تو گویا مہاراجہ کی بیوی تھی۔ اور اس کا آنا بھی اُس کے لئے کسی آسمانی بلا سے کم نہ تھا اُس کو ماضی یاد آ گیا تھا اور چمن آرا کے آخری محبت بھرے الفاظ صدائے بازگشت کی طرح اُس کے کانوں میں زہر گھول رہے تھے اور اُس کی تصویر گلزار کی آنکھوں میں زہر کی طرح سرایت کر رہی تھی۔ قدرت نے کتنی مضبوطی سے اُس کو گھیر لیا تھا اور اب وہ بے بس پرندے کی طرح صرف پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔ وہ مجبور تھا کہ ایک طرف نوکری اور دوسری طرف ماضی جو اب یاد ہی بن کر رہ گیا تھا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ چمن آرا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کاش وہ جانتا کہ ایک دن ایسا آئیگا تو وہ کبھی پیار ہی نہ کرتا۔ وہ سوچتا رہ گیا کہ یہ سب کیا ہے مگر اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا کہ میں اس سے کس طرح انتقام لوں پھر دل کے کسی گوشے سے آواز آئی کہ تم کمزور اور تنہا مقابلہ کیسے کر سکو گے پگلے بھاگ جا یہاں سے بھاگ جا۔

پھر اُسے خیال آیا کہ یہ بزدلی ہے۔ گویا اُس کے دل و دماغ میں ایک جنگ جاری و ساری تھی مگر گلزار کو مالک بہت چاہتا تھا۔ اُس پر وہ مکمل اعتماد کرتا تھا اور چمن آرا اسی کی بیوی تھی۔ گلزار اپنے آپ کو چھپانا چاہتا تھا اور اپنے وجود کو گم کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ تمام ملازم چمن آرا کو سلام کر رہے ہیں۔ وہ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔

چمن آرا نے اپنے نوکر کو بھیجا کہ دیوان صاحب کو بلا لاؤ۔ مگر گلزار نہ گیا۔ نوکر تین دفعہ آیا مگر گلزار نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ چمن آرا کو غصہ آ گیا اور وہ خود اُس کے کمرے میں جانے لگی۔ جب اُس نے گلزار کے کمرے کا دروازہ کھولا تو سامنے گلزار بیٹھا تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی دم بخود ہو گئی اور گلزار نے اُس پر لعن طعن شروع کر دی۔ وہ اُسے چپکی چپکی نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ چمن آرا زار و قطار رونے لگی اور اپنی کہانی سنانی شروع کر دی۔ جب حقیقت کھلی کہ اُس کو اُس کی سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی نے فروخت کر دیا تھا تو اُس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ وہ بار بار اپنا دایاں ہاتھ میز پر مارتا اور پھر آہیں بھرتا رہا۔ چمن آرا اُس کے گلے سے لپٹ گئی۔ چمن آرا نے کہا کہ "یہ کوئی ضروری نہیں کہ انسان جو چاہے وہی ہو جائے اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ کاش قسمت کی ڈور انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتی۔ کیا ہوا کہ آج میں مہاراجہ صلابت کی بیوی ہوں مگر دل میرا ابھی بھی تمہارے پاس ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ میں ہر حال میں تمہاری ہی رہوں گی۔"

اُس دن کے بعد چمن آرا عموماً بیمار نظر آنے لگی اور کچھ ہی دنوں بعد اُس کے ہاں بچی پیدا ہوئی۔ مہاراجہ صلابت خان نے اس بچی کا نام فردوس رکھا۔ بہت پیاری بچی تھی۔ مہاراجہ نے بڑا جشن منایا مگر چمن آرا مسلسل بیمار پڑی رہی۔ کچھ ہی دنوں بعد گلزار کو بھی اطلاع مل گئی کہ اُس کے گھر بھی بچی پیدا ہوئی۔ اور منشی فضل الحق نے پوتی کا نام ناہید رکھا۔ چمن آرا کو ہسٹیریا ہو گیا تھا۔ وہ تو اُسے اُس دن سے ہو گیا تھا جب اچانک گلزار سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ اسپتال میں ہی رہنے لگی۔ مہاراجہ کو بہت فکر لاحق ہو گئی۔ پانچ سال تک وہ مسلسل ہسپتال میں رہی تھی۔ پھر ایک ماہ گھر گزارنے کے بعد دوبارہ اسپتال داخل کرا دیا گیا ہے۔ وہ بالکل پاگل ہو چکی تھی۔ چمن آرا نے شروع ہی دنوں میں

گلزار کو پیار کا واسطہ دے کر فردوس کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ گلزار نے اپنی شاعری کے مجموعہ کا نام فردوس رکھ دیا۔ شاید اسی طرح چمن آرا کی یاد میرے دل میں کتابی شکل میں سمٹی رہے۔

چمن آرا اب بالکل پاگل ہو چکی تھی۔ اُس کا علاج ڈاکٹر اقبال ڈھنگوی اور ڈاکٹر خورشید جیسے لوگ کر رہے تھے۔ دراصل چمن آرا اب تک گلزار سے ملی تھی۔ اُسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں پیار سے بھی شکست کھا چکی ہوں اور دوسرے میرا شوہر گو مہاراجہ ہے مگر ادھیڑ عمر ہے۔ چمن آرا اُس کی دوسری بیوی تھی۔ دولت سے خریدی ہوئی اور مجبوری نے بڑھاپے کا سمجھوتہ تو کروا دیا لیکن دل کا میل نہ ہوا۔ اسی پچھتاوے نے چمن آرا کو ہسٹریا کی صورت دے دی اور ہسٹریا آہستہ آہستہ پاگل پن کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ مہاراجہ کی پہلی بیوی سے اولاد نہ تھی۔ اس کی پہلی بیوی خوددار اور باوقار عورت تھی۔ مہاراجہ کی دوسری شادی برداشت نہ کر سکی اور میکے واپس چلی گئی اور پھر اسی غم میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔

فردوس برطانیہ میں تعلیم حاصل کر رہی تھی اور اُس کی تعلیم مکمل ہونے والی تھی۔ اشرف جو مہاراجہ کا بھانجا تھا۔ فرانس سے تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ اُس کی منگنی فردوس سے ہو چکی تھی۔ اب وہ کاروبار کی خاطر بہت سے ملکوں کا چکر لگا کر آیا ہی تھا کہ اُسے بہاولپور کا سفر کرنا پڑ گیا۔ اُس نے گلزار سے کہا کہ وہ بہاولپور جا رہا ہے۔ لہٰذا گلزار نے کافی تحفے لے کر دیئے کہ میرے گھر پہنچا دینا۔ جب اشرف بہاولپور پہنچا تو وہ گلزار کے گھر گیا اور تحفے وغیرہ پہنچائے۔ ساجدہ بھی گھر موجود تھی اور گلزار کی بیٹی ناہید بھی۔ باتوں باتوں میں اشرف نے بتایا کہ میری منگیتر فردوس برطانیہ سے آنے ہی والی ہے تو پھر آپ سب لوگوں کو شادی پر مدعو کروں گا۔

گلزار کی بیوی خالدہ سے رہا نہ گیا۔ اُس نے کہا "کتنا خوبرو اور خوش اخلاق لڑکا ہے اشرف۔ کاش ہمیں بھی ایسا ہی داماد مل جائے"

ناہید نے شرم سے سرخ ہو کر اور نگاہیں جھکائے ہوئے۔ چائے کی ٹرے ہاتھوں میں لیے بولی "امی آپ تو ہمیشہ بے تکی سوچتی رہتی ہیں" لیکن ماں کا کہا ہوا یہ جملہ اُس کے دل پر نقش ہو گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے اچانک طور پر اس کی بھی یہی دلی خواہش ہو۔

کچھ ہی دنوں بعد فردوس کا خط اور تار گلزار کو موصول ہوا۔ اُس میں لکھا تھا کہ وہ ۱۰ مارچ کو جموں ایئرپورٹ پہنچ رہی ہے۔ گلزار نے مہاراجہ صلابت کو اطلاع دی۔ لہٰذا مہاراجہ سب کاموں کو چھوڑ کر جمنستان محل پہنچا۔ مہاراجہ، گلزار بمعہ تمام نوکروں کے فردوس کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گئے اور ۱۰ مارچ کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔

۱۰ مارچ کی صبح کو دھند میں ڈوبا ہوا راجپوتانہ ایئرپورٹ جموں اچانک برطانیہ سے ابھرتے ہوئے سورج کی کرنوں سے جگمگا اُٹھا۔ اِدھر اُدھر کھڑے چھوٹے بڑے ہوائی جہاز روشنی سے چمکنے لگے۔

لوگ بے چینی سے اُس جہاز کا انتظار کر رہے تھے جو برطانیہ سے آ رہا تھا۔ مہاراجہ صلابت اور گلزار بھی انہی لوگوں میں موجود تھے۔ مہاراجہ کا چہرہ مسرت سے کھلا جا رہا تھا۔ کیونکہ اُس کی لاڈلی بیٹی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے گھر آ رہی تھی اور مہاراجہ نے یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ فردوس کے آتے ہی اُس کی شادی اشرف سے کرے گا تاکہ وہ اپنی اس ذمہ داری سے آزاد ہو سکے۔

فردوس کی آمد کا انتظار میں گلزار بھی بے قرار تھا لیکن وہ اپنی تڑپ اور بے چینی کو ضبط کیے ہوئے تھا۔ وہ اپنی کسی بھی حرکت سے مہاراجہ پر یہ ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا کہ اُسے بھی فردوس سے کسی قسم کی دلچسپی ہے۔ اس لئے اُس نے مہاراجہ کی باتوں کا جواب ہوں یا ہاں کے علاوہ نہ دیا لیکن دل ہی دل میں وہ اُسے دیکھنے کے لئے ترس رہا تھا۔ ایک ایک پل کاٹنا اُس کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے فردوس مہاراجہ کی بیٹی نہیں۔ اُس کی بیٹی ہو۔

اناؤنسر نے برطانیہ سے آنے والی پرواز کا اعلان کیا۔ تمام انتظار کرنے والوں کی نگاہیں رن وے پر جم گئیں اور وہ اس ہوائی جہاز کو دیکھنے لگے جس کے پہیوں نے ابھی ابھی ایئرپورٹ کی زمین کو چھوا تھا۔ گلزار کو خوشی کے ساتھ کسی نامعلوم خوف کا بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ آج برسوں کے بعد اپنی محبت کی یادگار کو دیکھے گا۔ نہ جانے کیا ہو جائے۔ وہ اس خوشی کو برداشت بھی کر سکے یا نہ کر سکے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ اسے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

تبھی اُسے چمن آرا کے الفاظ یاد آ گئے۔ جب اُس نے کہا تھا "کیا کرو گے ان غزلوں کا"

"ایک کتاب کی شکل میں اپنی محبت کی یادگار بناؤں گا"

"کیا نام رکھو گے اپنی محبت کی اس یادگار کا"

"کوئی انوکھا، خوبصورت سا... ابھی سوچا نہیں"

"کہو تو میں تجویز کروں"

"ہاں ہاں کہو"

"اچھا تو پھر..."

"فردوس..."

"وہ رہی فردوس..." مہاراجہ کے اس جملے نے جیسے اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کا تصور جب ٹوٹا تو وہ مہاراجہ کی مسکراتی ہوئی نظروں کا سامنا کرتے ہوئے مسافروں کی اس بھیڑ کو دیکھنے لگا جو ہوائی جہاز کے زینے سے اتر کر آ رہی تھی۔ اس ہجوم میں کئی برقعہ پوش لڑکیاں، عرب خواتین، خوبصورت اور کچھ بے نقاب لڑکیاں تھیں۔ اس لئے گلزار کی نظریں بڑی

بے چینی سے فردوس کو نہ پہچان سکیں۔ وہ بے قراری سے پوچھ بیٹھا۔

"آپ کی بیٹی کون سی ہے۔ مہاراجہ صاحب؟"

"وہ رہی، سُرخ بلاؤز والی۔ اپنی ماں کے بالکل برعکس جیسے کوئی انگریز لڑکی ہو۔" گلزار کی نگاہ اس نوخیز اور مغربی اسٹائل کی حسینہ پر جم گئی جو کسٹم ہال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے دُور سے ہاتھ ہلا کر مہاراجہ کو "سب خیریت ہے" کا اشارہ کیا۔

"شکریہ" مہاراجہ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اور وہ خوشی سے پلٹ کر گلزار کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ اُس سے پوچھ رہا ہو... دیکھا نا میری بیٹی کو لاکھوں میں ایک ہے لیکن گلزار کی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھ کر وہ کچھ حیران سا ہو گیا اور اس سے پہلے کہ وہ گلزار سے کچھ سوال پوچھے گلزار اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے زبردستی مسکراتے ہوئے کہہ اُٹھا۔

"اولاد کی دید کتنی میٹھی ہوتی ہے۔"

"ہاں.. لیکن تم... تمھاری آنکھوں میں آنسو...؟"

"یوں ہی... اپنی بیٹی یاد آگئی۔" گلزار نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ تمھارے گھر والوں کو بھی یہاں بُلوا دوں گا۔"

یہ کہہ کر مہاراجہ صوفہ پر بیٹھ گیا اور گلزار فردوس کی طرف دیکھنے لگا جو کسٹم ہال میں تھی اور اب باہر آنے والی تھی۔

وہی پیشانی۔ وہی آنکھیں۔ وہی ناک نقشہ۔ گلزار کو لگا جیسے اس کے سامنے فردوس نہیں چمن آرا ہے۔ صرف لباس بدل گیا تھا۔ چال ڈھال اور انداز تیکھے ہو گئے تھے۔ چہرے پر شرم و حیا اور سادگی کی جگہ میک اپ نے لے لی تھی۔ صرف ماں کا گورا رنگ نہ لے سکی تھی لیکن اس گندمی رنگ میں بھی وہ ماں سے کم خوبصورت نہ لگ رہی تھی۔ وہ ماضی کی سنہری روپہلی کہکشاں میں اُڑتا چلا گیا اور اُس چمن آرا کے تصور میں اپنا جی بہلانے لگا جسے برسوں پہلے وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اُس سے چھین لیا تھا۔

"چمن آرا..." اس کے تھرتھراتے ہونٹوں پر ایک سسکی نے جنم لیا۔

"ہاں... کیا کہا؟" مہاراجہ کی آواز نے گلزار کو چونکا دیا۔ "جی کچھ نہیں۔ فردوس کی باری آنے میں اب دیر نہیں۔" گلزار نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا۔

گلزار کو مخاطب کرتے ہوئے مہاراجہ نے کہا "تمھیں یاد ہے کہ چمن آرا نے فردوس کی تعلیم اور تربیت نئے زمانے کے مطابق کرنے کو کہا تھا تاکہ وہ زندگی میں کسی کی محتاج نہ ہو۔"

گلزار نے کہا۔ "انھوں نے ٹھیک سوچا تھا۔ ورنہ اتنی بڑی جاگیر اور کاروبار کی اکلوتی وارث کا مستقبل خطرے میں پڑ جاتا۔"

اتنے میں فردوس کو باہر آتے دیکھ کر مہاراجہ اور گلزار اُس کی طرف لپکے۔

"ہلو پاپا"۔ اپنی میٹھی آواز میں کہتے ہوئے فردوس اپنے باپ سے لپٹ گئی۔

"میری بچی" مہاراجہ نے اُسے اپنی باہوں میں جکڑتے ہوئے کہا اور اُس کی پیشانی کو چوم لیا۔ یہ منظر دیکھ کر گلزار کے بدن میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی مگر وہ خاموش اپنی جگہ پہ کھڑا رہا۔

فردوس نے اچانک جب اس اجنبی کو دیکھا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اُسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اجنبی کوئی اور نہیں اس کے باپ کا دیوان ہے۔

"میرا دیوان..."

مہاراجہ نے بیٹی کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے گلزار کا تعارف کروا دیا۔

"ہیلو" وہ مسکراتے ہوئے دھیمی آواز میں کہہ اُٹھی۔

"میری بیٹی... فردوس..." مہاراجہ نے مسکرا کر گلزار سے کہا۔

گلزار کے ہونٹ کچھ کہنے کو تھرتھرا رہے تھے کہ شوخ اور شریر فردوس چہک اُٹھی۔

"آپ کافی شرمیلے معلوم ہوتے ہیں گلزار انکل۔"

"تمھیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"اشرف کے خطوں میں اکثر آپ کا ذکر ہوتا تھا۔"

"اچھا یا بُرا؟" گلزار نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"اچھا... اور بہت اچھا.. لیکن آپ تو مجھے اس سے بھی زیادہ اچھے لگ رہے ہیں۔"

گلزار نے سامان اُٹھایا اور مہاراجہ اور فردوس کے پیچھے پیچھے چل دیا مگر پورے راستے میں گلزار کے کان فردوس کی آواز پر لگے رہے اور نگاہیں اُس کو دیکھے جا رہی تھیں۔

"اشرف نہیں آیا؟" چلتے چلتے فردوس نے باپ سے پوچھا۔

"نہیں... وہ بہاولپور گیا ہے۔"

"کیوں...؟"

"کاروبار کے سلسلے میں۔"

فردوس نے کہا "اُس نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں خود برطانیہ آؤں گا لینے کے لیے۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ نپٹ لوں گی اُس سے..."

جب موٹر کار میں بیٹھ کر سب گھر کی طرف چلے تو فردوس مہاراجہ


حُسن ودلکشی کا مہکتا پیغام کوہِ نور ٹائلٹ سوپ
کوہِ نور ٹائلٹ سوپ کے تازگی بخش اجزا رنگ رُوپ نکھارتے ہیں
حُسن و دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں اور آپ کو دن بھر تر و تازہ رکھتے ہیں۔
Kohinoor
جلد ملائم، ریشم جیسے جھاگ
حُسن کو دیتا ہے ایک نیا انداز
کوہِ نور
ٹائلٹ سوپ

کی بغل میں بیٹھی چہک رہی تھی اور اُسے برطانیہ اور کالج کی تمام باتوں سے آگاہ کئے جا رہی تھی۔

گلزار کار کی فرنٹ سیٹ پر غلام رضا کے برابر بیٹھا ہوا کار کے شیشے میں مسلسل فردوس کے انداز کو دیکھے جا رہا تھا اور وہ بے چین تھی کہ کس وقت مہاراجہ سے اپنی ماں کا پوچھے مگر اُسے کوئی پروا نہ تھی۔

باتوں ہی باتوں میں فردوس نے اپنی سالگرہ کا جشن منانے کے لیے مہاراجہ سے منظوری لے لی اور جشن چمنستان میں منانے کو کہا۔ پھر وہ اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھ بیٹھی۔

"میری امی نہیں آئیں گی اس جشن میں؟"

مہاراجہ نے کہا: "نہیں۔ کیونکہ اُن کا مرض بڑھ گیا ہے اور ڈاکٹروں نے منع کر رکھا ہے۔"

"لیکن میں امی سے ملنا چاہتی ہوں۔" فردوس نے کہا۔

مہاراجہ نے غصہ سے کہا: "نہیں مل سکتیں کیونکہ اُسے تکلیف ہو جاتی ہے۔"

پھر فردوس چپ ہو کر گاڑی میں بیٹھی رہی۔

گاڑی چلتی رہی اور گلزار بیٹی کی بے بسی اور چمن آرا کے پاگل پن کا احساس کرتے ہوئے اپنے دل کو دباتا رہا۔

اچانک گلزار کی نگاہ پھر سامنے لگے ہوئے آئینے پر پڑی۔

فردوس کار کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی اور غصہ اُس کی ناک پر اٹھتی ہوئی آنچ کی طرح لہرا رہا تھا۔ اُسے اچانک چمن آرا یاد آ گئی۔ غصے میں اکثر وہ بھی اسی طرح سُرخ ہو جاتی تھی، جب بھی اُس کی سوتیلی ماں اُس پر ظلم ڈھاتی۔ وہ اسی بے بسی سے اپنے مرحوم باپ کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ کتنی یکسانیت تھی دونوں میں... وہ اپنے باپ کے لئے تڑپتی تھی اور فردوس اپنی ماں کے لیے بے قرار تھی۔

ایک چیخ نما آواز کے ساتھ بریک لگے اور موٹر کار گھوم کر مہاراجہ کے محل میں داخل ہو گئی۔ موٹر کار رکتے ہی تمام نوکر اُس کی طرف لپکے۔ جونہی فردوس موٹر کار سے باہر آئی، نوکروں نے مسکراہٹ اور پھول نچھاور کر کے استقبال کیا۔ مہاراجہ نے چند نوٹ اُس کے سر سے وار کر نوکروں کو دیئے۔ پھر اچانک گلزار کو دیکھ کر اُسے پانچ سو ٹکے دینے کی کوشش کی مگر اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ غریبوں اور یتیموں کا حق ہے۔"

"تو تم اُن میں سے نہیں؟" مہاراجہ نے طنزیہ کہا۔

"جی نہیں۔ میں کوئی امیر نہیں اور نہ ہی محتاج ہوں۔ میرا تعلق شریف خاندان سے ہے۔ جائداد بھی تھوڑی بہت ہے اور فردوس جیسے آپ کی بیٹی ہے ویسے ہی میری۔ میں اس کا صدقہ کیسے لے سکتا ہوں۔ اس کا صدقہ تو مجھے بھی اُتارنا چاہیئے۔"

فردوس کو اُس کی یہ خودداری بہت پسند آئی۔

نہ جانے کیا سوچتے ہوئے فردوس نے فوراً اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے شیفرڈ کا ایک خوبصورت پن نکال کر گلزار کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"یہ لیجئے..."

"لیکن...؟" وہ ذرا ہچکچایا۔

"میں جانتی ہوں یہ آپ کے لئے معمولی چیز ہے لیکن لے لیجئے۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ آپ کو کچھ نہ دوں۔"

"یہ تمہارے لئے معمولی ہو گا لیکن میرے لئے بے حد قیمتی ہے۔ اس سے خوبصورت تحفہ تم مجھے اور کیا دے سکتی تھیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اُس پن کو چوم لیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ زندگی کا وہ منظر گھوم گیا جب وہ ایک روز سکول کے باہر چمن آرا کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ امتحان دینے جا رہی تھی اور اُس نے اُسے پارکر کا ایک پن دیتے ہوئے کہا تھا "میری طرف سے ایک معمولی تحفہ... اس پن سے لکھو گی تو تمام پرچے اچھے ہوں گے۔"

"اور اگر میرے پرچوں پر اس کم بخت نے عاشقانہ اثر کیا تو...؟"

"تو کیا ہوا... یہ امتحان نہ سہی عشق کا امتحان تو پاس کرو گی۔"

اور چمن آرا یہ کہہ کر چلی گئی تھی کہ خدا کرے آپ کے اس قیمتی تحفہ کی برکت سے میں زندگی کے ہر امتحان میں کامیاب رہوں۔

کتنی سادگی تھی اس جملے میں کتنا بھولا پن تھا اس ادا میں۔

کتنی کشش تھی اس انداز میں۔ یہ سوچتے ہی گلزار کا جی بھر آیا اور اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور اُسے ارد گرد سناٹا محسوس ہونے لگا۔ اپنے دل کی دھڑکن کے سوا اور کچھ نہ سنائی دے رہا تھا۔

"کہاں کھو گئے گلزار انکل؟"

"نہیں نہیں۔" کہہ کر اُس نے فردوس کو ٹال دیا۔

وہ اتنی تیزی سے اندر گئی کہ شاید آرٹسٹی ہوا اور اشرف کو ٹیلی فون کیا۔ ٹیلی فون ملانے کے بعد نوکر کو کہا کہ اشرف کو بولو کہ فردوس پیرس چلی گئی ہے۔ نوکر نے اسی طرح کہہ دیا اور وہ بہت پریشانی کی حالت میں بار بار ٹیلی فون کرتا رہا کہ وہ وہاں کیوں گئی ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے گلزار کو ترس آیا اور وہ پوچھ بیٹھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔

فردوس نے جواباً کہا: "مجھے تڑپانے میں مزہ آتا ہے۔"

اُس کا یہ جواب سُن کر گلزار کے ماتھے پر شکنوں کا جال سا بچھ

گیا اور وہ زندگی کی اس تڑپ کا احساس کرنے لگا جب وقت کے ساتھ ناسور بن کر ہر وقت چمن آرا اُس کے دل میں رِستی رہتی تھی۔

آج اُس کی زندگی کی وہ تڑپ ایک نیا روپ لے کر اُس کے سامنے آگئی تھی۔ فردوس... اُس کی محبوبہ کی بیٹی۔ چمن آرا کی محبت کی نشانی۔ ۔ اُس کی شاعری کے مجموعے کا نام ... تو اس کی محبت کی ساری دلکشی سارا حسن اور سارا سوز اپنے سینے میں چھپائے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گمنامی کے اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔

فردوس نے قریب آکر گلزار سے بات چیت کا موضوع شروع کیا: جناب گلزار انکل! آپ کی بیوی کہاں ہے؟"

"بہاولپور میں...!"

"آپ کے بچے بھی تو ہوں گے؟" فردوس نے اچانک سوال کر دیا۔

"ہیں۔ ایک لڑکا... ایک لڑکی..."

"کتنے بڑے ہیں؟"

"لڑکا کوئی دس برس کا اور لڑکی تمہاری عمر کی..."

"آپ کو اُن کی یاد تو آتی ہوگی؟"

"کیوں نہیں۔ بچوں سے بڑھ کر خدا کی کوئی دین نہیں۔ اُنھی کے لئے تو انسان جیتا ہے۔"

"تب تو آپ میری ضرور مدد کریں گے۔"

"کیسی مدد؟" گلزار نے پوچھا۔

"کیا آپ مجھے میری امی سے ملائیں گے؟"

"لیکن تمہارے والد صاحب..."

"لیکن میں تو چھپ کر ملنا چاہتی ہوں۔ ایک بار اپنی امی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے وہاں تک لے جائیں۔ مہاراجہ صاحب کو پتہ نہ چلے گا۔"

"میں اس بارے میں سوچوں گا۔" گلزار نے کہا۔

"نہیں آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ آپ کو اپنی ناہید کی قسم..."

"فردوس..." وہ چیختے چیختے رہ گیا۔ اُس کا دل تڑپ اُٹھا اور وہ انکار نہ کر سکا۔ اُس نے گردن ہلا کر ہاں کہہ دیا۔

آج رات گلزار کی پریشانی کی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ فردوس نے شراب پی رکھی تھی اور ریکارڈ بج رہا تھا اور خود ناچ رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ شاید مغربی تعلیم اچھی ہوگی مگر آج پتہ چلا کہ مغربی تعلیم بے حیائی کے سوا کچھ نہیں۔

دوسرے دن گلزار فردوس کو لے کر اسپتال پہنچا اور فردوس کو اندر اپنی ماں کے پاس بھیجا اور دل ہی دل میں وہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ ایسا نہ ہو مہاراجہ کو پتہ چل جائے۔ تقریباً ملاقات ایک گھنٹہ تک رہی پھر واپس آگئے۔

اشرف کی آمد کا انتظار تھا تاکہ فردوس کی سالگرہ میں شرکت کر سکے۔ اتنے میں گھنٹی بجی اور اشرف آگیا۔ نوکروں نے کہا۔

فردوس نے جب یہ خبر سُنی کہ اشرف آگیا تو خوشی سے ناچنے لگی تھی۔ دوسرے دن سالگرہ کا جشن تھا۔ تمام انتظامات مکمل تھے۔ اُسی رات جشن کے بعد گانے بجانے کا پروگرام بھی تھا۔ اشرف اور فردوس نے حد سے زیادہ شراب پی لی تھی اور دونوں آپے سے باہر تھے۔ گلزار سے برداشت نہ ہو رہا تھا لیکن کیا کرتا۔ آخر اُس نے بھری محفل میں مہاراجہ کو اپنے کمروں میں پہنچایا۔

مہاراجہ نے بھی بہت زیادہ شراب پی لی تھی اور وہ بھی اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ آخرکار نوکروں نے اس کی مدد کی اور وہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ گلزار نے دیکھا کہ گہری خاموشی اور سناٹا ہے جیسے اس کے باقی مہمان شراب اور ناچ گانے سے بے سُدھ ہو گئے تھے۔

فردوس کی تعلیم مغرب میں ہوئی تھی۔ وہ چھوٹی موٹی بُرائی کو بُرائی نہ سمجھتی تھی۔ گلزار دن بدن فردوس کی عادتیں دیکھ دیکھ کر نیلا پیلا ہو رہا تھا۔ اس نے کئی دفعہ دیکھا کہ وہ نیم عریانی میں اشرف اور دیگر نوکروں کے سامنے آ جاتی تھی۔ بعض اوقات وہ اشرف کے ساتھ آدھی رات میں ناچتی تھی۔

ایک دن اشرف کے ایک دوست نے ایک بڑی پارٹی کا اہتمام کیا۔ مہمانِ خصوصی فردوس اور اشرف تھے۔ ویسے اشرف اور فردوس کا آپس میں بہت پیار تھا۔ ایک دوسرے کے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ یہ دیکھ کر گلزار کو اپنا ماضی یاد آتا اور وہ بغیر آنسوؤں کے کچھ نہ کر پاتا۔ اس پارٹی میں اشرف اور فردوس دیکھنے کے لائق تھے۔ دونوں نے شراب پینے کی حد کر دی تھی اور فردوس تو ہوش سے باہر تھی۔ اُس نے اپنا لباس اُتار دیا اور ناچنے لگی۔ گلزار سے نہ رہا گیا۔ اُس کو فردوس کے بجائے اپنی بیٹی ناہید نظر آنے لگی۔ وہ اپنی نشست سے اُٹھا اور دوڑ کر اُس تک پہنچا اور جاتے ہی دو تین تھپڑ دے مارے۔ فردوس نشے کی حالت میں دوڑنے لگی کہ اتفاقاً وہ ایک کھڈ میں جا گری۔ اُس کو باہر نکال کر اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی مگر بے سُود۔ وہ مر چکی تھی۔ اس واقعے کا علم مہاراجہ کو نہ تھا اُسے بتایا گیا کہ گلزار نے بُری نیت سے فردوس کا قتل کر دیا۔ اُس نے فوراً گلزار کو گرفتار

کروا کر جیل بھجوا دیا۔

اشرف اور مہاراجہ غم میں نڈھال تھے اور دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ خوشنما اور عالی شان چمنستان محل جسے مہاراجہ صلابت خان نے اپنی بیگم چمن آرا کی خوشیوں کا آشیانہ بنایا تھا۔ نہ جانے اس زمین پر افتادگی تھی یا کسی کی بددعا تھی کہ چمن آرا اس میں آتے ہی پاگل ہوگئی اور آج اس محل میں اس کی بیٹی فردوس کی قبر کھودی جا رہی تھی۔

گلزار کی گرفتاری اور میڈیکل سرٹیفکیٹ کے بعد پولیس نے فردوس کی لاش کا پوسٹ مارٹم بھی نہ کیا اور اب اس کی لاش چمنستان محل میں آ چکی تھی۔ مہاراجہ کے احباب و رشتہ داروں نے اس کی قبر کو گھیر رکھا تھا جس کے کنارے فردوس کا جنازہ رکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر ہزار روکنے کے باوجود بھی لوگوں کے آنسو لرز رہے تھے۔ وہ کبھی اس لاش کو اور کبھی مہاراجہ کے پتھرائے چہرے کو دیکھتے اور ٹھنڈی آہیں بھر کر رہ جاتے۔ اس سے کچھ فاصلے پر اشرف بھی اپنی تقدیر پر آنسو بہا رہا تھا۔

فردوس کے دفن کی تیاریاں ہو چکی تھیں اور لوگ بے چینی سے اس گاڑی کا انتظار کر رہے تھے جس میں فردوس کی پاگل ماں چمن آرا کو لایا جانا تھا۔ مہاراجہ تو اسے بلانے کے حق میں نہ تھے لیکن ڈاکٹر اقبال ... کے مشورے پر وہ مجبور ہو گیا تھا۔

موت کے اس سناٹے کو اسپتال کی گاڑی نے توڑ دیا جو ابھی ابھی چمنستان محل کے گیٹ میں داخل ہوئی تھی۔ ہجوم میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہر کوئی اس سفید گاڑی کو دیکھنے لگا۔ اس گاڑی کے پیچھے ڈاکٹر اقبال .... کی گاڑی تھی۔ وہ بھی آکر اس گاڑی کے پیچھے رک گئی۔ ڈاکٹر اقبال ... اور ڈاکٹر خورشید ... گاڑی سے نیچے اترے اور اس سفید گاڑی کی طرف بڑھے جس میں وہ چمن آرا کو لائے تھے۔

پاگل چمن آرا جب گاڑی سے اتری تو سب سے پہلے ڈاکٹر اقبال ... اور ڈاکٹر خورشید نے اس کا سامنا کیا۔ وہ نرسوں کا سہارا لیے ہوئے دو قدم چل کر رک گئی اور ہجوم کو دیکھ کر گھبرا گئی تبھی ڈاکٹر اقبال اس کے قریب چلا آیا اور بولا "چلو بھابی"۔ اس نے پتھرائی نظروں سے پہلے ڈاکٹر اقبال ... اور پھر ڈاکٹر خورشید ... کو دیکھا۔ ڈاکٹر اقبال نے اسے اپنے بازو کا سہارا دیا اور نرسوں کو الگ رہنے کا اشارہ کیا۔ جو اسے تھامے ہوئے اس طرف بڑھنے لگا جہاں اس کی بیٹی کی لاش کو رکھا گیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہجوم کی طرف جا رہی تھی تو لوگوں نے احتراماً نگاہیں جھکا لیں۔

چند لمحوں کے بعد خاموشی چھا گئی۔ چونکہ اب لوگوں کی نظریں چمن آرا پر تھیں کہ وہ کیا کرے گی۔ ڈاکٹر خورشید ... [illegible] نزاکت

کی نزاکت کا جائزہ لگانے کی کوشش میں تھے۔

مہاراجہ اور اشرف جنازے کے قریب کھڑے تھے۔ ان کے دل کی دھڑکن اس گھڑی کی بڑی بے چینی سے منتظر تھیں کہ کب چمن آرا اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھے گی۔ کہیں وہ اپنی بیٹی کا چہرہ ہی نہ نوچ لے۔ اس خیال کے آتے ہی مہاراجہ تڑپ سا گیا۔ اس کے بدن کا خون جوش کھانے لگا۔ وہ ڈری ہوئی نظروں سے چمن آرا کو دیکھنے لگا جو اپنی بیٹی کے جنازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چمن آرا جنازے کے قریب آکر رکی اور سفید چادر میں لپٹی ہوئی بیٹی کی لاش کو حیرت سے دیکھنے لگی اور چپ چاپ کھڑی پتھرائی ہوئی نظروں سے اس جنازے کو دیکھے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر اقبال اسے چھوڑ کر ایک طرف چلے گئے۔ مہاراجہ اور اشرف آہستہ آہستہ چلتے ہوئے چمن آرا کے سامنے چلے گئے اور اس کی گھبرائی ہوئی صورت کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے کسی بحالی کی آمد کا انتظار ہو۔ چمن آرا جنازے کے پاس کھڑی تھی۔ مہاراجہ نے وقت کو دیکھتے ہوئے میت کا منہ ننگا کر دیا۔ چمن آرا نے پہلے چہرے کو دیکھا پھر مہاراجہ کو۔ آج اس نے اپنے شوہر سے نفرت یا ناراضگی کا کوئی اظہار نہ کیا۔ وہ چپ چاپ اپنی بیٹی کے پاس بیٹھ گئی۔ اور اسے غور سے دیکھنے لگی جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ اس نے ہجوم کی طرف دیکھا۔ اور آہستہ آہستہ سے اشارہ کر رہی تھی کہ میری بیٹی سو رہی ہے۔ پھر پیار بھری نظریں بیٹی پر جما دیں۔ اس نے اپنی مومی انگلیوں سے فردوس کے بالوں میں کنگھی کی اور یکایک اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ فردوس کا نام لے کر چیخ ماری۔ چمنستان کی دیواروں سے جب وہ دردناک چیخ ٹکرائی تو ماحول میں جیسے زلزلہ آ گیا تھا۔ ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر خورشید ایک جھٹکے سے ہلے اور رک گئے اور اس عورت کو جو پاگل تھی دیکھنے لگے جو آج ایک مدت کے بعد درد سے چلائی تھی۔ جس نے اپنی مردہ بیٹی کو پہچان لیا تھا۔ چمن آرا اپنی بیٹی کا نام لے کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور زور زور سے پکار رہی تھی کہ تمہیں کس نے مار ڈالا۔ وہ کون ہے میں اس کا خون پی لوں گی۔ فردوس میری بیٹی۔ تم چپ کیوں ہو۔ بولو نا۔ مجھے ایسا چھوڑ کر نہ جاؤ۔

پھر چمن آرا کو فردوس کی لاش سے ڈاکٹروں نے علیحدہ کیا اور پھر وہ زور سے رونے لگی "نہیں۔ مجھے بیٹی سے جدا نہ کرو" وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی اور نرسوں نے اسے چمنستان محل میں پہنچا دیا۔ جہاں ڈاکٹر خورشید ... بھی محل کے اندر چلا گیا اور مہاراجہ کو اشارہ کیا کہ آپ نہ آئیں۔

بیگم چمن آرا کے جانے کے بعد لوگوں نے میت قبر میں امانتاً [illegible]

اجازت مہاراجہ سے چاہی۔ مہاراجہ نے گلوگیر ہو کر اجازت دے دی۔ پھر آہستہ آہستہ میت قبر میں اتار دی گئی۔ آج مہاراجہ نے اپنی فردوس کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا تھا جو اس کی زندگی کا اکیلا اور آخری سہارا تھی۔ اُس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی آہستہ آہستہ سوئیاں چبھو چبھو کر آنکھوں کی روشنی چھین رہا ہو۔ اس کی فردوس جس کے چہرے پر کبھی اُس نے دھول نہ بیٹھنے دی تھی۔ آج جب خود مٹھی بھر مٹی اس کی قبر پر ڈالی تو اس کی دردبھری چیخ نکل گئی کیونکہ جس بچی کو اس نے پھولوں کی طرح پالا تھا آج خود ہی دفنا رہا تھا۔ فردوس کو دفنانے کے بعد سبھی لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے۔ دوپہر شام میں ڈھل گئی اور شام آہستہ آہستہ اندھیری رات کا روپ دھارنے لگی۔ ایک بہت بڑا طوفان گزر گیا تھا اور اپنے پیچھے سسکیاں اور آہیں چھوڑ گیا۔

ایک ایسا ہی سناٹا مجرموں کی جیل میں گلزار کے گرد چھایا ہوا تھا جو آہنی سلاخوں کے پیچھے رات کے اس اندھیرے میں تنہا بیٹھا تھا۔ اپنی بے بسی پہ رو بھی نہ سکتا تھا۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ بدن پر پڑی کوڑوں کی نیلی لکیروں میں بھی درد کا احساس نہ تھا صرف ایک خیال اس کے ضمیر کو بار بار ڈس رہا تھا۔ وہ اُن بے گناہی کی بھی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ اس کی محبت ہی اس کی تباہی اور رسوائی بن جائے گی۔ اس وقت اس کی سوچ کا دھارا مجرموں سے بہاولپور چلا گیا اور چمن آرا اور فردوس کی جگہ اپنی بیوی اور بیٹی کے چہرے اُس کے سامنے اُبھر آئے۔ تند اور دولت مند مہاراجہ کی جگہ اُسے اپنا بوڑھا باپ نظر آنے لگا۔ اُن سب کا یہ سوال تھا۔ گلزار! تم نے یہ کیا کیا؟ اور اس سوال کا جواب اُس کے پاس نہ تھا۔ وہ گھٹنوں میں اپنا چہرہ چھپا رہا تھا تب ہی گھبرا کر وہ چونکا سامنے ڈاکٹر اقبال . . . سلاخوں کے باہر کھڑا تھا۔

گلزار کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ وہ ڈاکٹر اقبال کی آنکھوں میں جھانکنے لگا جو آج اُسے اجنبی کی طرح دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر اقبال نے کئی سوال کیے مگر وہ خاموش رہا۔ "تم نے کبھی یہ سوچا کہ تم تو موت کو گلے لگا لو گے لیکن تمہاری بیوی، بچے اور بوڑھے باپ پر کیا بیتے گی۔" ڈاکٹر اقبال نے تو اس کی مدد کرنے کو کہا لیکن گلزار نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ موت میرا مقدر ہے کیونکہ یہاں کا قانون جان کا بدلہ جان ہے۔

"بے شک گلزار مگر یہ خون تم نے نہیں کیا۔ فردوس جیسی معصوم لڑکی پر تمہاری بری نظر نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ تم بے گناہ ہو۔ پھر تم نے پولیس کے آگے اپنے ہونٹ کیوں سی لئے۔ یاد رکھو تمہاری خاموشی کئی زندگیوں کی تباہی کا سبب بنے گی۔"

گلزار نے ڈاکٹر اقبال سے التجا کی کہ وہ میرے گھر نہ جائے گا لیکن ڈاکٹر اقبال نے کہا کہ وہ کل شام جابر ایکسپریس پر یہاں پہنچ رہے ہیں۔ پھر گلزار دھاڑیں مار مار کر رونے لگا کہ میرے والد کو روکیے۔ ڈاکٹر جانی روکیے۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر اقبال جا چکا تھا۔

اپنے باپ کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ وہ اپنی بیوی بچوں کو کیا جواب دے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل میں جیسے سینکڑوں بچھو ایک ساتھ رینگ رہے ہوں۔

دوسرے دن مہاراجہ عدالت جانے کے لیے تیار ہوا تو ڈاکٹر خورشید کو دیکھ کر چونک سا گیا لیکن ڈاکٹر خورشید نے کہا۔ میں خوشخبری لایا ہوں کہ آپ کی بیوی کا پاگل پن جاتا رہا۔ وہ بڑا متعجب ہوا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ بیٹی کے صدمے نے ان کی دماغی نسوں کو ڈھیلا کر دیا جو بری طرح سے کھنچی ہوئی تھیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے سے سینے کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اور وہ اب بالکل نارمل ہیں اور ہوش و حواس کی باتیں کر رہی ہیں۔

یہ سن کر مہاراجہ نے ٹھنڈی آہ بھری اور پھر خوشی سے اپنے آنسو صاف کرنے لگا۔ تقدیر نے یہ کیسا مذاق کیا کہ بیٹی کی موت ماں کی زندگی بن گئی۔ ڈاکٹر خورشید نے کہا کہ کل رات اُس نے نہ جانے کتنی بار آپ کو پوچھا۔

"میرے بارے میں؟" مہاراجہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں آپ کے لئے وہ بڑی پریشان ہیں۔"

"ڈاکٹر ٹھہرو۔ میں ابھی تیار ہو کر اس سے ملنے جاتا ہوں۔"

"آپ کے جانے کی ضرورت نہیں وہ خود چل کر آئیں گی۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"کب؟" مہاراجہ نے کہا۔

اس سے پہلے کہ مہاراجہ کی بات کا ڈاکٹر خورشید کوئی جواب دیتا۔ کسی کی آہٹ سن کر مہاراجہ کی نگاہیں گیٹ پر رک گئیں۔ جہاں چمن آرا سیاہ لباس میں غم کی تصویر بنی اشرف کے ساتھ کھڑی تھی اور اپنے شوہر کو غم آلود آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"لیجئے وہ آ گئیں۔" ڈاکٹر خورشید نے چمن آرا کی طرف اشارہ کیا۔

"بیگم!" مہاراجہ نے کہا اور چمن آرا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اُس کی طرف بڑھی۔

"تمہاری فردوس سے مل کر آ رہی ہوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کہاں...؟"

"چمنستان میں۔ بڑے سکون سے سو رہی ہے۔"

"گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زندگی کے غم تو انسان کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔" مہاراجہ نے بیوی کی ہمت بڑھاتے

ہوئے اپنے سینے کے درد کو چھپانے کی ایک ناکام کوشش کی۔ ذرا تک کر پھر اس کی دلجوئی کرنے لگا۔ "اچھا ہوا کہ تم آگئیں ورنہ اس گھر میں میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ میں پاگل ہو جاتا۔ اور اب چلو میں تمہیں سونے کے کمرے تک چھوڑ آؤں۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"عدالت جا رہا ہوں۔ آج اس خونی کے مقدمے کی سنوائی ہے۔"

"تم اس کی سزا تو جانتے ہو؟"

"ہاں۔ سرِعام اس کا سر قلم ہوگا۔ خون کا بدلہ خون۔" چمن آرا نے سونے کے کمرے میں آتے ہی دروازے کا تالا لگایا اور زور زور سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

اور اب اس کے دل کی جگہ ایک انتقام بن چکی تھی کیونکہ اسپتال میں اُسے اشرف سے فردوس کے قتل کی تفصیل مل چکی تھی۔ اُس کی بیٹی کا قاتل کوئی اور نہیں اُس کا پرانا عاشق گلزار تھا۔ جس کی تصویر بھی اُس نے اخباروں میں دیکھی تھی۔ چمن آرا نے اپنی بیٹی کا نام اپنی محبت کی یادوں کو زندہ رکھنے کے لئے فردوس رکھا تھا۔ آج اسی محبت نے شیطانی روپ دھار کر محبت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وہ گلزار کو بے وفا، دغاباز سمجھنے لگی تھی اور غصے اور سینے کے بے پناہ درد سے پھپک لینے لگی۔

مہاراجہ صلابت کی بہن نورین نے چمن آرا کو بتایا کہ ایک عورت آپ سے ملنے آئی ہے اور اب وہ نیچے گھاس پر بیٹھی ہے۔ چمن آرا سیڑھیوں سے اتر کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔

"کون ہو تم؟" چمن آرا نے ہمدردی سے پوچھا۔

"ایک بدنصیب شوہر کی بدنصیب بیوی۔"

چمن آرا یہ سنتے ہی سمجھ گئی کہ یہ عورت کوئی اور نہیں گلزار کی بیوی ساجدہ ہے۔

"یہاں کیا کرنے آئی ہو؟" چمن آرا نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"اپنا نصیب بدلنے۔"

"میں تمہارا نصیب بدلنے کی قدرت نہیں رکھتی۔"

"اگر چاہو تو میری جھولی مرادوں سے بھر سکتی ہو۔" ساجدہ نے کہا۔

"نصیب تو اس نے میرا بگاڑا ہے محترمہ۔" چمن آرا نے طنزیہ کہا پھر وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ "اس نے میری زندگی کی ہر خوشی چھین لی ہے۔ میری ممتا کے کلیجے میں خنجر مارا ہے۔ میں اس بدکار اور مکار کو کبھی نہیں چھوڑوں گی۔"

"نہیں نہیں بیگم صاحبہ وہ ایسے نہیں ہیں۔ وہ تو ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور بوڑھے باپ کا اکلوتا سہارا ہے اور دو بچوں کا باپ ہے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔"

"مگر اس نے ایسا ہی کیا۔" چمن آرا نے رو روتے کر کہا۔

"یہ ناممکن ہے۔" ساجدہ نے کہا۔

"اس کی خاموشی اس کے گناہ کا کھلا ثبوت ہے۔" چمن آرا بولی۔ "اگر وہ بے گناہ ہے تو عدالت میں اپنی صفائی کیوں پیش نہیں کرتا۔" چمن آرا نے پُرزور الفاظ میں کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی مجبوری ہو۔"

"تم ساجدہ کیا کہنا چاہتی ہو؟" اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔

"چمن آرا تم اپنے دل کی گہرائی میں جاؤ تمہیں سب کچھ نظر آ جائے گا۔"

"وہ گلزار نے تمہیں پٹی پڑھائی ہے۔"

"نہیں بیگم صاحبہ اسے کیا معلوم کہ میں یہاں سہاگ کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔"

"تو پھر تمہیں دل کی گہرائیوں کا کیسے اندازہ ہوا؟"

"میں اُن کی بیوی ہوں۔ اُن کا درد مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے ساجدہ کے آنسو آ گئے اور چمن آرا کچھ سوچنے لگی۔

"اگر حالات کے بے رحم ہاتھ زبردستی اُس کی زندگی نہ بدلتے تو آج تم گلزار کی بیوی ہوتیں۔"

چمن آرا یہ سنتے ہی ایک دم اٹھی اور ایک زبردست چیخ مار کر ساجدہ کی گال پر پوری طاقت سے تھپڑ دے مارا۔

جیسے ساجدہ نے اُس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہو۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے سرخ آندھی میں گھر گئی ہو اور پھر آندھی نے اُسے کسی کھنڈر میں پھینک دیا ہو۔

اتنے میں مہاراجہ صلابت خان اندر داخل ہوا۔ پھر اُس نے چمن آرا سے اس اجنبی عورت کا پوچھا۔ چمن آرا نے جواب میں کہا کہ یہ عورت گلزار کی بیوی ہے۔ یہ سنتے ہی مہاراجہ چونک پڑا۔

"یہاں کیا کرنے آئی تھی؟"

"اپنے سہاگ کی بھیک مانگنے۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے نفرت کے انگارے بھر دیئے اس کی جھولی میں۔"

"بہت اچھا کیا۔ شاید وہ عورت جان کر اپنے شوہر کی رہائی چاہتی ہو۔" مہاراجہ جذبات میں بولا۔

"عدالت میں کیا فیصلہ ہوا؟" چمن آرا نے پوچھا۔

"کل صبح سورج نکلنے سے پہلے سر قلم کر دیا جائے گا۔"

"نہیں نہیں" ایک دردبھری چیخ سُن کر دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ ساجدہ پاگلوں کی طرح رو رہی تھی کیونکہ اُس نے مہاراجہ کی باتیں سب کچھ سُن لیا تھا۔ وہ گھائل ہرنی کی طرح سیدھی مہاراجہ کی طرف بھاگی اور اُس کے قدموں میں گر کر گلزار کی جان بخشی کی بھیک مانگنے لگی۔ اُس نے فرش پر سر مار کر لہولہان کر لیا اور اُس کے دونوں بچے لپٹے اداس سے بیٹھے ہوئے مہاراجہ سے بھیک مانگ رہے تھے۔ ان کے چہرے یوں سفید تھے جیسے باپ کی موت سے پہلے ہی وہ یتیم ہو گئے ہوں۔

مہاراجہ نے نفرت سے ان کو دیکھا اور ساجدہ کو ایک جھٹکے سے اپنے پیروں سے الگ کر دیا اور گرج کر بولا۔

"جان کے بدلے جان۔ یہ ہماری ریاست کا قانون ہے قانون اپنا فیصلہ سُنا چکا۔ ہم اپنی بیٹی کے قاتل کو کسی قیمت پہ معاف نہیں کر سکتے۔"

ساجدہ فرش سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس نے کچھ سوچا۔ اُس کی گردن تن گئی۔ چہرے پر ایک عجیب سی سختی چھا گئی۔ اُس نے ناہید کا ہاتھ پکڑ کر مہاراجہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جان کا بدلہ جان۔ آپ میری بیٹی کی جان لے کر میرا سہاگ مجھے واپس کر دیں۔ میرا گھر برباد نہ کریں۔"

منشی فضل الحق نے تائید کی۔ "مہاراجہ صاحب اللہ جانتا ہے میرا بچہ ایسا تو نہ تھا۔ میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر . . . جان کی بھیک مانگتا ہوں۔ آپ میری بہو کا سہاگ بچا لیں۔" یہ کہتے ہوئے منشی فضل الحق مہاراجہ کے قدموں میں گر گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

مہاراجہ نے اُس کا گریبان پکڑ کر اُسے دھکا دیا تو وہ سیدھا دروازے کی چوکھٹ پر لگا۔ اُس کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ ناہید نے اپنے آنچل سے اپنے دادا کی پیشانی پہ سے خون صاف کیا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ اُس کا منہ نوچ لے مگر وقت کی نزاکت سے مجبور تھی۔ آخر کار سب اپنے ٹوٹے ہوئے دلوں کو لے کر بیٹھ گئے۔

منشی فضل الحق نے کہا۔

"پہلے بڑا سنتے تھے کہ مہاراجے بڑے رحمدل ہوتے ہیں مگر یہاں آکر پتہ چلا کہ یہ لوگ پہاڑوں میں رہ رہ کر پتھر کی طرح بن گئے ہیں۔ آخر فریاد کا ان پر کیا اثر پڑے گا۔"

مہاراجہ کے محل کے پچھواڑے ڈاکٹر اقبال اپنی گاڑی میں بیٹھا ساجدہ بھابی اور منشی فضل الحق کا انتظار کر رہا تھا جوں جوں دیر ہو رہی تھی۔ وہ بے چینی میں مبتلا ہوتا جا رہا تھا کیونکہ ساجدہ کو چمن آرا سے ملنے کا مشورہ اُسی نے دیا تھا۔ وہ اُس ملاقات کا نتیجہ جاننے کے لئے بے تاب تھا مگر جب اُس نے منشی فضل الحق ساجدہ اور بچوں کے آنسو دیکھے تو وہ سمجھ گیا۔

ڈاکٹر اقبال نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں بھابی۔ یہ تو ہماری ایک کوشش تھی۔ کیا ہوا کہ انھوں نے ٹھکرا دی۔ خدا کا دربار ابھی کھلا ہے۔" پھر سب کو سوار کر کے چل دیا۔ "خدا کا دربار ابھی کھلا ہے شاید فیصلہ گلزار کے حق میں ہو جائے۔" زندگی پر سے جب اعتبار اُٹھ جائے تو سہارے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ امید کی آخری کرن بھی مایوسی کے اندھیروں میں ڈوب جاتی ہے تو انسان صرف اللہ کا سہارا لیتا ہے۔ یہی حال منشی فضل الحق اور ساجدہ کا تھا۔ ڈاکٹر کی دی ہوئی تسلی کے سہارے وہ گھر پہنچے۔

اُسی شام جب مہاراجہ گلزار کے کمرے میں گیا تو اُس کی چیزوں کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں اور اُس نے فتح خان سے کہہ دیا کہ ان سب چیزوں کو ڈاکٹر اقبال . . . کے گھر پہنچا دو جہاں گلزار کے بیوی بچے ٹھہرے ہیں۔

مہاراجہ نے گلزار کی الماری کھول کر تمام چیزیں باہر پھینکوا دیں اور قالین کو بھی پھینکوانا چاہا تو اُس وقت ایک موٹی سی ڈائری نما کتاب اُس کے قدموں میں گری اور اُس کے کھلتے ہی وہ تصویر باہر نکل آئی جو گلزار اور چمن آرا کی تھی۔ وہ دیکھتے ہی مہاراجہ پر سناٹا چھا گیا۔ اُس نے چوروں کی طرح نوکروں کی آنکھ بچا کر اُس ڈائری کو جلدی سے اٹھا لیا۔ اُس وقت تمام نوکر سامان بکسوں میں بند کر رہے تھے۔ اُس نے جھک کر تصویر بھی اٹھا لی۔ اُسی ڈائری میں گلزار کی لکھی ہوئی شاعری تھی جس کے پہلے صفحہ پہ سنہری حروف میں اُس کا نام لکھا تھا۔ "فردوس"

یہ نام پڑھتے ہی اُس کی رگوں کا کھولتا ہُوا خون ٹھنڈا ہو گیا۔ اُسے کس قدر پسینہ آیا کہ وہ نہا سا گیا جب اُس نے ورق اُلٹا تو اُس میں لکھا تھا۔

"اس پیلر کے نام:"

اب مہاراجہ کچھ سوچ میں پڑ گیا کہ میں کیا کروں۔ اُسے علم ہو چکا تھا کہ چمن آرا کبھی اُس سے محبت کرتی تھی۔ اُس نے تمام نوکروں کو حکم دیا کہ سامان جس حالت میں ہے اسی طرح چھوڑ کر چلے جاؤ۔ اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب نوکروں میں کھسر پھسر ہونے لگی کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔

رات کا پچھلا پہر دبے پاؤں، آہستہ آہستہ گزر رہا تھا گلزار کال کوٹھری میں موت کا انتظار کر رہا تھا۔ چمن آرا کی محبت کا انجام اتنا بھیانک اور ذلیل بن جائے گا، اُس نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ میرے بچے مجھے بدکار اور قاتل تصور کریں گے۔ اُس کا بدن کانپ رہا تھا۔

اتنے میں آہٹ سن کر گلزار چونکا تو مہاراجہ صلابت کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

"مہاراجہ صاحب آپ یہاں سے چلے جائیے میں اپنا منحوس چہرہ آپ کو دکھانے کے قابل نہیں سمجھتا" گلزار چیخا۔

"میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"صرف تمہارے چہرے کی تحریر پڑھنا چاہتا ہوں"

"آپ یہ کیوں؟"

"تاکہ اپنی بیٹی کے قتل کی اصلیت مل جائے" مہاراجہ نے کہا۔

گلزار نے کہا "وہ تو آپ کو پتہ ہے اور اُس کی سزا بھی مقرر ہو چکی ہے"

"لیکن میرا دل اس کو تسلیم نہیں کرتا" مہاراجہ نے کہا۔

"یہ سچ ہے" گلزار چلایا۔

"نہیں گلزار۔ دُنیا کا کوئی شاعر اپنے ہی کلام کو دفن نہیں کر سکتا۔ اُس کا خون نہیں کر سکتا۔ فردوس تو تمہاری شاعری کا مجموعہ تھی"

یہ سنتے ہی گلزار ایک دم سرد پڑ گیا اُس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ گلزار اس تصویر کو دیکھ کر تھرتھرا گیا جو مہاراجہ نے اُسے دکھائی، وہ تصویر اُس کی پرانی محبت کو تازہ کر دی تھی [illegible] مہاراجہ کو کچھ مل گیا۔

[illegible]

"مہاراجہ صاحب" گلزار نے اُس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "میری زبان کو گستاخی پر مجبور نہ کریں"

"آج سب گستاخی معاف ہے، بتاؤ یہ تصویر"

"میری محبت، جو بہت عرصہ پہلے اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی کے ہاتھوں بک کر آپ تک پہنچی"

گلزار کے درد بھرے الفاظ مہاراجہ کو چیرتے چلے گئے۔

"خدا گواہ ہے مہاراجہ صاحب، میرے لئے فردوس اور ناہید میں کوئی فرق نہیں۔ جب وہ سالگرہ کی پارٹی میں شراب پی کر اور کپڑوں سے آزاد ہو کر ناچنے لگی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فردوس نہیں ناہید بے حیائی پر اُتر آئی ہے۔ میں اس بے حیائی کو برداشت نہ کر سکا اور اُسے طمانچہ دے مارا"

"تو پھر یہ خون۔۔؟"

"خون نہیں ایک حادثہ تھا" گلزار نے اس حادثے کی تفصیل مہاراجہ کو بتائی۔

مہاراجہ ساری کہانی سن کر تڑپ اُٹھا کہ میری بیٹی کی غلط فہمی اُسے موت کے مُنہ میں لے گئی۔

"ہاں مہاراجہ صاحب" گلزار نے لرزتے ہونٹوں سے کہا۔ "اس غلط فہمی نے میرا گھر اجاڑ دیا اور میرے بچوں کو یتیم کر دیا"

پھر وہ چپ ہو گیا۔

"گلزار میں تمہارا قصوروار ہوں۔ میں نے تمہاری محبت چھینی۔ میں نے تمہارے ارمانوں کو بھاری قدموں میں کچل دیا" مہاراجہ نے درد بھری آواز میں کہا۔

"مہاراجہ صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" گلزار نے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تمہاری بد دعاؤں نے مجھے چین سے جینے نہیں دیا۔ چمن آرا میری ہو کر بھی میری نہ بن سکی۔ یہ سب جان کر بھی تم اپنے مہاراجہ کو معاف نہیں کر سکتے"

"مہاراجہ صاحب، معافی تو مجھے مانگنی چاہیے کہ آپ سب کچھ جان کر بھی مجھ سے نفرت نہ کر سکے۔ میرے سینے کا بوجھ ہلکا کر کے آپ نے میری موت کو آسان بنا دیا۔ میری ایک خواہش تھی۔ اگر پوری کر دیں تو چین سے مر سکوں گا"

"کہو کہو"

"میری موت کے بعد بیگم چمن آرا کو پتہ نہ چلے کہ آپ [illegible] محبت کا راز جان گئے ہیں۔ تاکہ اُس کے دل میں میرے لئے نفرت [illegible] اور آپ کی ازدواجی زندگی خوشگوار بن جائے"

[illegible] مہاراجہ نے کہا۔ "گلزار! اب تمہاری [illegible]"

بھی خوشگوار ہو جائے گی لیکن تم وعدہ کرو کہ میری تمنا بھی پوری کرو گے۔"

"ہاں، مہاراجہ صاحب!"

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھاری بیٹی کو اپنی بیٹی بنالوں۔ اس طرح مجھے فردوس مل جائے گی جو میری اکلوتی وارث ہوگی اور اشرف سے شادی کردوں گا۔ اس طرح دونوں گھر خوش حال ہو جائیں گے۔"

یہ سنتے ہی گلزار کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ وہ خوشی سے پاگل ہوکر مہاراجہ کو مسرت سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ مہاراجہ کو فرشتہ نما انسان سمجھنے لگا۔

"ہاں ہاں۔ مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔"

"اٹھو گلزار اب رشتے بدل چکے ہیں۔ اب تم میرے نوکر نہیں ہو ... تم مضبوط رشتوں میں بندھ گئے ہیں۔ اٹھو گلزار میرے گلے لگ جاؤ۔"

مہاراجہ نے اسے اپنی گرفت میں لے کر گلے سے لگانا چاہا تھا گلزار اس کے ہاتھوں سے چھپن گیا۔ مہاراجہ نے اپنی پوری طاقت سے اس کے جسم کو تھامنا چاہا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

"گلزار... گلزار۔ تمھیں کیا ہوگیا ہے؟"

گلزار نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی روح خوشی کی انتہا سے جسم سے الگ ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی مہاراجہ کو تشکر سے دیکھ رہی تھیں۔ ان میں اب بھی خوشی کے آنسو تھے۔

اتنی ہی دیر میں ساجدہ جیل کی کال کوٹھری کا دروازہ عبور کرتی ہوئی شوہر کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا مہاراجہ صاحب میرے شوہر کو۔ میرے سرتاج کو، وہ کیوں خاموش ہیں؟"

مہاراجہ نے اپنی گردن ایک طرف کرکے اس سے کہا "اب وہ یہاں سے چلا گیا ہے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک گئے۔ ساجدہ چیخ کر اپنے ہی بال نوچنے لگی۔

مہاراجہ نے جب اپنی دروازے کی طرف دیکھا تو وہاں گلزار کا ... فضل ... اس کی بیٹی ناہید اس کا بیٹا غلام احمد ڈاکٹر ... اور ... رشید سبھی موجود تھے۔ جو گلزار سے وداعی ملاقات ... تھے۔

... کی چیخ و پکار ... رسبھی لاش کی طرف بڑھے۔ نہ جانے ... تھے ان اعضوں نے مہاراجہ پر کتنے ہی سوال کیے۔ وہ خاموش ... اور اس کے عزیزوں کو چھوڑ کر جیل سے باہر چلا گیا۔ ... چیخ و پکار نے جیل خانے میں بھگدڑ مچادی۔

مہاراجہ جب جیل سے واپس جا رہا تھا تو آہنی دروازے پر بیگم چمن آرا سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے رک گئی۔

"آپ کہاں تھے میں رات بھر ڈھونڈتی رہی۔" لیکن مہاراجہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب اس نے جھنجوڑا تو پھر مہاراجہ نے کہا "بتاؤ نا۔ یہ کون ہے؟"

"گلزار مر گیا ہے بیگم۔"

چمن آرا نے جب یہ سنا تو یوں لگا جیسے اس کی روح جسم سے اس کے گلے ہی الگ گئی ہو۔

"وہ بے گناہ تھا بیگم۔"

"نہیں..."

چمن آرا چیخی اور دو قدم چل کر رک گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ گلزار کی لاش سے لپٹ کر، چیخیں مار مار کر دل کی بھڑاس نکال لے لیکن سماج اور زندگی کے بندھنوں نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔

ایک طرف محبت تو دوسری طرف فرض۔ وہ ان دونوں کی گرفت میں تھی۔ مہاراجہ نے اسے بھانپ لیا اور اس کی طرف بڑھا اور شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "چلو بیگم گھر چلیں۔"

افسانہ ختم ہوگیا۔

وہ ڈول رہی تھی اور آنسو ہی آنسو لیے اپنے شوہر سے ڈرتے ڈرتے بے جان قدموں کے ساتھ مہاراجہ کے پیچھے چل پڑی۔

جیل میں آہ و زاری کی دلدوز صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ اتنی دیر میں مولوی صاحب نے اذان شروع کی۔ وہ اللہ کی بڑائی کے ساتھ ساتھ فلاح حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھنے کو بلا رہا تھا۔





معاف کرنا — معافی مانگنا — دونوں ہی مرحلے انسان کے لئے کٹھن ہوتے ہیں۔ انسان کی جھوٹی "انا" نہ معافی مانگنے پر آمادہ کرتی ہے اور نہ معاف کر دینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اسی "انا" میں اگر حسد، رشک اور کینہ جیسے جذبے شامل ہو جائیں تو حقیقت آنسو جیسی کہانیاں جنم لیتی ہیں

وہ اپنی قسمت کا فیصلہ سُننے کے لئے دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی کمرے کے اندر سے اس کی خالہ زہرہ کی بیگم فرقان کے ساتھ مدھم مدھم سرگوشیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہاں یہ اُس کی بے حد محبت کرنے والی نثار ہونے والی خالہ ہی کی آواز تھی جو کہ اُس کی سماعت پر بم کی طرح گری۔

"ہاں بیگم فرقان! میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں نمو ہمارے ایک بہت ہی پُرانے ملازم رحمان علی کی بیٹی ہے۔"

"کیا سچ...؟" بیگم فرقان کی حیرت زدہ آواز سُنائی دی۔

"ہاں... جھوٹ نہیں۔ نمو کی ماں اس کی پیدائش کے فوراً بعد ہی مر گئی تھی۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ نورین اور جمال بھائی کو اولاد کی کتنی خواہش تھی۔ مگر جمال بھائی چونکہ نورین کو بے حد چاہتے تھے اس لئے اُسے کبھی یہ احساس تک نہ ہونے دیا کہ وہ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق کبھی بھی ماں نہیں بن سکتی۔ بلکہ کبھی اُسے بتایا ہی نہیں۔ نمو جب پیدا ہوئی تو اس وقت میں اور نورین اس کے کوارٹر ہی میں تھے۔ بچی کی پیدائش میں بڑی دشواری ہوئی اور رانو بچی کو جنم دینے کے فوراً بعد ہی اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملی۔ مُردہ ماں کے پہلو میں پڑی ہوئی بچی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ نمو اس وقت نورین کو بے حد پیاری لگی۔ اس نے بے اختیار اُسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ نمو کے رونے کی آواز سُن کر رحمان علی نے دروازے پر دستک دی۔ جب اُسے بتایا گیا کہ نمو کی ماں اُسے جنم دے کر مر گئی ہے تو اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ نگاہوں میں نفرت کی چمک آ گئی۔ وہ ننھی مُنی معصوم بچی کو نفرت اور طیش سے گھورنے لگا۔ پھر اُس پر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔

"بیگم صاحبہ اس کا بھی گلا گھونٹ دیں۔" اس منحوس کم بخت ڈائن کو لے کر میں کیا کروں گا۔ جس نے پیدا ہوتے ہی ماں کو کھا لیا۔ اس کے ہاتھ نمو کا گلا گھونٹنے کے لئے بڑھنے لگے تو نورین کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا تھا اس نے بچی کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"رحیمو...! میں تمھیں اس معصوم بچی کو مارنے نہیں دوں گی۔ تم اُسے ہمیشہ کے لئے مجھے سونپ دو۔"

رحمان علی نے کہا: "بیگم صاحبہ آپ اس منحوس لڑکی کو لے کر کیا کریں گی۔ یہ آپ کو بھی کھا جائے گی۔"

نورین نے کہا: "نہیں رحیمو میں اسے تمھیں نہیں دوں گی۔ تم اُسے مار دو گے۔ رحمان خدا کے لئے میری جھولی بھر دو میں تمھاری جھولی روپوں سے بھر دوں گی۔ میں اسے پالوں گی۔ اس پر تمام ممتا نچھاور کر دوں گی۔ تم ایک مرتبہ اُسے مجھے سونپ دو۔"

"ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! آپ مجھے دس ہزار روپے دے



دیں۔ میں بچی کو نہیں ماروں گی۔ اور آپ کو سونپ دوں گی۔"

اتنے میں جمال بھائی بھی باتوں کی آواز سُن کر وہاں آ گئے۔ نورین کی والہانہ محبت اور بچی کی بھولی بھالی صورت دیکھ کر جمال بھائی کو بھی ننھو پر پیار آ گیا۔ نورین نے ساری صورتِ حال جمال بھائی کو بتا دی۔ ساری بات سُن کر جمال بھائی نے فیصلہ کیا کہ وہ بچی کو گود لے لیں۔ انھوں نے اُسی وقت دس ہزار کا چیک کاٹ کر رحمان علی کو دے دیا۔ اس طرح ننھو، نورین اور جمال بھائی کی بیٹی کی حیثیت سے پرورش پانے لگی۔ وہ دونوں کو بے حد عزیز تھی لیکن اس سبز قدم لڑکی کی نحوست اُن دونوں کو بھی لے ڈوبی۔ وہ کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ ڈائن نے پہلے ماں کو کھایا اور پھر اپنے محسنوں کو بھی چٹ کر گئی۔" زہرہ کے لہجے میں بے پناہ نفرت تھی۔ ننھو کو لگا جیسے یہ الفاظ نہ ہوں بلکہ وزنی ہتھوڑے کی ضربیں ہوں۔ جو کہ اس کی سماعت پر... بھرپور قوت سے برسائے گئے ہوں۔ اس کے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے۔ ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا تھا اور ٹانگوں میں جیسے جان ہی باقی نہ رہی ہو۔ اُف میرے خدا! یہ کیسا مرحلۂ حیات ہے۔ یہ کیسا موڑ ہے کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟ اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو اتنے عرصے تک مجھے بے خبر کیوں رکھا گیا۔ اگر رکھا ہی گیا تھا تو آج اس انکشاف کی کیا ضرورت تھی؟ اُس نے ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبا لیں۔ چہرہ کرب سے زرد پڑ گیا۔ اچانک اُس کی نگاہیں دروازے پر پھر سے جم گئیں۔ ابھی تو اُسے اور بہت کچھ بھی سُننا تھا۔ ابھی اُس کی ہمت کا امتحان ختم نہیں ہوا تھا۔ زہرہ رازداری سے بیگم فرقان سے کہہ رہی تھیں۔ "میں چاہتی ہوں کہ اب آپ ننھو کو اپنے گھر رکھ لیں۔"

"میں...؟" بیگم فرقان گھبراہٹ زدہ آواز میں کہہ رہی تھیں۔

"ہاں... آپ۔"

"لیکن، میں کیسے ایک جوان لڑکی کی ذمہ داری سنبھال سکتی ہوں۔ بقول تمھارے یہ اتنی منحوس سبز قدم ہے تو کیا میرے گھر کے لئے منحوس ثابت نہ ہوگی۔"

"بیگم فرقان! آپ سمجھ نہیں رہی ہیں۔ جب تک آپ اس سے کام کاج لیتی رہیں گی اور محبت پیار سے پیش نہیں آئیں گی تو اس کی سبز قدمی بھلا آپ پر کیا اثر کرے گی۔"

"بھئی زہرہ! ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں ننھو سے بے حد متاثر ہوئی ہوں۔ کیسی گورے رنگ والی نرم طبیعت سی لڑکی ہے۔"

"جی ہاں بیگم! .... اسے یہ بات معلوم نہیں ہے کہ ....

اور بھائی جمال کی بیٹی ہے۔"

"زہرہ! تم کیوں نہیں رکھ لیتیں ننھو کو اپنے پاس۔"

"میں...؟" زہرہ خالہ گھبراہٹ سے بولی۔ پھر سنبھل کر کہا۔ "میں کس طرح رکھ لوں۔ میں مجبور ہوں۔ کیونکہ تم عامر کو تو جانتی ہی ہو کہ وہ ننھو کو کتنا پسند کرتا ہے۔ اور اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر اُس نے زیادہ زور دیا تو شاید میں ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر مان بھی جاؤں۔ مگر میری فطرت میں شکست نام کی کوئی چیز شامل نہیں ہے۔ اسی لئے میں چاہتی ہوں کہ تم ننھو کو اپنے ہاں رکھ لو۔ اس میں تمھارا بھی فائدہ ہے کہ بن دام کی ملازمہ ہاتھ آئے گی۔ اب تو نورین اور جمال بھائی بھی حیات نہیں ہیں جو کہ اپنی لاڈلی کا یہ حشر دیکھیں۔ اگر رکھ سکتی ہو تو فوراً جواب دو تاکہ میں گھر جا سکوں۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔

"لیکن، تم نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ ننھو میرے پاس رہنے کے لئے کیسے رضامند ہو سکتی ہے۔"

"بھئی تم باتوں باتوں میں اُسے جتا دینا کہ وہ ایک ملازم کی بیٹی ہے اور ملازموں کی بھلائی اسی بات میں پنہاں ہے کہ وہ اپنے مالکوں کا چپ چاپ ہر حکم بجا لائے۔"

ننھو دروازے کی اوٹ میں کھڑی تمام انکشافات سُن رہی تھی۔ اُس کے دل و دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ اُس کی ہستی جیسے طوفان کی زد میں آ کر بُری طرح زیر و زبر ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے نہایت کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک بیگم فرقان کی آواز اُبھری۔

"ٹھیک ہے زہرہ! تم ننھو کو چھوڑ جاؤ۔ میں تمام معاملہ سنبھال لوں گی۔"

زہرہ کی آواز اُبھری۔ "شکریہ بیگم فرقان! آپ نے میرے دل سے بہت بڑا بوجھ اُتار دیا ہے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ اُس کے کپڑے میں نوکر کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔"

پھر کرسیاں کھسکنے کی آواز آئی۔ وہ جلدی سے دروازے سے ہٹ گئی پھر تیز تیز ڈولتے قدموں کے ساتھ ڈائننگ روم میں داخل ہو گئی۔ صائمہ، فائقہ اور عاطفہ خاموش ہو گئیں۔

"آؤ بھئی ننھو! تم تو ایسی گئیں کہ اپنی خالہ کی ہی ہو کر رہ گئیں۔ ہم اکیلے بیٹھے بور ہو رہے تھے۔" پھر وہ چونک اُٹھیں کیونکہ ننھو کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اور چہرے پر زردی سی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے کسی نے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ صائمہ گھبرائے انداز میں بولی۔

"نمّو ڈیئر! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ دیکھو تو کیسی زرد ہو رہی ہو؟"

نمّو سنبھل گئی اور لہجے کو بشاش کرتے ہوئے بولی۔ "کچھ نہیں بس سر میں ذرا سا درد ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بیٹھو! میں تمہارے لئے گولی منگواتی ہوں۔"

"رہنے دو صائمہ! تم بیٹھو اب اتنی بھی تکلیف نہیں ہے کہ میں گولیاں کھاتی پھروں۔ تم لوگ اتنے عرصے سے اصرار کر رہی تھیں کہ میں تمہارے پاس چند دنوں کے لئے رہوں۔ چلو اب تمہاری خواہش پوری کئے دیتے ہیں۔ جتنا عرصہ رکھنا چاہو رکھ لو۔"

"سچ! نمّو!" صائمہ نے خوش ہو کر کہا۔ "نمّو تم بیٹھو میں تمہارے لئے کمرہ سیٹ کرواتی ہوں۔" نمّو کے لبوں پر ایک زہر خند سا پھیل گیا۔ اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ اور ان سے باتیں کرنے لگی۔

دن گزرتے گئے۔ نمّو کو بیگم فرقان کے ہاں رہتے ہوئے پورا مہینہ ہو گیا۔ آہستہ آہستہ صائمہ، فائقہ اور عاطفہ کا بھی رویہ تبدیل ہوتا چلا گیا۔ ان کو بیگم فرقان نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ نمّو کی موجودگی میں وہ صائمہ جو ہر وقت نمّو ڈیئر، نمّو ڈیئر کی رٹ لگائے رکھتی تھی۔ اب کہتی۔ جاؤ نمّو! میرے کپڑوں پر استری کر دو۔ مجھے پارٹی میں جانا ہے۔ جلدی کرنا کہیں تم وہاں پر خیالوں میں گم ہو جاؤ اور میرے کپڑوں کا ستیاناس ہو جائے۔ نمّو ایک سرد آہ بھر کر خاموش نہ جاتی۔ کیوں کہ اب اس کو محسوس ہو چکا تھا کہ اس کی حیثیت اس گھر میں نوکرانی سے زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھلا نوکروں کو کیا حق تھا کہ وہ مالکوں سے تلخ کلامی کریں خالہ زہرہ نے اس کے تمام پڑے بیگم فرقان کے ہاں بھجوا دیئے تھے لیکن شاید اب اچھے کپڑے پہننا اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ وہ جب بھی نہانے دھونے کا نام لیتی صائمہ، فائقہ یا عاطفہ کو کوئی کام یاد آ جاتا اور وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتی۔

آج نمّو کو اس گھر میں آئے دو ماہ ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے تھے۔ اب تو نمّو کو یوں لگتا تھا جیسے وہ کبھی بھی اپنا وہ زمانہ دیکھ سکے گی جیسے وہ گزار کر آئی تھی۔ وہ لڑکی جسے کبھی پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا گیا تھا اب نوکرانی کی طرح بیگم فرقان کے گھر کام کرتی تھی۔ اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے کانوں سے اپنے بارے میں انکشافات سن چکی تھی اور وہ انکشافات سن کر اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کہ کسی نے جنت سے نکال کر جہنم میں رکھا ہو۔

وہ خیالوں میں گم کچن میں شامی کباب تل رہی تھی۔ حسین چہرے پر شعلوں کا سُرخ عکس بے انتہا پیارا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یاسیت کے آنسو تھے اور خیالات نجانے کہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ایک دم اس کے خیالات کا طلسم ٹوٹ گیا۔

"نمّو... ! تم نے ابھی تک کباب نہیں بنائے۔ میری دوست بیٹھی ہوئی ہیں۔"

"بس بننے ہی والے ہیں۔" اس نے چونک کر کہا۔

"تم تو نجانے کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہو۔ کام تو جیسے کرنا ہی نہیں آتا۔"

نمّو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "یا اللہ ! یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ اے کاش ابو آپ نے مجھے میرے غریب باپ کے پاس ہی رہنے دیا ہوتا۔ کم از کم میری رُوح کو یہ عذاب تو نہ جھیلنا پڑتا۔" وہ پھر محرومی کے سمندر میں کھو گئی۔ کباب آگ پر رکھے تھے پہلے سُرخ ہوئے پھر سیاہ پڑ کر جلنے لگے۔

"نمّو...!" صائمہ گرجی۔

"آں... ہوں..." وہ جیسے خواب سے بیدار ہو گئی۔

"اُف ... میرے خدایا ! یہ تو تمام کے تمام جل گئے۔"

"اور کیا ہونا تھا محترمہ! نقصان کے سوا کیا کرتی ہو۔ اب میں اپنی سہیلیوں کو کیا کھلاؤں گی۔"

"صائمہ ! چند منٹ ٹھہر جاؤ۔ فرج میں قیمہ رکھا ہوا ہے میں اس کے کباب بنا دیتی ہوں۔"

"اونہہ... اب بناؤ گی۔ پتہ نہیں ممّی نے تمھیں کیوں اپنے گھر رکھنے کی حامی بھر لی تھی۔ کپڑوں پر استری بھی نہیں ہوتی اب تک۔ ائیرپورٹ بھی جانا تھا۔"

"کیوں...؟" نمّو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تمھیں کیا مطلب ہے؟"

"بس یونہی پوچھ لیا تھا۔" نمّو کے لہجے میں دُکھ کی سُرخی گھل گئی۔

"اچھا چائے اور کیک وغیرہ ڈرائینگ رُوم میں بھجوا دو۔"

"بھیجتی ہوں ابھی۔" نمّو نے دھیرے سے کہا۔

●

"اُف صائمہ ! وہ دیکھو۔"

"ہاں ! لگتے تو وہی ہیں۔"

"لگتے کیا ہیں ! ہیں ہی وہی۔"

ایک دراز قد خوبصورت نوجوان تھا۔ نیوی بلیو سوٹ میں ملبوس وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اُس کی نگاہ بیگم فرقان پر پڑی۔ وہ تیزی سے اُن کی جانب لپکا۔

"ممّی ! وہ دیکھئے نوید بھائی ہماری ہی طرف آ رہے ہیں۔"

"ہاں... اُس نے مجھے پہچان لیا ہے۔" بیگم فرقان مسکراتے ہوئے بولیں۔

"ہیلو آنٹی !" وہ قریب آنے پر نوید نے بڑے اسٹائل سے جُھک کر آداب کہا۔

"جیتے رہو بیٹا ! جیتے رہو..." بیگم فرقان نے پیار بھرے لہجے میں دُعا دی۔

"نوید بھائی ! کیا آپ ہمیں بھول گئے۔" صائمہ نے ہانک لگائی۔

"نہیں بھئی ! میں آپ لیڈیز کو بھول سکتا ہوں۔"

"ہائے نوید بھائی ! آپ نے تو ہمیں لیڈیز بنا دیا۔"

"او سوری ، ویری سوری گرلز۔" نوید نے شوخی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"صائمہ ، فائقہ اور عاطفہ تم نے تو ابھی سے نوید بیٹے کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔"

"نو آنٹی نو ! میں بالکل تنگ نہیں ہو رہا ہوں۔ بھلا کوئی اتنی پیاری دوست بہنوں سے بھی تنگ ہو سکتا ہے۔"

"چل چالاک کہیں کا۔" بیگم فرقان نے ہنستے ہوئے کہا... شوفر نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا۔ نوید شوفر کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بیگم فرقان بیٹیوں کے ہمراہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

"ہاں تو آنٹی بتائیے۔ انکل کا کیا حال ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہیں۔"

"بزنس کیسا چل رہا ہے؟"

"بہت اچھا... اب تو تمھارے انکل کی کئی کمپنیاں نیویارک اور جرمنی میں قائم ہو چکی ہیں۔"

"ویری گڈ۔"

"نوید بھائی ! امریکہ کے بارے میں بتائیے کیسا پایا؟ اور اتنا عرصہ وہاں پر رہے ہیں۔ کیسے انجوائے کیا؟"

"انجوائے کیا کرنا تھا بس یہ کہ امریکہ سے زیادہ کھوکھلی تہذیب میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ جب وہاں کے عریاں مناظر دیکھتا تھا۔ تو جی چاہتا تھا کہ ڈاکٹری واکٹری چھوڑ چھاڑ کر اپنے پاک وطن کی ممتا بھری آغوش میں آ جاؤں لیکن پھر دل کو تسلی دیتا کہ ڈاکٹر بن کر اپنے وطن کی خدمت کروں گا۔"

"سنا ہے نوید بھائی ! ہم نے تو سُنا ہے کہ جو امریکہ گیا وہ لوٹ

کر نہیں آئے۔ اگر آیا بھی تو ایک مدد میم صاحبہ کے ساتھ۔ آپ پھر کیسے آ گئے وہ بھی بغیر امریکن میم کے؟"

"اوہ... بھئی میں نے بتایا کہ مجھے وہاں کا ماحول پسند نہیں آیا اور نہ ہی وہاں کی بے باک قسم کی خواتین۔"

"کمال ہے..." عاطفہ نے کندھے اچکائے پھر معنی خیز نگاہوں سے صائمہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"بھئی نوید بیٹے کو تنگ مت کرو۔ بے چارہ ابھی اتنا لمبا سفر طے کر کے آیا ہے۔ تھکاوٹ ہو رہی ہو گی۔"

"نہیں آنٹی، بلکہ آپ کی پیاری پیاری باتیں سن کر تو میری ساری تھکن ہی غائب ہو گئی۔ اب بالکل فریش ہو گیا ہوں۔"

"پھر بھی بیٹا..."

"آنٹی مجھے تو اپنے وطن میں آ کر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں اپنی ممی کی گود میں سما گیا ہوں۔" ماں کا ذکر کر کے وہ اداس ہو گیا۔

"بیٹا... اداس کیوں ہوتے ہو۔ ہم کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ میں بھی تو تمہاری ممی کی جگہ ہوں۔"

"کیوں نہیں آنٹی! لیکن وطن واپس آ کر تو ممی ڈیڈی کی یاد زیادہ ہی آنے لگی ہے۔"

"ہاں بیٹا! بھلا ماں باپ بھی ایسی چیز ہیں جو بھلائے جا سکیں۔" بیگم فرقان اداس ہو گئیں۔ نوید جو کہ بے حد زندہ دل واقع ہوا تھا۔ ماحول کو سنجیدہ دیکھ کر بات پلٹ گیا۔ اور دوسرے لوگوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔

نمو ڈرائینگ روم کی صفائی کر کے پلٹی ہی تھی کہ اچانک لان میں باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ صائمہ، عاطفہ اور فائقہ کے قریب ہی ایک نہایت خوبرو نوجوان کھڑا تھا۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ نیوی بلیو عوامی سوٹ میں ملبوس وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے لبوں سے وہ صائمہ سے محو گفتگو تھا اور صائمہ خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔

"اوہ تو یہ ہے وہ مہمان جس کا کئی دنوں سے اس گھر کو انتظار تھا، جس کی وجہ سے اس پر بے بھاؤ کی ڈانٹ پڑی تھی۔ جس کی خاطر صائمہ اور دوسری دونوں بہنوں نے نئی ساڑھیاں بنوائی تھیں اور صبح سے ہی سنگھار میں مصروف تھیں، نمو جلدی سے کچن میں چلی آئی۔ اس کا آتشی گلابی سوٹ بہت میلا ہو رہا تھا۔ آتشی گلابی دوپٹہ کپڑوں کی بہ نسبت پھر بھی صاف تھا۔

"نمو! بھئی نمو...؟"

"جی..." نمو نے آنکھوں میں آئی نمی دوپٹہ سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"جلدی سے چائے بنا کر دوسری نمکین چیزیں ڈرائینگ روم میں لے آؤ۔"

"اچھا ابھی لاتی ہوں۔ چائے تو کبھی کی بنی پڑی ہے۔ بس گرم کرنا باقی ہے۔ پکوڑے اور کباب بنا لوں پھر لے کر آتی ہوں۔" وہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ یا خدا! کیا اس دن کے لئے مجھے عالم وجود میں لایا گیا تھا کہ پہلے تو شہزادیوں کی طرح زندگی بسر کروں، اور پھر نوکروں کی طرح کام کروں۔ اس کی حسین آنکھوں سے نمکین نمکین موتی بہہ نکلے۔ اس نے جلدی جلدی چائے اور دوسرے لوازمات ٹرالی میں جمائے اور ڈرائینگ روم میں چلی آئی۔ سامنے ہی صوفے پر وہ اجنبی مہمان براجمان تھا۔ آتشی آنچل میں ڈھکا پُر وقار سا سراپا۔ لال لال حسین آنکھیں اور سرخی مائل خوبصورت چہرہ۔ وہ چونک اٹھا۔ نگاہیں جیسے اس اجنبی چہرے پر گڑ کر رہ گئیں۔

نمو اجنبی کی نگاہوں کی تپش سے گھبرا سی گئی اور اس کی نگاہوں سے بچنے کے لئے چائے بنانے لگی۔ صائمہ جلتی ہوئی نگاہوں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ نوید نمو کو دیکھ کر جیسے بے قابو سا ہو گیا تھا اور مسلسل اُسے تکے جا رہا تھا۔ صائمہ کو بے انتہا غصہ آیا جب اس کی قوت برداشت جواب دے گئی تو نمو سے نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

"جاؤ نمو... تم کچن میں جا کر کام کرو میں خود چائے بنا لوں گی۔"

وہ تو خود وہاں سے جانا چاہ رہی تھی۔ اس لئے جلدی سے ڈرائینگ روم سے نکل گئی نوید کی نگاہیں اس وقت تک اسے تکتی رہیں۔ جب تک کہ وہ باہر نہ نکل گئی۔

"نوید بھائی! کیا زیادہ ہی پسند آ گئی ہے؟" صائمہ جلے بھنے لہجے میں بولی۔

"نن... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس ویسے ہی دیکھ رہا تھا کہ تم نے کتنی بدصورت ملازمہ رکھی ہے جسے لباس پہننے کی تمیز نہیں..."

'بدصورت، بدتمیز' صائمہ نے دل ہی دل میں حیرت سے سوچا کیونکہ پہلے تو نمو کے سلیقے اور شائستگی و خوبصورتی کا چرچا ہر جگہ تھا۔ 'اگر اسے نمو جیسی حسین لڑکی بدصورت لگ سکتی ہے تو ہمارا تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔'

"کیا سوچنے لگیں صائمہ؟"

"کچھ نہیں، بس ویسے ہی سوچ رہی تھی کہ مغرب کی آب و ہوا

میں رہنے سے آپ کتنے ہینڈسم ہو گئے ہیں؟"
"بس صائمہ اب اتنی بھی تعریف مت کرو کہ میں خوشی سے پھول جاؤں۔"
"نوید بھائی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ جیسے امریکہ میں کسی اچھی لڑکی نے لفٹ نہیں دی؟"
"واہ بھئی واہ، کیا خوب کہا ہے فائقہ صاحبہ... ! میں تو پانچ سال تک الرجک رہا ہوں اُن کے قریب سے۔"
"بھئی صائمی! کیوں ناراض کرتی ہو نوید بھائی کو؟ بے چارے کو آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے کر لینا تنگ بعد میں جتنا جی چاہے۔" فائقہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ اس کا مطلب سمجھ کر صائمہ سُرخ پڑ گئی۔ اور بظاہر ناراضگی سے تنک کر بولی۔
"کیوں نوید بھائی! میں نے آپ کو تنگ کیا ہے؟"
"نہیں نہیں... میں تو بالکل تنگ نہیں ہُوا۔ آپ کی یہ دلچسپ نوک جھونک تو مجھے بالکل بُری نہیں لگ رہی۔"
"اچھا نوید بیٹے! جانے دیو، ان لوگوں کا کیا ہے؟ یہ تو یونہی بکواس کرتی رہیں گی۔"
"تو آنٹی مت منع کیجئے۔ یہ تو میری بہنیں ہیں۔ بھلا بہنیں بھائی کو تنگ کئے بغیر دیکھ کر چپ رہ سکتی ہیں؟"
صائمہ کا منہ بن گیا جیسے نادانستگی میں کونین کی کڑوی گولی کھالی ہو۔ بیگم فرقان بھی دل ہی دل میں شرمندہ سی ہو رہی تھیں۔ کیونکہ وہ تو صائمہ کے لئے نوید کی آس لگائے بیٹھی تھیں۔ ایسا اچھا لڑکا جو کہ نہ صرف خوبصورت تھا بلکہ ایک بہت بڑی جائیداد کا تنہا وارث بھی تھا۔ اب اس نے جو نہایت بھولے پن سے اُن سب کو بہن بنا ڈالا تو وہ شرمندہ سی ہو گئیں۔ تو وہ شرمندہ سی ہو گئی تھیں پھر کیا ہے شادی سے پہلے ہر لڑکی لڑکے کی بہن ہی تو ہوتی ہے اُسے بھلا کیا پتہ کہ صائمہ کو اُسے بہن نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ آہستہ آہستہ خود ہی پتہ چل جائے گا۔ اس دلیل سے ان کا دل کچھ مطمئن ہو گیا۔
"بیٹا نوید! تم جا کر نہالو۔"
"اچھا آنٹی! میں پہلے غسل کر لوں پھر باتیں ہوں گی۔"
"جائیے صائمہ آپی نوید بھائی کو باتھ روم دکھا آئیں۔" عاطفہ نے صائمہ کی طرف عجیب سے انداز سے دیکھ کر کہا۔
"آپ کہاں جائیں گی صائمہ! کسی ملازمہ وغیرہ سے کہہ دیں؟"
"وہ تمو تو نجانے کیا کر رہی ہوگی۔ چلئے میں بتا دیتی ہوں۔" صائمہ نے ملازمہ کا ذکر سُن کر بیزاری سے کہا۔ فائقہ کو بے اختیار ہنسی آگئی صائمہ نے گھور کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

وہ نوید کو باتھ روم دکھانے کے لئے باہر آئی کچن کے قریب سے گزرتے ہوئے نوید کی نظریں بے اختیار کچن کی طرف اُٹھ سی گئیں۔ قدموں کی تیزی آہستگی میں بدل گئی تمو کچن میں ہی تھی۔ سُرخ سُرخ زہریلی سی پیاز کاٹتے ہوئے اس کی خوبصورت آنکھیں پانی سے بھر بھر جاتی تھیں۔ جسے وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے بار بار صاف کر رہی تھی۔ شاید پیاز کے زہریلے پن سے اپنی محرومی کو اس کی آڑ میں آنسو... بہا کر کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نوید کے ٹھٹک کر رُک جانے سے صائمہ کے چہرے پر غصے کی لالی چھا گئی
"نوید بھائی... !" اس نے خود پر ضبط کر کے نارمل لہجے میں کہا وہ بے اختیار چونک اٹھا پھر شرمندہ سا ہو کر چلنے لگا۔
"آپ رُک کیوں گئے تھے؟"
"پاؤں میں شاید کچھ چبھ گیا ہے۔"
صائمہ کی نظریں بے اختیار اس کے قدموں پر پڑیں۔ بھاری بوٹوں نے اس کے پاؤں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ دل ہی دل میں تلملا کر چپ ہو گئی۔
فرقان صاحب جرمنی کے دورے سے واپس آ چکے تھے۔ ان کا یہ ٹور کامیاب رہا تھا اور جرمنی میں وہ اپنی کمپنی کی ساکھ جمانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ نوید سے مل کر وہ بے انتہا خوش ہوئے ایسا ہیرا لڑکا بھلا کہاں ملتا ہے وہ بھی بیگم فرقان کی طرز پر سوچ رہے تھے صائمہ کے لئے اُنھیں نوید بے انتہا مناسب لگا۔ اپنی سوسائٹی میں اُسے متعارف کروانے کے لئے اُنھوں نے اس بات کی آڑ لی کر وہ اپنی کمپنی کے افتتاح کے لئے پارٹی دیں۔
شاندار پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ رنگین قمقموں نے اندھیرے کی دبیز چادر کو نگل لیا تھا بڑے بڑے گلوب اندھیروں کو پاٹ رہے تھے۔ سبز سبز درختوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنیاں سُرخ بجری کی سڑک پر رینگ رہی تھیں۔ رات دن سے بھی زیادہ روشن تھی۔ لمبی لمبی رنگ برنگی چمکیلی نئے ماڈلز کی کاریں بڑے داخلی گیٹ سے داخل ہو کر چند لمحے پورٹیکو میں رُکتیں۔ مہمان ایک شان بے نیازی سے اُترتے اور خالی کاریں دوسرے گیٹ سے نکل کر سڑک کے کنارے کھڑی ہو جاتیں۔ وقت گزر رہا تھا اور سڑک پر کھڑی ہونے والی کاروں کی لمبی قطاروں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ قہقہے بڑھ رہے تھے۔ مُسکراہٹیں اُبھر رہی تھیں۔ ریشمی آنچل شانوں سے ڈھلکتی ہوئی زرتار ساڑھیاں اور مغربی طرز کے اسکرٹ ماحول کو رنگین بنا رہے تھے۔ مردوں کے قیمتی ملبوسات کی سرسراہٹیں مرصع اور طلائی زیورات کی کھنک میں مدغم ہو رہی تھیں۔ آرکسٹرا

کی ہلکی ہلکی دھنیں فضا میں ترنم شور بکھیر رہی تھیں اور ایک لطیف سا ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ محفل اپنے شباب پر تھی نوید مردوں اور عورتوں میں گھرا کھڑا تھا۔ کریم کلر کے قیمتی سوٹ میں اس کا وجیہہ چہرہ بہت پُرکشش لگ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی صائمہ کھڑی تھی۔ پنکی ساڑھی میں خاصی اچھی لگ رہی تھی۔ میک اپ سے سانولا رنگ گلابی مائل ہوگیا تھا۔ فائقہ اور عاطفہ کوک پیتی ہوئیں نوید سے باتیں کر رہی تھیں نوید کی متلاشی نگاہیں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ کسی گوہرِ مقصود کی تلاش میں۔ لیکن تلاش بے کار ثابت ہو رہی تھی۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ فائقہ اس کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اس کی بے چینی اس کی نگاہوں سے چھپ نہ سکی۔

"نوید بھائی! بڑے بے تاب نظر آ رہے ہیں کیا وجہ ہے؟" فائقہ کے لہجے میں شوخی تھی۔

"کک... کچھ نہیں۔" وہ چونک کر بولا۔

صائمہ بھی ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔ "کیا باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ؟"

"کچھ نہیں... بھئی آپ اپنی سہیلیوں سے گفتگو کریں ہم... غریبوں کا کیا ہے؟" نوید مزاحیہ انداز میں بولا۔ صائمہ جھینپ سی گئی۔

نمو کوٹھی کے اندرونی حصے سے بیرونی حصے میں کسی کام سے آئی تھی۔ چاروں طرف لوگوں کا ہجوم دیکھ کر وہ سٹپٹا کر رہ گئی اور وہ کام بھول گئی۔ جس کے لئے آئی تھی۔ نوید کی نظر یونہی اس پر پڑی۔ وہیں جم کر رہ گئی۔ شربت کا گلاس اس کے ہاتھ میں کانپ گیا صائمہ نمو کو دیکھ کر تیزی سے اُس کے قریب آئی۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟" وہ اُس کے میلے کچیلے کپڑوں پر نفرت بھری نگاہ ڈال کر چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"وہ... وہ فائقہ نے بلایا تھا..." وہ ڈری ڈری سی بولی۔

"جاؤ یہاں سے..." صائمہ نے اُسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ جھٹکا لگنے سے وہ لڑکھڑائی۔ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور منہ کے بل پختہ فرش پر دھماکے سے گر پڑی۔ خوبصورت پیشانی پوری قوت سے زمین سے ٹکرائی۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے نیلی نیلی چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ پیشانی سے لہو رسنے لگا۔ حواس جواب دے گئے۔ ڈوبتے ذہن میں آخری آواز اُن وحشیانہ قہقہوں کی آئی جو کہ اُسے منہ کے بل گرتے دیکھ کر صاحب ثروت لوگوں کے منہ سے بے اختیار نکلے تھے۔ ایک خادمہ ہی تو منہ کے بل گر کر... زخمی ہوئی تھی۔ ایک حالات کی ستائی ہوئی نوخیز کلی کا ہی تو لہو بہا تھا۔ کوئی امیر زادی تو منہ کے بل گر کر زخمی نہیں ہوئی تھی۔

جس کو اُٹھانے کے لئے سب لوگ آگے بڑھتے وہ تو حالات کی ستائی ہوئی لڑکی تھی۔ جس کو تقدیر نے امتحان لینے کے لئے ظالموں کے زنداں میں قید کر دیا تھا۔ ظالم لوگوں کی عدالت... میں انصاف کے لئے لا کھڑا کیا تھا۔ نہ اس سے پہلے کسی غریب مظلوم خادم کو انصاف ملا تھا نہ ملنا تھا۔ بھلا کیا فرق پڑتا تھا؟ کیا خاص بات تھی؟ پھر کیوں اس کی حالت پر رحم کھایا جاتا۔ وہ بھی تو ایک خادمہ ہی تھی۔ ملازم تو اکثر مالکوں کے ہاتھوں سے زک اٹھاتے ہی... رہتے ہیں۔ زخمی ہوتے رہتے ہیں۔ مر جاتے ہیں اس سے مالکوں کی شان ہی بڑھتی ہے مالکوں کی جان و مال کا صدقہ ہی نکل جاتا ہے۔

نوید سکتے کی سی حالت میں بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ خون آہستہ آہستہ آتشی گلابی لباس کو رنگ رہا تھا۔ بھگو رہا تھا پھر نجانے کونسی کشش تھی یا ایک مظلوم لڑکی کے لہو کی پکار کہ اس کی ڈاکٹری حس بیدار ہوگئی۔ فرض پکار اٹھا۔ وہ بے تابی کے عالم میں آگے بڑھا۔ صائمہ گنگ رہ گئی۔ نوید نے نمو کی کلائی پکڑی۔ بے تابی کے عالم میں اُس کی نبض ٹٹولنے لگا۔ نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس نے بے ہوش نمو کو بازوؤں کے دائرے میں اُٹھایا اور جنونی انداز میں راستہ بناتا ہوا باہر نکلتا چلا گیا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نمو اُس کی زندگی کا لازمی جزو بن چکی ہے۔ اس کے بغیر زندگی زندگی نہیں۔ وہ خاموشی سے اپنے جذبات کا تجزیہ کر رہا تھا۔ نمو اس کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہی تھی وہ اُس کے دل کی دھڑکن بن کر دل میں سما چکی تھی۔ وہ اُسے دل کی تمام تر قوتوں سے چاہنے لگا تھا۔ اپنی روح کی گہرائیوں سے پیار کرنے لگا تھا۔ نوید کو اپنے جذبات کا پوری طرح احساس ہونے لگا تھا۔ وہ نمو کو گاڑی میں ڈال کر سیدھا ہسپتال لے آیا تھا اور ڈاکٹر زیب کے سپرد کر دیا تھا۔

نمو بے ہوش تھی۔ وہ اضطراب سے پہلو بدلنے لگا۔

اچانک وارڈ کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر جہاں زیب باہر نکلے۔

"ڈاکٹر وہ اب کیسی ہے؟ خطرے سے تو باہر ہے؟"

"ڈاکٹر نوید... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مریضہ کمزور ہے۔ باقی خیریت ہے۔"

نوید کے چہرے پر اطمینان سا چھا گیا۔

"مریضہ آپ کی کیا لگتی ہیں؟" ڈاکٹر زیب نے پوچھا۔

"میری...؟" وہ سوچنے لگا۔

"چپ کیوں ہوگئے آپ؟"

"ڈاکٹر صاحب! یوں سمجھئے کہ میرے لئے اجنبی ہے جو کہ زخمی حالت میں مجھے ملی پھر ڈاکٹر صاحب میرا تو فرض بنتا تھا کہ اس

کی زندگی بچانے کے لیے جدوجہد کرتا۔" ڈاکٹر لبیب نے اُسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب! یہ بتلائیے کہ میں اُسے لے جاسکتا ہوں؟"

"ابھی وہ اس قابل نہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں اپنے گھر فون کرکے یہیں ٹھہر جاتا ہوں۔ جب وہ جانے کے قابل ہوجائے گی لے جاؤں گا۔" نوید نے کہا۔

پارٹی ختم ہوگئی لیکن نوید ہاسپٹل سے نہیں آیا۔ صائمہ سخت غصے میں تھی۔ اُسے نوید پر سخت غصہ آرہا تھا جوکہ ایک ملازمہ کو اُس پر فوقیت دے گیا تھا۔ سب سہیلیوں اور دوسرے مہمانوں نے نوید اور نمو کے بارے میں بہت چہ میگوئیاں کی تھیں اور وہ ہر بات پر جل اُٹھتی تھی۔ وہ یہ بھول ہی چکی تھی کہ اُس کی وجہ سے نمو اس حالت کو پہنچی ہے۔ بس اُسے تو یہ دُکھ تھا کہ نوید اُسے اپنی باہوں میں کیوں اُٹھا کر لے گیا تھا۔ مرجاتی کمبخت میرا بھی پیچھا چھوٹ جاتا۔ وہ اپنے بیڈروم میں ٹہلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ چہرہ غصہ سے سُرخ تھا۔ وہ جنونی انداز میں ڈیکوریشن پیس اُٹھا اُٹھا کر زمین پر پھینک رہی تھی۔ ڈیکوریشن پیس پختہ فرش سے ٹکراتے اور چھناکے کی مترنم آواز سے ٹوٹ جاتے۔ فرش پر شیشے کے اور دوسرے قیمتی ڈیکوریشن پیسز کا ڈھیر لگ گیا۔ پھر نجانے اُسے کیا خیال آیا کہ وہ بیڈ پر بیٹھ کر رونے لگی۔ اس کی زندگی میں بہت سے نوجوان آئے تھے لیکن نوید میں اور اُس کی دولت میں جو کشش تھی وہ اُسے پہلے کسی میں نظر نہیں آئی تھی۔ "نمو تم میری راہ کی رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔ میں تمہیں ایک ٹھوکر سے گرا سکتی ہوں تم نے میری محبت پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ نوید میرا ہے تم اُسے مجھ سے نہیں چھین سکتیں تم ایک غریب ملازم کی غریب لڑکی اور میں اتنی امیر ہوں کہ تمہاری سات پشتوں کو خرید سکتی ہوں۔" وہ غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ کر نمو کے تصور سے مخاطب تھی پھر وہ ایک فیصلہ کرکے بیڈ پر دراز ہوگئی ہونٹوں پر ایک زہریلہ سا تبسم پھیل گیا۔

نوید ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوگیا طاقت کے انجکشنوں اور پھر پھلوں نے اس کی صحت ٹھیک کردی اس نے ڈاکٹر سے کہہ دیا تھا کہ نمو کو اس کا خون دینے کے بارے میں بالکل بتایا نہ جائے نمو کو ڈسچارج ہونے میں ابھی پورا ہفتہ باقی تھا۔ اُسے ہوش آگیا تھا لیکن کمزوری باقی تھی اس نے اس مہربان فرشتے کا نام پوچھنے کی بے انتہا کوشش کی جس نے اُسے اپنا خون دے کر نئی زندگی بخشی تھی وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ نرسوں نے اُسے بتایا کہ خون دینے والے نے نام بتانے سے منع کیا ہے۔ اجنبی مہربان سے ملنے کا اشتیاق بڑھتا ہی گیا۔ کڑوی کسیلی گولیاں اور دوائیاں کھاتے ہوئے اُسے بے اختیار وہ یاد آجاتا۔ نجانے کون ہے؟ جس نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا جس کے خون نے میری مردہ ہوتی ہوئی رگوں کو زندگی بخشی وہ جتنا سوچتی وہ اتنا ہی یاد آتا۔ پھر اچانک ایک دن اپنے وارڈ میں صائمہ، فائقہ اور عاطفہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ صائمہ کے چہرے پر پُراسرار سی مُسکراہٹ تھی وہ اس کے قریب آگئیں۔

"ہیلو... نمو ڈیئر! کیا حال ہے؟ کیسی ہو؟" صائمہ کا لہجہ خوشگوار تھا۔ نمو حیرت زدہ رہ گئی۔ پھر حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہوں، آپ سب سُنائیے کیا حال چال ہیں؟ میں تو آپ سب کی منتظر تھی لیکن ..."

●

آج صبح ہی سے گھنگھور گھٹائیں آسمان پر چھاگئی تھیں۔ ہلکی ہلکی نمی فضا میں رچ بس گئی تھی۔ انھوں نے نوید سے آج وعدہ لے رکھا تھا کہ وہ جھیل پر پکنک منانے کے لئے جائیں گے۔ صائمہ فائقہ اور عاطفہ تیار تھیں۔

جب سے ہسپتال سے آئی تھی۔ اُن سب کا رویہ اس کے ساتھ قدرے بہتر ہوگیا تھا۔ وہ نمو کو بھی ساتھ لے کر جارہی تھیں۔ وہ گاڑی کے قریب کھڑی ہوئی نوید کا انتظار کررہی تھیں۔ ملازم نے کار کی ڈگی میں مختلف چیزیں رکھ دی تھیں۔ گرما گرم کباب اور تلی ہوئی مچھلی نمو کی پسندیدہ ڈشز تھیں۔

"نجانے نوید بھائی کہاں رہ گئے۔" صائمہ نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ نمو نجانے نوید کے نام سے کیوں سمٹ سی گئی۔ صائمہ کی تیز نگاہوں نے اُسے سمٹتے ہوئے بھانپ لیا وہ دل ہی دل میں پیچ وتاب کھانے لگی۔

"اُف میرے خدا! موسم کتنا دلکش ہے اور یہ نوید بھائی ہیں کہ ابھی تک ہاسپٹل میں دھرنا دیے بیٹھے ہیں۔" فائقہ بولی۔

اسی وقت نوید تیزی سے گیٹ کے اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چرمی بیگ تھا۔ "ہیلو گرلز! کیا حال چال ہیں؟"

"یہ وقت ہے آپ کے آنے کا...؟" صائمہ غصیلے لہجے... میں بولی۔

"سوری! ویری سوری صائمہ! دراصل ایک سیریس کیس میں پھنس گیا تھا بس میں ابھی آیا پانچ منٹ میں تیار ہوکر۔" پھر اس کی نگاہ فائقہ کے پیچھے چھپی ہوئی نمو پر پڑی۔ شفق رنگ... پیرہن میں ملبوس نمو بے حد دلفریب لگ رہی تھی۔ ریشمی سیاہ



Adapted by MNJ

بالوں کا جوڑا اس پر بے انتہا سج رہا تھا۔ گوری گوری کلائیوں میں سیاہ چوڑیاں عجیب سی بہار دکھا رہی تھیں۔ وہ ساکت رہ گیا۔

صائمہ اس کی حالت دیکھ کر سمجھ گئی پھر ضبط کرتی ہوئی بولی "نوید بھائی! جب تک آپ کپڑے تبدیل کریں، پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے یا پھر ایسا کریں ہم جھیل پر چلے جاتے ہیں اور آپ ڈیڈی کی گاڑی لے کر آجائیں۔"

"ٹھیک ہے... میں ابھی آتا ہوں۔"

ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھولا اور وہ چاروں کار میں بیٹھ گئیں۔ ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے کار اسٹارٹ کی، سویا انجن جاگ اٹھا۔ کار تیزی سے شرمیلا جھیل کی سمت بڑھنے لگی۔ نمو بڑے انہماک سے باہر دیکھ رہی تھی۔ سرو کے خوبصورت درخت سڑک کے دونوں طرف کھڑے بے حد بھلے لگ رہے تھے نمو کے دل میں سکون سا اتر آیا۔

"نمو... کیا دیکھ رہی ہو؟" صائمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

"کک... کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی درخت دیکھ رہی تھی، کتنے پیارے ہیں۔"

"ہاں بھئی تمھیں، تو ادب سے لگاؤ ہے اس لئے تم ہر چیز میں حسن تلاش کرتی ہو۔"

"صائمہ! دیکھنے کے لئے دیدہ بینا چاہیئے پھر تمہیں بھی ہر چیز میں قدرت کی صناعی اور دلکشی نظر آنے لگے گی۔"

"نو فلسفہ، نو فلسفہ۔" صائمہ نے بیزاری سے منہ بناتے ہوئے کہا۔ کار چلتی رہی۔ مناظر تبدیل ہوتے گئے۔ اچانک ایک پھولوں والے قطعے پر اس کی نگاہ جم گئی۔ رنگ برنگے دلکش پھول باغیچے میں لہرا رہے تھے۔ رنگین تتلیاں آزادی سے اڑ رہی تھیں جیسے انھیں کسی چیز کا غم نہ ہو۔

منظر تبدیل ہوگیا۔ بنجر سی زمین اس کی نگاہوں میں تھی۔ اُسے اپنی زندگی کے پیچ و خم یاد آنے لگے۔ اس کی زندگی بھی تو اسی طرح تھی کبھی پھولوں بھرا باغیچہ کبھی شعلوں بھری بھٹی کبھی صیاد کبھی رہائی، کبھی رنگینی کبھی دلکشی، کبھی یاسیت کبھی دُکھ، کبھی کرب۔ شاید زندگی اسی کا نام ہے۔ اس کے خیالات نجانے زندگی کی کونسی گرہ کو سلجھانے میں مصروف تھے۔ کار جھٹکے سے رُکی۔ نمو کے تخیل کی پرواز رُک گئی۔

"اُترو بھئی نمو۔" فائقہ نے اس کا شانہ ہلا کر کہا۔ وہ ان کے ہمراہ نیچے اُتر آئی۔ جھیل کے کنارے سبز سبز ریشمی ملائم گھاس اُگی ہوئی تھی۔ کنارے میں کہیں کہیں آس پاس جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ننھے سے خوش رنگ پھول... نزدیک ہی ریسٹ ہاؤس کی خوبصورت عمارت تھی۔ ملازم نے ڈگی سے تمام چیزیں نکال کر بچھے ہوئے قالین پر رکھ دیں۔ وہ بے تابی سے نوید کا انتظار کر رہی تھیں لیکن دُور دُور تک اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ سارا علاقہ سنسان سا تھا۔ دُور تک کسی متنفس وجود کا پتہ تک نہ تھا۔

"فائقہ! چلو ہم تو ریسٹ ہاؤس کو دیکھ کر آتے ہیں۔" عاطفہ نے فائقہ کا بازو ہلا کر کہا۔

"چلو..." وہ بھی فوراً تیار ہوگئی۔ وہ دونوں باتیں کرتی ہوئیں ریسٹ ہاؤس کی طرف چل دیں۔

"نمو! چلو ذرا کشتی کی سیر کرتے ہیں۔" نمو تیار ہوگئی۔ صائمہ کی آنکھوں میں خطرناک سی چمک ابھر آئی تھی۔ دونوں نے کشتی کے چپو سنبھال لئے، جھیل زیادہ گہری نہیں تھی لیکن کسی ایسے شخص کے لئے خطرناک ہوسکتی تھی جس کو تیرنا نہ آتا ہو۔ صائمہ اور نمو کشتی کو کھینچنے لگیں۔ جھیل درمیان سے کچھ گہری تھی۔ پانی کی شفاف لہریں کشتی سے ٹکرا کر لوٹ جاتی تھیں "نمو تم چھوڑ دو میں خود دونوں چپو سنبھال لیتی ہوں۔ میں نے کئی دفعہ کشتی چلائی ہے۔" نمو نے پہلی مرتبہ کشتی چلائی تھی۔ اس کے ہاتھ چپو کھینچنے سے سُرخ ہو گئے تھے وہ فوراً ہی مان گئی۔ اور کھڑی ہو کر پانی کی لہروں سے بنتے ہوئے بھنور کو دیکھنے لگی۔ صائمہ آہستہ آہستہ چپو چھوڑ کر کھڑی ہوئی اور ایک زوردار جھٹکے سے نمو پانی میں جا گری۔ نمو کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا پھر اس کی نگاہ طنزیہ انداز سے قہقہے لگاتی ہوئی صائمہ پر پڑی۔

"تم نے مجھے گرایا ہے؟" نمو کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ اس کے کپڑے بھیگ کر بدن سے چپک گئے تھے۔

"ہاں میں نے تمہیں گرایا ہے۔ آج میں نے اپنا بدلہ تم سے لے لیا ہے۔ تم نے تو مجھ سے نوید چھینا تھا لیکن میں نے آج تمہاری زندگی چھین لی ہے۔ تم چند گھڑیوں کی مہمان ہو یہ جھیل تمہاری قبر بن جائے گی پھر یہ تمہارا خوبصورت وجود ہمیشہ کے لئے مچھلیوں کی خوراک بن جائے گا۔ آج میری فتح ہے۔" وہ وحشیانہ انداز سے قہقہے لگا رہی تھی۔ اس نے کشتی کا رُخ کنارے کی طرف موڑ دیا۔ ڈوبتی ابھرتی نمو اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ اپنی فتح پر قہقہے لگاتی ہوئی ریسٹ ہاؤس کی طرف چل دی۔

نوید نے جلدی جلدی غسل کیا اور کار لے کر شرمیلا جھیل کی طرف روانہ ہوگیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ جھیل پر پہنچ چکا تھا۔ سیٹی پر کوئی خوبصورت سی دھن بجاتے ہوئے وہ چاروں طرف دیکھنے لگا۔ "ارے

یہ سب کہاں چلی گئیں؟ وہ خود سے مخاطب تھا۔ اچانک اس کی نگاہ ایک طرف اٹھ گئی وہ ایک ہوش رُبا نظارا تھا۔ جھیل کے کنارے نمو بے سدھ پڑی تھی۔ جوڑا کھل کر چہرے پر بکھر گیا تھا۔ کپڑے بے ترتیب سے تھے۔ وہ اُسے تکنے لگا۔ وہ بالکل کسی جل پری سے مشابہ تھی۔ اس کا نفس تیز تھا وہ ہوش میں آگیا اور پھر تیزی سے آگے بڑھا "نمو... نمو" وہ اسے پکارنے لگا لیکن وہ دُنیا و مافیہا سے بے نیاز بے سدھ پڑی تھی۔ اس نے نبض ٹٹول کر دیکھی۔ نبض ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔ اس نے جھیل کے شفاف پانی کو چلو میں بھرا اور آہستہ آہستہ اُس کے چہرے پر چھینٹے مارنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اُسے ہوش آگیا "میں... میں کہاں ہوں؟" وہ بولی۔

"نمو... نمو تمھیں کیا ہوا ہے؟"

"وہ صائمہ... جھیل..." وہ ہکلا کر رہ گئی مگر اس کے حواس بیدار ہوگئے۔

"تو کیا تمھیں صائمہ نے گرا دیا تھا؟"

"ہاں" وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"میں سمجھ لوں گا اُن سب سے... اُف یہ اتنی ظالم بے درد بے رحم ہیں ایک انسانی زندگی سے کھیلتے ہوئے ان ذلیلوں کو شرم نہ آئی" وہ لڑاکی عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا کر بولا "چلو میرے ساتھ" وہ اسے لئے کار میں آگیا نمو کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

"نن... لیکن میں وہاں نہیں جاؤں گی۔"

"مگر میں تمھیں لے کر وہاں کب جا رہا ہوں۔"

"تو پھر اور کہاں جا رہے ہو؟"

"بھئی محفوظ جگہ ہی لے کر جاؤں گا۔ اب تمھیں فٹ پاتھ پر تو بٹھانے سے رہا" کار دھیرے سے اسٹارٹ ہوئی نوید نے گیئر بدلا۔ اور کار موڑ کر شہر کی سمت روانہ ہوگیا کار میں خاموشی چھا گئی۔

"نمو! مجھے بتاؤ تو کہ صائمہ نے تمھیں کیوں اور کیسے جھیل میں گرا دیا تھا اور تم کیسے نکل سکیں؟"

وہ دھیرے دھیرے کرب زدہ دُکھی لہجے میں تمام واقعات بتاتی چلی گئی۔

"ہوں... تو یہ بات تھی۔ اُف میں تو سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ صائمہ جو کہ بظاہر بڑی مہذب اور شریف لڑکی نظر آتی ہے اور اندر سے اتنی گھناؤنی اور ظالم ہے کہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے اتنا بڑا قدم اُٹھا کر ایک انسانی زندگی سے بھی کھیل سکتی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ تمھیں تیرنا آتا تھا ورنہ میں تو بِن موت بھی مر جاتا!"

نمو کے چہرے پر شرم کی شفق پھیل گئی جیسے دھنک کے ساتوں رنگ اس کے چہرے پر پھیل گئے ہوں۔

نمو نے کار میں رکھی ہوئی سفید چادر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی پھر اس کی نگاہ ڈرائیو کرتے ہوئے نوید پر پڑی۔ سُرمئی رنگ کے عنابی سوٹ میں ملبوس نوید بے حد پُرکشش لگ رہا تھا۔ گداز مخروطی انگلیاں ڈرائیو کرتے ہوئے بے حد بھلی لگ رہی تھیں۔ سیاہ چمکیلے بال بڑے اسٹائل سے سنوارے ہوئے تھے۔ وجاہت کا پیکر نوید نگاہوں کے ملتے دل میں اُتر گیا۔ دل میں میٹھی میٹھی سی کسک جاگ اٹھی لیکن پھر اُسے اپنی حقیقت یاد آگئی۔ بھلا ایک ملازم کی بیٹی کو اتنے سہانے خواب دیکھنے کی اجازت کب ہے؟ اس نے نوید کا پیکر ذہن سے جھٹکتے ہوئے باہر نظریں جما دیں۔ کار انجانے راستوں سے گزر رہی تھی۔ آسمان پر چھائی ہوئی گھنگھور گھٹا کے وسیع دامن سے بارش کے ننھے ننھے قطرے رم جھم... رم جھم کر کے گرنے لگے۔ کار کے شیشے سے باہر گرتے ہوئے بارش کے قطرے یوں لگ رہے تھے جیسے کسی دوشیزہ کے ہنسنے سے لعل موتی فضا میں بکھر کر بارش کی شکل اختیار کر گئے ہوں۔

ریسٹ ہاؤس...... میں وہ تینوں ڈرائیور کے ہمراہ بیٹھی تھیں۔ باہر بارش شروع ہوگئی وہ گھبرا سی گئیں لیکن پھر موسم کی دلکشی نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"صائمہ آپی! وہ نمو ابھی تک وہاں کیا کر رہی ہے؟" فائقہ نے سوالیہ لہجے میں پوچھا "جاؤ شوفر نمو کو بلا لاؤ بارش میں بھیگ جائے گی۔" فائقہ نے ڈرائیور سے مخاطب ہو کر کہا۔ صائمہ کے چہرے پر خشونیت کے آثار پھیل گئے۔

"اچھا جاؤ بھئی لے آؤ۔ یہ نمو کی داسیاں اداس ہو رہی ہیں!" وہ طنزیہ لہجے میں مسکرا کر بولی۔

"خدا نخواستہ ہم کیوں اس کی داسیاں ہوتیں" فائقہ اور عاطفہ بیک وقت جھنجلا کر بولیں۔ شوفر تینوں بہنوں کی نوک جھونک سے گھبرا کر اپنی کیپ درست کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا لیکن سناٹے کی چادر بارش کی رم جھم سے چاک ہو رہی تھی۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن نمو کا کہیں پتہ نہ تھا۔

"نمو بی بی... نمو بی بی...!" اس کی آواز سناٹے میں گونج کر رہ گئی۔ وہ بدحواس ہو گیا "او... اللہ نہ کرے کہیں نمو بی بی خدانخواستہ جھیل میں تو نہیں ڈوب گئیں" شوفر کے دل میں وسوسے جاگ اُٹھے وہ کچھ دیر تک متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھتا رہا لیکن وہ خوف زدہ سا ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوا۔

"بی بی جی غضب ہو گیا۔ وہ نمو بی بی نجانے..." وہ جملہ اُدھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ صائمہ کے چہرے پر پُراسرار سی مسکراہٹ..

رینگ گئی۔

"نہیں کہیں ہوگی وہ بے وقوف لڑکی ...؟"

"اب کیا ہوگا صائمہ آپی! اللہ نہ کرے کہیں جھیل میں تو نہیں ڈوب گئی بڑا شوق ہے اسے اوٹ پٹانگ کام کرنے کا۔"

"ہاں بی بی! مجھے بھی یہی خیال آتا ہے کہ کہیں نمو بی بی جھیل میں نہ ڈوب گئی ہوں۔"

صائمہ دکھاوے کے لئے پریشان سی ہوگئی۔ "شوفر کیا تمہیں تیرنا آتا ہے؟ اگر آتا ہے تو تم جھیل میں تیر کر اچھی طرح دیکھو شاید وہ زندہ ہی ہو اگر وہ ڈوب گئی ... تو کیا ہوگا؟" اس کا لہجہ پریشان تھا۔ لیکن اندر کے بھید خدا کے سوا کون جانے۔ شوفر بے چارہ جھیل میں اترنے کے لئے تیار ہوگیا بارش چونکہ ہلکی تھی اس لئے وہ سب باہر نکل آئیں شوفر نے کیپ اتار دی اور خدا کا نام لے کر جھیل میں کود گیا۔ ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ صائمہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی "یا اللہ! کم بخت کی لاش ہی نکلے اور اگر زندہ بچ گئی تو ... اف ..." وہ کانپ سی گئی جو حشر اس کے بچ نکلنے پر ہوتا اس کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔ لیکن بچ نکلنے کے امکان بہت کم تھے کیونکہ جھیل میں گرے ہوئے اسے تقریباً آدھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔ بالآخر شوفر کا بھیگا ہوا جسم اور پریشان چہرہ پانی سے نمودار ہوا۔

"کیا ہوا؟" لیکن اسے خالی ہاتھ دیکھ کر صائمہ چونک سی گئی۔

"بی بی جی یہ رومال جھاڑی میں پھنسا ہوا تھا۔"

ہلکے نیلے رنگ کا پھولدار رومال اس کے ہاتھ میں تھا۔

"ہاں یہ تو نمو کا ہے۔"

"بی بی جی! میں جھیل کی تہہ تک گیا لیکن نمو بی بی کا کوئی پتہ ... نہیں یہ رومال بھی کنارے کے قریب اگی ہوئی جھاڑی میں پھنسا ہوا تھا۔"

صائمہ کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا ایک رنگ جا رہا تھا۔ 'کہیں بچ تو نہیں گئی؟' وسوسے دل میں جاگ اٹھے لیکن 'نہیں اسے تو تیرنا نہیں آتا ہے اوہ ... کہیں نوید نے تو اسے نہیں بچالیا؟' سہمی سہمی سی میں، ڈری ڈری حالت کسی اور ہی بات کو ظاہر کر رہی تھیں۔ دونوں بہنیں اس کے چہرے کو غور سے تک رہی تھیں۔

"آپی! اب کیا ہوگا؟"

"میں بھی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں۔" صائمہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

"آؤ ذرا دوسری طرف بھی دیکھ لیں۔"

صائمہ ان کے ہمراہ بادل نخواستہ چلی آئی۔ پھولوں بھرے کنج خوبصورت درخت لہراتی ڈالیاں بہتے چشمے اڑتی تتلیاں سب ہی تھے لیکن جس کی تلاش تھی وہ نہ ملنا تھی نہ ملی۔ آدھ گھنٹے کی تلاش کے بعد بھی ڈھاک کے وہی تین پات۔ شوفر بے چارہ خود تلاش کر کر کے تھک گیا تھا۔

"بی بی! یہ نہ ہو کہ نمو بی بی بغیر بتلائے نوید صاحب کے ہمراہ گھر چلی گئی ہوں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" صائمہ تیزی سے بولی لیکن ایک بے نام سا خوف اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

"ہو کیوں نہیں سکتا آپی! بھیا نوید نے وعدہ ... کیا تھا کہ وہ ابھی آتے ہیں شاید وہ آگئے ہوں اور نمو ان کے ہمراہ چلی گئی ہو ...؟"

صائمہ کی سماعت پر یہ الفاظ بم کی طرح گرے مگر پھر وہ سنبھل کر بولی۔

"اگر نمو نوید کے ساتھ جاتی تو ہمیں بتا کر جاتی۔ بغیر بتلائے نہ جاتی۔"

"ہاں یہ تو ہے آپی!" فائقہ نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ مزید ایک گھنٹے کی تلاش کے باوجود وہ نہ ملی بارش کی رم جھم اچانک تیز ہو کر بڑی بڑی بوندوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ بارش سے گھبرا کر انھوں نے واپس جانے کی ٹھانی۔ شوفر نے تمام سامان کار کی ڈگی میں رکھ دیا۔ وہ سب کار میں بیٹھ گئے۔ شوفر نے چہرے پر پھیلا ہوا بارش کا پانی صاف کرتے ہوئے کار چلادی۔

●

ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں زہرہ داخل تھی اسے خون کا کینسر ہوگیا تھا۔ مرض لاعلاج ہونے کے علاوہ آخری اسٹیج پر تھا۔ زہرہ کے سر پر ہر وقت موت کے خوفناک سائے رقصاں رہتے۔ ایک نرس کی بے وقوفی سے زہرہ کو مرض کا پتہ چل گیا تھا۔ فکرمند اور پریشان سوچوں کے باعث وہ موت کے اور زیادہ نزدیک ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر فہیم ابھی اسے مارفیا کا انجکشن لگا کر گئے تھے۔ زہرہ کی آنکھیں بند ... ہوگئیں۔ ذہن تھک گیا۔ نشہ طاری ہوگیا اچانک اس کی نگاہوں کے سامنے نورین کا چہرہ آگیا۔ سفید کفن میں لپٹا ہوا اداس چہرہ ... زہرہ کا ذہن جاگ اٹھا اس کے کانوں میں ایک انجانی سی سرگوشی کی۔

"زہرہ تو قاتل ہے میری ... میری لخت جگر کی تو نے میری بچی کو بے گھر کیا تم میرے انتقام سے نہیں بچ سکتیں۔ ظالم عورت تو نے فقط دولت کی خاطر میری معصوم لاڈلی بچی کو بے گھر کیا۔ تو نے جھوٹ بولا کہ وہ میرا خون نہیں ہے تو نے میرے نازوں کی پلی بیٹی کو خادمہ بنایا تو نے جو ظلم اس پر ڈھائے۔ مجھے اس کے متعلق سب کچھ پتہ ہے میری روح بے چین ہے۔ انتقام لینے کے لئے زہرہ اب بھی وقت ہے

میری بچی کو سینے سے لگالو شاید اس طرح تیرے گناہ معاف ہوجائیں لیکن اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میرے خدا کا قہر تجھ پر اور تیری اولاد پر پڑے گا۔ لفظ انتقام یاد رکھنا۔"

نورین کے سفید کفن میں لپٹے ہوئے ہیولے کے لب ہلے۔ اور وہ غائب ہوگیا۔ زہرہ کی آنکھ خوف سے مارے فیلکے نشے کے باوجود کھل گئی۔ اس کا وجود خزاں رسیدہ زرد پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ لفظ انتقام کی گردان دماغ میں گونج رہی تھی "ہم... میری بچی نمو میں تجھے سینے سے لگالوں گی۔ تیرے قدموں میں اپنا دوپٹہ ڈال کر خود کو...... معاف کروالوں گی۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دینا۔" وہ نمو سے خیالی بڑے پشیمان لہجے میں مخاطب تھی۔

●

کار شہر میں داخل ہوگئی وہ دونوں خاموش تھے لیکن کبھی کبھی خاموشی بھی بولا کرتی ہے پھر اس خاموشی کو نوید کی آواز نے ہی ختم کیا۔

"نمو... تم اتنی خاموش کیوں ہو؟ کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں بس ویسے ہی سوچ رہی تھی کہ حالات اور تقدیر کی ستم ظریفی نے مجھے کہاں پہنچا دیا ہے؟ میری کسی سے بھی دشمنی نہیں لیکن یہ سب لوگ میرے دشمن کیوں بن گئے ہیں؟" وہ معصومیت اور اداس لہجے میں نوید سے مخاطب تھی۔

"لیکن میں تو تمہارا دشمن نہیں۔ یہ بتاؤ تم میری جان... کی دشمن کیوں بن گئی ہو؟" وہ شوخ لہجے میں چہرہ اس کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔

"میں... لیکن میں نے" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئی۔

"یہ دشمنی نہیں تو کیا ہے میری راتوں کی نیند اڑا کر مجھے پریشان کرتی ہو اور پھر کہتی ہو کہ تم بڑی معصوم ہو۔"

میں نے کب آپ کو کہا ہے کہ آپ جاگا کریں..."

وہ اس کی معصومیت پر مسکرانے لگا۔ "نمو... تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے۔"

"میرے لئے...؟" وہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔

"ہاں تمہارے لئے..."

"اب تو عرصہ ہوگیا کوئی خوشخبری سنے بھلا ان حالات میں میرے لئے آپ کیا خوشخبری لائیں ہیں۔"

"ہاں ہے... پہلے وعدہ کرو کہ جو انعام میں مانگوں گا تم دوگی۔"

"وعدہ... وہ معصوم انداز میں پلکیں جھپکا کر بولی۔

"اونہہ... ہوں پہلے مجھ سے ہاتھ ملا کر وعدہ کرو کہ بعد میں انکار نہ کروگی۔"

"ٹھیک ہے کہہ تو دیا بابا جو کہیں گے مانوں گی۔" وہ جھنجلا کر بولی۔ وہ آپس میں اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔

"یہ لو پھر..." نوید نے اخبار کا ایک تراشہ نکال کر اس کی گود میں پھینک دیا۔

"یہ کیا...؟" وہ حیرت سے بولی۔

"محترمہ! آپ کا رزلٹ ہے۔"

وہ خوشی اور استعجاب سے اپنا رول نمبر تلاش کرنے لگی۔ "اف نمو... میں فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوگئی ہوں۔"

"دیکھا آخر ہم نجومی دلوں کا حال معلوم کر لیتے ہیں۔ یہ رزلٹ تو ہمارے سامنے کیا چیز ہے۔" وہ شاہانہ انداز میں اترا کر بولا۔

"اچھا تو تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نہ؟"

"ہاں بالکل یاد ہے۔" وہ خوشی سے لبریز لہجے میں بولی۔

اچانک کار دھچکے سے کاٹج کے سامنے رکی۔ وہ گیٹ کی جانب دیکھنے لگی کاٹج کی خوبصورت پیشانی پر نیلم ولا کندہ تھا وہ لرز اٹھی۔

"یہ یہ... آپ مجھے کہاں لے آئے؟"

"محترمہ یہ ہماری آنٹی کا گھر ہے۔ یہاں تم بالکل محفوظ ہوگی آج کل کوٹھی کی چابی میرے پاس ہے کیونکہ آج کل آنٹی زہرہ ہسپتال میں ایڈمنٹ ہیں۔"

"کیا ہوا زہرہ آنٹی کو؟" وہ لرزتے لہجے میں بولی۔

"بے چاری کو کینسر ہوگیا ہے۔"

"کینسر...؟" وہ جیسے چلا ہی اٹھی۔

"چلو بھئی تعجب بعد میں کرنا پہلے اندر چلو۔"

وہ بادل نخواستہ کار سے اتر کر گیٹ کے قریب کھڑی ہوگئی۔ نوید نے قمیص کی جیب سے چابی نکالی۔ اور کھل گیا۔

"نمو بھئی اندر چلو میں ابھی آتا ہوں یہ کار ذرا پورٹیکو میں چھوڑ آؤں وہ کار اسٹارٹ کر کے پورٹیکو میں داخل ہوا کار کھڑی کر کے وہ باہر آگیا۔ نمو کی پسندیدہ بیل سامنے تھی وہ عشق پیچاں کی خوبصورت بیل کو ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہی تھی۔ عشق پیچاں کے ننھے ننھے خوبصورت پھول دل کو لبھا رہے تھے۔

"کیسی بے وقوف لڑکی ہو۔ ابھی تک یہیں کھڑی ہو اندر کیوں نہیں گئیں؟"

وہ گھبرا کر مڑی وہ جھنجلایا سا کھڑا تھا نمو کے لبوں پر نرم سی مسکان پھیل گئی۔

"چلو آؤ وہ کاٹج کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ نمو چپ چاپ

اُس کے پیچھے اندر چلی آئی ۔ دُھلا دُھلا سا نوید اچھا لگ رہا تھا۔

"نوید...."

"کچھ نہیں۔" وہ چپ ہوگئی۔ نوید کے لبوں پر شگفتہ سی جاندار مسکراہٹ پھیل گئی۔ نوید اُسے ایک بیڈ روم میں لے آیا۔

"نمو! یہ میری کزن نیلم کا بیڈ روم ہے لیکن آج سے تم اس میں رہنا۔ نیلم کسی سہیلی کی شادی میں ایبٹ آباد گئی ہوئی ہے۔"

اب وہ اُسے کیا بتاتی کہ وہی نیلم ہے جس کے بارے میں زہرہ خالہ نے مشہور کیا ہوا ہے کہ وہ شادی میں گئی ہوئی ہے۔

"میں کچھ دیر کے لئے ہوسپیٹل جا رہا ہوں۔ تم بھی لباس تبدیل کر کے آرام کرو اور ہاں یہ گولیاں رحیمو آجائے تو اس سے دودھ لے کر کھا لینا۔"

"اچھا..." نمو کی آواز جیسے بہت دور سے آئی۔ وہ گنگناتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

نمو اب بھی ساکت سی کھڑی ہوئی اُسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ زنان خانے میں ویرانی سی چھا گئی۔ اس نے بیڈ روم کا پردہ ہٹایا۔ سامنے ہی شوکیس پر دو تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بے خودی کے عالم میں چلتی ہوئی تصویروں کے قریب آئی۔ اُس کے ہاتھ بے اختیار آگے بڑھے تصویروں کے فریم اُٹھا کر اُس نے اپنے سینے سے لگا لئے۔ یہ اس کے محسن والدین جمال اور فوزین کی تصویریں تھیں۔ امی ابو آپ نے مجھے مر جانے دیا ہوتا۔ غریب باپ کے ہاتھوں، اُس کی جھیل کنول آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار سا بہہ نکلا۔ کتنی بدقسمت ہوں میں... جسے نہ حقیقی ماں باپ نصیب ہوئے اور نہ ہی میں سگے باپ کی محبتوں کی مرکز بن سکی۔ اس نے سسکتے ہوئے کرب زدہ لہجہ میں تقدیر سے شکوہ کیا اور پھر تصویروں کو چوم کر کارنس پر سجا دیا۔ بیڈ روم سے ملحقہ باتھ روم میں اس نے اپنا چہرہ دھویا۔ شدت گریہ سے اُس کی آنکھیں گلابی سی ہوگئی تھیں۔ اس نے وارڈ روب سے فاختی لباس نکال کر زیب تن کیا۔ فاختی لباس میں وہ سہمی سہمی سی فاختہ ہی نظر آ رہی تھی۔

●

ڈاکٹر جمال زیب زہرہ پر جھکے ہوئے تھے۔ زہرہ کا تنفس تیز سے تیز تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"ڈاکٹر! میں... میرے جسم میں زہر پھیل رہا ہے سانپ سا ڈس رہا ہے۔ دیکھو سانپ میرے ذہن میں کلبلا رہے ہیں۔ خُدا کے لئے مجھے بچاؤ میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔"

"مسز ظہیر! اطمینان رکھئے آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں نے بلڈ بینک کو فون کر دیا ہے۔ انشاءاللہ تھوڑی دیر تک ہم مقررہ مقدار میں خون مل جائے گا تو پھر ہم خون تبدیل کر دیں گے۔"

"آنٹی! اطمینان رکھئے میں آپ کے قریب ہوں۔ ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔" نوید جو کہ اسی اثنا میں وہاں پہنچ چکا تھا زہرہ کے قریب جھک کر بولا۔

"ن... نہیں... م... میں مر جاؤں گی۔ نوین مجھے مار ڈسے گی۔ تت... تم... ن... نیلم کو بلا دو۔ ک... لا دو۔ م... میں اس سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ اُسے بلا دو۔" وہ نڈھال ہو کر چپ ہوگئی۔

"آنٹی آنٹی! پلیز ہوش میں آئیے۔ ہم ابھی نیلم کو ایبٹ آباد فون کرتے ہیں فون نمبر بتا دیں۔"

"ن... نہیں بیٹا! وہ... وہ ایبٹ آباد نہیں گئی ہے۔ وہ تو میں نے ن... نوکرانی بنا کر ف... قان صاحب کے گھر... چھوڑ دی ہے۔ خ... خُدا کے لئے اُسے ب... لا دو۔ نمو... نمو بیٹی... مجھے معاف کرنا... میں تمہاری مجرم ہوں۔ اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو مجھے... یہ س... سانپ مجھے م... مار دیں گے۔"

نوید جو کہ ابھی پریشانی کے عالم میں نیلم ولا سے آیا تھا۔ یہاں... یہ منظر دیکھ کر اور بھی گھبرا گیا۔ زہرہ کی باتیں سن کر اسے پتہ چل گیا کہ نمو ہی نیلم ہے۔ اس نے نیلم ولا میں نمو کو فون کیا۔

ٹرن... ٹرن... ٹیلی فون کی گھنٹی بجی نمو بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اچانک اُس کی سماعت سے فون کی گھنٹی کی آواز ٹکرائی۔ "نجانے کس نے فون کیا ہے۔" وہ بے دلی سے اُٹھ کر فون کے قریب آگئی۔ "ہیلو... نمو بول رہی ہوں۔" نمو ریسیور اُٹھا کر بے دلی سے بولی۔

"نمو... میں نوید بول رہا ہوں۔ تم کیا کر رہی ہو...؟"

"کچھ نہیں، بس لیٹی ہوئی تھی۔"

"نمو! تمہیں ہاسپیٹل کا تو پتہ ہے نا...؟ جس میں تم داخل ہوئی تھیں"

"ہاں پتہ ہے۔"

"تم ہاسپیٹل پہنچ جاؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"اچھا... لیکن معاملہ کیا ہے؟" نمو نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

"بس ہاسپیٹل آجاؤ پتہ چل جائے گا۔"

"اچھا...! میں آرہی ہوں۔" اُس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور جلدی سے اپنا پرس اُٹھا کر باہر آگئی۔

ٹیکسی دس ہی منٹ میں ہاسپیٹل پہنچ گئی۔

"جلدی آؤ نمو! زہرہ آنٹی کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

"زہرہ آنٹی کی طبیعت خراب ہے؟"

"ہاں جلدی آؤ۔" وہ اس کے قریب آکر بولا۔ وہ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

وہ اُسے لیے ہوئے زہرہ کے وارڈ میں آگیا۔ زہرہ کی نگاہیں دروازے پر جمی تھیں۔ نمو کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی وہ اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ نمو دوڑتی ہوئی اُس سے لپٹ گئی۔

"آنٹی یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" اس کے لہجے میں کرب تھا۔

"بیٹی مجھے اپنے گناہوں کی سزا ملی ہے۔"

"گناہ کیسا گناہ؟"

"تم جمال کی بیٹی ہو۔ مجھے معاف کر دینا۔"

نمو حیرت سے مُنہ تکتی رہ گئی۔ زہرہ کی سانس اکھڑنے لگی۔

"تم... نوید بیٹے تم... میرے قریب آؤ میں مرنے والی ہوں۔ میرے بعد شیلم کا اس دُنیا میں کوئی نہیں۔ تم وعدہ کرو کہ تم اسے اپنا لو گے بیٹا میرے معصوم بیٹی نے بہت دُکھ جھیلے ہیں۔ اُس کو کوئی دُکھ نہ دینا۔ میں نے سگی خالہ ہوتے ہوئے بھی اسے بہت دُکھ دیا ہے۔ تم اسے اپنا لینا میں نے ساری جائیداد تم دونوں کے نام لکھ دی ہے۔ اس دولت نے مجھے شیطان کے جال میں پھنسا دیا تھا۔ میری بچی ایک دفعہ میرے سینے سے لگ جا۔"

نمو اس کے سینے سے لگ گئی۔

"میرا بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہے۔ نورین میں تمہارے پاس آ رہی ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔ خدا ان دونوں کو خوش رکھے۔" پھر اُس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

●

شام کا سہانا سماں تھا۔ نیلگوں آسماں پر ہلکے ہلکے سرمئی بادلوں کے آوارہ ٹکڑے اِدھر اُدھر منڈلاتے پھر رہے تھے۔ ہوا کے نرم و لطیف جھونکے کیف و سرور کا احساس دلا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ جس نے فضا میں جلترنگ کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی آبشاریں بہا رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ آبشاروں کے مترنم نغموں نے سوئی ہوئی موسیقی کو بیدار کر کے ساز فطرت کے تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔ اونچے کے خوبصورت درختوں نے کشمیر کی وادی کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ حدِ نظر تک قدرت کے دلکش نظارے بکھرے پڑے تھے۔ پہاڑی علاقے میں ویسے بھی بارش یا بارش کے بعد کے مناظر کچھ اور بھی پیارے ہو جاتے ہیں۔ بل کھاتی پگڈنڈیاں، سیاہ ناگن کی طرح لگ رہی تھیں۔ ہلکے پیازی رنگ سوٹ میں ملبوس نمو بے انتہا حسین لگ رہی تھی۔ سفید سچے موتیوں کی خوبصورت مالا اُس کی صراحی دار گردن میں پڑی اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ نازک نازک گلابی پاؤں سفید چپل میں بند تھے۔ ڈھیلی ڈھیلی سی دو چوٹیاں اُس کے شانوں پر بل کھا رہی تھیں۔ نوید گہرے بلیو سوٹ میں ملبوس وجاہت کا دلکش نمونہ نظر آ رہا تھا۔ اُنھوں نے کورٹ میرج کر لی تھی۔ اس لیے کہ کہیں دشمن رنگ میں بھنگ نہ ڈال دیں۔ ہنی مون منانے کے لئے وہ دونوں کشمیر کی وادی میں آئے ہوئے تھے۔ کشمیر میں اُنھوں نے اپنی کوٹھی میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کل شام ہی وہ یہاں پہنچے تھے۔ نمو تو اتنی خوش تھی۔ جیسے اُسے دُنیا میں ہی جنت مل گئی ہو۔ وہ دونوں کوٹھی کی بالائی منزل پر قیام پذیر تھے۔ نمو وارفتگی کے عالم میں پہاڑ تلے کو بل کھاتی پگڈنڈیوں کو بہ چشم پڑتی بارش کو دیکھ رہی تھی اور نوید اُس کے شوق کو دیکھ رہا تھا۔

"نمو معلوم ہوتا ہے تمھیں یہ جگہ بہت پسند آئی ہے۔"

"جی بہت زیادہ۔ یوں لگتا ہے جیسے میں جیتے جی جنت میں آ گئی ہوں۔"

"ہاں بے حد پُرسکون جگہ ہے۔" نوید اُس کے حسین چہرے کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"نمی جان!"

"اونہہ..." وہ ہولے سے بولی۔

"نمی تم میری زندگی بن چکی ہو۔"

"اچھا..." وہ کچھ شوخ سی ہو گئی۔ "ویسے نوید ایک بات کہوں؟"

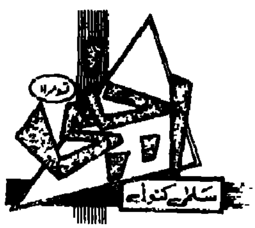
"کیا..." وہ اشتیاق سے بولا۔

"وہ یہ کہ ہماری شادی کی خبر سے صائمہ پر بجلی گر پڑی ہوگی۔"

"ظاہری بات ہے کہ اس کی اُمیدیں خاک میں مل گئی ہیں تو اس پر بجلی ہی گرنی ہے۔ ویسے ہمیں کیا ہمیں تو ہماری منزل مل گئی ہے۔ چاہے کوئی کتنا ہی جلے ہمیں کیا؟"

سورج تیزی سے مغرب کی آغوش میں جا رہا تھا۔ وقت کا تقاضا تھا یا پھر اُس کی شرمیلی ظالم ادا کا اثر کہ نوید نے بے اختیار اُس کی گلابی ہاتھ کی پشت پر اپنے جلتے لب ثبت کر دیئے تو اُس کی گستاخی کی تاب نہ لا کر حیا سے لچک دار پھولوں بھری شاخ کی طرح وہ لجا گئی۔

خلوصِ مہر و محبت کی جلوہ گاہ تو ہیں
نہیں ہیں منزلِ مقصود، سنگِ راہ تو ہیں
اگر ثواب کے قابل نہیں ہیں ہم، نہ سہی
خدا کے فضل سے شائستہ گناہ تو ہیں



عید اور عید کے اردگرد دو تین دن میں جیسے اک خواب کے سے عالم میں رہا تھا۔ نہ سوتا ہوا، نہ جاگتا ہوا۔
بس عجیب سی کیفیت تھی۔
معاملہ آمنہ کا تھا۔ یہاں ہمارے درمیان اس کی پہلی عید تھی۔ سب کو اس کی خوشی اور خاطر مقصود تھی لیکن میں ...
ہاں میں بھی عید کی خوشیوں کی اس پھوار میں نہا گیا۔ مجھے بھی یہ عید زندگی کے مزوں سے روشناس کر گئی۔
یہ عید جس ہنگامے اور گہماگہمی سے گزری تھی یا پھر میں تو اسے ایک حادثے کا نام ہی دوں گا۔ خوشی کے بھی حادثے ہوتے ہیں۔
اور یہ مسرتوں بھرا حادثہ مجھ پر سے گزر کر مجھے مزید دکھی کر گیا۔ اس نے کوئی نیا دکھ نہیں دیا۔ پچھلے ہی دکھوں اور محرومیوں کے نقش گہرے ہو گئے۔ پہلے احساس نہیں تھا جو کچھ مقدر سے ملتا تھا۔ اُسے ہی غنیمت جان لیتا تھا۔ مگر اب آگہی مل گئی تھی۔ اسی لئے پچھلے دکھ اور پرانے زخم زیادہ ٹیسیں دینے لگے تھے۔

آمنہ اپنوں کے درمیان پہلی عید منانے جا رہی تھی۔ یہ احساس ہر بڑے اور بچے کو تھا۔ لہٰذا بھرپور انداز میں منائی جاتی تھی۔
وہ دوسری بات تھی۔ کچھ کی نظروں میں مصلحت بھی تھی۔ اس کی خوشی سے زیادہ مصلحت لیکن مقصد تو ایک تھا۔ خوشیوں سے بھری ہوئی عید مسرتوں سے چھلکتی ہوئی عید۔
میں جانتا تھا کہ چھوٹی امی بڑی امی اور ان کی اولادیں ایک سودمند سودا کرنے جا رہی تھیں۔ آمنہ کو ڈھیروں ڈھیر محبتیں دے کر خوشیوں مسرتوں سے اس کا دامن پُر کر کے انھوں نے اسے فتح کرنا تھا۔ اسے حاصل کرنا تھا لیکن میں اور میری امی۔
گو ہم نہ اس سودے میں شریک تھے اور نہ کوئی اور ہمیں فائدہ پہنچا تھا لیکن گھر میں رہتے تو تھے۔ اس لئے ہم بھی اس سے فیض یاب ہو گئے۔
ایک فیض ہی تو تھا۔ مُردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونک دینا۔ مرجھائے پودوں کی آبیاری کرنا امی کے احساسات بتانے کیا تھے۔
پر میں تو جیسے جی اُٹھا تھا۔ مجھ پر تو جیسے بہار سی آ گئی تھی۔
آمنہ... وہ کالی کلوٹی سی لڑکی جو بن بلائی اس گھرانے پر کسی آفت کی طرح مسلط ہو گئی تھی۔
"ہمارے پاس اسے دینے کو کچھ نہیں ہے لیکن پھر بھی...!"
دوسروں نے تو کچھ حاصل کرنا تھا۔ اس سے زندگی کا مرکز بنا رکھا تھا لیکن میری امی خوامخواہ ہی پریشان ہو رہی تھیں۔



"آمنہ کی پہلی پہلی عید ہے اور اس کا باپ بھی..."

میں دکھ بھرے فقرے کا مقصد سمجھتے ہوئے میں نے قدرے بے بسی سے امی کی طرف دیکھا۔ وہی کیفیت تھی ہمیشہ والی جب بھی آمنہ کی بات کرتیں پلکوں کی نوکوں پہ ننھے ننھے ستارے آکر چمک جاتے۔

"میں کہہ رہی تھی۔ باپ پاس نہیں ہے اور پتہ نہیں اگلی عید بھی جاری کی۔"

ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ اس وقت اس سے میرا بھی دل کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا تھا۔ "امی کیوں ایسی مایوسی بھری باتیں کرتی ہیں۔"

بعض کرچیاں بڑی نوکیلی ہوتی ہیں جہاں گرتی ہیں چھید ڈال دیتی ہیں۔ میرے اندر بھی کئی زخم پڑ گئے تھے کئی داغ ہو گئے تھے۔

اور ان سوراخوں میں سے آمنہ کے علاوہ میرے اپنے بھی دکھ جھانکنے لگے تھے اور میرا منہ چڑانے لگے تھے۔

میں نے تو اپنوں میں رہ کر بھی کبھی عید اپنوں کے ساتھ نہیں کی تھی۔ مجھے کبھی کسی سے عیدی نہیں ملی تھی۔ میں نے کبھی عید پر نیا کپڑا نہیں پہنا تھا۔ نئی جوتی کو ہمیشہ ترسا تھا۔

مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ میری اس محرومی کے لئے کبھی کسی نے ایک لمحہ کو بھی سوچا تک نہ تھا۔ سب اپنے اپنے میں مگن رہتے تھے۔ میرے سامنے نہ تو لے پھرتے تھے اور میں آنکھوں میں حسرتیں اور تشنگی لئے دیکھتا رہتا۔

ایک میری ماں تھی۔ نمی بھری آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکتی۔ ان حسرتوں اور ارمانوں کو دیکھتی رہتیں اور ٹھنڈی آہیں بھرتی رہتیں۔

"میرے پاس ایک چھوٹا سا لاکٹ ہے، وہ تیرے باپ نے..." بات پھر مکمل نہ ہو سکی۔ پہلے ستارے ٹوٹے تھے۔ اب طوفان باد و باراں شروع ہو گیا آہیں، آنسو، سسکیاں...

"امی! عید ہے۔ کوئی آگیا تو کیا سوچے گا؟"

"ہاں۔ آمنہ نے ابھی آنا ہے۔"

انہوں نے جلدی جلدی آنسو پونچھے۔ ضبط کے جانے کون سے ایسے مضبوط بند باندھے تھے کہ لرزتے پھڑکتے ہونٹ بھی ساکت ہو گئے۔ پھر ساتھ ہی قوس قزح کی طرح چہرے پہ مسکراہٹ کی رنگین سی لہر بھی پھیل گئی۔

"یوں تو وہ لاکٹ میں نے تیری دلہن کے لئے رکھا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں سب سے چھپا کے۔"

مطلع صاف ہوتے ہی آسمان کے سارے ستارے امی کی آنکھوں میں اتر آئے۔

"اگر تو اجازت دے تو... میں سوچ رہی تھی آمنہ کو عید پہ..."

ایک لمحہ کے لئے چپ ہو کر وہ پھر بولیں۔

"مجھے تو اسے کوئی عیدی دینا چاہئے نا، میرا بڑا دل چاہتا ہے۔"

"تو دے دیجئے۔ بلکہ ضرور دیجئے۔ آپ اس طرح بھیک مانگنے کے انداز میں مجھ سے کیوں اجازت لے رہی ہیں۔ وہ آپ کی چیز ہے امی! جس طرح چاہیں استعمال کریں۔"

"پر... میں تو ہمیشہ تیری امانت سمجھتی رہی ہوں نا۔"

"میری کیوں...؟"

"ارے تو ہی تو میری ہر چیز کا حقدار ہے۔ وارث ہے میرا..."

"وہ تو ٹھیک ہے۔ وارث ہوں تو ساتھ ہی آپ کی طرف سے بہت سارے فرائض بھی مجھ پہ عائد ہوتے ہیں۔"

"وہ کیا؟" آنکھوں میں شوخی بھری چمک لئے وہ مسکراتی رہیں۔

"سب سے پہلا فرض آپ کو خوش رکھنا، خوشیاں مہیا کرنا پھر آپ کی تابعداری کرنا۔ فرمانبرداری کرنا جو حکم دیں اس کی تعمیل کرنا اور میری جس چیز پر آپ انگلی رکھ دیں، یہاں تک کہ جان بھی مانگ لیں تو..."

میں نے شرارت سے گردن پر انگلی پھیر کر کاٹ ڈالنے کا اشارہ کیا۔

"فوراً حاضر کر دوں۔ بلا کسی چوں و چرا کے..."

"خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے۔"

امی نے سنجیدہ ہوتے [illegible] میرے منہ پر [illegible] کر دیا۔

"کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے۔ بات صرف لاکٹ کی تھی اور تم نے صرف اسے بدلنے کی بات کی تھی کہ ...؟"

امی پھر چپ سی ہو کر کچھ سوچنے لگیں۔ میں بیٹھا ان کے اندر کی کش مکش کو جو چہرے سے بھی عیاں تھی، دیکھتا رہا۔

"ویسے اگر کوئی اور انتظام ہو جاتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔"

"دیکھئے امی! میں چند دن پہلے امتحانات سے فارغ ہوا ہوں۔ نتیجہ نکلنے میں ابھی کچھ دیر ہے۔ اتنے عرصے کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ کوئی چھوٹی جاب مل جائے۔ تو پھر پہلی ہی تنخواہ پر انشاء اللہ ویسا ہی لاکٹ آپ کو بنوا دوں گا ضرور۔"

امی کی پریشانی میں نے بھانپ لی تھی، وہ آمنہ کو کچھ دینا بھی ضرور چاہتی تھیں لیکن لاکٹ کے سوا اور کچھ پاس بھی نہ تھا۔

"آپ بے فکر ہو کر یہ والا آمنہ کو دے دیں۔"

"بالکل ایسا ہی بن جائے گا نا؟"

امی کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا۔

"کیوں نہیں، نمونہ دے کر بنوا لیں گے۔"

"اور تم ...؟"

نئی سی رازداری کے لئے میرے اور قریب ہو گئیں۔

"نمونے کے لئے آمنہ سے لاکٹ لے کر دوسرا بنواؤں گی تو ... اگر ... چپکے سے بدل لوں تو امانت میں خیانت کرنے کی مجرم تو نہیں بن جاؤں گی؟"

میں زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"خیانت کیا ہوتی ہے؟"

"آمنہ سے لے کر بدل لوں گی تو ...؟"

"بالکل ویسا ہی بن گیا تو پھر بھلا بدلنے کی کیا ضرورت ہے۔ امی! آپ بھی کیسی بھولی بھولی باتیں کرتی ہیں۔"

"نہیں رے۔ ہاتھ ہاتھ کی بات ہوتی ہے۔ یہ تیرے باپ کے ہاتھ کا ہے۔ اس میں میری بہت ساری یادیں ہیں ... اور ...؟"

امی کے ہونٹ کپکپائے اور انہوں نے ہکلا ہکلا کر خاموش ہوتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

وہ حسین جذبوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھیں۔ میں انہیں سمجھ گیا تھا۔ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر انہیں تسلی دی۔

"پکا پکا وعدہ ہے آپ کے ساتھ۔ اس وقت اپنی خوشی پوری کر لیں۔ ملازمت ملتے ہی پہلی تنخواہ پر آپ کو ایسا لاکٹ بنوا دوں گا۔"

میری تسلی اور دلاسہ دینے سے وہ کافی بحال ہو گئیں۔ خوشی خوشی اٹھیں اور اسی وقت سب سے نیچے والے بکس میں سے وہ لاکٹ نکال کر مجھے دکھانے لگیں۔

چھوٹا سا تھا لیکن خوبصورت بہت تھا۔ سونے کی نازک سی زنجیر میں لٹکا ہوا ایک منا سا دل۔

محبت کی زنجیر میں بندھا ہوا یہ دل مجھے اپنا ہی لگا۔ زندگی میں پہلی بار میرے سینے کے اندر ایک عجیب سی ارمانوں بھری ہلچل مچ اٹھی اور ...

وہ ان دیکھی لڑکی اپنی سفید راج ہنس جیسی گردن میں لاکٹ پہنے چھم چھم کرتی میرے خیالوں میں اتر آئی۔

ہائے! کتنی خوبصورت تھی وہ ... اور کتنی انوکھی اور نرالی سی۔

میرے خیالوں کی نظریں اس پر ٹکی کی ٹکی رہ گئیں۔ وہ تو مائی پیچاں کی شہزادی سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔

"کیا سوچ سوچ کر مسکرائے جا رہے ہو؟"

"اوہ ...!" امی کی آواز سماعت سے ٹکرائی تو چونک کر سٹپٹا کر میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

کہیں میرے چہرے پر اس کا عکس اور میری آنکھوں میں اتری ہوئی اس کی شبیہ امی نہ دیکھ لیں۔

ابھی میں کسی قابل تو ہو جاؤں۔ ابھی تو میں نے ان کے خواب پورے کرنے تھے اور ... میں اپنے ہی دیکھنے لگ گیا تھا۔ ان کے پورے کئے بنا بہت نااہل تھا۔

"بتایا نہیں تم نے، اگر کوئی اور چیز بدل جانے تو میں یہ سنبھال ہی لوں۔"
شاید امی نے میرے چہرے پر کیا پڑھ لیا تھا جو اپنا ارادہ بدل رہی تھیں۔
"نہیں نہیں امی! آپ نے جو فیصلہ کیا تھا بس وہ درست ہے۔"
"تو پھر ۔ یہ لاکٹ۔۔ کیا تم خود دو گے؟"
امی نے میری بند مٹھی کی طرف اشارہ کیا تو میں چونکا۔ مجھے علم ہی نہیں تھا لاکٹ ابھی تک میری مٹھی میں دبا تھا۔
"میں نے تو ویسے ہی۔" میں نے گھبرا کر اُسے امی کی طرف بڑھا دیا۔
"آپ خود ہی اسے دیں۔"
"بہت خوبصورت ہے نا؟"
"بہت۔۔۔" میری نظروں میں پھر وہی راج ہنس جیسی گردن والی خوبصورت لڑکی گھوم گئی۔
جلدی سے نظریں جھکا کر امی سے اُسے چھپانے کے لئے میں وہاں سے ہٹ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔
"آپ آمنہ کو یہ ضرور دیں۔ وہ افضال ماموں کی بیٹی ہے۔ اس کی خوشی ہمیں ہر دوسرے کی خوشی پہ مقدم رکھنی چاہیئے۔"
"اور شمسی! تم ہر پچھلی عید کی طرح اس بار سب سے الگ تھلگ نہیں رہو گے۔"
میں پھر چونک کر مڑا اور امی کی طرف دیکھنے لگا۔ انھوں نے یہ، اس انداز کا مطالبہ پہلی بار کیا تھا۔
"آمنہ کیا سمجھے گی، جانتے نہیں! اسے تم سے بھی بڑا پیار ہے۔"
"جانتا ہوں۔ وہ ابھی صرف خون کی محبت کے ران ایزوں میں آئی ہے۔ جیسے ایک بچہ پیدائش کے وقت معصوم اور نا سمجھ بالکل صاف تختی کی طرح آتا ہے۔"
"دشمنی اور نفرت کے سبق تو حالات، وقت اور ارد گرد کے لوگ سکھائیں گے۔"
میں نے کہنا چاہا لیکن کہا نہیں۔ اب ہر وقت امی کو کوئی نہ کوئی طعنہ دے کر یا ان کی مخالفت کر کے انھیں دُکھی کر دینا بھی تو اچھا نہ تھا۔
میں اُن کی اولاد تھا تو وہ اُن کے بھائی، بھتیجے، بھتیجیاں تھیں۔ اُن کے ساتھ بھی خون کا تعلق بندھا تھا۔
"جو میں نے کہا تھا سن لیا ہے تم نے۔"
میں خاموش رہا تھا اس لئے امی نے دوبارہ تاکید کر دی۔
میری خاموشی میری رضا بن گئی اور امی کی تاکید اس پر مُہر۔۔
تب۔ میں نے امی کا حکم یاد رکھا ویسے یہ حکم بھول بھی جاتا، نہ اس پہ کاربند رہتا تو مجھ پہ امی بھی زبردستی نہ کر سکتی تھیں۔ اس معاملے میں امی خود بھی کمزور پڑ جایا کرتی تھی۔
لیکن۔۔۔ امی کے حکم کی پوری پوری تعمیل ہوئی اور اس میں سارے کا سارا آمنہ کا ہاتھ تھا۔ میری کوئی سعی نہ تھی۔
چاند رات تھی۔ امی میرا ایک پرانا سوٹ عید کے دن پہننے کے لئے استری کر رہی تھیں اور میں چپ چاپ لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ سب کے نئے کپڑے بنے تھے ہمیشہ کی طرح۔
ہر سال یہ سین دہرایا جاتا تھا۔ یونہی کمرے میں چپ چاپ لیٹ کر اور چھت کو گھور گھور کر میرے عید سے پہلے کے دو دن اور بعد کے دو دن گزرا کرتے تھے۔
نہ میں زبان سے کچھ کہا کرتا تھا نہ امی کچھ بولا کرتی تھیں۔ ہم دونوں کے درمیان نظروں ہی نظروں میں اندر ہی اندر سوال و جواب کا سلسلہ چھڑا رہا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ سلسلہ جاری تھا۔
استری کرتے ہوئے بار بار میری طرف اٹھنے والی امی کی نظریں وہ حکم سنا رہی تھیں جو ایک دن پہلے انھوں نے مجھ پہ لاگو کیا تھا۔
مگر میں اپنی سوچ میں گم تھا کہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ سی میرے کانوں میں اتری۔ میں لیٹا لیٹا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر وہی بھنبھناہٹ بولے بولے کھسر پھسر بنی اور پھر صاف اور واضح الفاظ میں باتوں کی آواز میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔
"میں نے بس کہہ دیا ہے کہ شمسی کو ساتھ لئے بنا نہیں جائیں گے۔"

یہ آمنہ کی آواز تھی۔ جیسے کسی سے جھگڑ رہی تھی۔

"فرحان اور میں تو اپنی بہنوں کے ساتھ جا رہے ہیں۔ شمسی کس حق کے ساتھ جائے گا؟"

شرجیل آمنہ کی مخالفت کر رہا تھا۔

"ہاں تو... مقدر مقدر کی بات ہے نا۔ اسے خدا نے کوئی بہن نہیں دی۔ اکیلا ہے تو رہے۔ اکیلا کوئی کب تک کسی کے نصیب کے ساتھ...؟"

"چلنے چلنے..." آمنہ نے چلاتے ہوئے فرحان کی بات کاٹ دی۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ہم کیا غیر ہیں۔ بھئی ہم اس کے ماموؤں کی بیٹیاں ہیں۔ کیا ہم اس کی بہنیں نہیں ہیں؟"

میرے لئے پہلی بار کسی نے اس انداز میں سوچا تھا۔ ہمارے کمرے کے دروازے کے باہر ہی یہ ساری گفتگو ہو رہی تھی جو گفتگو کم اور جھگڑا زیادہ تھا۔

خاموشی تھی، امی نے بھی سن لیا تھا۔ ایک دم آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر چمک لئے میری طرف تکنے لگیں۔ "دیکھا آمنہ کیسی محبتوں والی لڑکی ہے۔" ان کی نظر جتا رہی تھی۔

خدا نے اسے کوئی محرومی دی ہے تو ہم اس کے اپنے کس لئے ہیں؟ اس کی محرومی کو دور کرنے کی قدرت رکھتے ہوئے بھی کیا ہم اتنے سنگ دل ہیں کہ اسے دور نہ کریں گے؟

آمنہ بلند آواز میں بولتے ہوئے اندر آ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے فرحان، شرجیل، رعنا اور فرح بھی بڑھے چلے آئے۔

"چلو شمسی! اٹھو...!"

آمنہ نے میرا بازو پکڑ کر کھینچا۔

"ہم تینوں لڑکیاں چوڑیاں پہننے چلی ہیں۔"

فرحان اور شرجیل کے چہروں پر انتہائی ناگوار سے تاثرات تھے۔ یہ بھانپ کر میں نے کوئی بہانہ تراش لینا ہی مناسب سمجھا نہ جاؤں گا، نہ تلخی بنے گی۔

"تم لڑکیاں جاؤ۔ مجھے کوئی چوڑیاں پہننی ہیں؟"

"صرف چوڑیوں کا معاملہ ہوتا تو ہم اکیلی بھی جا سکتی تھیں۔"

"تینوں اکیلی...؟"

میں نے اس کا مذاق اڑا کر بات ہنسی میں ڈال دینا چاہی۔

"مذاق وذاق اس وقت نہیں چلے گا۔" وہ بے حد سنجیدہ ہو رہی تھی اس وقت۔

"مجھے گاڑی ڈرائیو کرنا آتی ہے۔ لائسنس بھی ہے میرے پاس۔"

"تو پھر جاؤ۔" میں نے شرجیل اور فرحان کے چہروں کے ناگواری بھرے تاثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ ملانا چاہا تھا۔ اسی لئے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔

فرحان اور شرجیل نے میری ہاں میں ہاں نہیں ملائی، خاموشی سے نظریں پھیر لیں۔ جیسے میری کوئی بھی بات انہیں اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"میں نے کہا نا ہم سب اکٹھے چلیں گے۔" آمنہ چمک کر بولی۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کا لہجہ ملتجی سا ہو گیا۔

"بھئی میں آئس کریم کھلا رہی ہوں۔ ساتھ کچھ لمبی ڈرائیو ہو گی۔ کچھ گپ شپ۔ انگریزی گانے بھی سناؤں گی میں خود۔ چلو نا...!"

وہ میرا بازو کھینچنے لگی۔

"اتنی مزے کی باتیں کرتا ہے شمسی کا بچہ۔ نہیں رعنا؟"

اس نے رعنا کو اپنا گواہ بھی بنا لیا۔ آمنہ کی بجائے کسی اور کا معاملہ ہوتا تو رعنا فوراً مخالفت کر دیتی لیکن آمنہ کی تو کسی بھی بات کی کسی نے بھی مخالفت نہیں کرنا تھی۔

عین میری سوچ کے مطابق رعنا نے جواب دیا۔

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"دیکھا سب کا یہی خیال ہے۔"

"لیکن۔" میں اب بھی ہچکچا رہا تھا فرحان اور شرجیل کے موڈ کافی بگڑے ہوئے تھے اور میں ایک اپنی وجہ سے ان کے رنگ میں بھنگ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

"امی سے تو پوچھ لوں۔"

مجھے یقین تھا۔ امی سے پوچھتے پوچھتے اشاروں کنایوں میں میں نے اپنا مدعا سمجھا دینا تھا اور انھوں نے میری مرضی کے مطابق جواب دینا تھا۔

میری ماں مجھے اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس کا مجھے یقین تھا۔

"میں خود ہی پھوپھو سے پوچھتی ہوں۔"

میرا بازو چھوڑ کر وہ امی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ "پھوپھو! شمسی کو کہیئے ہمارے ساتھ چلے۔"

میں لپک کر ان کے قریب آیا۔ اس سے پہلے کہ امی آمنہ کو کوئی جواب دیں، میں اشارہ کر دوں مگر۔۔۔

امی نے مجھ کو بھی دیکھے بغیر، نہ میرا کوئی اشارہ، نہ فرحان اور شرجیل کے بگڑے موڈ، بس فوراً جواب دے دیا۔

"جائے گا کیوں نہیں۔"

"دیکھا۔ پھوپھو نے بھی اجازت دے دی۔ فرحان! آنا ذرا تم۔ اسے پکڑ کر کھینچ لے جاؤ۔ بڑا ڈھیٹ انسان ہے۔ دوسروں کی خوشی بھی پوری نہیں کر سکتا۔"

"کس کی خوشی، آمنہ! کس کی خوشی کی بات کر رہی ہو؟"

سوائے اس لڑکی کے باقی سب کے موڈ خراب تھے۔ اب میں کس کی خوشی پوری کرتا۔ پاگل سی! کچھ سمجھ بھی نہیں رہی تھی۔

آمنہ کے کہنے پر فرحان آگے بڑھا تو میں خود ہی چل پڑا۔ ان لوگوں کی آپس میں خوشیاں ٹکرا رہی تھیں کس کی خوشی پوری کرتا آمنہ کی یا فرحان اور شرجیل وغیرہ کی۔

تب اس وقت میں نے بھی آمنہ ہی کا انتخاب کیا۔ امی کی بھی رضا اسی میں تھی۔ ماں کی خوشی اور مہمان کی خوشی۔ دونوں مقدم تھیں۔ سب کے ساتھ باہر نکلا۔

"لوگ زیادہ ہو گئے ہیں۔ دوسری گاڑی بھی نکال لیں۔ ہیں نا شرجیل۔"

میرے ساتھ جانے کی وجہ سے جگہ کم پڑ گئی تھی۔ مجھے پھر پریشانی سی لگ گئی۔

"اسی لئے میں مان نہیں رہا تھا۔ بہتر ہے مجھے۔۔۔"

"او۔۔۔ تم چپ کرو۔" آمنہ نے میری بات کاٹ دی۔

"آج کی رات تو جتنے لوگ زیادہ ہوں گے اتنا ہی زیادہ مزہ آئے گا۔ ہیں نا فرح! تم نے بتایا تھا نا پچھلی عید کو تمہاری تین خالاؤں کی بیٹیاں اور بیٹے سب مل کر گئے تھے۔ پوری چار گاڑیاں بھر کر۔"

"ہاں۔ بڑا مزہ آیا تھا۔"

"تو بس پھر۔۔۔ اور۔۔۔ وہ جلیل کہاں ہے؟"

وہ پوری تھانے دارنی بنی ہوئی تھی۔

"وہ پڑھ رہا ہے۔" رعنا نے فوراً جواب دیا۔

"عید کے بعد اس کا امتحان ہے۔"

"امتحان بھی ہو جائے گا۔ میں ابھی اسے بھی پکڑ کر لاتی ہوں۔ اتنی دیر میں چلو تم سب۔۔۔"

وہ بے حد جوش میں تھی۔ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں دیپک سے جل اٹھے تھے۔

ہم گاڑی کے پاس پہنچے تو وہ جلیل کو بھی کھینچ لائی۔

"مائی غزنیئہ دماغ کو بھی تو ذرا سا سستانے کا موقع دیا کرو۔"

"اس کے گلے میں پٹہ ڈالے وہ اسے لئے آ رہی تھی۔

"ایک دو گھنٹے اگر ضائع بھی ہو گئے تو تفریح کرنے سے دماغ کی جو بیٹری چارج ہوگی وہ گئے دو گھنٹوں میں پانچ چھ گھنٹے کا کام بھی تو نمٹا دے گی۔"

جمیل ہنس پڑا تھا: "آمنہ آپا! یہاں سے آپ بڑی شریر ہیں اور بڑی دلچسپ بھی۔"

آمنہ پر اس کی نظریں بڑی معصوم سی محبت لئے اٹھ رہی تھیں۔ دوسروں کی نسبت میں نے ان نظروں میں سب سے زیادہ خلوص دیکھا۔ جمیل سب میں سے چھوٹا تھا اور آمنہ تو اس کے ساتھ بالکل ہی ننھے سے بچے کا سا سلوک کر رہی تھی۔

"میں نے کیا شرارت کی ہے یار! ایک تجھے ساتھ چلنے ہی کو کہا ہے نا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا تمہاری بہنیں تم سے ایک ایک کوک کی فرمائش کر دیں گی۔"

"اور یہ تینوں بڑے کس لئے ہیں؟"

انہیں پیار بھری نظروں سے آمنہ کو تکتے ہوئے جمیل نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

"یہ ہمیں چوڑیاں پہنائیں گے۔" وہ کھٹ سے بولی۔

"لیکن میری تو جیب اس وقت خالی ہے۔"

"ادھار، بھیا! ادھار کی ماں کا انتقال تو نہیں ہو گیا۔ میں تجھے ادھار دوں گی۔"

آمنہ نے بڑے پیار سے انداز میں سینے پر ہاتھ مارا۔ اس وقت وہ مجھے بے حد اچھی لگی۔

زندہ دل، پرخلوص اور پرمحبت۔ اس کے وجود کی تشریح یہی تین الفاظ کرتے تھے۔

"پھر ٹھیک ہے۔" جمیل نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

کرنل کا فرق تھا جو ایسی بے تکلفی اور محبت پر مرتا تھا اور جلیل تو میں نے سنا تھا اس سے اچھا خاصا متاثر ہوا تھا۔ آمنہ دن کو رات کہتی تھی تو وہ بھی رات کہتا تھا اور رات کو دن تو وہ بھی۔

"لیکن میں آپ کے ساتھ بیٹھوں گا۔"

اس نے بھی آمنہ کے گلے میں بازو ڈال دیا۔

"ڈن۔ پھر بولو کس گاڑی میں۔"

"فرحان بھائی کی گاڑی میں۔"

"اپنے بھائی کی چھوڑ کر میری میں کیوں ہے؟"

فرحان نے شرارت سے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کی۔

"بھائی جان کے پاس بیٹھ جاؤں تو ان کے رعب و جلال کے مارے زبان گنگ ہوتی رہتی ہے۔"

فرحان کو شرمیلے شرمیلے اور دبے دبے سے لہجے میں جواب دینے کے بعد اس نے آمنہ کے کان میں کچھ کہا۔

آمنہ ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگی۔ باقی ہم سب کھڑے دیکھ رہے تھے اور فیصلے کے منتظر تھے۔ آمنہ چونکہ چیف گیسٹ تھی۔ وہ اپنے گاڑی اور جگہ کا تعین کر لیتی تو باقی لوگ بیٹھتے نا۔

"شاباش... چل پھر۔" کچھ دیر ہنسنے کے بعد جیل کی پیٹھ ٹھونکی اور اسے پھر بازو کے حلقے میں باندھا اور فرحان کی گاڑی کی طرف چل پڑی۔

"اجازت ہے؟"

فرحان اپنی خوبصورت نئے ماڈل کی گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ بڑے انداز سے جھکا۔

"زہے نصیب۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔"

آمنہ کو پتہ نہیں اس کا یہ انداز کیسا لگا تھا۔ مجھے تو حد درجہ لوفرانہ لگا۔

"آؤ شمسی، تم بھی۔"

بیٹھتے بیٹھتے آمنہ نے مجھے بھی اشارہ کیا۔ میں نے اجازت طلب نظروں سے فرحان کی طرف دیکھا۔

ابھی ادھر سے نہ کوئی اجازت نامہ ملا تھا اور نہ انکار ہوا تھا۔ فرحان جانے کیا سوچنے لگ پڑا تھا۔ آمنہ نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر کھینچ لیا۔

میرے بیٹھتے ہی فرحان چونکا۔

"تم ادھر کھڑی کیا کر رہی ہو۔ آؤ نا دیر ہو رہی ہے۔"

فرحان نے ان دونوں کو بھی بلا لیا۔

"لو۔ شرجیل تو اکیلے رہ گئے۔"

فرحان نے گاڑی کی کھڑکی میں سر گھسا کر میری طرف دیکھتے ہوئے اس انداز میں کہا جیسے وہ چاہتا تھا، میں اس کے پاس چلا جاؤں۔ فرحان کا مدعا سمجھتے ہی میں دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگا تو آمنہ نے مضبوطی سے میرا بازو پکڑ لیا۔

"تم بیٹھے رہو شمسی، اور فرحان، شرجیل سے کہو وہ بھی یہیں آ جائیں۔ ذرا تنگ ہو کر بیٹھ جائیں گے تو کیا ہو جائے گا؟ میرا خیال ہے اس طرح زیادہ مزا آئے گا ہے نا جلیل۔"

"مجھے مروانے کا ارادہ ہے تو مرضی آپ کی۔"

جلیل شوخی بھرے انداز میں ہولے سے بڑبڑایا۔ آمنہ ہنس پڑی۔

"ارے نہیں مرتے ورتے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کسی بڑے بھائی کا رعب داب نہیں چلنے دوں گی۔ اس وقت سب برابر ہیں۔ کوئی چھوٹا نہیں، کوئی بڑا نہیں۔"

"اللہ آپ کو سلامت رکھے آمنہ آپا۔"

یوں سب کو ایک ہی گاڑی میں ٹھونس ٹھانس، مختلف قسم کی ہدایات دیتی ہوئی آمنہ میر کارواں بنی ہوئی تھی۔

سارا راستہ وہ خود بھی ڈھیروں ڈھیر باتیں کرتی رہی اور جس نے خاموشی کی زبان اپنانا چاہی اس سے بھی ڈھیروں ڈھیر باتیں کروالیں۔
اس نے جلیل کو اُدھار پیسے دے کر سب کو کوک پلوائی ۔
"پہلے خود کہہ رہی تھی "آئس کریم کھلائے گی۔ وہ آمنہ بیگم نے میرے کھاتے میں ڈال دی۔ مجھ پر بھی اُدھار چڑھا دیا۔
فرحان اور شرجیل سے چوڑیاں پہنوائیں فرح کو، عنا کو اور خود سب سے زیادہ پہنیں۔ یہ ہاتھ سے لے کر کہنی کہنی تک بازو بھروالئے۔
فرح اور رعنا نے دو دو درجن چڑھوائیں تو فرحان اور شرجیل چیخنے لگے۔ "بھئی ذرا کفایت سے۔ جہیز کے لئے بھی اور بہت سے لوازمات باقی ہیں۔"
آمنہ نے کہنی کہنی تک بازو بھروالئے تو کوئی نہ بولا۔
"او لے لو۔ یہ بڑی اچھی ہیں۔ وہ بڑی اچھی ہیں۔"
جھنگی سے جھنگی اس کے لئے منتخب کر رہے تھے اور سو سو کے نوٹ نکال نکال کر آگے بڑھا رہے تھے
ایک بار تو میرا دل تو اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ جی چاہ رہا تھا دونوں کے نوٹ چھین لوں اور پھاڑ کر ہوا میں اڑا دوں۔ بکھر جائیں دور دور تک اور
یہ انہیں پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے پیچھے لپکیں۔ یوں آمنہ سے دور دور ہوتے چلے جائیں۔
دور... آمنہ... ان کے ناپاک ارادوں سے بچ جائے۔ ان کی دشمنی بھری محبت سے نجات پاجائے۔
"تم کیا سوچ رہے ہو شمسی ؟"
آمنہ کے ٹہوکے پر میں چونکا۔ سب گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔
"کیا پھوپھو کے لئے چوڑیاں لینا چاہتے ہو؟"
"نہیں نہیں... امی کبھی چوڑیاں نہیں پہنتیں۔"
"پھر... کسی دوست کے لئے کیا۔ ارے شرماؤ نہیں۔ بتادو۔ میں خود پسند کر دوں گی اور..."
ہولے سے میرے کان میں کہنے لگی۔
"ادھار بھی دے دوں گی۔"
"ارے میری کوئی دوست نہیں ہے۔"
میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔
"سچ کہہ رہا ہوں۔"
"میں بھی نہیں ؟"
"تم نے تو دونوں بازو پہلے ہی بھروالئے ہیں۔ اب کوئی جگہ باقی ہے ؟"
"تم جھوٹے منہ سے ہی کہہ کے تو دیکھو۔ ابھی جگہ بناتی ہوں۔"
"وہ کس طرح ؟"
"یوں .. اس طرح ..."
وہ دونوں بازو ایک دوسرے سے ٹکرا کر چوڑیاں توڑنے ہی لگی تھی کہ میں نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا۔
"پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟"
وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔
"ڈر گئے ہو۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔"
اور وہ گاڑی کی طرف چل دی۔
واپسی پر لمبی ڈرائیو کرتے ہوئے آمنہ نے بڑے خوبصورت انگریزی گانے سنائے۔ میں نے انگلش میوزک کبھی غور سے سنا ہی نہ تھا۔ جو تھوڑا بہت گزرتے ہوئے آتے جاتے کان میں اترتا تھا تو لگتا تھا کوئی چیخ چلا ہی رہا ہے
مگر۔ آمنہ کے منہ سے سنا تو اچھا لگنے لگا۔ اس کی آواز میں ایک خاص درد تھا۔ ایک خاص سوز تھا۔
ایک گانے میں اس نے اپنی مرحومہ ماں کی شان میں مدح سرائی کی تھی۔ دوسرے دو میں باپ کو یاد کیا تھا کہ عیسدتا دن آنے والا

"۔۔۔ وہ ان کے بغیر اداس تھی۔

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ انگلش پوئٹری میں بھی کچھ شدھ بدھ رکھتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سے، دو سادہ سادہ سے اشعار کافی پُراثر تھے۔ سب خاموش اور سنجیدہ تھے۔ آمنہ کو جلد ہی احساس ہو گیا۔ تیسرا اگلا شعر بھی نہیں کیا۔ ادھورا چھوڑ کر ایک دم بولی۔

"ارے آگے بھول ہی گئی۔"

اور پھر جلدی سے ایک خوشی و مسرت بھرا نغمہ چھیڑ دیا۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس کی کیفیت کو جان گیا تھا مگر اس نے اس طرح خود کو سنبھال لیا کہ کسی اور کو کچھ پتہ ہی نہ چل سکا۔

"ارے! فرح رعنا تم بھی میرا ساتھ دو نا۔ تالیاں ہی بجاتی جاؤ۔"

آمنہ کی فرمائش پر فرح اور رعنا نے نہ صرف خالی خولی تالیوں سے ہی اس کا ساتھ دیا بلکہ انھوں نے بھی بڑے پیارے پیارے گیت سنائے۔ لوک گیت۔۔۔

جو آمنہ کو بہت پسند تھے۔ کئی کئی بار اس نے سُنے۔ اس کی پسند دیکھتے ہوئے جمیل نے بھی ماہیا سنایا۔ اس کی آواز اچھی تھی۔ گلے میں رس بھی تھا مگر بول بار بار بھول جاتا تھا۔

تب سب نے تالیاں بجا بجا کر اسے ہوٹ کرنا شروع کر دیا۔

"نہ جی نہ۔" آمنہ نے ہاتھ لہرا کر سب کو منع کر دیا

"میرے مُنے سے فرینڈ کا کوئی مذاق نہ اُڑائے میرے خیال میں اسے سب سے زیادہ نمبر ملنا چاہئیں۔ لہٰذا۔ آج کے اس میوزک کنسرٹ کا ونر، جمیل۔۔۔"

جمیل کا ایک بازو پکڑ کر آمنہ نے بلند کر دیا اور آمنہ ہی کی خاطر تو سب بھی ونر کی آڑ میں تالیاں بجانے لگے۔

یُوں کچھ ایسا سماں بندھا۔ کچھ ایسا ماحول طاری ہُوا کہ محمود و ایاز جیسے ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ ہنس رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔ چیخ چہاڑ کر رہا تھا۔ میں جو ایک خادم تھا۔ اس گھر کے سارے افراد کا خدمت گزار تھا۔ اب خود کو ان کا کزن تصور کر رہا تھا۔ آقا اور غلام کا فرق مٹ چکا تھا۔

اپنے رشتہ داروں کے ساتھ یہ میری زندگی کی پہلی تفریح تھی۔ پہلا ٹرپ تھا۔ کامیاب اور خوش گوار اور اس کی وجہ آمنہ بنی تھی۔

بڑی برکتوں رحمتوں والی لڑکی تھی اور آج۔۔۔ آج تو وہ مجھے تن کی بھی کالی نہیں لگ رہی تھی۔ جیسا اُس کا دامن اُجلا تھا۔ ویسی وہ وہ خود اُجلی اُجلی دکھائی دے رہی تھی۔

آمنہ! تو پہلے کیوں نہیں آئی؟ تو اتنی دیر سے کیوں آئی؟

آج سے چند سال پہلے آجاتیں تو، میری زندگی مختلف ہوتی۔ دُکھوں اور ویرانیوں کی بجائے میں بھی اس سُکھ اور خوشی کے گلزار میں ایک پھول بن کر مہک رہا ہوتا۔ میری بھی کوئی قدر و قیمت ہوتی۔

اس طرح۔ جس طرح آج تُو نے بنائی ہے۔

●●

میں بڑی گہری نیند میں ڈوبا ہُوا تھا جب کسی نے جھنجوڑ جھنجوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"اُٹھو شمس! عید کی نماز کا وقت ہُوا جا رہا ہے اور تم ابھی تک سو رہے ہو۔"

جاگنے کے کئی لمحات بعد ہوش میں آیا تو آمنہ کی عجلت بھری آواز کانوں میں اُتری۔ میں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

رات کو دیر سے سویا تھا اس لئے ابھی تک سویا پڑا تھا۔ باہر نگاہ دوڑائی کافی روشنی پھیل چکی تھی اور امی کمرے میں نہیں تھیں۔ یقیناً کچن میں ہوں گی۔

"آج کے دن، عید کے دن تو کچھ میری طرف توجہ دیتیں۔"

ان کی خالی چارپائی کی طرف دیکھتے ہُوئے میں نے دل ہی دل میں ان سے غائبانہ شکایت کی۔

اور یہ شکایت شاید میرے چہرے پر بھی موٹے موٹے حروف میں لکھی گئی تھی جو آمنہ نے پڑھ لی تھی۔

"اُدھر پھوپھو کی چارپائی کی طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ اُنھوں نے تو مجھے بھیجا ہے کہ تمھیں جگا دوں۔ وہ صبح سے تمھیں تین مرتبہ جگا چکی ہیں۔"
"بڑی ذہین ہو۔" میں اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔
"دل کی بات بہت جلد سمجھ جاتی ہو۔"
شاید وہ بڑی جلدی میں تھی۔
"اب دوبارہ نہیں سو جانا۔ سب کے ساتھ مل کر عید پڑھنے جانا ہے۔ پتہ ہے نا تمھیں۔ فرح نے بتایا ہے کہ تم کاہل ہمیشہ دیر سے تیار ہوتے ہو اور پھر اکیلے جاتے ہو۔ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"
تاکید کرتے کرتے وہ جلدی سے چلی بھی گئی۔ مجھ پر ابھی تک رات کی سیر و تفریح کا خمار طاری تھا۔ جی چاہتا تھا اس سے کچھ باتیں کروں۔ مگر وہ... جو کہتی تھی۔
"وہ انسان ہی کیا جو دماغ نہ رکھتا ہو۔"
اس وقت اس کی انسانیت دماغ سمیت پتہ نہیں کہاں چلی گئی تھی۔ میری خواہش کو سمجھی ہی نہیں اور بھاگ نکلی۔
"اوہ...!" اچانک سامنے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ میں پاگل کیسی کیسی باتیں سوچ رہا تھا اور ادھر واقعی نماز کو دیر ہو رہی تھی۔
پر میں نے کون سا، آمنہ کے حکم کے مطابق گھر کے باقی افراد کے ساتھ مل کر عید کی نماز پڑھنے جانا تھا۔ رات گزر چکی تھی۔ وہ وقت دوسرا تھا۔ آمنہ بازو سے پکڑ کر کھینچ لے گئی۔ اب تو آمنہ نے گھر میں ہی رہنا تھا۔ اب کس نے میرے ساتھ ایسی خلوص و محبت بھری زبردستی کرنا تھا۔
میں نے غسل کیا۔ امی نے رات کو میرے کپڑے استری کر کے رکھ دیئے تھے، وہ پہنے۔ دیوار میں لگے چھوٹے سے آئینے میں سے دیکھ کر بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔
سوچیں اب بھی دماغ میں وہی تھیں۔ فرح نے کیسے اپنے باپ، چچا اور بھائیوں کا الزام میرے سر تھوپ دیا تھا کہ میں کاہل دیر سے اٹھنے کی وجہ سے اُن کے ساتھ نہیں جاتا تھا۔ کیسا سفید جھوٹ بولا تھا۔
حالانکہ وہ خود کبھی ساتھ نہیں لے کر گئے تھے۔ جھوٹے سے بھی کبھی نہیں پوچھتے تھے اور آمنہ کو بتایا میری کاہلی تھی۔
"ارے! وہی پُرانا سوٹ پہن لیا ہے؟"
آمنہ نے اندر آتے ہی ڈانٹنے کے انداز میں پوچھا۔
"یہ آج تم صبح سے اُدھر ہی کے چکر کیوں لگا رہی ہو۔ جاکر اپنی بہنوں، سہیلیوں کے ساتھ عید مناؤ۔"
"اوئے ہوئے۔ تم نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا۔ میں تو تمھیں عید مبارک کہنا بھول ہی گئی۔ شمسی عید مبارک۔"
"عید مبارک۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔
"چلو اب جاؤ۔ تمھارے چاچے چاچیاں..."
"چاچے اور چاچیوں کو میں سنبھال لوں گی۔ میں یہ دیکھنے آئی تھی کہ تم نے کپڑے کون سے پہنے ہیں۔"
"دیکھ لو۔" میں اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔
"اسمارٹ لگ رہا ہوں نا؟"
"خاک...!" اس نے ناک چڑھائی۔
"عید کے دن بھلا کوئی برسوں پُرانے کپڑے پہنتا ہے؟"
"یہ موضوع نہ چھیڑو۔"
میں پھر آئینے کی طرف رُخ پھیر کر کنگھا کرنے لگا۔
"یہ اپنی عیدی کا پیکٹ تم نے کھولا کیوں نہیں؟"
"کون سا...؟"
"آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ میز پر نہیں پڑا تھا؟"
"میں نے دھیان نہیں دیا۔"

... اس نے میز پر سے اٹھا کر مجھے تھما دیا۔

"پر یہ میز پر کب رکھا تھا؟"

"رات کو... چوڑیاں پہن کر واپس آئے۔ پھر مہندی لگائی۔ شجھوں کے نیچے بیٹھ بیٹھ کر سو گئی۔ اسی میں فجر ہو گئی۔ نماز پڑھی اور پھر آ کر چپکے چپکے رکھ گئی۔ یہ تینوں لڑکیاں تو ساری رات جاگتی ہیں۔ بڑا مزہ آیا۔ کھولو نا۔"

"نماز پڑھ کر واپس آؤں گا تو پھر کھولوں گا۔"

"نہیں پہلے کھولو۔"

"او بابا دیر ہو رہی ہے۔"

"او بابا! اتنی نہیں ہوئی۔ میں نے ہی جلدی ڈالی ہوئی تھی۔ اس کی خاطر کہ دیکھوں میرا تحفہ تمہیں پسند آیا ہے یا نہیں۔" وہ بڑے انداز سے مسکرائی۔

"تا یا جی کھولو۔"

میری جان کا عذاب بن گئی تھی۔ کسی بھی طرح ٹل ہی نہیں رہی تھی۔ جلد از جلد اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے میں نے وہ پیکٹ جلدی جلدی کھولا۔

بڑے خوبصورت رنگ کا بڑا ہی خوبصورت ریڈی میڈ عوامی سوٹ تھا اس میں...

"یہ ابھی پہننا ہے۔ میں اس لئے بار بار ادھر کے چکر لگا رہی تھی کہ مجھے یقین تھا تم گڑبڑ کرو گے۔ نہیں کھولو گے اور پرانا پہن لو گے۔"

"لیکن آمنہ..."

"کہا نا لیکن ویکن کچھ نہیں۔ کوئی بات میں نے سننا ہی نہیں ہے۔"

آمنہ نے سوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"جلدی کرو۔ سب کے ساتھ عید پڑھنے جانا ہے تمہیں۔ یہ میری خوشی ہے شمسی! چلو... میں ابھی پھر آتی ہوں دیکھنے کے لئے۔"

وہ پھر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ ادھر بھی کوئی ایسے ہی چکر چلا رکھے ہوں گے جو پل کر ادھر آتی تھی اور دوسرے پل ادھر بھاگ جاتی تھی۔ پتہ نہیں کیا کرتی پھر رہی تھی۔

یہ عیدی قبول کروں یا نہیں۔ بڑا قیمتی سوٹ تھا اور آمنہ مجھ سے چھوٹی تھی۔ اسے کچھ دینے کے بجائے اس سے کچھ لینا کوئی اچھی بات نہ تھی۔ میری تو غیرت گوارا نہیں کر رہی تھی۔

میں انہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ آمنہ پھر شور مچاتی اندر داخل ہوئی۔

"مجھے یقین تھا کہ تم اسی طرح کھڑے ہو گے اور کچھ غلط سلط سوچ رہے ہو گے۔"

وہ تو مجھے مجھ سے بھی زیادہ سمجھنے لگی تھی۔

"ارے بابا! ہم سب نے ایک دوسرے کو عید کا تحفہ دیا ہے۔ فرحان اور شرجیل سے بھی پوچھ لو۔ سب نے ایک دوسرے کو..."

"مگر میں نے تو تمہیں کچھ نہیں دیا۔" میری غربت میری محرومی میرے ہونٹوں پہ آ گئی۔

"کب کچھ نہیں دیا؟"

"کیا...؟" میں اس کے سفید جھوٹ پر متحیر سا ہو کر چلایا۔

میں تو سمجھا تھا وہ صرف تن کی کالی ہے۔ اس کا من بڑا روشن اور اجلا تھا مگر یہ جھوٹ۔ اچھی ذہنیت کی دلیل تو نہ تھی۔ چھی چھی... مجھے غصہ آنے لگا۔

"میں نے تمہیں کیا دیا ہے؟"

"دوستی، خلوص...؟"

"کیا...؟" میں گڑبڑا سا گیا۔ اس جواب کی مجھے قطعی توقع نہ تھی۔

"کیا نہیں...؟" اس نے میرے قریب آ کر میری آنکھوں میں جھانکا۔

"شمسی! تم مانو یا نہ مانو۔ مگر اس سارے گھر میں مجھے سب سے زیادہ جن دو ہستیوں کے خلوص اور محبت اور یقین ہے وہ پھوپھو ہیں اور تم ہو۔

میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں اور میری بات کا اگر تم یقین کرو تو تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ تم بھی مجھے باقی سب سے زیادہ عزیز ہو۔ اپنی پھوپھو کے اکلوتے بیٹے ہونے کے ناتے اور میرے لئے تمہارے اندر جو جذبے ہیں جن کا اظہار تم نے کبھی نہیں کیا۔ ان کے حق کی ادائیگی کے طور پر بھی۔۔"

میں حیرت بھری آنکھوں سے اسے تکے جا رہا تھا۔ وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ اس نے ٹھیک پرکھا تھا۔ باقیوں کے دلوں میں تو کوئی لالچ تھا مگر میں پُرخلوص سے اس کا بہی خواہ تھا۔ افضال ماموں کی بیٹی کے ناتے۔ اس کا بھلا چاہتا تھا۔ وہ پہچان والی نگاہ رکھتی تھی۔

"میں تم پہ اعتماد کرتی ہوں شمسی اور یہ جو بے لوث خلوص بھرا جذبہ تم سے مجھے ملا ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ تمہاری عیدی ہے میرے لئے سب سے اعلیٰ سب سے قیمتی، ہے نا نہیں؟"

تب ہکا بکا کھڑا تھا جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس وقت میرے چہرے پر جانے کیسے رنگ تھے کون سی پرچھائیاں تھیں جنہوں نے اُسے پریشان سا کر دیا۔

"اس کے چہرے پر بکھری خوشیوں کی چمک یک دم کافور ہو گئی۔ اس نے بڑھ کر وہ سُوٹ پکڑ لیا۔ "اچھا پھر ٹھیک ہے۔ تم اس کو اپنی انا اور خودداری کا مسئلہ بنا رہے ہو تو۔۔ میں واپس لئے جاتی ہوں۔ ویسے اس میں ایسا کوئی معاملہ نہ تھا۔ بس خلوص اور محبت تھی سراسر۔ احسان بھی نہیں تھا کوئی۔"

وہ سُوٹ کو بانہوں میں دبائے سینے کے ساتھ لگائے کچھ سوچتی ہوئی، کھوئی کھوئی سی چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی باہر کو چل دی۔

دروازے تک پہنچی تھی کہ امی اندر داخل ہوئیں۔

"عید مبارک پھوپھو۔"

"کیا ہوا۔۔۔؟ یہ تمہاری آنکھوں میں آج کے دن۔۔"

"آنسو ہیں پھوپھو۔۔" اس نے خود ہی امی کا جملہ پورا کر دیا۔

"آپ کے بیٹے نے عیدی دی ہے۔ بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ۔۔"

وہ امی کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔

"ارے ارے! کیا ہوا میری جان؟"

"پھوپھو! ہم سب نے ایک دوسرے کو عید کے تحفے دینے ہیں۔ یہ سُوٹ میں شمسی کے لئے لائی تھی مگر اس نے یہ تحفہ قبول نہیں کیا۔ اس کی خودداری اور غیرت کا تقاضا یہی ہے۔"

"خواہ مخواہ ہی۔۔"

امی نے جلدی سے اس کے ہاتھوں سے سُوٹ لے لیا۔

"کیوں نہ لے گا۔ عیدی واپس نہیں کیا کرتے۔"

"امی! میں نے واپس نہیں کی۔" میں گھبرا گھبرا کر اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

"میں تو کہہ رہا تھا۔ یہ چھوٹی ہے۔ حق میرا بنتا تھا اسے کچھ دینے کا۔"

"تم بھی دو گے۔" امی جلدی سے وہ لاکٹ نکال لائیں۔

"بدلے کے طور پہ نہیں۔ محبت کے ساتھ۔ لے پہنا دے اپنی بہن کے گلے میں۔۔۔ تیری افضال ماموں کی اکلوتی بیٹی ہے۔"

امی نے لاکٹ میری طرف بڑھایا۔

"ہائے! اتنا خوبصورت۔۔۔؟"

آمنہ نے میرے پکڑنے سے پہلے ہی امی کے ہاتھ سے اُچک لیا اور زنجیر کے درمیان میں لٹکا ہوا وہ چھوٹا سا دل ہتھیلی پر رکھ کر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسو آسمان کے ستارے بن گئے۔ آنکھیں جگمگ جگمگ کرائیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی کلیاں کھل گئیں۔

"پھوپھو! ایسی عیدی مجھے کسی اور سے نہیں ملی۔ یہ میری پھوپھو بھی تو سب سے جُدا ہے۔"

وہ ایک بار پھر امی سے لپٹ گئی۔

"پھوپھو! آپ کا مَس مجھے لگتا ہے مجھے لگتا ہے جیسے میرے بابا نے مجھے گلے سے لگا لیا ہو۔ وہی خوشبو، وہی لمس اور آج عید کا دن

ہے پھوپھو! سب پاپا... اکیلے... اکیلے...؟"

"تو خوش ہے تو وہ بھی خوش ہوں گے۔ آج کے دن خوشی سے دعا سے انھیں یاد کرو۔"

امی نے اپنی نم آنکھوں کو جھپکتے ہوئے اس کی آنکھوں کے ٹوٹے ستارے چنے۔

"عید کارڈ بھیجا تھا اپنے باپ کو...؟"

"ہاں۔ ان کا بھی آیا تھا بکہ تحائف بھی آئے ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھے؟ اوہ! کل ہی تو ملے تھے۔ پھر رات کو ہم سب چاندرات منانے چلے گئے تو دکھانا یاد ہی نہیں رہے۔ میں ابھی لاکر دکھاتی ہوں لیکن یہ آپ کے والا سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔"

اس نے ہتھیلی پر رکھے اس دل پر ایک نظر پھر ڈالی اور جذباتی سی ہو کر اسے چوم لیا۔

"ابھی تیار ہو کر پہنتی ہوں اور شمسی سے بھی کہیں نا۔ لے۔ میں نے اس کی عیدی لے لی ہے نا۔"

جس انداز میں اس نے لاکٹ وصول کیا تھا۔ اب انکار کی گنجائش کہاں رہ گئی تھی۔ میں خود کمزور پڑ گیا تھا۔ اس کے جذبے کے اظہار کے سامنے مجھے اپنے جذبے بڑے ہلکے نظر آنے لگے تھے اور امی تو بالکل ہی اتھل پتھل ہو گئیں۔

"ہاں شمسی! جاؤ یہ سوٹ پہن لو۔ جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔"

پھر انھوں نے دروازے سے باہر دیکھا۔ دھوپ کافی نکل آئی تھی۔

"نماز تو اب شروع ہونے ہی والی ہو گی۔ میں سویّوں کا پوچھنے آئی تھی۔ باقی سب کے لئے میز پہ ناشتہ لگا آئی ہوں۔ تمھارے لئے کیا یہیں لے آؤں اور ہاں آمنہ بیٹی! تمھیں وہ سب پوچھ رہے تھے تم جانتی ہو تمھارے بغیر کوئی نوالہ نہیں اٹھائے گا۔ تم جلدی پہنچو۔"

"ہاں پھوپھو! یہاں کے سب لوگ بڑے پیارے ہیں۔ بس میں جا رہی ہوں۔"

مٹھی میں لاکٹ دبائے وہ چلی گئی۔

"عید کے دن نیا کپڑا پہنیں تو ثواب ہوتا ہے۔"

اس کے جانے کے بعد امی مجھے نصیحت کرنے لگیں۔

"اور ہاں یہ بھی ذہن میں رکھو۔ ذرا سی بات کے لئے کسی کا دل توڑ دینا بھی گناہ ہے۔"

امی بھی مجھے سمجھا کر باہر نکل گئیں۔ مجھے اچھی طرح سمجھ آگئی تھی کہ ان کا اشارہ کس طرف تھا۔ لہٰذا میں گناہ سے بچنے اور ثواب کمانے کی خاطر جلدی جلدی آمنہ کا دیا ہوا سوٹ پہننے لگا۔

اس کا رنگ اور ماڈرن ڈیزائن مجھے بے حد پسند آیا۔ زندگی میں پہلی بار کوئی ڈھنگ کا کپڑا پہنا تھا۔ اپنا آپ ہی بدلا ہوا لگ رہا تھا۔

کپڑے بدلنے سے بال خراب ہو گئے تھے۔ اسی آئینے کے سامنے کھڑا بال درست کر رہا تھا کہ پھر آمنہ کی جوتی کی ایڑی کی کھٹ کھٹ سنائی دی ساتھ ہی آئینے میں بھی اس کا چہرہ نظر آیا۔

"تم ابھی تیار نہیں ہوئے؟"

"بس ہو گیا۔" کنگھا ہاتھ میں تھامے میں اس کی طرف گھوما۔

"ارے واہ... بالکل شہزادے لگ رہے ہو۔ ایک دم لسے ون۔ چلو بس کرو۔ بال ٹھیک ہیں۔"

میرے ہاتھ سے کنگھا چھین کر رکھتے ہوئے عجلت سے بولی۔

"سب کو دیر ہو رہی ہے۔ جلدی چلو۔"

"لیکن میرا باقی سب سے کیا تعلق...؟"

"عید کے دن سب کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ میں سب کو منع کر آئی ہوں۔ جب تک شمسی نہیں آئے گا۔ کوئی سویّاں نہیں کھائے گا۔ چلو چلو۔ جلدی۔"

وہ میرا بازو پکڑ کر کھینچنے لگی۔

"لیکن آمنہ سنو تو..."

"میں کچھ نہیں سنوں گی۔"

وہ مجھے کھینچنے لگی۔ دروازے میں امی سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی، وہ میرے لئے پلیٹ میں سویاں لئے چلی آ رہی تھیں۔

"نہیں پھوپھو! یہ یہاں نہیں اُدھر ہم سب کے ساتھ کھائے گا۔ یہ کیا بات ہوئی، عید کے دن بھلا یوں کوئی علیحدہ علیحدہ رہتا ہے، ایک گھر کے افراد ہو کر۔ چلئے آپ بھی، دونوں۔"

دوسرے ہاتھ میں اُس نے امی کا بازو پکڑ لیا۔

"آپ کو تو پھوپھو پتہ ہی ہے، آج دونوں گھروں کا کھانا پینا اکٹھا ہوگا سارا دن، بلکہ کل کا دن بھی، اور آپ ہم سے علیحدہ ہیں کوئی۔"

ہم دونوں ماں بیٹا حیران پریشان سے تکتے تکتے اس کے ساتھ کھانے والے کمرے کی طرف چل دیئے۔ اسے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور جو کچھ وہ کئے جا رہی تھی، وہ بھی انہونی سی بات تھی۔

ہم ڈائننگ روم میں پہنچے۔ وہاں دونوں ماموؤں کے گھروں کے سارے افراد موجود تھے۔ ایک ہی میز کے گرد۔ میز انواع و اقسام کی چیزوں سے بھری پڑی تھی۔

دو تین قسم کی سویاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک سویوں کا زعفرانی قوام تھا۔ باداموں والا شیر خرما تھا۔ رومالی سویوں کا زردہ تھا۔ سویوں کی کھیر تھی۔

سب کے سامنے خالی پلیٹیں دھری تھیں اور بڑے صبر و تحمل کے ساتھ آمنہ کا انتظار ہو رہا تھا۔

یہ آمنہ وہی تھی جس کی وجہ سے دونوں گھروں کے کچن علیحدہ ہو گئے تھے اور آج اس نے انہیں پھر یکجا کر دیا تھا۔

"ہائے! کتنا اچھا لگ رہا ہے۔"

ان سب کو اور پھر ہمیں دیکھ کر آمنہ خوشی سے چلائی۔ "پھوپھو! آپ یہاں بیٹھیں بڑی چاچی کے ساتھ اور شمسی! تم فرحان اور شرجیل کے ساتھ۔"

اس نے خود ہی ہمارے لئے سیٹیں منتخب کر دیں۔ امی کی حالت کا اندازہ کرنے کا مجھے ہوش نہیں تھا۔ میں تو خود اپنے حواس میں نہ تھا۔

جھجک، ہچکچاہٹ، سٹپٹاہٹ... سب کچھ تھا جو مجھ پر طاری تھا۔

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ میں اپنے اچھے لباس میں، ایک باعزت خاندان کے ساتھ بڑے وقار کے ساتھ بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ وہ بھی عید کا ناشتہ۔ مجھ کم نصیب کو کب کبھی ایسی عزت ملی تھی، ہوش و حواس نہ کھو بیٹھتا تو اور کیا ہوتا۔

"واہ واہ شمسی تو آج بڑا بانکا سا لگ رہا ہے۔"

چھوٹی مامی نے پتہ نہیں طنز کیا تھا یا زبان پر خلوص سے بھرے کلمات تھے۔ میں نے نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے ان کی نیت کو سمجھ نہ سکا۔

"یہ چاچی جان! میں نے اسے عید کا تحفہ دیا ہے۔ فرحان اور شرجیل جیسا سوٹ...!"

کوئی وجہ ضرور ہوئی ہوگی تبھی تو آمنہ نے فوراً جواب دیا۔ شاید ان کی میری طرف اُٹھنے والی نظروں میں کچھ تھا۔ آمنہ ذہین تو تھی ہی۔

"اچھا لگ رہا ہے نا...؟"

"اس نے بھی تمہیں کچھ دیا کہ مفت بری چلائی۔"

بڑی امی کے لہجے کا طنز میرے اندر تک اُتر گیا۔ سویاں حلق ہی میں اٹکنے لگیں۔

ہاں ہاں۔ یہ دیکھئے، یہ لاکٹ...!"

آمنہ جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان کے پاس جا کھڑی ہوئی اور جھک کر گلے میں پہنا ہوا لاکٹ انہیں دکھانے لگیں۔

"خوبصورت ہے نا؟"

"یہ شمسی نے دیا ہے؟"

"شمسی نے...؟"

"...نے کیا؟"

کئی زبانوں سے حیرت و تعجب میں ڈوبے مختلف لہجوں اور انداز میں مختلف جملے پھسل پڑے۔ جیسے یہ گناہ کی بات تھی۔ میں نے گھبرا کر صفائی پیش کی۔

"میں نے نہیں... امی نے" میری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"ایک ہی بات ہے بشیں اور چھوچھو کوئی دو ہیں۔ میں تا پھوپھو۔؟"
آمنہ نے امی کے گلے میں باہیں ڈالیں اور جھک کر اُن کا گال چوم لیا۔

جانے کیا ہوا میز پر کچھ عجیب کھلبلی سی مچ گئی۔ فرح اور رعنا نے ایک دُوسرے کے کان میں کوئی بات کی۔ دونوں ماموں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نظروں ہی نظروں میں جانے کیا اشارے کئے۔ اتفاق سے اس وقت میں امی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"بس" اور اسی لمحے فرحان اور شرجیل ناشتہ ختم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"خواہ مخواہ ہی۔"

آمنہ نے جلدی سے جا کر دونوں کا ایک ایک بازو پکڑا اور کھینچ کر واپس بٹھا دیا۔

"سب لُکنے ختم کریں گے اور مجھے معلوم ہے تم دونوں کتنا کھاتے ہو۔ عید کے دن بھری میز سے بھوکے اُٹھو گے تو گناہ ہوگا۔"

میں ان دونوں کے اُٹھ جانے کے معنی بھی سمجھتا تھا۔ دونوں آمنہ کو اپنی اپنی ملکیت جاننے لگے تھے۔ تبھی تو اُس کی ہلکی سی توجہ کو وہ بھی ہماری طرف، ان سے کہیں زیادہ کم حیثیت والے لوگوں کی طرف۔ وہ سہار ہی نہ سکے۔

آمنہ نے ان کی پلیٹوں میں بھر بھر چمچ ڈال دئیے۔ "یہ اتنا ختم کرو گے تو اُٹھنے دُوں گی۔"

بڑی اپنائیت سے اُس نے حکم لگایا تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر دونوں واپس بیٹھ گئے اور بڑی خوشی سے اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگے۔

"پہلے مجھے خود ہی سب کچھ بتایا ہے اور اب خود ٹھیک طرح عید مناتے نہیں۔ کیوں فرخ، رعنا!"

"ہاں مسلمان گھرانوں میں اسی طرح اکٹھے ہو کر عید کا تہوار منایا جاتا ہے۔ ہم نے کوئی غلط تو نہیں نا کہا آپا جی؟"

"نہیں۔ بالکل درست ہے۔"

بڑے ماموں اپنی پلیٹ خالی کر کے ڈکار مارتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"بھئی بڑا مزہ آیا۔"

پھر انھوں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔

"اور اب نماز میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں، لڑکو! باقی ناشتہ آ کر کر لینا۔"

"ارے ہاں ہاں جاؤ۔"

شرجیل کی پلیٹ ابھی آدھی باقی تھی۔ آمنہ نے عجلت سے ایک دم وہ پلیٹ گھسیٹ کر پرے کر دی۔

"نماز نکل جائے تو ہاتھ نہیں آ سکتی اور سویاں تو پھر بھی کھائی جائیں گی۔ چلو پہلے۔۔۔"

اس کے جوش اور جذبوں بھری حرکات دیکھ دیکھ کر سبھی بےبس رہے تھے کوئی بھی بُرا نہیں منا رہا تھا۔

کسی کو جیتنا، کسی کو حاصل کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے کتوں تک سے پیار کرنا پڑتا ہے اور ہم، میں اور امی تو پھر انسان تھے۔ سب کچھ برداشت کیا جا رہا تھا۔ آمنہ کی خاطر ہماری معیت بھی برداشت ہو گئی۔

آمنہ کہی کہتی، بلی کو بھی ان کے ساتھ میز پر بٹھا کر ناشتہ کرا دیتی تو شاید یہ لوگ وہ بھی کر لیتے خوشی خوشی سے۔

گھر کے سب مرد عید پڑھنے چلے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ ان کا ہو کر بھی پہلے ہمیشہ ان سے علیحدہ رہا کرتا تھا۔ کبھی کوئی نہیں پوچھتا تھا مگر آج۔۔۔

آمنہ کی خاطر۔ اس کی خوشی کی خاطر، اس کو دکھانے کی خاطر، سب نے مجھے تسلیم کر لیا تھا۔

عید کی نماز سے فارغ ہونے تو مجھ سے بھی سب اسی طرح باری باری بغل گیر ہوئے جس طرح سارے نمازی بھائی چارے کا اظہار کر رہے تھے دوستی اور اخوت کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ دلوں کی کدورتیں اور نفرتیں اور دشمنیاں بھلا کر آج کے دن، عید کے دن سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ بغل گیر ہو گئے تھے دوست بن گئے تھے۔

کیا میرے لئے بھی میرے ماموؤں اور بھائیوں کے دلوں میں یہی جذبہ تھا؟ پوری صداقت سے اترا تھا؟

کوئی میل، غبار، گرد باقی نہ رہی تھی؟

باقی آئندہ



یہ کہانی اُن لڑکیوں کے نام ہے جو رومانی کہانیاں پڑھ پڑھ کر
لیئے آپ کو کسی ان دیکھے ہیرو کی ہیروئن سمجھنے لگتی ہیں اور پھر
اُسی خیالی ہیرو کے دھوکے میں اصل ولن سے جا ٹکراتی ہیں



دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک بھی اُسے اس مدمان پرور خیالی دنیا سے واپس نہیں لا سکی تھی جس میں وہ ناول کے خوبصورت ہیرو ہیروئن کے ساتھ سوات کی حسین وادیوں میں گھوم رہی تھی۔ ناظرہ بیگم کو اس کی اس عادت سے بے حد چڑ تھی کہ وہ جب بھی کسی ناول یا رسالے کے پیچھے لگ جاتی۔ اُسے ختم کئے بغیر نہ چھوڑتی۔ اُسے حقیقت کی دنیا میں لانے کے لئے اس کے ہاتھ سے رسالہ چھیننا پڑتا۔ تب وہ چونک کر اتنی اجنبی نگاہوں سے دیکھتی کہ ان کا خون کھول جاتا اور اس مدہوشی پر اُسے اتنی صلواتیں سننی پڑتیں کہ سارا نشہ ہرن ہو جاتا اور وہ اتنا کہ کئی روز تک کسی کتاب کو ہاتھ نہ لگاتی۔ اور ناظرہ بیگم شکر ادا کرتیں لیکن چند روز بعد ہی وہ کسی دوسرے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی نظر آجاتی۔ پھر چاہے دودھ اُبل اُبل کر ختم ہو جائے یا ہنڈیا جل کر راکھ۔ شازمہ کو اس وقت تک خبر نہ ہوتی جب تک ناظرہ بیگم آکر اس کی خبر نہ لیتیں۔ جب تک وہ اسکول میں پڑھتی رہی۔ ناظرہ بیگم بلاتکلف دو ہتھڑ جما دیا کرتی تھیں۔ لیکن جب سے وہ کالج میں آئی تھی انھوں نے اس پر ہاتھ اٹھانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ صرف ڈانٹنے پر اکتفا کرتیں۔

"دیکھو شازمہ، تیری یہ دیوانگی یہ مدہوشی تجھے ایک دن لے ڈوبے گی۔ ارے سب ہی لڑکیاں رسالے کتابیں پڑھتی ہیں لیکن ایسے غرق ہوتے کسی کو نہ دیکھا کہ سر پر ڈھول بجیں اور تمہیں خبر نہ ہو۔ آئندہ میں تمہارے ہاتھ میں رسالہ نہ دیکھوں سمجھیں۔" وہ ہمیشہ اُسے دھمکی دیتیں اور وہ کسمسا کر کہتی۔

"میں کیا کروں امی؟ مجھے پتہ نہیں چلتا جان بوجھ کر تو میں ایسا نہیں کرتی نا؟"

"کیوں آتی دلچسپی لیتی ہو خیالی باتوں میں سرسری سا پڑھ لیا اور بس۔ نصاب کی کتابیں پڑھتے ہوئے تو یہ حالت نہیں ہوتی تمہاری۔" وہ خشمگیں نگاہوں سے گھورتیں۔

"اچھا امی اب کام کے وقت نہیں پڑھوں گی پلیز..." وہ لاڈ سے کہتی اور وہ منہ پھیر کر اٹھ جاتیں۔ وہ اس سے محبت بھی بہت کرتی تھیں کیونکہ وہ دو بھائیوں کی ایک ہی بہن تھی۔ وہ اس کی کوئی بات ٹالتی بھی نہیں تھیں کہ جانے وہ کیا محسوس کرے۔ لڑکیوں کے نصیب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ جانے اگلے گھر میں کیسی زندگی گزرے۔ والدین کے گھر تو سکھ سے رہیں۔ یہی سوچ کر وہ اس کی خواہشات پر پابندی نہیں لگاتی تھیں۔ اسی لئے اسکول کی لڑکیوں کی دیکھا دیکھی جب شازمہ کو بھی ناول اور افسانوں کا شوق ہوا تو انھوں نے اُسے نہیں روکا۔ جب بھی سیفی آتا، ناظرہ بیگم شازمہ کے لئے رسالہ لانے کی سفارش کر دیتیں۔

سیفی نے شروع میں انھیں سمجھانا چاہا کہ فضول کتابوں کے بجائے وہ ادبی، مذہبی نوعیت کی کتابوں کا مطالعہ کرے جو اس کے تعلیمی مشکلات میں مفید و معاون ثابت ہوں لیکن شازمہ کو تو جیسے لت لگ گئی تھی۔ وہ نہ لاتا تو وہ اسکول کی کسی سہیلی سے مانگ لاتی۔ اب اتنا ہوا تھا کہ وہ فارغ اوقات میں پڑھنے بیٹھتی یا جب ناظرہ بیگم کہیں چلی جاتیں اور ندیم، فہیم اسکول گئے ہوتے تو وہ گھر اندر سے بند کر کے ناول پڑھنے بیٹھ جاتی۔ ابا جان رات گئے لوٹتے تھے۔ پچھلے کئی روز سے وہ ناول پڑھنے کا پروگرام بنا رہی تھی جو سیفی نے اس کے بے حد اصرار پر لا کر دیا تھا۔ دوپہر کے کھانے سے فراغت کے بعد ناظرہ بیگم نے اُس سے سارہ پھپھو کے ہاں چلنے کو کہا تو اس نے فوراً نوٹس بنانے کا بہانہ کر کے معذرت کر لی۔ اور اب وہ اطمینان سے بستر پر دراز ناول پڑھنے میں محو تھی۔ ناول اتنا دلچسپ اور رومانی تھا کہ وہ ہر چیز سے بیگانہ ہو گئی تھی اور اس وقت تو وہ ہیرو مراد کے ساتھ ہیروئن کی آنکھوں کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی۔ جونہی صفحہ پلٹتے ہوئے لمحہ بھر کے لئے حقیقی دنیا میں آئی تو دستک سنائی دی۔ اس نے چونک کر دیوار پر لگی... گھڑی پر نظر ڈالی۔ ندیم، فہیم کے اسکول سے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ بڑبڑا کر اٹھی۔ جانے بیچارے کب سے دستک دے رہے ہیں۔ اس لئے ناول پر نظر جماتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

"آجاؤ بھئی..." اس نے دروازے کا پٹ پکڑے پکڑے ہی کہا۔ نظریں بدستور سطروں پر پھسل رہی تھیں۔ لیکن مردانہ کھنکار پر اس نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں تو مارے خوف کے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کوئی اجنبی دیوار سے ٹیک لگائے اطمینان سے کھڑا تھا۔ سارا رومانس پل بھر میں رفوچکر ہو گیا۔ تنہائی کے احساس سے وہ مزید خوفزدہ ہو گئی۔ اس نے جلدی سے دروازہ تقریباً بند کرتے ہوئے کہا۔

"کون ہیں آپ؟" اس کی آواز خوف سے لرز رہی تھی۔

"آپ خوفزدہ نہ ہوں۔ میں کوئی غلط آدمی نہیں ہوں۔" وہ کچھ دیر پہلے اس کی محویت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے یوں خوفزدہ ہو کر... دروازہ بند کرنے پر خود بھی بوکھلا گیا۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟ اور آپ اوپر کیسے آگئے؟" وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"اوپر تو میں سیڑھیوں کے ذریعے آیا ہوں۔ ملنا آپ کے ابو سے تھا جو غالباً گھر میں نہیں ہیں؟" وہ بھی اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا۔

"جی ہاں، ابو سے تو آپ رات ہی کو مل سکتے ہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"آپ کی امی ہیں؟"

"اُفوہ... یہ تو پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے۔ جانے کون ہے؟" ایک تو سارے ناول کا مزہ کرکرا کر دیا۔ اوپر سے سوال پہ سوال کر رہا ہے۔
وہ غصے سے خاموش کھڑی رہی۔

"دیکھئے... اصل میں بات تو مجھے کلیم صاحب سے ہی کرنی چاہئے۔ لیکن مجھے آج رات ہی اپنے گاؤں ضروری کام سے جانا ہے۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ آپ کی امی ہی کو کرایہ دیتا جاؤں۔" وہ اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے آنے کا مقصد بیان کرنے لگا۔

"اچھا تو یہ کرایہ دار ہے۔" اس نے سوچا۔ "امی پڑوس میں گئی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی۔" اسے مجبوراً کہنا پڑا۔

"اچھا... اگر آپ مناسب سمجھیں تو کرایہ لے لیں۔" اس کی آواز قریب ہی محسوس ہوئی تو وہ سچ مچ ڈر گئی۔ یہ تو کوئی چالباز معلوم ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں دوبارہ اس کے سامنے آؤں۔ تب ہی اسے لگا کہ وہ ذرا دیر میں دروازے کو دھکا دے کر اندر آ جائے گا۔

دروازے کے ساتھ مضبوطی سے لگ کر اس نے دعا مانگی۔ "یا اللہ ندیم یا نسیم کو جلدی سے بھیج دے۔ کاش! امی ہی واپس لوٹ آئیں۔" اس نے چٹخنی کو بند کرنے کے لئے اس پر ہاتھ رکھ لئے۔ لیکن وہ اجنبی پہ اپنے خوف کو ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مضبوط اور سخت لہجے میں کہا۔

"میرا کسی کرائے وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ تھوڑی دیر بعد آیئے گا۔"

"اچھا جی... تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گا۔" کافی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ غالباً وہ اس کے لہجے کی تلخی کو پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ شازمہ نے شکر کا سانس لیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے جانے کس جذبے کے تحت اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ اور بالکل اچانک سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا۔ اور بڑی معصومیت سے مسکرا دیا۔ وہ جھپ سے پیچھے ہٹ گئی۔ "حد ہو گئی شازمہ! وہ بھی کیا سوچتا ہو گا کہ یا تو اتنا ڈر رہی تھی۔ تلخی سے جواب دے رہی تھی اور اب جھانک بھی رہی ہے۔ اور وہ... کیسے مسکرا رہا تھا۔ جیسے اسے یقین تھا کہ میں ضرور اسے دیکھوں گی۔" تب ہی نسیم اور ندیم آ گئے۔ انہیں [illegible] کر وہ دوبارہ ناول میں گم ہو گئی۔ لیکن آج پہلی بار [illegible] ادھر بھٹک رہا تھا۔ بار بار اس کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے آ جاتا۔ اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ محبت کی دنیا کے ہیرو ایسے ہی مسکراتے ہیں اور ساری ہیروئنیں یونہی انہیں [illegible] ہیں۔ امی ٹھیک کہتی ہیں کیا رکھا ہے ان کتابوں میں۔ اس انقلابی سوچ نے اسے خود حیران کر دیا۔ اپنی اتنی بڑی تبدیلی پر وہ مسکرا دی۔ شام کو سیفی امی کو چھوڑنے آیا تھا لیکن اس کی آمد پر اس نے کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ خود ہی بول پڑا۔

"معلوم ہوتا ہے ناول چاٹ کر بیٹھی ہو۔ تب ہی ہوش ٹھکانے نہیں۔" وہ اس کے شوق کے لئے ہمیشہ چاٹنے کا لفظ استعمال کرتا تھا۔

"ہاں تھوڑا سا پڑھا تو تھا۔ مزہ نہیں آیا۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"یہ تو بہت عمدہ تبدیلی ہے۔ دیکھو شازمہ میں... اب تمہیں یہ سب خرافات لاکر نہیں دوں گا۔" سیفی فیصلہ کن لہجے میں 'خرافات' پہ زور دیتا ہوا بولا۔

"نہ لایئے گا۔ میں خود بور ہو گئی ہوں۔" وہ شانِ بے نیازی سے بولی۔

"تو کیا تم نے میری بات ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" وہ بے یقینی اور حیرت سے بولا۔

"کونسی بات...؟"

"یہی کہ اب تم اچھی اچھی معلوماتی، حدیث و فقہ کی کتابیں پڑھو گی۔ تاکہ ذہن کو غور و فکر کے لئے صحیح راستہ مل جائے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"آپ کے کہنے پہ تو فیصلہ نہیں کیا۔ البتہ اب میں کچھ نہیں پڑھوں گی۔ آپ بھی روز روز کی زحمت سے بچ جائیں گے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"میں اب چلتا ہوں تم اس وقت ہوش میں نہیں بلکہ ناول کے زیر اثر ہو شاید۔" وہ ناظمہ بیگم کو سلام کر کے تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وہ ناظمہ بیگم کے ساتھ باورچی خانے میں مصروف تھی۔ ندیم نے آکر کسی راشد بھائی کی آمد کی اطلاع دی۔ "راشد بھائی...؟" اس نے سوالیہ نظروں سے امی کو دیکھا جو واش بیسن میں جلدی جلدی ہاتھ دھو رہی تھیں۔

"تم ہنڈیا سنبھالو۔ میں ذرا کرائے دار کو دیکھ لوں۔ نہ جانے اب کیا بات ہو گئی۔" وہ تو بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں اور کرائے دار کے نام پہ شازمہ چونک گئی۔ تجسس نے سر ابھارا تو اس کا کام میں دل نہ لگا۔ اس نے چولہے کی لو بالکل ہلکی کر دی۔ اور دبے پاؤں کمرے کا رخ کیا۔ ذرا سا پردہ سرکایا تو ہنس پڑی۔ "اچھا تو موصوف راشد بھائی ہیں۔ ندیم، نسیم اکثر ان کا ذکر کرتے ہیں۔ کیسی اپنائیت سے باتیں کر رہا ہے۔ امی کو مکھن لگا رہا ہے۔ مالک مکان جو ہیں امی!" اس نے سر جھٹک کر باورچی خانے کا رخ کیا۔ اگلے دن وہ کالج جانے کے لئے نیچے اتری تو نظریں خود بخود اس کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ تو جیسے اس کا منتظر ہی تھا اور بڑی دیدہ دلیری سے مسکرا رہا تھا۔ وہ

گھبرا کر آگے بڑھ گئی لیکن جاتے جاتے اس کی آواز پیچھے سے سنائی دی۔
"سلام عرض کرتا ہوں"۔ اس دن کالج میں سارا وقت "سلام عرض کرتا ہوں" کی صدا کانوں میں گونجتی رہی۔ وہ چونک چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگتی۔ وہ حیران تھی کہ اچانک کیا واردات ہوگئی۔ موصوف اتنے عرصے سے نیچے رہتے ہیں اس سے پہلے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں۔ چلو اب تو دیکھ لیا نا۔ اتنا تو جان ہی گئی تھی کہ وہ اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ نگاہوں کے پیغام اور مسکراہٹیں ہی تو کسی کہانی کا عنوان بنتے ہیں۔

کالج سے واپسی پر پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے چند لمحے رک کر اس نے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ "شاید گھر میں نہیں ہے۔" اس نے سوچا۔ عین اسی لمحے دھڑ سے دروازہ کھل گیا۔

"زہے نصیب...!" وہ مسکرا کر آہستہ سے بولا۔ "لگتا ہے سارا دن گھر میں رہتا ہے۔"

"کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں آپ! میں آپ کے نہیں اپنے گھر جارہی تھی۔" وہ تیزی سے بولی۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ سارا گھر ہی آپ کا ہے۔ میں تو غریب کرایہ دار ہوں جس سے آپ ڈر گئی تھیں۔" وہ جان بوجھ کر بات کو طول دے رہا تھا۔

"جی نہیں، میں کسی سے نہیں ڈرتی۔" وہ آگے بڑھی

"دیکھئے پلیز...! آپ یوں ناراض ہوکر نہیں جاسکتیں۔" وہ ایکدم ہی آگے بڑھ آیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ شاید اس پر تھپڑوں کی بارش کر دیتی لیکن وہ افسانوی دنیا میں رہنے والی لڑکی تھی۔

"کیوں...؟" وہ تیکھے انداز لئے مڑی۔

"آپ کی ناراضگی مجھے گھر سے بے گھر بھی کرسکتی ہے۔ پھر اتنے بڑے شہر میں کہاں گھر ڈھونڈتا پھروں گا۔" وہ بڑی ادا سے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ ضبط کے باوجود اس کے لب مسکرا اٹھے۔

"ڈھونڈ لیجئے کوئی اور گھر، مجھے کیا؟" وہ بھی مغرورانہ انداز میں بولی۔

"لیکن میں اب یہاں سے کہیں نہیں جاسکتا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے رومانٹک انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ پگھل کر رہ گئی۔ پھر کسی کے دیکھ لینے کا بھی ڈر تھا۔

"کوئی نہیں کررہا آپ کو بے گھر۔ اطمینان سے رہیئے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"شکریہ... یعنی اس کا مطلب ہے آپ بھی نہیں چاہتیں کہ میں جاؤں۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔

"اچھا، بس اب زیادہ بے تکلف نہ ہوں۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی اور وہ اپنی فتح پر مسکرا دیا۔

سارہ پھپھو بہت دنوں بعد آئی تھیں۔ وہ اُن کے پاس بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی۔ کسی انوکھے جذبے سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ندیم کے ساتھ بظاہر کیرم کھیلتا ہوا سیفی دراصل اس کا جائزہ لے رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں گہری سوچ اتر آئی تھی۔ شازمہ کی بدلی ہوئی شخصیت بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ سے بیگانہ لڑکی یکایک اتنی خود شناس ہوگئی تھی۔ آنکھوں میں بولتے جذبے اور بے اختیار مسکراہٹیں یونہی نہیں بکھر اکرتیں یہ سیفی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ لوگوں کے چہرے پڑھنے کے فن سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شازمہ اس کے بچپن کی مانگ ہے۔ اس کی ماں کی آرزو ہے جو اپنی ہے۔ اس سے اظہار تمنا کیا کرنا۔ وہ کیوں لفظوں کا سہارا لے کر محبت کا ڈرامہ کھیلے۔ یہاں عشق و عاشقی والی بات تو نہ تھی ایک مقدس سا بندھن تھا۔ جس کا وہ پاس کرتا تھا۔ اس نے سوچا تھا جب اظہار کا وقت آئے گا تو وہ ذرا بھی... کنجوسی سے کام نہیں لے گا۔ فی الحال وہ کوئی حق جتانے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ وہ حقیقت پسند نوجوان تھا جو بڑی سنجیدگی سے اپنے مستقبل کے لئے کوشاں تھا۔ اور تعلیمی مراحل بڑی ذہانت سے طے کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ شازمہ کو اپنے جذبوں سے آگاہ کر دے لیکن قبل از وقت خیال کر کے رہ جاتا لیکن آج اس کے چہرے پر وہ رنگ تھے جو اس نے اپنے لئے چاہے تھے۔ تب وہ بے چین ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"کہاں کھوئے ہوئے ہیں سیفی بھائی؟ دھیان سے کھیلیں، ہار جائیں گے۔" شازمہ شوخی سے بولی۔

"تمہیں خوشی ہوگی میری ہار سے؟" سیفی ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اور کیا... پھر آپ کوک جو پلائیں گے سب کو۔" شازمہ چہک رہی تھی۔ ندیم اور فہیم نے بھی اس کی پرزور انداز میں تائید کی۔

"وہ کس خوشی میں؟" وہ حیران حیران ساتینوں کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ جو راشد بھائی ہیں نا! وہ اکثر مجھ سے ہار جاتے ہیں۔ پھر ہم سب کو کوک پلاتے ہیں۔" ندیم نے معلومات فراہم کیں۔

"میرا اُن سے تعارف نہیں ہے کون ہیں راشد بھائی؟" سیفی نے چونک کر شازمہ کے چمکتے چہرے کو دیکھا۔

"ارے، ہمارے کرائے دار ہیں نا راشد بھائی۔" فہیم نے زور دے کر کہا۔ "بہت اچھے ہیں وہ۔"

"بہت دوستی ہوگئی ہے شاید تمہاری۔ کیا کرتے ہیں موصوف؟" سیفی نے ٹٹولا۔

"وہ کسی فرم میں کام کرتے ہیں۔ ان کے سب گھر والے گاؤں میں

رہتے ہیں۔" ندیم نے کہا۔

سیفی نے خاموش ہو کر شازمہ کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اور وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔ پھر تو اُسے کھوج سی لگ گئی۔

"راشد صاحب تمہارے گھر آتے ہیں ندیم؟" وہ کھیلتے ہوئے بولا۔

"ہاں اکثر آتے رہتے ہیں جب ابو نہیں ہوتے۔" ندیم بے خیالی میں بولا تھا۔

"کیوں، ماموں جان منع کرتے ہیں کیا؟" سیفی نے آہستہ سے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں تو... مگر جب وہ آتے ہیں تو ابو گھر میں نہیں ہوتے۔ ویسے آتے ہیں نا۔" ندیم گوٹ پاکٹ کرتا ہوا بولا۔

"اچھا... کھیلتا کون کون ہے؟" سیفی نے بے چینی سے کہا۔

"میں، فہیم اور راشد بھائی۔"

سیفی نے اطمینان محسوس کیا لیکن تجسس برقرار تھا۔

"یار میں بھی تو ملواؤ اپنے راشد بھائی سے جیتیں تو جانیں۔" سیفی چالاکی سے بولا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے سیفی بھائی! میں ابھی بلا کر لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے بھاگ گیا۔

کیرم بورڈ پر ایک کہنی ٹکائے سیفی خیالوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ جو بات اُس کے دل میں کھٹک پیدا کر رہی تھی وہ اس سے نجات چاہتا تھا۔ ہوا میں معلق ہونا اُسے پسند نہیں تھا۔ آر یا پار۔ اِدھر یا اُدھر۔ درمیانی کیفیت اُسے سخت اذیت دیتی تھی۔ اگرچہ اُسے اپنے معاملہ فہم اور دور شناس ہونے پر اعتماد تھا لیکن وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ بہت گمان کرنے سے منع کیا گیا ہے کہ بہت گمان گناہ ہوتے ہیں سو بدگمانی کو جگہ دیئے بغیر وہ نتیجہ دیکھنا چاہتا تھا تب ہی تو فوراً ندیم کو دوڑا دیا تھا۔ شازمہ کسی کام سے اندر آئی تو اُسے یوں بیٹھا دیکھ کر ہنس پڑی۔

"معلوم ہوتا ہے ہار کے بیٹھے ہیں سیفی بھائی؟" اُس نے پھر اس کی الجھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"لوگ نے آج مجھے شکست سے دوچار کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔" وہ ملجی سے بولا۔ "فی الحال تو ہار جیت کے درمیان لٹک رہا ہوں اور تم جانتی ہو کہ مجھے منافقت پسند نہیں۔"

"پھر فیصلہ کیسے ہوگا؟" وہ اس کی بات کی گہرائی میں جانے سے قاصر رہی تھی۔

"فیصلہ ابھی ہو جائے گا شازمہ جی! راشد صاحب آ رہے ہیں پھر ہوگا مقابلہ۔" اپنی بات کا تاثر جاننے کے لئے وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"اِس کا مطلب ہے کھیل بڑا طول کھینچے گا۔" وہ اپنے لہجے کی خوشی چھپا نہ سکی۔

"ہوں... کھیل تو ابھی شروع ہوا ہے شازمہ جانے انجام کیا ہوگا؟" وہ سنجیدگی سے آہ بھر کر بولا۔ "راشد صاحب آئیں تو تم اندر چلی جانا۔"

"کیوں، میں کوئی پردہ کرتی ہوں کسی سے؟" وہ چمک کر بولی۔

اور سیفی کے دل میں پھانس سی چبھ گئی۔

"کاش تم پردہ ہی کرتی ہوتیں...!" سیفی نے حیرت سے کہا۔ "آج احساس ہوا کہ پردہ کتنی اچھی روایت ہے، کتنا خوبصورت حکم ہے اور اس میں کتنے اسرار کتنی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ کاش ہم سمجھ سکیں۔" وہ بڑے رسان سے بولتا رہا۔

"آج آپ کو پردے کا خیال کیسے آ گیا؟ اگر میں پردہ نشین ہوتی تو آپ کے سامنے بھی نہ آتی کبھی۔ مجھے آپ...!" وہ ناگواری سے بولی۔

"سچ! بہت اچھا ہوتا۔ آج ہی تو دل چاہا ہے کہ تم کسی کے سامنے نہ آئی ہوتیں، نہ میرے نہ کسی اور کے۔ کاش ایسا ہوا ہوتا۔ لیکن میرے لئے پھر بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔" وہ اُسی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں عجیب بہکی بہکی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" وہ بیزاری سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"اچھا، اب تم اندر جاؤ۔" باہر قدموں کی آواز سن کر سیفی نے ذرا سختی سے کہا تو وہ پیر پٹختی اندر غائب ہو گئی۔

سیفی کھیل کے ساتھ ساتھ دوسری طرف بھی پوری توجہ دے رہا تھا۔ راشد کی بار بار بھٹکتی ہوئی آوارہ نگاہیں جانے کسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کے دیکھنے کا انداز غیر شریفانہ تھا۔ اور وہ کہیں سے بھی تعلیم یافتہ انسان نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی گفتگو سے تو سیفی کو یہی اندازہ ہوا تھا۔ اب وہ بار بار پہلو بدل کر دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیفی کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ ایک غیر مرد اس کے گھر کی چیز پر بری نظریں ڈالے۔

"کیا بات ہے راشد صاحب؟ کس چیز کی خواہش محسوس کر رہے ہیں آپ؟" وہ شائستگی سے بولا۔

"اوہ، اب تکلف کیسا۔ دراصل سیفی صاحب! مجھے اِس وقت چائے پینے کی عادت ہے۔ لگتا ہے آج یہاں بھی نہیں ملے گی۔" وہ... کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا بولا۔

"کیوں نہیں ملے گی جناب!" سیفی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "جاؤ فہیم پھپھو سے چائے کا کہہ آؤ۔"

"تھوڑی ہی دیر بعد شازمہ کی شرمیلی سی آواز سنائی دی۔" فہیم چائے

لے جاؤ۔" سیفی کے خیال سے وہ اندر نہیں آئی تھی ورنہ اکثر ناظمہ بیگم سے نظر بچا کر وہ خود کھانے دے جاتی تھی۔

"مصروف ہیں آئیں نا شازمہ آپی۔" نعیم بیزاری سے بولا۔

"ہوش میں تو ہو تم، چلو جا کر کھانے لاؤ۔" سیفی نے تیز آواز میں کہا۔ اُسے ڈر تھا کہ شازمہ خود ہی نہ چلی آئے۔ جب کہ راشد اس کی آواز سن کر بے چین نظر آ رہا تھا۔ اور اس کی بے چینی پر سیفی کا خون کھول رہا تھا۔ چائے کا مشغلہ ختم ہوا تو وہ اطمینان سے کھیلنے لگا۔ کوئین لے جانے سے پہلے اس نے نظر اٹھا کر راشد کی طرف دیکھا جو دروازے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ سیفی نے حیران ہو کر اس کی نظروں کے تعاقب میں نظر دوڑائی تو شک یقین میں بدل گیا۔ سینے میں دل ڈوبتا محسوس ہوا، پردے کے پیچھے یقیناً شازمہ تھی جو چھپکے چھپکے جھانک رہی تھی۔

"میں ابھی آیا۔" وہ پھرتی سے اٹھتا ہوا بولا۔ شازمہ اُسے آتا دیکھ کر تیزی سے اندر بھاگی تھی، مگر وہ لپک کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"کوئی کام ہے تمہیں ڈرائنگ روم میں؟" وہ سختی سے بولا۔

"نہیں تو...۔" وہ بُری طرح گھبرا رہی تھی سیفی نے کبھی اس طرح بات نہیں کی تھی۔

"پھر کیوں جھانک رہی تھیں؟" سیفی نے غصے سے پوچھا۔

"میں کھیل دیکھ رہی تھی۔" وہ سٹپٹا کر بولی۔

"کیوں؟ کوئی بہت اہم ٹورنامنٹ ہو رہا تھا کیا؟ تمہیں کب سے کھیلوں میں دلچسپی ہو گئی؟" وہ جرح کر رہا تھا۔

"آپ کو کیا، میں جس چیز میں بھی دلچسپی لوں۔" وہ بھی تنک گئی۔

"ہاں تمہاری دلچسپیاں تو میری سمجھ میں آ گئی ہیں۔ لیکن اتنا یاد رکھنا شازمہ، ناسمجھی میں کھیلے گئے کھیل بعد میں بہت تکلیف پہنچاتے ہیں۔ تم ابھی ناسمجھ ہو اور تمہارا شکاری بہت گھاگ۔ اس کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر ماموں، ممانی کی عزت کا جنازہ نہ نکال دینا۔" سیفی ایک جذب کے عالم میں کہتا ہوا واپس مڑ گیا۔ اور وہ حیران پریشان کھڑی رہ گئی۔ اتنی احتیاط کے باوجود چوری پکڑی گئی۔ ہونہہ... سمجھتے ہیں جیسے مجھ پر صرف اُن کا حق ہے۔ تب ہی اتنا ناراض ہو رہے تھے۔ لیکن میں اُن کی پابند نہیں ہوں۔ میری مرضی... میں جسے چاہوں پسند کروں۔ پھر راشد بھی تو مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ میری ہر ہر بات کی تعریف کرتے ہیں۔ سیفی بھائی نے تو کبھی جھوٹے منہ بھی میری تعریف نہیں کی۔ اُلٹا ہر وقت تنقید کرتے رہتے ہیں۔ راشد کی لمبی چوڑی شخصیت سے مرعوب ہو رہے ہیں۔ جل رہے ہیں۔" یہ سوچ کر اُسے عجیب سی طمانیت کا احساس ہونے لگا۔ اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ وہ خود بخود مسکراتی رہی۔ اس بات سے بے خبر کہ ناظمہ بیگم دو بار اُدھر سے گزرتے ہوئے اُسے اسس طرح مسکراتا دیکھ کر جا چکی ہیں۔ تیسری بار وہ اس کے قریب غریب چلی آئیں۔

"ارے لڑکی کیا دیوانی ہو گئی ہے۔ آپ ہی آپ ہنسے جا رہی ہے۔ تمہاری پھپھو دیکھیں گی تو کیا سوچیں گی۔ چلو کھانا تیار کرو۔" شازمہ چپ چاپ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

اُنہی دنوں ندیم کو بخار چڑھ آیا۔ اُسے بھی چار دن تک چھٹی کرنی پڑی۔ اس دوران راشد بھی ندیم کو دیکھنے آتا رہا۔ لیکن ناظمہ بیگم کے سامنے وہ کمرے میں نہیں آ سکتی تھی۔ کئی دن بعد جب وہ کالج جانے کے لئے نیچے اُتری تو راشد نے اُسے دیکھ کر ناراضگی سے منہ پھیر لیا۔ وہ کتابیں اس کی میز پر رکھ کر اٹھلا کر بولی۔

"تین چار دن نہیں دیکھا تو مزاج برہم ہو گیا؟"

"تمہیں احساس تھا پھر بھی تڑپاتی رہیں۔ آئندہ ایسے تڑپایا تو اچھا نہیں ہو گا۔" وہ لاڈ سے بولا۔ "دیکھو شازمہ، اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ اس کے ہاتھ تھام بیٹھا۔

"یہ کیا کرتے ہیں آپ۔ کوئی دیکھ لے گا تو مصیبت ہو جائے گی۔ مجھے اب کالج سے دیر ہو رہی ہے۔" وہ جلدی سے ہاتھ چھڑا کر بولی۔

"بہت بزدل ہو تم۔ محبت میں ڈر کیسا! اچھا یہ بتاؤ، تمہارا وہ کزن سیفی کیا چیز ہے؟ اس دن بڑی اکڑ دکھا رہا تھا۔ رقیب روسیاہ تو نہیں بن جائے گا؟"

"جناب، میں اُنہیں بھائی سمجھتی ہوں، لیکن فرض کریں۔ وہ آپ کے رقیب بن جائیں تو آپ کیا کریں گے؟" وہ چڑاتے ہوئے بولی۔

"راشد تمہیں سب کی نظروں سے دور اُٹھا کر لے جائے گا۔" وہ سینہ ٹھونک کر بولا۔

"اُفوہ، آپ تو پورے اٹھائی گیرے معلوم ہوتے ہیں۔" وہ ہنستی ہوئی باہر نکل آئی تھی لیکن اس روز وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی جنھیں پہلی بار مردانہ ہاتھوں نے چھوا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی۔ ناظمہ بیگم نے سویٹر بنتے ہوئے اُسے دیکھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟ امتحان کی فکر ہے نا؟"

"نہیں امی! میں سوچ رہی تھی کہ پھپھو اتنے دن سے نہیں آئیں۔ بیمار نہ ہو گئی ہوں۔ ہو سکے تو آپ ہو آئیں۔ کتنی محبت کرتی ہیں ہم سے۔" وہ ہمدردی سے بولی۔

"ہاں! اس میں شک نہیں لیکن میں ان کی خواہش بھی تو پوری نہیں کر سکتی۔ وہ غصے کی ذرا تیز ہیں اور تمہارا گزارہ ان کے ساتھ مشکل ہو جائے گا۔ خیر جاؤں گی آج ہی...۔"

"امی کتنی اچھی ہیں۔ میں جانتی ہوں وہ میری شادی پھپھو کے ہاں نہیں کریں گی۔" اور یہی خوشخبری وہ راشد کو سنانا چاہتی تھی کیونکہ اس نے

سبقی کے سلسلے میں تشویش کا اظہار کیا تھا۔ ناظمہ بیگم کے جاتے ہی اُس نے خود کو اچھی طرح سنوارا۔ ہلکا سا میک اپ کیا اور دبے پاؤں نیچے آ گئی۔

"تیاری ہو رہی ہے حضور؟" وہ اس کے پیچھے جا کر گنگنائی۔

"تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ میں تمہاری امی کو کہیں جاتا ہوا دیکھ... چکا ہوں۔" وہ اُسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"دن بہ دن خوبصورت ہوتی جا رہی ہو۔ ذرا قریب آؤ نا۔" وہ خود اس کے قریب آ کر بولا۔ اور پھر جتنے رومانٹک ڈائیلاگ اُسے یاد تھے۔ شازمہ کے کانوں میں اُتر کر اُسے مدہوش کر رہے تھے۔ وہ ایک معمول کی طرح بے خودی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اور یہی خود سپردگی کا خطرناک لمحہ تھا جب شازمہ اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے والی تھی۔ عین اُسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ دونوں نے چونک کر کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ ناظمہ بیگم کو دیکھ کر راشد تو بڑی فنکاری سے شازمہ کی... آنکھوں کو تشویش سے دیکھتا ہوا میز کی طرف بڑھ گیا۔ اور آنکھ میں ڈالنے والی دوا اُٹھا کر شازمہ کو دیتا ہوا بولا۔ "آنکھوں کی صفائی کے لئے یہ دوا بھی اچھی ہے لیکن اب تو خالہ جان آ گئی ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ اُن کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلی جائیں۔" اور شازمہ جو دیوار سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ راشد کی ایکٹنگ پر ششدر رہ گئی کیسی ڈھٹائی سے وہ ناظمہ بیگم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کا، شرمندگی کا کوئی پرتو نہ تھا۔ اس کی بات سُن کر ناظمہ بیگم کا جی تو چاہ رہا تھا۔ اس مارِ آستین کو اسی وقت دھکے دے کر باہر نکال دیں لیکن اس شور ہنگامے میں اپنی عزت کی دھجیاں اُڑنے کا بھی ڈر تھا۔ وہ قہر آلود نظروں سے شازمہ کو دیکھ رہی تھیں اور شازمہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی روح پرواز کرنے والی ہے۔ کیونکہ اُن کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اُنھوں نے اس کی جھوٹی اور بے تکی توجیح پر بالکل یقین نہیں کیا۔

"شازمہ اوپر جاؤ۔" اُن کے بدلے لہجے میں چنگھاڑ سنائی دی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح شازمہ اوپر بھاگی تھی۔ ناظمہ بیگم اس کے پیچھے نکلیں تو راشد ان کے قریب آ کر بڑی شائستگی سے بولا۔

"خالہ جان! یہ دوا لیتی جائیں۔"

"یہ دوا اپنی آنکھوں میں ڈالو راشد میاں! بینائی کی ضرورت تمھیں بھی ہے۔" طنز کے باوجود لہجہ شکست خوردہ بھی تھا۔ اپنے ہی لہو سے دھوکہ کھا کر انسان کسی کو الزام دینے کے قابل نہیں رہتا۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں خالہ جان! شازمہ کی آنکھوں میں درد تھا۔ وہ کسی پڑوسن سے دوا لینے جا رہی تھیں۔ غلطی میری ہے میں نے دوا دینے کے لئے اندر بلا لیا۔ میرا خیال تھا اُنھیں گھر میں اکیلا چھوڑ نا نہ چاہیئے۔" وہ ایک بار پھر جھوٹ کا سہارا لے کر اپنا اور شازمہ کا دفاع کر رہا تھا۔ کیونکہ اُسے گھر سے بے گھر ہونے کے علاوہ کلیم صاحب کا بھی ڈر تھا جانے وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے۔

"میں نے تم سے کیا کہا ہے جو تم صفائی پیش کر رہے ہو۔" وہ مصلحتاً نرمی کا مظاہرہ کر کے آگے بڑھ گئیں۔ اور راشد اپنی کامیاب ایکٹنگ پر مسکرا رہا تھا۔ پتہ نہیں بڑی بی اتنی جلدی کیسے واپس آ گئیں۔ بہترین موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ جانے بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کریں گی؟ وہ بے چاری تو محبت کے چکر میں بہت آگے نکل گئی ہے۔ یہ بھولی چڑیاں کتنی آسانی سے جال میں آ جاتی ہیں۔ مجھے بھی اچھی لگنے لگی ہے۔ خیر راشد میاں اب اپنی خیر مناؤ۔" اس نے خود کو تنبیہہ کی۔ اور اوپر کی آوازوں کو سُننے کی کوشش کرنے لگا لیکن ناکام رہا۔

ناظمہ بیگم نے اُوپر پہنچتے ہی دروازہ بند کیا۔ کڑی نظروں سے شازمہ کو گھورا جس کے چہرے پر ندامت، ڈر، خوف ایک ساتھ لرز رہے تھے۔ اُنھوں نے جھک کر چپل اُتاری اور شازمہ پر برسانی شروع کر دیں۔ وہ اُسے مارتی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ کوستی جاتی تھیں۔ "بدبخت بے شرم اسی لئے منع کرتی تھی فضول کتابیں پڑھنے سے۔ چل پھپھو تمہاری راستے پر۔ اسی لئے پھپھو کے ہاں بھیجنے پر اصرار کر رہی تھی تاکہ خود...!" اُن کی زبان رُک سی گئی۔ اُنھوں نے اس کے بالوں کو زور سے جھٹکا دے کر پوچھا۔ "بتا کب سے یہ ڈرامہ چل رہا ہے۔ کتنی بار جا چکی ہے اس کے کمرے میں؟"

"ایمان سے امی... آج پہلی دفعہ گئی تھی۔" وہ بُری طرح سسک رہی تھی۔

"کیا سوچ کر گئی تھی ناہنجار؟ تجھے نہیں معلوم جب ایک مرد اور عورت تنہا ہوتے ہیں تو تیسری چیز ان کے درمیان شیطان ہوتا ہے۔ اسی لئے منع کیا گیا ہے اور اس مردود کو دیکھو، ہمارے گھر میں ڈاکہ ڈال کر کہانیاں گھڑ رہا ہے لیکن میں تو یہ جانتی ہوں جب تک کوئی لڑکی حوصلہ افزائی نہ کرے کسی مرد کی آگے بڑھنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ تم نے ہی اُسے شہہ دی ہوگی۔" وہ مسلسل بولتے بولتے اور مارتے مارتے تھک گئی تھیں۔ اُسے ایک طرف دھکیل کر وہ خود بھی کرسی پر بیٹھ کر ہانپنے لگیں۔ زندگی میں پہلا موقع تھا۔ جب اُنھوں نے لاڈلی بیٹی کو چار چوٹ کی مار دی تھی جس کی آنکھ میں وہ آنسو بھی نہ دیکھ سکتی تھیں۔ وہ ان کے سامنے پڑی بلک بلک کر رو دی تھی لیکن ان کو اُس پر ذرا رحم نہیں آیا تھا۔ اُس نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ اُنھیں اپنی تربیت پر شک ہو رہا تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر کانپ رہی تھیں کہ آج اگر وہ اتفاقاً فوراً ہی واپس نہ آ گئی ہوتیں تو یہ بے وقوف لڑکی جان سے مار دینے کے قابل ہو جاتی۔

اُنھیں اندازہ نہیں تھا کہ شازمہ اتنی بُودی لڑکی ثابت ہوگی، کیسے اس نے ایک غیر مرد پر اعتبار کرلیا اور تنہائی میں اس کے پاس چلی گئی۔ کوئی ڈر، کوئی خوف، کوئی حجاب مانع نہ ہوا۔ انھیں پھر غصہ آنے لگا تھا۔ ندیم اور نسیم کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ معصوم ذہنوں پر بُرا اثر پڑے۔ "رونا دھونا بند کرو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمھاری پھپھو کا گھر بند تھا جو تم فوراً واپس آگئیں۔ کل سے تم کالج بھی نہیں جاؤ گی۔ کیا فائدہ ایسی تعلیم کا۔ جو تمھیں اتنا بھی باشعور نہ کرسکی کہ تم بُرے اور اچھے کی تمیز کرسکو۔"

اور کلیم صاحب کے آنے تک وہ مسلسل بولتی رہیں اور وہ سر جھکائے روتی رہی۔ اس دن کے بعد سے شازمہ کو چُپ سی لگ گئی تھی۔ ناظمہ بیگم اس پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ اُنھوں نے اُسے چھپکے چھپکے روتے بھی دیکھا تھا۔ کالج جانا بند تو کردیا تھا لیکن وہ یہ سوچ کر پریشان تھیں کہ کلیم صاحب کو پتہ چلے گا تو وہ کیا جواب دیں گی۔ اور نہ راشد کے بارے میں وہ ان سے کوئی بات کرسکتی تھیں۔ وہ اِن دِنوں عجیب کشمکش میں مبتلا تھیں۔ اِدھر شازمہ کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہوتی جارہی تھیں۔ چھ سات دن میں ہی وہ مہینوں کی بیمار لگنے لگی تھی۔ ہر وقت خاموش اور اداس رہتی۔ بھائیوں کے ساتھ بھی ہنسی مذاق نہ کرتی اور ناظمہ بیگم سے تو وہ بات ہی نہ کرتی۔ یہ لڑکی روگ نہ پال لے۔ وہ گھبرا کر سوچتیں۔ بہت پڑھی لکھی نہ سہی مگر وہ ایک سلجھی طبیعت کی سمجھدار خاتون تھیں لیکن اپنی بیٹی کے معاملے کو سنبھالنے کی کوئی ڈور ان کے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ اس کی خاموشی سے انھیں خوف آنے لگا تھا۔ کہیں وہ ہاتھ نہ ہو جائے۔ وہ لرز جاتیں۔ تب بہت سوچ بچار کے بعد ایک دن انھوں نے شازمہ سے پوچھا۔

"تم نے راشد کا عندیہ بھی لیا تھا۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟" شازمہ نے حیرت سے انھیں دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

"اس کے گھر والے کیسے لوگ ہیں۔ آج تک تو کوئی آیا نہیں۔ اگر وہ سنجیدہ ہے تو آکر مجھ سے بات کرے۔ یہی شریفوں کا طریقہ ہوتا ہے۔" انھوں نے جانے کیسے یہ جملے ادا کئے تھے۔ کاغذ اور قلم شازمہ کو تھماتے ہوئے وہ بولیں۔ "لکھو کہ اگر وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہے تو آکر امی سے بات کرے۔ ورنہ خاموشی سے یہ گھر چھوڑ دے۔" شازمہ نے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے لکھا۔ اسے یقین تھا کہ راشد ضرور سنجیدہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ "جاؤ جلدی سے یہ پرچہ دے کر آؤ۔ میں اوپر کھڑی ہوں۔" ناظمہ بیگم نے دل پر جبر کر کے کہا۔

"امی! آپ خود...؟" وہ ہچکچا رہی تھی۔

"پاگل ہو تم... میں اتنی بے غیرت نہیں ہوں کہ خود جا کر اس سے کہوں گی کہ آؤ میری بیٹی کا رشتہ مانگو۔ پہلے ہی بہت بے عزتی کیا ہے تم نے۔" وہ ناراضگی سے بولیں۔

وہ خاموشی سے جاکر پرچہ دے آئی۔ راشد اُسے پکارتا رہ گیا لیکن وہ اس پر نظر ڈال کر واپس آگئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد راشد آگیا اور شازمہ خوشی سے کھِل اُٹھی۔ محبت پر اس کا یقین اور اعتماد بڑھ گیا۔ وہ دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی۔ راشد روایتی انداز میں اپنا مدعا بیان کر رہا تھا کہ وہ جلد ہی گاؤں جائے گا والدین کو لے کر آئے گا۔ ناظمہ بیگم بظاہر سنجیدہ سی بیٹھی تھیں لیکن اندر سے مطمئن تھیں کہ لڑکا اتنا بُرا نہیں۔ کم از کم شادی کا تو ارادہ رکھتا ہے۔ اور شازمہ کا تو سارا غم جاتا رہا تھا۔ راشد کے جانے کے بعد کالج جانے کی بھی اجازت مل گئی تھی۔ اِن دو ہفتوں میں شازمہ نے کیسے کیسے سپنے دیکھ ڈالے تھے۔ وہ کتنے فخر سے اپنی سہیلیوں کو بتلائے گی کہ اس کا ہونے والا شوہر کیسا خوبرو اور کڑیل جوان ہے جس کی گاؤں میں زمینیں ہیں شہر میں بھی اس کی چھوٹی سی فرم ہے۔ لڑکیاں تو جل ہی جائیں گی۔

وہ بڑی بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ تب ہی ایک دن نسیم نے آکر بتایا کہ راشد بھائی آئے ہیں۔ شازمہ کا دل بڑی زور سے دھڑکا۔

"اکیلا ہے یا کوئی ساتھ ہے؟" ناظمہ بیگم نے خوش ہو کر پوچھا تھا۔

"وہ تو اکیلے ہیں امی!" نسیم نے کہا تو دونوں نے ٹھٹک کر ایک دوسری کو دیکھا۔ شازمہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"اچھا تم دونوں بھائی باہر کھیلو اور انھیں اندر بھیج دو۔" تھوڑی دیر بعد ناظمہ بیگم بردباری سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

"خالہ جان! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اور نہ آپ کو دھوکے میں رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے گھر والوں کو آپ کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور چلنے کے لئے اصرار کیا۔ لیکن وہ... کسی صورت نہیں مانتے... دراصل ہمارے یہاں خاندان سے باہر شادیاں نہیں ہوتیں۔ اور اگر میں نے ایسا کیا... تو وہ مجھے جائداد سے عاق کردیں گے۔" وہ بڑی اُداسی سے کہہ رہا تھا۔ ناظمہ بیگم نے بغیر تاثر کے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے راشد میاں؟"

"جی... وہ میں کیا سوچ سکتا ہوں۔ دیکھئے نا والدین کی نافرمانی بھی نہیں کی جاسکتی اور پھر...!" وہ چُپ سا ہو گیا۔

"اور پھر جائداد کون چھوڑ سکتا ہے یہی کہنا چاہتے ہونا!" وہ تلخی سے مسکرائیں۔

"یہ حقیقت ہے خالہ جان، آج کل تو لوگ دولتمندوں کو پوچھتے ہیں۔" اس نے صفائی سے اقرار کرلیا۔ "میں خود کیا ہوں۔ ایک چھوٹی

سی فرم میں پارٹنر۔ اگر کل کلاں کو فرم بند ہو جاتی ہے تو مجھے ہر حال میں اپنے والدین کی طرف دیکھنا ہوگا۔ میں نے بہت کوشش کی، منتیں کیں کہ وہ مان جائیں۔ اور اگر میں اُن سے چھپ کر یہاں... شادی کر بھی لوں تو بھی انجام ہم دونوں کے لئے اچھا نہیں ہوگا۔" وہ بڑی معصومیت کا اظہار کر رہا تھا۔ اور ناظمہ بیگم کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

"جب تمہیں معلوم تھا کہ تمہارے یہاں خاندان سے باہر شادی نہیں ہوتی تو تم نے ایسا سوچا بھی کیوں؟ کیوں کسی کو دھوکے میں رکھا؟" وہ غصے سے بولیں۔

"میں نے کسی کو دھوکہ نہیں دیا خالہ جی! یہ تو میری خواہش تھی اور اس کے لئے میں نے بہرحال کوشش تو کی نا" وہ بڑی ڈھٹائی سے کہہ گیا۔

نجانے سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک نمبر فراڈی ہے کم بخت۔ میری معصوم بچی کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ اس کی عزت کی دھجیاں اُڑا کر چلتا بنتا تو ہم کیا کر لیتے۔ رہتے گاؤں دیہاتوں میں ہیں۔ کمینگی شہروں میں ڈالتے ہیں ذلیل لوگ انھوں نے نفرت سے سوچا۔ اچھا ہوا جلدی کھل کر سامنے آگیا۔

"خدا کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے بندوں کی۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب اس سارے معاملے کو ہی ختم سمجھو۔ میں آئندہ اس سلسلے میں کوئی بات سننے کی بھی روادار نہیں۔ اور ہاں اگر تم الگ گھر تلاش کر لو تو اچھا ہے۔ کلیم صاحب کو اپنی بہن کے لئے گھر کی ضرورت ہے۔" انھوں نے صاف لہجے میں کہا اور اُٹھ کر اندر چلی آئیں تاکہ وہ خود ہی اُٹھ کر چلا جائے۔ سسکتی ہوئی شازمہ کو دیکھ کر انھیں بے حد رحم آیا۔ نادان لڑکی۔ انھوں نے آگے بڑھ کر اُسے سینے سے لگا لیا۔ یقیناً وہ سب کچھ سن چکی تھی۔

"دیکھ لیا تم نے ان مردوں کو۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو مردوں کے جال میں نہیں پھنسنا چاہئے۔ بہت سے مرد کھاگ شکاری ہوتے ہیں۔ جہاں گئے نئے شکار کر لئے۔ کسی ایک سے وفاداری ان کے لئے ممکن نہیں۔ خدا کا شکر کرو کہ اس کی حقیقت جلد ہی کھل گئی۔ اگر وہ مخلص ہوتا تو تمہارے لئے جائیداد کو ٹھوکر مار دیتا لیکن آج کل ایسی محبتیں صرف فلموں، افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ حقیقی دنیا میں یہ باتیں نہ ہوئی ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں۔ دیکھو شازمہ! لڑکی کی عزت آئینہ کی طرح ہوتی ہے۔ جس میں اس کے شوہر کا عکس ہی خوبصورت لگتا ہے۔ غیر محرم کا عکس اس آئینہ کو بدصورت کر دیتا ہے۔ کاش میں نے یہ سب باتیں تمہیں پہلے ہی سمجھائی ہوتیں تو تم بھٹکنے سے بچ جاتیں۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا تم خود کو سنبھالو اور اُسے بُرے خواب کی طرح بھول جاؤ!" وہ اُسے تسلیاں دیتے ہوئے دھیرے دھیرے سمجھا رہی تھیں اور وہ زیادہ رو رہی تھی۔ شام ڈھل رہی تھی۔ وہ اُسے نماز پڑھنے کا مشورہ دے کر باورچی خانے کی طرف چل دیں۔

لیکن شازمہ کی آنکھیں اب ہر وقت ہی سُرخ رہنے لگی تھیں۔ بات بات پر دل بھر آتا۔ ناظمہ بیگم ہر طرح سمجھا کر تھک گئی تھیں لیکن وہ بے وقوف جذباتی لڑکی اس صدمے کو سہہ نہیں پا رہی تھی۔ اپنے مسترد کئے جانے کے احساس نے اُسے بیمار کر دیا۔ ناظمہ بیگم سخت پریشان ہو گئیں۔ ان کا جی چاہتا کہ راشد کا منہ نوچ لے جو ابھی تک ٹکا ہوا تھا۔ تب ایک دن انھوں نے کلیم صاحب سے کہا:

"یہ راشد کچھ مشکوک سا آدمی لگتا ہے۔ کوئی اور کرایہ دار... رکھ لیں۔"

"کیوں؟ کیا کوئی بات سُننے میں آئی ہے؟" وہ تشویش سے بولے۔

"نہیں آئی تو آجائے گی۔ محلے کی لڑکیوں پر بُری نظریں ڈالتا ہے۔ اکیلے مرد کا کیا اعتبار۔ کل کو کوئی بات ہو گئی تو ہماری مصیبت آئے گی۔"

"ایسی بات ہے تو میں کہہ دوں گا اُس سے۔ لیکن اچھے کرایہ دار آج کل کہاں ملتے ہیں۔ خیر اللہ مالک ہے۔" کلیم صاحب نے کہا پھر تشویش سے بولے۔

"یہ شازمہ کا بخار ابھی تک نہیں اُترا۔ کل کسی اچھے ڈاکٹر کو... دکھائیں گے۔"

"ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میری بچی گھلا کر رہ گئی ہے۔" وہ سوچ میں گم تھیں۔

● سیفی کئی مہینے بعد آیا تھا۔ شازمہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کتنی کمزور ہو گئی تھی وہ۔

"یہ کیا حالت بنائی ہے تم نے؟ کب سے بیمار ہو؟" وہ بے حد دکھی ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہوں سیفی بھائی۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" شازمہ کو اس کی ہمدردی اچھی نہیں لگی۔

"ہاں میں کیوں فکر کروں۔ فکر کرنے کے لئے تو اور ہمدرد پیدا ہو گئے ہیں۔" حالات سے بے خبر سیفی جانے کیسے طنز کر گیا شاید دل زخمی تھا اس لئے۔

"خاموش ہو جائیں آپ! نفرت ہے مجھے اُس سے مت لیجئے گا میرے سامنے اُس کا نام۔" وہ ایکدم چیخ پڑی تو سیفی گھبرا گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر اُسے کچھ شک تو ہوا تھا لیکن کیا اور کب ہو چکا اُس سے وہ بے خبر تھا۔ بہت سے بُرے خیالات اس کے ذہن میں آئے اور وہ تڑپ اُٹھا۔

"کیا بات ہے شازمہ پلیز... مجھے بتاؤ۔" وہ بیتابی سے بولا۔

"کچھ نہیں...۔" وہ بُری طرح رو پڑی۔

"شازمہ... خدا کے لئے مجھ سے نہ چھپاؤ۔ سنو، میں تمہارے حق کے لئے لڑوں گا۔ تم جو چاہو گی وہی ہوگا۔ لیکن اگر اُس نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو میں اُسے بالکل نہیں بخشوں گا۔ کہہ دو مجھ سے شازمہ کہہ دو۔" وہ سخت طیش میں کتنے اپنے لہجے سے تنگ رہے تھے اس کا جی چاہا۔ انہیں سب کچھ بتا دے لیکن اُن کے سامنے اپنی رُسوائی اُسے گوارا نہ تھی۔ کتنا منع کیا تھا اُنھوں نے مجھے۔ باخبر کر دیا تھا مجھے لیکن میں نے کچھ نہ سُنا۔ اب میں خود ہی سب کچھ برداشت کروں گی۔ اس نے آنسوؤں کو حلق میں گھونٹتے ہوئے خود کو سنبھالا۔

"مجھے کسی سے کچھ نہیں کہنا۔" وہ رکھائی سے بولی لیکن آواز میں بے بسی نمایاں تھی۔

"لیکن کچھ کہنے کے لئے ہے شازمہ تم نے یہ کیوں کہا کہ تمہیں راشد سے نفرت ہے؟"

وہ اس کا جواب نظر انداز کر کے بولا لیکن وہ خاموش بیٹھی ناخن چباتی رہی۔

"مجھ پر اعتبار کرو شازمہ! میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ یوں بیمار ہو کر روگ نہ لگاؤ زندگی کو، بہادر بنو۔ ہر انسان زندگی میں کبھی نہ کبھی دھوکہ کھاتا ہے۔ پھر سنبھل جاتا ہے اپنے پیاروں کی مدد سے اپنے ہمدردوں کے تعاون سے۔ یہی انسانیت ہے۔ بولو نا شازمہ پہلے بھی تو تم ہر بات مجھے بتاتی رہی ہو۔ میں نے کبھی غلط رہنمائی کی ہے بولو...؟" وہ حوصلہ بڑھا رہا تھا تب وہ ہار گئی۔

"بس آپ سمجھ لیں میں نے بھی دھوکہ کھایا ہے اور اب سنبھلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"لیکن اس طرح؟ اس طرح تو تم بیمار پڑی ہو اور بالکل ہو گئی لگ رہی ہو؟ تمہیں تو خوش رہ کر اسے شکست دینی چاہیئے چلو ٹھیک ہو جاؤ فوراً۔" وہ اُسے ہنسانے کو بولا۔

"بہرحال اب مجھے علم ہو گیا ہے کہ سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔ اور عورت کو کھلونا سمجھتے ہیں۔" وہ تلخی سے کہہ گئی۔

"بالکل غلط، ایک تجربہ کی بنا پر تم ایسا نہیں کہہ سکتی۔" سیفی تیزی سے بولا۔

"آپ خود مرد ہیں اس لئے کہہ رہے ہیں لیکن میں اب کسی مرد پر اعتبار نہیں کر سکتی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ اور اس کے فیصلے میں چٹانوں کی سختی تھی۔

سیفی کا جی چاہا کہ راشد کا گریبان پکڑ کر پوچھے کہ تمہیں کیا حق تھا ایک معصوم بے وقوف لڑکی کا اعتماد مجروح کرنے کا۔ کیوں تم نے اس کی شخصیت کو توڑ پھوڑ دیا لیکن ایسا کرتے ہوئے اگر اس نے پلٹ کر پوچھ لیا کہ کیوں آئی تھی تمہاری کزن میرے پاس، تو وہ کیا جواب دے گا۔ اب تو مسئلہ ہی ختم ہو گیا تھا لیکن شازمہ کی انتہا پسند سوچ نئے مسائل پیدا کرے گی۔ کوئی نہ کوئی دل پذیر محرک انسان کو انتہا پسند بنا دیتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس جذبے میں کمی آ جاتی ہے۔ اُسے اُمید تھی کہ جب اس حادثے کے اثرات کم ہوں گے تو وہ خود کو شازمہ کے لئے پیش کر دے گا۔ لہٰذا وہ اسے مزید پریشان کئے بغیر چلا آیا۔

سارہ پھپھو کو اس کی بیماری کا علم ہوا تو اس کے پلنگ سے لگ کر بیٹھ گئیں اُس کا اتنا خیال رکھتیں کہ وہ شرمندہ ہو جاتی۔ یوں بھی راشد کے گھر چھوڑ جانے کے بعد وہ خاصی حد تک سنبھل گئی تھی۔ یہی شکر تھا کہ اس کے جذبوں کی عمر ابھی کم تھی۔ اگر پختہ ہو جاتی تو شاید وہ مر ہی جاتی۔ قسمت اچھی تھی جو ڈرامہ کا ڈراپ سین جلدی ہو گیا۔ سارہ پھپھو کی محبت اُسے صحت کی طرف کھینچ لائی۔ ذرا رخساروں پر سرخی چھلک آئی تھی لیکن اندر کی اُداسی ابھی باقی تھی جب بھی اُسے راشد کا خیال آتا وہ بجھ جاتی۔ پھپھو کے کہنے پر اس نے نماز کی پابندی اختیار کر لی تھی۔ بقول اُن کے جو لوگ نمازی ہوتے ہیں وہ بہت کم بیمار ہوتے ہیں۔ تن کے ساتھ ساتھ اُن کا من بھی اُجلا رہتا ہے۔ شازمہ سوچتی۔ سارہ پھپھو اتنی اچھی اتنی عظیم عورت ہیں کم عمری میں بیوہ ہونے کے بعد اُنھوں نے پاکیزہ زندگی اختیار کی۔ کتنے صبر و تحمل سے سیفی بھائی کی بہترین تربیت کی۔ بس اتنی سی بات ہی تو ہے کہ وہ غلط اور خلاف شریعت باتیں برداشت نہیں کر پاتیں۔ اور سخت رویہ اختیار کرتی ہیں۔ ورنہ بلا وجہ تو غصہ نہیں ہوتیں پھر امی کیوں اُن سے خائف رہتی ہیں۔ یہ شاید ہمارے اندر کی کمزوریاں ہوتی ہیں جو ہمیں نیک لوگوں سے ملنے نہیں دیتیں۔ وہ جتنے خلوص سے ہمیں قریب کرنا چاہتے ہیں ہم اُن سے اتنا ہی دُور بھاگتے ہیں۔ وہ خود بھی کالج میں ایسی لڑکیوں سے کتراتی ہے جو نیک اور پاکیزہ خیالات کی مالک ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کو اچھی باتوں کی تلقین کرتی ہیں جو اللہ کے لئے ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں۔ کاش میں نے اُن کی رفاقت اختیار کی ہوتی تو شاید اس غلط روش پر نہ دوڑتی۔ اُس وقت تو مجھے اُن لڑکیوں کی باتیں پُرکشش محسوس ہوتی تھیں جو

اچھے اپنے چاہنے والوں کے قصے مزے لے لے کر سناتی تھیں۔ ان کی طرف سے ملنے والے تحائف دکھاتی تھیں۔ اور وہ خود جب ان کی... دلہن بن کے گھر آ ہی ہوگئی تھی تو ان بھی تیز ... راشدہ کی باتیں انھیں بتانے لگی تھی۔ اور اب یہ سب کچھ آبا مضحکہ خیز لگتا تھا۔ اس نے خود کو مختلف کاموں میں مصروف کر رکھا تھا۔ بی۔ اے سال آخر کے امتحان سے فارغ ہو کر بھی وہ سارا دن گھر میں رہتی۔ اس کی سہیلیاں اکثر ملنے آ جاتیں لیکن وہ کہیں نہ جاتی تھی۔ راشدہ والے قصے کے بعد اس کی ہمت نہ ہوتی کہ وہ ناظمہ بیگم سے کہیں جانے کی اجازت مانگ سکے۔ دونوں کے اس کھیل نے اپنی ہی ماں کے سامنے اسے کیسا بے اعتبار بنا دیا تھا۔ حالانکہ پھر کبھی انھوں نے اس موضوع پر اس سے بات نہیں کی تھی۔ یوں بھی ماں تھیں۔ اولاد کی کمزوریوں کو ماں ہی چھپاتی ہیں۔ خود کلیم صاحب بھی شازمہ سے بہت محبت کرتے تھے۔

اُن ہی دِنوں کلیم صاحب کے گہرے دوست عثمان صاحب اپنی بیگم کے ساتھ کسی عزیز کی شادی میں شرکت کرنے لاہور آئے تو ان سے ملنے بھی چلے آئے۔ بیگم عثمان نے شازمہ کو دیکھا تو کھل اٹھیں۔ گلے لگا کر خوب پیار کیا۔ اگلی دفعہ آئیں تو شازمہ کا رشتہ مانگ بیٹھیں۔ اس انداز سے کہ انکار کی گنجائش ہی نہ چھوڑی۔ ناظمہ بیگم اُن کی جہاں داری پر حیران تھیں لیکن وہ کسی صورت ٹلنے والی نہ تھیں۔ انھیں ہمیشہ سے صحت مند لڑکیاں پسند تھیں۔ دُبلی پتلی نازک لڑکیوں کو... انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا تھا کہ ناک پکڑو تو دم نکلے۔ اور سدا بیمار رہنے والے لوگ تو انھیں بالکل گوارا نہ تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں کی تربیت بھی صحت مندانہ خطوط پر کی تھی۔ اُن کی خواہش تھی کہ اُن کی بہو بھی تندرست ہو چاہے خوبصورت نہ ہو۔ شازمہ تو شکل و صورت کی بھی بہت اچھی تھی اور صحت بھی اُس کی اب بہت بہتر ہو گئی تھی۔ اسی لئے انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ شازمہ ہی اُن کی بہو بن سکتی ہے۔ اُن کا بیٹا وجاہت گورنمنٹ سروس میں تھا اور خاصی معقول تنخواہ لے رہا تھا۔

ان کے بے حد اصرار پر ناظمہ بیگم نے کلیم صاحب سے بات کی۔ انھیں بظاہر تو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ عثمان صاحب کو ایک طویل عرصے سے جانتے تھے لیکن انھیں اپنی بہن سارہ کی خواہش کا بھی خیال تھا جنہوں نے بچپن میں ہی شازمہ کو مانگ لیا تھا۔ انھوں نے ناظمہ بیگم کو یہ بات یاد دلائی تو وہ پھٹ پڑیں۔

دیکھئے آپ بُرا نہ مانیئے گا۔ آپ اپنی بہن کی سخت مزاجی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور ہماری ایک ہی بیٹی ہے بعد میں شکایت پیدا ہو تو کیا فائدہ۔"

"لیکن ناظمہ، وہ دِل کی تو بُری نہیں، ذرا زبان کی سخت ہے۔ پھر شازمہ سے تو وہ بہت محبت کرتی ہے۔ کیسے دن رات اس کی تیمارداری کی ہے۔" انھوں نے بہن کی وکالت کی۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے آخر ان کا خون ہے لیکن آپ یہ بھی تو سوچیں بچپن کی اس چھوٹی سی بات چیت کے بعد انھوں نے پھر کبھی ایسی بات نہیں کی۔ اگر اُن کی خواہش ہوتی تو دوبارہ ذکر کرتیں پھر سیف کو ابھی سروس بھی نہیں ملی جانے کتنا عرصہ لگ جائے۔ پھر شازمہ کا رجحان بھی نہیں لگتا مجھے تو یہ رشتہ بہت اچھا ہے... میری مانیں۔"

"لیکن ناظمہ جلد بازی میں ہم کسی لوگوں کے ساتھ زیادتی نہ کر دیں۔" انھیں سارہ کا خیال تھا۔

"زیادتی کیسی نصیب کی بات ہے۔ دیکھیں اتنے اچھے رشتے بار بار نہیں آتے۔ شازمہ بھی بی اے کر چکی ہے۔ ہمیں اور پڑھانا تو ہے نہیں۔ گھر بٹھانے کا کیا فائدہ۔ بیٹی کی ذمہ داری جتنی جلدی اُتر جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ میری مانیں تو ہاں کر دیں۔" ناظمہ بیگم کو جو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا جانے کب کوئی بات کسی کے سامنے آ جائے۔ انھیں اس سے بہتر کوئی بات نظر نہیں آئی کہ شازمہ کا شہر ہی بدل جائے تو اچھا ہے تاکہ پرانے حادثے کی کوئی پرچھائیں اس کے ساتھ نہ ہو۔ اس رشتے کو وہ غیبی امداد سمجھ رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے پھر وجاہت کے آنے پر منگنی کئے دیتے ہیں۔" انھوں نے آسانی سے ہار مان لی۔

شازمہ کو علم ہوا تو سُلگ اٹھی۔ وہ تو شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ اب کسی مرد کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتی تھی۔ وہ انکار کر دے گی۔ اس نے مٹھیاں بھینچ کر سوچا۔ اپنی ساری ہمتیں مجتمع کر کے وہ کمرے میں پہنچی تھی۔ اُسی وقت کلیم صاحب منگنی کا سامان لئے کمرے میں داخل ہوئے اور ناظمہ بیگم کو دکھانے لگے۔ جو بے حد خوش ہو کر کچھ اور چیزیں لانے کے لئے کہہ رہی تھیں۔ اس کی ساری جرأتیں سارے حوصلے دم توڑنے لگے۔ ابا تو کسی بات سے واقف نہیں صرف امی میرے غم سے آشنا ہیں۔ وہ کیسے انکار کرے، کیسے احتجاج کرے۔ ابا کیا سوچیں گے۔ ان کی تو کمر جھک جائے گی۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ ہم لڑکیاں بھی کتنی بے بس ہوتی ہیں۔ کچھ بھی تو ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا۔ ایک دل پر اختیار تھا اسی کا غلط استعمال کر بیٹھی تھی۔ شاید والدین کے کئے ہوئے فیصلے ہی صحیح ہوتے ہیں۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا۔ ایسے میں اُسے سیفی بھائی بہت یاد آئے۔ جنھیں ابھی تک کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ پہلی بار سیفی بھائی کے لئے بے پناہ دُکھ اُس کے دل میں اُتر آیا اور وہ چپکے چپکے سسکتی رہی۔

منگنی میں ناظمہ بیگم نے اس کی قریبی سہیلیوں کو بلایا تھا جو اسے دُلہن بناتے ہوئے اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔ چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ اور نہ جانے کس کی منتظر تھی۔ اسے اتنا اداس دیکھ کر اس کی قریبی سہیلی نعیمہ نے سرگوشی کی۔

"شازمہ پُرانی کہانی بھول جاؤ نئی زندگی کے بارے میں سوچو" تو وہ بُری طرح چونک گئی۔ تب وہ زبردستی مُسکرا دی۔ اور وجاہت کو دیکھ کر تو وہ سب کچھ بھول گئی۔

"اچھا ہُوا جو میں نے احتجاج نہیں کیا۔ کتنی شاندار شخصیت ہے وجاہت کی۔ راشد تو اس کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔ اُجڈ سا۔ لیکن سیفی بھائی...!" اور اس کے آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی وجاہت کی شخصیت سحر بن کر چھا گئی تھی۔ اُن دِنوں وہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ سُرخ دوپٹے پر گوٹہ کرن لگاتے ہوئے وہ خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ سارہ پھپھو کے تیز تیز بولنے کی آواز پر چونک گئی۔ منگنی پر جب کلیم صاحب ڈرتے ڈرتے انھیں بلانے گئے تو معلوم ہُوا کہ وہ سیفی کے ساتھ سُسرال عزیز کی شادی میں گئی ہوئی ہیں۔ تب انھیں اطمینان سا ہوگیا تھا۔ اب انھیں علم ہوا تو وہ دوڑی چلی آئیں۔ اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اُٹھ کر انھیں سلام ہی کر آتی۔ قدموں کی چاپ پر اس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ آنکھوں میں بے پناہ درد لئے سیفی بھائی بڑے ضبط سے مُسکرا رہے تھے۔ وہ کانپ کر رہ گئی۔ وہ یونہی چُپ چاپ کھڑے اُسے دیکھتے رہے۔ ان کی گمبھیر خاموشی اُن کے اندر بپا طوفان کا پتہ دے رہی تھی۔ پھر بغیر کچھ کہے وہ تیزی سے واپس چلے گئے اور اُسے بے چین کر گئے۔ ناظمہ بیگم خاموشی سے سارہ پھپھو کی باتیں سُنتی رہیں۔ بہرحال وہ اُن کی مجرم تھیں جنھوں نے نہ صرف ان کا حق کسی اور کو دے دیا تھا بلکہ اُن کی شرکت کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ غیروں جیسے سلوک پر سارہ پھپھو کو بے حد غم اور غصہ تھا لیکن چلتے وقت وہ شازمہ کو گلے لگا کر رو پڑیں۔

"خدا تمھیں سدا سُکھی رکھے بیٹی! تُو نے بھی غریب پھپھو کا انتظار نہ کیا۔ خیر تیرا کیا دوش، جیتی رہ، میرے بیٹے کا مان ٹوٹ گیا تو کیا ہُوا۔ خُدا اُسے بھی سکون دے۔" شازمہ اُن کے سینے سے لگی روتی رہی اور وہ دُعائیں دے کر چلی گئیں۔ لگتا تھا اب وہ کبھی نہیں آئیں گی لیکن کچھ ہی دن بعد وہ جہیز کی تیاری میں ناظمہ بیگم کا ہاتھ بٹانے آگئی تھیں۔ ساتھ ہی سیفی بھائی کو بہت اچھی سروس ملنے کی خوشی میں مٹھائی بھی لائی تھیں۔ ناظمہ بیگم کو تھوڑا سا افسوس ہُوا۔ انھیں سیفی کو اتنی جلدی اتنی اچھی سروس ملنے کی اُمید نہ تھی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ سیفی بھائی کی اُجڑی صورت دیکھ کر وہ شرمندہ ہو جاتیں۔ ساری خوشی کافور ہو جاتی۔ تب اُسے سیفی پر غصہ آنے لگتا۔ کیوں یہ مجھے پریشان کرنے لگے ہیں۔ مجنوں بنے خواب پھرتے ہیں جیسے میرا اِن سے کوئی افیئر تھا۔ وہ جب بھی وجاہت کی تصور میں کھونا چاہتی سیفی بھائی کی اُداس آنکھیں اُسے پریشان کر دیتیں۔ وہ گھبرا کر سوچتی "یا اللہ...! میرے نصیب میں سکھ بھی ہے یا نہیں؟ وجاہت کو اگر میرے ماضی پر شک ہوگیا تو کیا ہوگا۔ اور اگر راشد...؟ نہیں نہیں۔" وہ بُری طرح گھبرا جاتی۔ وہ وسوسوں میں گھِر جاتی۔ اور یہ وسوسے ایک دن حقیقت کا رُوپ دھار گئے۔ وہ نماز کے بعد دُعا مانگ رہی تھی۔ منگنی کی انگوٹھی اس کی اُنگلی میں جگمگا رہی تھی۔ لُٹی لُٹی سی ناظمہ بیگم اس کے قریب آکر آہستہ سے بولیں۔

"شازمہ بیٹی! انگوٹھی اُتار کر مجھے دے دو۔" اُن کا لہجہ بدلا تھا۔ شازمہ نے بے حد حیران ہو کر انھیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر جانے کیا تھا کہ اس نے فوراً انگوٹھی اُتار کر انھیں دے دی۔ پھر انھوں نے الماری میں سے کپڑے وغیرہ نکالے اور دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ راشد کا آسیب اس کی خوشیاں چھین کر لے گیا تھا۔ وجاہت کی امی نے اُن کا دیا ہُوا سامان واپس بھجوا دیا تھا۔ اور اپنا سامان واپس منگوایا تھا۔ ساتھ ایک رقعہ بھیجا تھا۔

"ہم نے منگنی کرنے میں جلد بازی کی اُسے ختم کرنے پر معذرت قبول کریں۔ شادی بیاہ زندگی بھر کا بندھن ہے لڑکیوں کی مرضی کے خلاف شادیاں زندگی کا روگ بن جاتی ہیں پھر اپنے شوہروں کی صحیح وفادار ثابت نہیں ہوتیں۔"

بیگم عثمان

ناظمہ بیگم سمجھ گئی تھیں۔ یہ آگ راشد ہی کی لگائی ہوئی ہے وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ وہ اُن کے شہر سے جا چکا ہے جانے اس شیطان نے کیسے یہ بھید معلوم کیا اور جانے کیا کچھ اُن لوگوں سے لگایا ہوگا۔ شازمہ نادانستگی میں ہونے والے جُرم کی سزا کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ پہلا ہی حادثہ ابھی ذہن میں کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ نئی خوشی سمیٹنے بھی نہ پائی تھی کہ بکھر گئی۔ آنسو حلق میں پھنس پھنس کر اس کی سانس روکتے رہے۔ دماغ کی دھجیاں اُڑاتے رہے لیکن اپنے دُکھ پر وہ کھل کر رو بھی نہ سکی۔ اندر ہی اندر ٹوٹتی رہتی۔ امی کو دیکھ کر اس کی نظریں جھک جاتیں۔ کلیم صاحب حیران تھے کہ یہ سب کیا ہوا اس سے پہلے کہ وہ عثمان صاحب سے کچھ پوچھتے وہ اُن سے ملے بغیر کراچی جا چکے تھے۔ اور ناظمہ بیگم نے وہ رقعہ انھیں نہیں دکھایا تھا کہہ دیا تھا کہ شاید انھیں کوئی اور لڑکی پسند آگئی ہے اور

کلیم صاحب پریشان تھے کیونکہ وہ جس معاشرے میں رہتے تھے وہاں کسی لڑکی کی منگنی ٹوٹ جانا ہی بہت معیوب بات سمجھی جاتی ہے اُنھیں رہ رہ کر اپنی بہن کے ساتھ کی جانے والی ناانصافی کا خیال آتا تو انہیں اُن کی آہ لگ گئی۔ وہ جب تک یہ بات کہتے ناظرہ بیگم چُپ کی چُپ رہ جاتیں۔ اب وہ اُنھیں اصل بات کیا بتاتیں اور کیسے بتاتیں اُنھوں نے یہ بات نعیم فہیم سے چُھپائی تھی۔ مبادا کہیں وہ باہر ذکر نہ کردیں۔ سارہ پھپھو اس کے کپڑے چننے کے لئے لے گئی تھیں۔ تیار کرنے لائیں تو شازمہ کمرے میں جاکر چُھپ گئی اس کے لئے دُنیا میں کسی بات میں کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ اس جذباتی سی لڑکی کے لئے یہ حادثہ بہت بڑا تھا۔ کیونکہ اس کی زندگی پر مقصدیت نہیں تھی۔ انسانوں کی دُنیا میں رہنے والی ایک حساس اور بے وقوف لڑکی تھی جو ایک جذباتی غلطی سے اپنا مستقبل مشکوک کرچکی تھی۔ سیفی جانتا تھا شازمہ کے لئے یہ دوسرا شاک ہے۔ وہ پھر خود کو فنا کردے گی وہ اُسے ڈھونڈتا ہوا پہنچ گیا۔ یہ خبر سُن کر اُسے بے حد دُکھ ہوا تھا لیکن عجیب سی خوشی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"سنو شازمہ! انسانوں کے ساتھ اس سے بھی بڑے بڑے اور تکلیف دہ حادثات رونما ہوتے ہیں اور انسان ہی اُنھیں برداشت کرتے ہیں۔" وہ بلاتمہید بولا۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" وہ تلخی سے بولی۔

"اس لئے کہ تم انسانوں کا سامنا کرنے سے کترا رہی ہو۔ بزدلی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔"

"آپ کے خیال میں میں اس خوشی پر قہقہہ لگاؤں۔ خدا کے لئے آپ یہاں سے جائیں سیفی بھائی۔ ورنہ میں پھر کوئی گستاخی کر گزروں گی۔ میں پہلے ہی بکھر چکی ہوں۔" وہ رو پڑی۔

"اتنی سی بات پر میں تمہیں بکھرنے نہیں دوں گا۔" وہ عزم سے بولا۔

"کیوں؟ آپ کو مجھ سے کیا دلچسپی ہے؟" وہ بھنویں چڑھا کر بولی۔

"تمہیں نہیں معلوم؟" وہ حیرت سے بولے۔

"جی نہیں۔" وہ سختی سے بولی۔

"پھر میں کچھ نہیں کہوں گا۔" سیفی اُداسی سے بولا۔

"میں جانتی ہوں ہر مرد کی طرح آپ کو بھی وقتی دلچسپی ہوئی ہوگی آپ تو بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ چلو پھر میدان خالی ہوگیا پھر قسمت آزمائی کی جائے۔ اسی لئے آپ مجھ سے ہمدردی کرنے آگئے۔" وہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔

"تم میری توہین کر رہی شازمہ۔" سیفی اس کی حالت کے پیش نظر غصہ ضبط کر گیا۔

"تو اور کیا کروں؟ آپ چاہتے ہیں اب میں آپ کے جال میں پھنس جاؤں اور جب آپ کا جی چاہے مجھے ٹھوکر مار کر چل دیں؟" وہ غصے سے چیخ رہی تھی۔ سیفی حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

"اتنی گھٹیا باتیں تم نے میرے لئے کی ہیں۔ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی شازمہ۔ کسی کے لئے مخلصانہ جذبات رکھنا اور اس کی بہتری کے لئے چاہے تم یقین سے اسے اپنانا کوئی بُری بات نہیں۔ میں نے تم سے کوئی فلرٹ نہیں کیا۔ نہ کبھی محبت بھرے جملے تمہیں سنائے ہیں۔ تم مجھے عام مردوں میں شامل نہیں کرسکتیں۔ بہت فرق ہوتا ہے مرد مرد میں۔ خیر اپنے ذہن کوئی اِلزام خالی چھوڑ دو۔ مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا" غصے کے باوجود اسے شازمہ پر رحم آگیا۔ وہ کمزور اعصاب کی لڑکی کس طرح یہ سب برداشت کرسکتی تھی اُسے ہمدردی بھی زہر لگتی تھی اور سیفی کو بہرحال اس سے ہمدردی تھی وہ اُسے روتا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

پھر ایک روز سارہ پھپھو نے اُسے پیار کرتے ہوئے کہا "میری بیٹی آخر کہیں اور کیسے جاسکتی تھی اِسے تو میرے گھر کی رونق بننا ہے" تو شازمہ ایک جھٹکے سے ان سے الگ ہوگئی۔ اور ناظرہ بیگم خلاف توقع اُن کے منہ سے یہ بات سُن کر خوش ہوگئیں۔ ان کا خیال تھا کہ سارہ بیگم اب ہرگز شازمہ کو بہو نہیں بنائیں گی۔ اُنھوں نے جھٹ پٹ تیاریاں شروع کردیں۔ شازمہ کو پتہ چلا تو وہ آتش فشاں بن گئی۔ ناظرہ بیگم فہیم کو سپارہ پڑھا رہی تھیں۔

"میں شادی ہرگز نہیں کروں گی۔" احتجاج اس کی آواز میں چیخ رہا تھا۔ ناظرہ بیگم نے بُری طرح چونک کر اُسے دیکھا۔ اتنی تندی سے وہ کبھی نہیں بولی تھی۔ وہ اس وقت نیم دیوانی لگ رہی تھی۔ فہیم بھی گھبرا کر اُسے دیکھنے لگا۔

"فہیم تم سبق یاد کرو۔ میں ابھی سُنتی ہوں۔" اور شازمہ کا ہاتھ پکڑ کر... دوسرے کمرے میں لے گئیں۔

"کیا اول فول بک رہی ہو تم شادی نہیں کرو گی تو کیا ساری عمر گھر بیٹھی رہو گی؟" وہ آہستہ سے بول رہی تھیں۔

"میں نے آخری بار کہہ دیا ہے امی! اب ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ دوبار ٹھکرائے جانے کے بعد میں تیسری بار نہیں جھکوں گی۔ کیا میں قربانی کا جانور ہوں جس کی بولیاں لگتی رہیں گی؟" وہ بُری طرح چیخ پڑی۔

"شازمہ بیٹے! خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری پھپھو تمہیں اپنا رہی ہیں۔ بہت پیار کرتی ہیں تم سے۔ تم نے کوئی جُرم تو نہیں کیا۔ جو بھی خدا کو منظور تھا وہ ہُوا۔ اب تم تسلی رکھو۔ انشاءاللہ وہ تمہیں بہت خوش رکھیں گی۔" وہ اُسے کرید کر پیار سے سمجھا رہی تھیں۔

"نہیں، بیٹے مجھے کسی کی ہمدردی، محبت کی بھیک، کبھی تو طعنہ دیں گے وہ مجھے۔ میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔ امی ہمیشہ آپ کے پاس... ہمیشہ۔"

ناظرہ بیگم نے گھبرا کر اس کی بند ہوتی آنکھوں کو دیکھا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ "یا اللہ رحم کر میری بچی پر۔" انھوں نے گھبرا کر فہیم کو آواز دی اور جلدی سے ٹیکسی لانے کو کہا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص پر معلوم ہوا کہ نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی اس کی حالت تسلی بخش نہیں تھی۔ ناظرہ بیگم کا رو رو کر برا حال تھا۔ کلیم صاحب اور سیفی بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں سے رجوع کر رہے تھے۔ سیفی نے سارہ بیگم کو ہسپتال آنے سے منع کر دیا تھا اور خود بھی اُس کے سامنے نہیں آتا تھا۔ مبادا اس کے ذہن پر مزید برا اثر پڑے۔ کیونکہ ناظرہ بیگم نے اُسے ساری باتیں بتا دی تھیں۔ ڈاکٹروں کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ اب وہ خطرے سے باہر تھی۔ اب ڈاکٹروں نے نفسیاتی تجزیے کا مشورہ دیا تھا۔ سیفی نے فوراً اپنے ماہرِ نفسیات دوست کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور اُسے ساری صورت حال بھی سمجھا دی تھی۔ اور اس کے علاج کے لئے انھوں نے بڑا دوستانہ اور بے تکلف ماحول اُس کے کمرے میں بنایا تھا جہاں بیٹھ کر وہ اس طرح کی گفتگو کرتے کہ اُسے اپنے ساتھ ہونے والے واقعات بہت معمولی لگنے لگیں۔ کبھی کبھی وہ اُسے بھی گفتگو میں شریک کرنے کی کوشش کرتے لیکن وہ سوائے ڈاکٹر رضیہ کے کسی کی بات کا کوئی جواب نہ دیتی۔

اُس دن ناظرہ بیگم شازمہ کو سوپ پلا رہی تھیں۔ تب ہی ڈاکٹر رضیہ اُداس اُداس سی اندر داخل ہوئی۔ سلام کر کے وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر رضیہ! آج آپ چپ چپ سی ہیں؟" ناظرہ بیگم نے محبت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں خالہ جان! کوئی خاص بات نہیں۔ معمولی سی بات ہے۔" ڈاکٹر رضیہ نے اطمینان سے کہا۔

"پھر بھی بتاؤ تو سہی۔" انھوں نے اصرار کیا۔

"جانے بھی دیں۔ ایسی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ بس یونہی چپ تھی۔" اس نے ٹالنا چاہا۔

"دیکھو بیٹی! تم مجھے شازمہ کی طرح عزیز ہو گئی ہو۔ میں تو اب ضرور سنوں گی۔"

اب شازمہ بھی آنکھوں میں تجسس لئے ڈاکٹر رضیہ کو دیکھ رہی تھی۔

"بس خالہ جان! مردوں کی خود غرضی۔ میری منگنی ٹوٹ گئی! اسی وجہ سے۔" وہ بڑے مزے سے مسکرا رہی تھی۔ "منگنی ٹوٹ گئی!" شازمہ بڑبڑائی۔ "یہ معمولی بات ہے؟"

"ہاں تو کیا ہوا۔ میری صحت پر تو کوئی اثر نہیں پڑا۔ بلکہ میں تو خوش ہوں کہ ایک خود غرض آدمی کی نیت پہلے ہی معلوم ہو گئی۔" وہ ہنس پڑی۔ "جانتی ہیں خالہ جان! میرا منگیتر اس لئے کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں ڈاکٹر ہوں۔ لہٰذا وہ ساری عمر میری کمائی کھائے گا... بے غیرت میں نے خود ہی منع کر دیا۔ دُنیا میں اچھے لوگوں کی کمی تھوڑی ہے جو میں جان کو روگ لگا ڈالوں۔"

"تم نے بہت اچھا کیا بیٹی! لڑکیوں کو ایسا ہی بہادر ہونا چاہیے۔" ناظرہ بیگم نے کہا تو شازمہ حیرت سے انھیں دیکھتی رہی۔ اُسے حیرت میں ڈوبا چھوڑ کر وہ دونوں باہر نکل گئیں۔

ڈاکٹر رضیہ کو ہمیشہ ہنستا کھلکھلاتا دیکھ کر وہ حیران ہوا کرتی۔ اس دن اس کا موڈ کچھ خوشگوار دیکھ کر ناظرہ بیگم بے حد خوش تھیں۔ کلیم صاحب ندیم اور فہیم کے ساتھ ابھی گھر گئے تھے۔

"امی... پھپھو مجھے دیکھنے نہیں آئیں؟" اس نے خود ہی پہلی بار ان کا ذکر کیا۔

"آئی تھیں بیٹی! سیفی کے ساتھ۔ پھر سیفی خود ہی انھیں واپس لے گیا کہ کہیں دیکھ کر شازمہ ناراض نہ ہو جائے۔" انھوں نے جان کر کہا۔

"لیکن کیوں... میں کیوں ناراض ہونے لگی۔" وہ اطمینان سے بولی تو مارے خوشی کے ناظرہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اُس دن وہ ڈاکٹر رضیہ سے باتیں کر رہی تھی۔ ڈاکٹر ریاض نے اندر آ کر کہا۔ "ڈاکٹر رضیہ! آپ یہاں ہیں۔ سیفی صاحب آپ کو باہر یاد کر رہے ہیں۔" شازمہ نے چونک کر دونوں کو دیکھا۔

"اوہ پلیز... آپ اُن کو بھی یہیں بلا لیں۔ اچھا نہیں۔ میں تو بھول ہی گئی کہ شازمہ اُن سے کچھ ناراض ہے۔ کیوں شازمہ؟" ڈاکٹر رضیہ نے اُسے دیکھا۔ تب اس کی سمجھ آیا کہ یہ سیفی بھائی کی بات کر رہی ہیں۔

"جی... نہیں تو۔ آپ بُلا لیں سیفی بھائی کو۔" وہ گھبرا کر بولی۔

اُس کا خیال تھا کہ اس کے اور ناظرہ بیگم کے علاوہ کوئی ان کی ذاتی باتوں سے واقف نہیں۔

"نہیں بھئی! ڈاکٹر رضیہ! آپ اپنے دوستوں سے باہر جا کر ملیں۔ مجھے اپنی مریضہ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" ڈاکٹر ریاض نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ڈاکٹر رضیہ ہنستی ہوئی باہر چلی گئیں اور شازمہ کا ذہن اُلجھنے لگا۔ "سیفی بھائی آتے ہیں، مجھ سے تو ملنے آتے نہیں۔ ڈاکٹر رضیہ سے ضرور ملتے ہیں۔ لگتا ہے بہت دوستی ہو گئی ہے۔ اونہہ مجھے کیا۔" ڈاکٹر ریاض اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے غصے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔ وہ جان گئے

تھے۔ کیا سوچ کر اُسے غصہ آیا ہوگا۔ تب اُنھوں نے شازمہ سے کہا۔
"شازمہ بی بی! آپ کے اپنے دوست یا رشتے دار گھر والوں کے علاوہ، جن سے آپ ملنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ کہیں گی تو ہم اُنھیں آپ سے ملنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔"
"جی ہاں ڈاکٹر صاحب! میری ایک پھوپو ہیں جو مجھے بہت چاہتی ہیں۔ وہ مجھ سے آج تک ملنے نہیں آئیں۔ اگر انھیں آپ اجازت دے دیں تو مہربانی ہوگی۔"
"اور کوئی...؟" ڈاکٹر ریاض نے ٹٹولا۔
"اور...؟" اُسے سیفی بھائی کا خیال آیا لیکن اس نے جھٹک دیا۔ "اور کوئی نہیں۔"
"میرا مطلب تھا۔ آپ کے کزن بیچارے روز آتے ہیں۔ انھیں ہماری طرف سے تو اجازت ہے لیکن وہ آپ کی اجازت چاہتے ہیں۔ شاید وہ آپ کی ناراضگی سے خوفزدہ ہیں؟" ڈاکٹر ریاض ہنس کر بولے۔
"مرد بھی کبھی کسی سے خوفزدہ ہوا ہے؟" وہ طنز سے بولی۔
"یوں نہ کہیں۔ میں تو اپنی بیوی سے بہت ڈرتا ہوں بھئی۔"
وہ مزاحیہ انداز میں بولے تو وہ بھی مُسکرا دی۔
"ڈاکٹر صاحب آپ بہت اچھے ہیں۔"
"شکر ہے خدا کا۔ آپ نے کسی مرد کو اچھا بھی سمجھا۔ اس کا مطلب ہے آپ صحت مند ہو رہی ہیں۔ آپ کے سوچنے کا انداز بھی بدل رہا ہے تو پھر اپنے سیفی بھائی کو بھی معاف کر دیجیے۔" ڈاکٹر صاحب جلدی سے بولے۔
"اُنھوں نے تو مجھے بدنام ہی کر دیا۔ میں کب کسی سے ناراض ہوں۔ بس اب میں اُنھیں آنے کی اجازت نہیں دوں گی۔" وہ خفگی سے بولی۔
ڈاکٹر ریاض ہنستے ہوئے چلے گئے۔ اور اس کا ذہن ایک بار پھر ڈاکٹر رضیہ کی طرف گھوم گیا۔
ہر وقت چٹکلے سُنانے والی ڈاکٹر رضیہ گھوم پھر کر سیفی کو موضوعِ گفتگو بنا لیتی تھی۔ جانے کیوں اس کے سر پر سیفی سوار تھا اور سیفی تھا کہ ایک بار بھی اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ میری ناراضگی کا بہانہ اچھا ہے۔ پہلے تو جیسے بڑی میری ناراضگی کا خیال کرتے تھے۔ اُسے غصہ آنے لگا۔ جب مجھ سے نہیں ملنا تو پھر ہسپتال کیوں آتے ہیں۔ اور یہ ڈاکٹر رضیہ اب مجھے عجیب سی لگنے لگی تھی۔ کیا ڈاکٹروں کو ایسی باتیں زیب دیتی ہیں؟ ہر وقت کسی مرد کی باتیں کرنا۔ اسی لئے شاید اُن کی پہلی منگنی ٹوٹ گئی۔ وہ جل کر سوچتی لیکن اپنا حادثہ یاد کر کے وہ سنبھل جاتی۔ لیکن اب اُسے اتنا دُکھ نہ ہوتا۔
اس دن ڈاکٹر رضیہ اُسے خوشخبری سُناتے سُناتے اداس ہوگئی۔
"اوہ شازمہ تمھارے صحت یاب ہونے کی بے حد خوشی ہے۔ اب تم ایک نئی زندگی کا آغاز کرو گی۔ دیکھو چھوٹی چھوٹی باتوں کو روگ نہیں بناتے۔ ہنستے کھیلتے برداشت کرتے ہیں۔ اب تم ہمیشہ خوش رہنا۔"
"ڈاکٹر رضیہ! آپ کی منگنی ٹوٹ گئی تھی نا؟ اب جب آپ کی شادی ہو تو مجھے ضرور بلائیے گا۔" شازمہ نے کہا۔
"اوہ کیوں نہیں۔ لیکن سیفی جیسے آدمی سے شادی کروں گی میں۔ یقین کرو شازمہ میں نے سیفی جیسا مرد نہیں دیکھا۔ وہ ایک آئیڈیل انسان ہے۔ کاش سیفی...!" وہ آہ بھر کر رہ گئی۔
"تمھارا کیا خیال ہے اپنے کزن کے بارے میں؟"
"کوئی خاص نہیں۔ مجھے مردوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔" وہ جل کر بولی۔
"ارے نہیں شازمہ! میرا بھی یہی خیال تھا پہلے لیکن سیفی سے مل کر میری رائے بالکل بدل گئی ہے!" وہ زور دے کر بولی۔
"اُف سیفی سیفی...! یہ ڈاکٹر کیسی عورت ہے اسے سیفی کے سوا کوئی موضوع نہیں ملتا۔ جاتے جاتے بھی مجھے چھوڑ کے گا رہی ہے۔"
"آپ اُنھیں پسند کرتی ہیں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔
"بہت زیادہ۔ ایسے مرد کا ساتھ کون نہیں چاہے گا؟" وہ حسرت سے بولی۔
"پھر آپ اُن سے اپنی خواہش کا اظہار کیوں نہیں کر دیتیں؟"
وہ بے کل سی بولی۔
"یہی تو مشکل ہے ڈیئر! وہ کسی اور لڑکی کو بچپن سے پسند کرتا ہے۔ حالانکہ وہ لڑکی بہت ضدی ہے۔ اُسے لفٹ نہیں دیتی بلکہ آج تک اس کی محبت کو سمجھ ہی نہ سکی۔ مجھے تو وہ لڑکی نفسیاتی مریضہ لگتی ہے جس کے پیچھے وہ خواہ مخواہ سر پھوڑ رہا ہے یا پھر وہ کسی اور سے محبت کرتی ہوگی۔ بیچارے سیفی کی زندگی خراب کر رکھی ہے اُس نے۔ کہتا ہے صرف وہ، ورنہ کوئی نہیں۔ کتنی خوش نصیب ہے نا وہ لڑکی شازمہ، جسے سیفی چاہتا ہوگا۔" وہ اس قدر روانی سے تبصرہ کر رہی تھی کہ شازمہ کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ جو بات سیفی خود نہیں کہہ سکا تھا۔ وہ کتنی آسانی سے اُسے بتا رہی تھی۔ اس نے گھٹنوں پر اپنا سر ٹکا دیا تھا۔ اب وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ تب ہی ڈاکٹر رضیہ اس کی طرف گھومی۔
"شازمہ تم بھی تو سیفی کی کزن ہو تم ضرور اس لڑکی کو جانتی ہوں گی۔ پلیز مجھے اس کا پتہ بتا دو۔" شازمہ نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا پھر گردن جھکالی۔ اس کا سر جھکا رہا تھا۔

"بتاؤ نا شازمہ! میں اس لڑکی سے مل کر بات کرنا چاہتی ہوں۔ پھر تو سیفی کو میری بات ماننی ہوگی کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ میں صرف اس لڑکی کی بات مان سکتا ہوں۔ پھر دیکھنا تم...." اس نے میز پر مکا مار کر اپنے جوش کا اظہار کیا۔ "سیفی میرے ہوں گے۔"

"سیفی آپ کے نہیں ہیں ڈاکٹر!" وہ ایک دم چیخ پڑی۔

"پھر کس کے ہیں شازمہ؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"کس کے ہیں؟" وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

"ہاں ہاں بتاؤ۔ میرے نہیں تو پھر کس کے ہیں؟" رضیہ نے زور دے کر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ نہیں معلوم...!" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"وہ لڑکی انھیں نہیں چاہتی تو وہ میرے بن سکتے ہیں۔" ڈاکٹر رضیہ زور سے بولی۔

"نہیں نہیں یہ ظلم نہ کرو ڈاکٹر۔ وہ میرے ہیں۔ ان پر صرف میرا حق ہے۔ ڈاکٹر تم یہ ظلم نہیں کر سکتیں۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

ڈاکٹر رضیہ مطمئن انداز میں مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ اس کی نبض تھام کر دروازے کی طرف دیکھا۔ سیفی، ڈاکٹر ریاض کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا۔ شازمہ نے بند ہوتی پلکوں سے سیفی کو دیکھا۔ جو دلفریب انداز میں مسکرا رہا تھا پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

"لیجیے سیفی صاحب! آج ڈراپ سین ہو گیا۔" ڈاکٹر ریاض بولے۔ "ہمیں اپنے کام کے علاوہ آپ کا ذاتی کام بھی خود ہی کرنا پڑا۔ اب تو آپ مطمئن ہیں؟"

"میں بے حد شکر گزار ہوں آپ سب کا۔ خاص طور پر ڈاکٹر رضیہ آپ کا۔ آپ نے واقعی کمال کر دکھایا۔ ورنہ مجھے بہت محنت کرنا پڑتی اس کام کے لیے۔" وہ سب ہنس رہے تھے۔

ہوش میں آنے کے بعد شازمہ نے قریب بیٹھی ناظمہ بیگم کو دیکھا جو قرآنی آیات پڑھ کر اس پر دم کر رہی تھیں۔ اُسے ہوش میں دیکھ کر... انھوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ بھی مسکرا دی۔ وہ خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

"میں ڈاکٹر ریاض کو اطلاع دے دوں!" وہ جلدی سے باہر نکلیں۔ شازمہ نے پُرسکون ہو کر آنکھیں موند لیں۔ تبھی اُسے کسی کے وجود کا احساس ہُوا۔ کوئی قریب ہی گہری گہری سانس لے رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر... آنکھیں کھول دیں۔ سیفی بھائی آرام سے کرسی پر بیٹھے تھے۔

"اب خیال آیا ہے آپ کو میرا؟" وہ شکایتی لہجے میں گویا ہوئی۔

"میں تو ہر وقت تمہارے آس پاس رہا ہوں۔" سیفی سنجیدگی سے بولے۔

"ہاں مجھے معلوم ہے آپ کہاں ہوتے تھے۔" وہ مُنہ پھیر کر رہ گئی۔

"تمہارا اشارہ ڈاکٹر رضیہ کی طرف ہے غالباً تو یہ کہ شازمہ! کتنی محبت کرتی ہے وہ تم سے اور تم اس سے...." سیفی نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"جی نہیں مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ آپ کو اپنانا چاہتی ہیں تو شوق سے اپنائیں۔" وہ مُنہ پھُلا کر بولی۔

"تمہارا اعتراف سُننے کے بعد بھی یا وہ ایسا چاہے گی؟" سیفی شوخی سے بولے۔ "اتنی ظالم تو نہیں ہو سکتی ایک ڈاکٹر... کہ تمہارا حق تم سے چھین لے۔" وہ اُسے چھیڑ رہے تھے اور تب ہی شازمہ کو سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ کس طرح چیخ رہی تھی اور اسی وقت سیفی کمرے میں آئے تھے۔ "اُف میرے خدا!" وہ شرم سے سُرخ ہو گئی.... "سے پلکیں اٹھانی مشکل ہو گئیں۔ یہ سب کیسے ہو گیا۔ کیا سوچتے ہوں گے سیفی بھائی کتنی بے شرم لڑکی ہے۔ کٹی جا رہی تھی اور سیفی اس کے گلنار چہرے کو تک رہے تھے۔

"تمہاری بیماری سے ایک فائدہ تو ہُوا تم نے اعتراف خوب کیا۔ جانتی ہو چار کمروں تک آواز آ رہی تھی۔ میں تو اُچھل ہی پڑا تھا۔ سچ بڑا سکون مل رہا تھا مجھے جب تم کہہ رہی تھیں "سیفی میرے ہیں۔ ان پر میرا حق ہے۔" سیفی بڑی ترنگ میں بولتے جا رہے تھے۔

"اللہ! بس کریں نا سیفی بھائی۔" اس نے شرما کر اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔

"سچ بڑا تعاون کیا ہے ڈاکٹر رضیہ نے میرے ساتھ۔"

"کیا مطلب...؟" شازمہ نے چونک کر سر اُٹھایا۔

"تم جو مردوں سے بیزار ہو چکی تھیں۔ اتنی آسانی سے کیسے راہ راست پر آ گئیں۔ یہ سب ڈاکٹر ریاض، ڈاکٹر رضیہ اور ماہد ولت کا کمال ہے۔"

"کیا کیا...؟" وہ حیرت سے بولی۔

"بس یہ سمجھو کہ سارے نفسیاتی حربے استعمال کیے ہیں۔ ایک بگڑی ہوئی لڑکی کے لیے۔" وہ جلدی سے بولے۔

"اچھا، یہ سب نفسیاتی حربے تھے ایک لڑکی کو جال میں پھنسانے کے لیے۔" وہ ایک دم پٹڑی سے اُتر گئی۔ "آپ سب مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔ بڑے افسوس کی بات ہے سیفی صاحب! پڑھے لکھے لوگ مل کر بھی ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ اچھا ہُوا آپ نے مجھے بتا دیا۔ ورنہ میں دھوکے میں رہتی۔ جائیں آپ یہاں سے۔ نہیں چاہیے مجھے کسی کی ہمدردی اور آئندہ مجھ سے کوئی توقع نہ رکھیں آپ۔" وہ اُسی انداز میں چیخ رہی تھی اور سیفی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تک بہت

خوش نظر آ رہے تھے سخت پریشانی کے عالم میں اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر اُسی حالت کی طرف لوٹ گئی تھی۔

"شازمہ پلیز... خدا کے لئے غلط نہ سمجھو، سنو میری بات سنو!" وہ اس کا ہاتھ تھام کر گڑگڑانے لگا لیکن اُس نے فوراً ہاتھ جھٹک دیا۔

"چھوڑ دیں مجھے، جائیں یہاں سے۔ میری امی کو بلائیں، میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے جاؤں گی۔" وہ چیخ رہی تھی۔ سیفی گھبرا کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر رضیہ بھاگی ہوئی آئی۔ شازمہ نے جانے اُن سے کیا کہا تھا جو وہ بھی شازمہ کی طرح اس بات پر بضد تھی کہ اُسے گھر بھجوا دیا جائے اور اُن کے کہنے پر ڈاکٹر ریاض کو بھی اُن کی بات ماننی پڑی۔ اور سیفی دکھ اور مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

اس کی دوبارہ اسی کیفیت کا ذمہ دار وہ خود کو سمجھ رہا تھا۔ جس نے شازمہ کو پاکر ایک بار پھر کھو دیا تھا۔ اس نے کلیم صاحب کے گھر جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ خود کو مجرم سا محسوس کرتا تھا۔ سارہ بیگم جب بھی اُن کے گھر سے آتیں وہ بے چینی سے شازمہ کا حال پوچھتا۔ اور وہ صرف اتنا کہتیں "ٹھیک ہے بیٹے، تم اپنا خیال رکھو۔" تو وہ اُلجھ کر رہ جاتا۔ امی کتنے اطمینان سے کہہ دیتی ہیں ٹھیک ہے بیٹے! اور کچھ بتاتیں بھی نہیں۔

اور اس دن تو زندگی میں پہلی بار اُسے سارہ بیگم پر سچ مچ غصہ آ گیا۔ جب اُنھوں نے کہا کہ وہ اس کی شادی پڑوس کی ایک لڑکی سے کر رہی ہیں۔ اور سب کچھ طے ہو گیا ہے تو وہ اُن کا منہ یوں تکنے لگا جیسے اُسے اُن کی ذہنی صحت پر شبہ ہو۔

"امی خدا کے لئے مجھ سے مذاق نہ کریں۔ میں آج کل ویسے ہی بہت پریشان ہوں۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اطمینان سے بولیں۔ اور وہ غصے سے باہر نکل گیا۔ ہسپتال کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے سوچا "ڈاکٹر ریاض سے شازمہ کے لئے مشورہ کرنا چاہیئے۔ آخر اُنھوں نے پہلے بھی اُسے ٹھیک کیا تھا۔ ہو سکتا ہے نادر ممانی اُسے لے جاتی ہوں۔ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر رضیہ اُسے دیکھ کر کھل اُٹھی۔

"مبارک ہو سیفی!" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"کس بات کی مبارک باد دے رہی ہیں آپ؟" وہ تعجب... سے بولا۔

"اچھا جناب! اب آپ ہم سے بھی مذاق کریں گے۔ یہ کارڈ آج ہی شازمہ کی امی دے کر گئی ہیں۔ مجھے تو شازمہ نے خاص طور پر بلایا ہے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

"اوہ... تو شازمہ کی شادی ہو رہی ہے۔" سیفی نے ڈوبتے دل کو سنبھالا۔

"شازمہ کی کیا مطلب ہے اور جناب کی نہیں؟" ڈاکٹر رضیہ کارڈ نکالتے ہوئے بولی۔

"ڈاکٹر، ذرا دکھائیں مجھے یہ کارڈ۔" وہ بُری طرح سے پٹا کر کارڈ دیکھ رہا تھا۔ جس میں سیف احمد کی شادی ہمراہ شازمہ کلیم کے ساتھ ہونا قرار پائی تھی۔

"اوہ ڈاکٹر رضیہ... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، یہ یہ سب کیا ہے؟" وہ حیرت اور خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

"تو کیا شازمہ شادی کے لئے مان گئی ہے، وہ بھی میرے ساتھ؟"

"ہاں بالکل، اُسے کیا ہوا ہے؟ وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"لیکن اُس دن تو وہ دوبارہ... میرا مطلب ہے۔" وہ ہکلایا۔

"ارے... تو آپ کو اب تک کچھ نہیں معلوم۔ وہ تو شازمہ نے ڈرامہ کیا تھا آپ کو ستانے کے لئے۔ کمال ہے بھئی آپ کی تیاریاں مکمل ہو گئیں اور آپ کو کچھ علم ہی نہیں۔" ڈاکٹر رضیہ بتا رہی تھی اور سیفی معصوم بچے کی طرح پلکیں جھپکا رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ زوردار "شکریہ ڈاکٹر" کہتا ہوا باہر بھاگ نکلا۔

"نسیم امی ہیں گھر میں...؟" وہ ہانپتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں وہ تو ندیم کے ساتھ بازار گئی ہیں۔ شازمہ آپی ہیں اندر۔" اور وہ لپک کر اندر پہنچ گیا۔

"شازمہ کی بچی...!" اس نے پیچھے سے جا کر اس کی چٹیا پکڑ لی۔ "میرے ساتھ اتنا بڑا ڈرامہ!"

"ہائے اللہ! چھوڑیں سیفی بھائی..." وہ درد سے کراہی۔

"کیا...؟ سیفی بھائی، ارے لڑکی کارڈ چھپ گیا لیکن بھائی کا دُم چھلا وہیں موجود ہے۔" وہ اس کے بال چھوڑتے ہوئے بولا۔ "تم سے تو میں گن گن کے بدلے لوں گا۔ اتنی سی لڑکی نے سب کو ساتھ ملا کر مجھے دھوکہ دیا۔ مجھے یعنی سیف احمد کو۔ اور اُوپر سے فرما رہی ہیں سیفی بھائی!" وہ بھائی پر زور دے کر بولا۔

"پھر کیا کہوں، فی الحال تو آپ کزن ہی ہیں نا؟" وہ اُسے پہلی بار اتنا شوخ ہوتا دیکھ رہی تھی۔

"فی الحال کزن ہوں۔ اور بقول امی کے۔ کزن کو سجن بنتے کیا دیر لگتی ہے۔ سو اب ہم تمہارے...!" اور شازمہ نے جلدی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سیفی زور زور سے ہنستے ہوئے سُرخ ہوتی شازمہ کو دیکھ رہا تھا۔

اُس کے اندر اور باہر ایسا سناٹا طاری تھا کہ وہ دُعا مانگتی
کہ کاش یہ سکوت مر ہی جائے — درودیوار سے لپٹ کر
وہ رولے تو — زندگی کا جمود تو ٹوٹے —
[illegible] ہوئی کہانی

مداوا نہیں کیا

رخشندہ میر

بیتا موسم یہ نوید سنا رہا ہے کہ بہار آگئی ہے
پھول کلیاں مسکرا رہے ہیں کہ بہار آگئی ہے
لیکن یہ مجھے بہاروں کی چاپ میں بھی پت جھڑ کی آواز کیوں سنائی دے رہی ہے؟

میرے اندر کی خزائیں بہاروں کے پیغام کو کیوں قبول نہیں کر رہیں۔ رہ رہ کر مجھ پر اُداسی مسلط ہو رہی ہے' میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں روؤں، کوئی تو سبب ایسا پیدا ہو کہ میں اِن خالی درودیوار سے لپٹ کر رو سکوں۔ کاش کوئی مر ہی جائے۔ یہ اتنا گہرا جمود' یہ سکوت' یہ کھوکھلا پن' یہ خلا جو میری رُوح تک پر محیط نظر آ رہا ہے۔ کسی طرح تو ختم ہو۔ یہ دل کی بستی اتنی ویران اور بیابان کیوں نظر آتی ہے؟ جیسے اِس میں بسنے والی ہر شے مٹ گئی ہو۔ فنا ہو گئی ہو۔ یہ سیٹیاں بجاتی، سائیں سائیں کرتی شام' طوفانی ہوائیں۔ دل کے بند دریچوں پر دستک کیوں نہیں دیتیں۔ یہ میرا دماغ جس میں کبھی ایک سودا سمایا رہتا تھا۔ جو خیالات کا مرکز تھا۔ اس قدر خالی خالی اور سنسان سا کیوں لگتا ہے۔ مگر اس کے مستقر پر ہر دم اُترنے والی خیالات کی پاکیاں سوچ کی موشگافیاں' تصورات کی حسین پریاں تھیں۔ ڈھونڈنے سے نظر نہیں آتیں۔ یہ درد کے جلتے ہوئے صحرا میں کسی خالی پڑاؤ کی طرح ویرانیاں اور اُداسیاں کیوں بکھری ہوئی ہیں اور... اور یہ میرے سینے میں بار بار ایک جان لیوا سی کسک کیوں اُٹھ رہی ہے جبکہ جذبات و احساسات پر تہہ در تہہ برف جمی ہوئی ہے۔

آہ... کہاں گئے وہ حسین دِن جب زندگی کا سارا حسن میری مٹھی میں بند تھا۔

اے خدا! تو اپنی کائنات کو پیچھے کی طرف لے چل اور مجھے میرا گزرا ہوا "کل" دے دے۔

آہ' لیکن ہماری خواہشات اگر پوری ہونے لگیں تو دُنیا میں غم نام کی کوئی چیز باقی نہ رہے۔ کوئی دل ویران اور کوئی نغمہ بے ساز نہ رہے، کوئی اتنی شدت سے اپنے اِردگرد کی ویرانیاں محسوس نہ کرے؟

آفاق احمد نے حسرت سے اپنے اِردگرد کھلے پھولوں پر نظریں جما کر سرد سی آہ بھری' شام کے سائے پھیل پھیل کر کائنات پر عجیب سی اُداسی بکھیر رہے تھے اور اس وقت اُنہیں وہ شعلہ و شبنم سی لڑکی یاد آگئی جس نے آفاق احمد کے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ وہ آج کئی برس بیت جانے کے بعد بھی اُن کے دل میں دھڑکن بن کر دھڑک اُٹھتی تھی! اے کاش! آج وہ ہوتی تو زندگی کتنی مختلف اور خوبصورت ہوتی اور آج یہ جو گل و گلشن کھلے ہوئے ہیں۔ رنگین فضائیں جو ہر سو پھیلی ہوئی ہیں' خزاں سے مشابہ نہ لگتیں۔ کوئی پوچھے تو کہ میرا دِل کیوں ویران ہے۔ کس کو سنائیں وہ دل؟ یہاں تو جسے بھی دیکھیں وہ اپنے آپ میں گم ہے۔ زبان تو ہے لیکن کوئی ہم زبان نہیں ہے۔



۔ایسا بھی نہیں ہے کہ اس جہاں میں پیار کی کمی ہے لیکن جہاں اس کی اُمید اور ضرورت ہو۔ یہ وہیں ناپید ہے۔ صبوحہ جی! لوگوں کی نظروں میں یہ عرصہ کتنا جلد گزر گیا۔ تمہارے خیال میں میں نے بھی یہ عرصہ بہت ہنس کر گزارا ہوگا لیکن نہیں صبوحہ علی! وقت بہت کٹھن گزرا ہے میری زندگی کا، چونکہ وقت کو ہم سب اپنے احساسات کے ساتھ گزارتے ہیں غموں سے چُور لوگوں کے لئے یہ وقت' یہ لمحے' بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ ہر گھڑی مرتے ہیں غمزدہ لوگ۔ اور ہر گھڑی جیتے ہیں۔ یہ ظالم زنگ آلود لمحے زنجیر کی طرح جسم کو اس طرح جکڑ لیتے ہیں کہ اُن سے آزاد ہونے کی جستجو میں اپنا وجود زخمی کر لیتے ہیں۔ اور کچھ لوگ میری طرح اس وقت دُکھ کی لذت سے آشنا ہوتے ہیں۔ جب خود ان کے سنگریزے دل میں اُترتے ہیں۔

میں خود ہی ساری زندگی اپنے وجود سے جھگڑتا رہا اور اپنے ہی دِل کو زخمی کرتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج میں ہر چیز کو ایک ہی عینک سے دیکھنے لگا ہوں' بہار بھی مجھے خزاں کا سندیسہ دیتی ہے۔ صبوحہ علی تم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ آفاق احمد! تم نے زندگی گزارنے کا جو فلسفہ بنا رکھا ہے۔ وہ اتنا خوبصورت ہے کہ اس کے لئے اگر مجھے سو زندگیاں بھی ملیں تو تمہارے فلسفے کے تحت گزاروں!

لیکن صبوحہ علی! اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا فلسفہ بالکل بے ضرر اور غلط تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے میں زندگی گزارنے کا حق بھولتا جا رہا ہوں۔ جانے یہ عمر کا تقاضا ہے یا محرومیوں کی وجہ۔

"ہیلو انکل جانی!" اپنی تنہائیوں سے برسرِپیکار آفاق احمد اس آواز پر چونک پڑے۔ اُن کے قریب اُن کا جواں سال خوبصورت بھتیجا معاذ کھڑا تھا۔ خلافِ توقع وہ آج بہت بُجھا بُجھا اور نڈھال سا لگ رہا تھا۔

"آؤ، آؤ معاذ بیٹے!" آفاق احمد نے دِل کی خزاں میں پت جھڑ کے موسم سے نکل کر لبوں کو مسکراہٹ سے آشنا کیا۔

"کیسے ہیں انکل؟" معاذ نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔

"بالکل ٹھیک۔ تم سُناؤ آج پورے دو دن بعد آئے ہو۔ کہو کیا پروگرام بنائیں؟" آفاق احمد نے معاذ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"انکل آج میں بہت پریشان ہوں مجھے آج کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ جی چاہ رہا ہے کہ سب کچھ توڑ پھوڑ دوں۔

یہ نہ کرو' وہ نہ کرو یہاں نہ جاؤ، وہاں نہ جاؤ۔ یہ لکھو' وہ نہ لکھو۔ یوں لگتا ہے زندگی تو ہماری ہے لیکن بسر اسے دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ دوسروں کی خواہشوں میں جکڑی ہوئی اس زندگی سے تو موت بہتر ہے۔" معاذ کا لہجہ ٹوٹا ٹوٹا اور مایوس کُن تھا۔

آفاق احمد اپنے لاڈلے بھتیجے کا یہ انداز پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے۔

"بات کیا ہے مائی سَن؟" آفاق احمد نے معاذ کے منتشر بالوں میں انگلیاں اُلجھا کر نرمی سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔"

"بھئی، ہوتا بہت کچھ ہے۔ کسی ایک بات کی نشاندہی کرو گے تو تمہارا مسئلہ سمجھ سکوں گا نا!" وہ معاذ کے قریب ہی بیٹھ گئے اور اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ معاذ اُن کا اپنا بیٹا بے شک نہیں تھا۔ بلکہ اُن کے بھائی اشفاق احمد کی اولاد تھا لیکن جانے کیوں وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اُن دونوں کے مزاج میں بڑی ہم آہنگی تھی۔ معاذ بے حد شوخ و شریر اور پُرخلوص نوجوان تھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشی اور پریشانی بھی آ کر آفاق احمد سے ہی کہا کرتا تھا لیکن جو انداز اور ٹوٹا ٹوٹا اعتماد آج اُس کے چہرے اور لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ آفاق احمد پریشانی سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"انکل جانی! بچپن سے لے کر جوانی تک والدین بچے کی ہر خواہش پوری کرتے ہیں۔ اُس کی ہر ضد مانتے ہیں لیکن جب یہی بچہ جوان ہوتا ہے۔ اُس کی شادی کا مسئلہ اُٹھتا ہے تو یہ پُرخلوص والدین اولاد کی خواہشوں کے آگے دیوار بن جاتے ہیں اور زبردستی اپنے فیصلے ٹھونستے ہیں۔ کیا ایسے والدین اولاد سے مخلص ہیں؟ میں جانتا ہوں' جانتا ہوں یہ کہ بعض اوقات والدین کا فیصلہ درست ہوتا ہے۔ اُن کے پاس تجربہ ہے عقل ہے لیکن اگر اس فیصلے میں جوان اولاد کی خواہش بھی شامل کر لی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ بچپن میں پھولوں کی چھڑی نہ مارنے والے والدین جب دیکھتے ہیں کہ اُن کی اولاد اُن کے قد کے برابر ہو گئی ہے تو وہ ایک دم ڈکٹیٹر بن جاتے ہیں۔ اور اولاد کی خواہش کو بچپنا اور جذباتی فیصلہ قرار دیتے ہیں۔"

"مائی سَن! لعن طعن کرنا بڑی نادانی ہے۔ اپنی خامیوں پر غلبہ پانے کے لئے ہمیں عمر درکار ہوتی ہے۔ ایسی صُورت میں کسی کی غلطی پر یہ کہہ کر بڑبڑانا کہ کیوں خُدا نے سب کو یکساں عقل نہ دی بے فائدہ بات ہے۔"

"انکل! آپ شاید میری بات سمجھے نہیں جو کچھ میرے والدین میرے متعلق سوچ رہے ہیں۔ اس کے لئے وہ قصوروار ہیں۔"

"لوگوں کو بُرا کہنے کی بجائے اُن کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور ہم کو یہ معلوم کر لینا چاہیئے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اُن کے اسباب کیا ہیں؟ نکتہ چینی کرنے کی بجائے آدمیوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا زیادہ نفع بخش ہے۔ اس کی بدولت دل سوزی' بردباری اور مہربانی پیدا ہوتی ہے۔ سب کو جاننا دوسرے لفظوں میں سب کو معاف کرنا ہے۔" آفاق احمد جانتے تھے کہ معاذ اس وقت اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ اس لئے وہ نرم لفظوں سے اُسے پہلے ہی اس بات پر آمادہ

کر رہے تھے کہ وہ مزید ٹوٹنے سے پیشتر سنبھل جائے۔ وہ ہر حالت میں اسے ایک مضبوط انسان دیکھنا چاہتے تھے۔

"انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ کے سینے میں جو دل دھڑکتا ہوا دل ہے۔ وہ رحم و کرم سے معمور ہے۔ جس نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ آپ کی عظمتوں کا میں معترف ہوں لیکن انکل! سب آپ کی طرح مضبوط اور اعلیٰ ظرف نہیں ہو سکتے۔

آپ خود سوچیں۔ امی، ابو جانتے ہیں کہ میں اور صبا ایک دوسرے میں انٹرسٹیڈ ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوبیوں اور برائیوں سے آگاہ ہیں۔ ہم دونوں آپس میں سمجھوتہ کر چکے ہیں... تو پھر بھی... مجھے معلوم نہیں تھا کہ والدین اتنے خود غرض ظالم اور انا پرست بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ میں صبا کو پسند کرتا ہوں۔ ان کو علم ہے کہ میری خوشی کا سرچشمہ کہاں ہے؟ انہیں معلوم ہے کہ میں اس بیچاری لڑکی سے خاموش سا وعدہ کر چکا ہوں اور اب یہ چاہتے ہیں بلکہ حکم دے رہے ہیں کہ وہ میری شادی اپنی پسند اور مرضی سے کریں گے۔ امی چھپکے چھپکے لڑکیاں دیکھنے جاتی رہی ہیں اور اب ایک لڑکی انہیں پسند آ گئی ہے اور وہ اس کے لئے مجھے مجبور کر رہی ہیں۔ جب میں نے انکار کیا تو امی نے دھمکی دی کہ میں تمہیں دودھ نہیں بخشوں گی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ذرا سا دودھ جو ماں بچپن میں پلا دیتی ہے۔ اس کا احسان کتنا جتاتی ہے۔ جیسے یہ اس کا کوئی بڑا اعزاز ہو مگر یہ سب قوانین قدرت ہیں۔ ایسی مائیں بھی تو ہیں جو اپنے بچوں کو ایک گھونٹ بھی دودھ نہیں پلاتیں بلکہ اس دودھ کی لذت سے بھی آشنا نہیں کرتیں اور ڈبے کا دودھ پی پی کر بھی وہ بچے شیر جوان بن جاتے ہیں۔ بھلا ان بچوں کی مائیں مرتے وقت انہیں کیا دھمکی دیتی ہوں گی اور ابو جان کو دیکھئے وہ جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ یہ سب لوگ بچوں کو جوانی کے دنوں میں بھی کھلونے دکھا دکھا کر کیوں بہلانا چاہتے ہیں؟ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ہم ان کھلونوں کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ مجھے بڑا مان تھا اپنے والدین پر کہ وہ ضرور اس معاملے میں میری پسند اور رائے کو اہمیت دیں گے لیکن آج پتہ چلا کہ ان کو مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ صرف اپنی بڑائی جتانا چاہتے ہیں۔ بیٹے کی خواہش ان کے نزدیک دیوانے کی بڑ ہے۔

معاذ ہیجانی انداز میں۔ آنکھوں میں جوانی کا جوش لئے بول رہا تھا۔ غصے سے اس کی آنکھوں میں لال ڈورے تیرنے لگے تھے۔ جنہیں دیکھ کر آفاق احمد کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون ہو گیا ہو

"مائی سن! سگمنڈ فرائیڈ کہتا ہے کہ آپ اور ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں، اس کے دو سبب ہیں۔ اول خواہش نفسانی اور پھر ذاتی عظمت کی ہوس۔ انسان مغرور اور متکبر اُس وقت بنتا ہے جب اُس کے پاس اختیار ہوں۔ جب اُسے چند روز کے لئے حکومت مل جائے تو وہ حاکم الحاکمین کے سامنے ایسی چال چلتا ہے کہ جسے دیکھ کر فرشتے بھی کانپ جاتے ہیں۔ اور بیٹا جی! یہ جو ہمارے بزرگ ہوتے ہیں نا، یہ ہمیشہ اپنے چھوٹوں کو اپنا مطیع دیکھنا چاہتے ہیں۔ اولاد سے محبت بھی بہت کرتے ہیں۔ اُس پر مر مٹنے کے لئے ہر وقت تیار بھی رہتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ اُن کی اولاد اُن کے حکم کے بغیر پتا بھی نہ توڑے۔ ہر معاملے میں اُن کی سوچ لے۔ اگر پڑھنا ہے تو اُن کی مرضی سے مضامین کا انتخاب کرے۔ باہر نکلنا ہے تو اُن سے پوچھ کر نکلے۔ دوست بنانا ہے تو اُن کی پسند سے بنائے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو آج کل کے دور میں ضرور والدین کو چھوڑنی چاہئیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ زمانہ بھی تھا جہاں یہ سب ہوتا تھا لیکن ہر دور کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں۔ آج کل کے نوجوان ذرا نازک مزاج واقع ہوئے ہیں۔ وہ اِن چھوٹی چھوٹی بندشوں کا بہت اثر لیتے ہیں اور ڈپریشن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگر دوستانہ رویہ اپنا کر اُن کو شروع سے ہی ذہنی آزادی دے دی جائے تب ہی وہ ذہنی طور پر بالغ ہوں گے۔ وہ اچھے بُرے میں تمیز کر سکیں گے لیکن ہمارے والدین ایسا رویہ اختیار کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں اِس طرح اولاد ہاتھ سے نکل جائے گی۔ وہ اپنی... عظمت اور بڑائی کو بچوں پر مسلط دیکھنا چاہتے ہیں اور اگر کسی موقع پر اُن کی اولاد یہ کہے کہ "آپ کا فیصلہ غلط ہے"۔ تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور بچوں کو "باغی" جیسے القابات دے کر دودھ نہ بخشنے اور عاق کرنے کی دھمکی دیتے ہیں، جب کہ ایسے موقعے پر اُنھیں حکمت عملی سے کام لینا چاہیئے۔

شادی کا معاملہ سراسر لڑکے اور لڑکی کا ذاتی معاملہ ہے۔ والدین کو دیکھنا اور سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے بچے کی پسند کیا ہے؟ وہ اپنے شریکِ حیات میں کیا کیا خوبیاں دیکھنا چاہتا ہے۔ اِن تمام باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر اگر وہ انتخاب کریں تو، نہ بچے کو اختلاف ہوگا اور نہ والدین کی عظمت کو دھچکا پہنچے گا لیکن ہمارے ہاں والدین بچے کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے باوجود بھی اُسے دودھ پیتا بچہ ہی سمجھتے ہیں اور جب اُن کے فیصلے میں اولاد انکار کی گنجائش نکال لے تو وہ ضد میں آ کر وہی کریں گے جس سے اولاد انکار کرتی ہے۔ وہ اِسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ پھر جو نتیجہ نکلتا ہے، وہ کس سے چھپا ہے؟" آفاق احمد آخری جملہ کہتے ہوئے بکھر بکھر گئے۔ محرومیوں کا عکس اُن کی آنکھوں میں آنسو بن کر تیرنے لگا۔

"مجھے معلوم ہے انکل! آپ اندر سے بہت دُکھی اور ٹوٹے ہوئے ہیں۔ آپ نے آج تک مجھے کچھ نہیں بتایا لیکن مجھے آپ نے اتنی محبت اور شفقت دی ہے کہ میں نے آپ کی محبت میں ٹوٹا ہوا عکس بارہا دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے بانو آنٹی اور آپ کی شخصیت میں بے حد تضاد تھا۔ مرے ہوئے انسان کی بُرائی تو نہیں کرنی چاہیئے لیکن امی کہتی ہیں کہ وہ بہت سخت مزاج اور گھمنڈی عورت تھیں۔ اُنھوں نے آپ جیسے انسان کی قدر نہیں کی۔ آپ جتنے نرم خو، شفیق جو اور مخلص تھے وہ بالکل اِس کے برعکس تھیں۔ اور آپ جہاں اتنی قابلیتوں اور علم کا سمندر تھے۔ اس کے برعکس وہ بالکل ایک عام سی اَن پڑھ خاتون تھیں۔ آپ کی عظمتوں کا اندازہ تو اِس بات سے ہی ہو جاتا ہے انکل کہ آپ نے آج تک کسی کے آگے اپنی محرومیوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ بلکہ ہر ممکن طریقے سے اِس رشتے کو نبھایا۔ جب کہ اس کا صلہ آپ کو اس صورت میں ملا کہ آپ آج اتنے بڑے گھر میں بالکل اکیلے رہ رہے ہیں۔" معاذ کا سر اپنے انکل کی عظمتوں کے آگے جُھکا جا رہا تھا۔

"ہاں بیٹے جی! میں اپنی ذاتی محرومیوں کا دُکھڑا کسی اور کے آگے رونا پسند نہیں کرتا۔ یہ بالکل بچوں کی سی بات اور ایک بیہودہ حرکت ہے چونکہ جو ہم چاہتے ہیں اُس سے صرف ہمیں دلچسپی ہے۔ مگر دوسروں کو اس سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔ یوں تو ہم سب ایک جیسے ہی ہیں۔ مگر ہم اُسی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ جن کی ہمیں ضرورت ہے۔ کامیابی... حاصل کرنے کی اگر کوئی کلید ہے تو دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور اس کے اور اپنے زاویہ نظر سے جُملہ حالات پر غور کرنے کی قابلیت پیدا کرنا پڑتی ہے۔ اگر ہم مخلص لوگوں پر اثر ڈالنے اور اُن سے ہمدردیاں حاصل... کرنے کے لئے اپنے لئے دلچسپی پیدا کر لیں تو ہمیں کبھی بھی وفا شعار، جانثار، خیر خواہ اور صادق دوست ملنا ممکن نہیں۔

میں نے اپنی زندگی جس طرح گزاری، میرے ساتھ جو جو المیے... ہوئے ان سے صرف مجھے واسطہ ہے۔ اُس غم کے محسوسات صرف میرے ساتھ وابستہ ہیں۔ اگر میں ہر ایک سے کہتا پھروں تو لوگ میرے ساتھ زبانی ہمدردی ضرور کریں گے لیکن مجھے اُس ہمدردی سے کیا حاصل ہوگا۔ ہمدردی کے چند بول میری زندگی نہیں بدل سکتے۔ میری وہ تمنائیں اور آرزوئیں جو وقت کے ہاتھوں... مر مٹ گئیں۔ زندہ تو نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ مردہ ماضی کو ماضی میں ہی... دفن کر دیں اور زندہ چیزوں میں دلچسپی لیں۔" آفاق احمد نے مُسکرا کر اپنا ہاتھ معاذ کے کندھے پر رکھ دیا۔"

"انکل جانی! آپ بہت عظیم اور اعلیٰ ظرف انسان ہیں۔ کاش کہ میں بھی آپ جیسا ہی ہوتا لیکن بدقسمتی سے میں ہر معاملے میں شدت

نہ واقع ہوا ہوں، خواہ وہ معاملہ خواہش کا ہو، کوئی شوق ہو، محبت... بعد ازاں حتیٰ کہ نفرت ہی کیوں نہ ہو۔ میری انتہا پسندی انتہا پر ہوتی ہے لیکن جہاں تک صبا کا تعلق ہے تو میں نے بلکہ ہم نے یہ فیصلہ... بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے کہ ہم ایک بھرپور اور کامیاب ازدواجی زندگی گزار سکتے ہیں۔ میں یقیناً لاڈ پیار سے بگڑا ہوا نوجوان ہوں لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ صبا میں وہ خوبی ہے کہ وہ میری چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو اس طرح معاف کر سکتی ہے۔ جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو کبھی پر ظاہر نہیں کرتی اور ہر مرد کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اسے ایسی بیوی ملے جو ماں کی طرح شفیق اور محمل ہو۔ شوہر تھکا ہارا آئے تو وہ ماں کی طرح اُسے اپنی محبت بھری باہوں میں سمیٹ لے۔ وہ رُوٹھے تو اُسے منائے، وہ ضد کرے تو اُس کی ضد پوری کرے، اُسے پیار بھری لوری دے کر سلائے، اُس کے ماننوں کو کسی دوسرے پر آشکارا نہ کرے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو در گزر کرے، جس طرح ایک ماں اپنے بچے کے چہرے سے اُس کے دل کا اندازہ لگا لیتی ہے اور بچہ لفظوں کے ہیر پھیر میں نہیں اُلجھتا، اسی طرح بیوی بھی...“

”بیٹے جان! کیا یہ ساری خوبیاں صرف بیوی میں ہی ہوں، مرد ان سے بری الذمہ ہیں؟“ آفاق احمد نے مُسکرا کر معاذ کو ٹوکا۔

”نہ... نہیں بالکل نہیں انکل! دونوں کو ایک دوسرے کی خوبیوں اور بُرائیوں سے سمجھوتہ کرنا چاہیئے۔ مجھے وہ لوگ پسند نہیں جو اپنے عزیزوں، دوستوں میں بیٹھ کر اپنی رفیق زندگی کی عیب جوئی اور نکتہ چینی کرتے ہیں اور ان کی خانہ داری اور پکوانوں کا تقابل اپنی والدہ یا کسی اور خاتون کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ دوستوں کے ساتھ تو رات ایک ایک بجے تک گپ شپ لگاتے ہیں اور گھر آتے ہی اُن پر تھکاوٹ اور بیزاری طاری ہو جاتی ہے۔ وہ عورت جو پورا دن اُن کے گھر اور بچوں کی حفاظت کرتی ہے۔ اُس کے لئے اِس کے پاس وقت نہیں ہوتا اور اگر بیوی اپنی زبان سے کبھی یہ کہہ دے کہ اُسے سیر و تفریح کی ضرورت ہے تو اُسے یہ کہہ کر ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ ”سارا دن تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے کام کروں اور شام کو بھی تمہاری ہی جی حضوری کے لئے کمر بستہ رہوں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔“ میرا تو خیال ہے کہ ایسے مرد کو شادی کرنی ہی نہیں چاہیئے جو اپنے کام کو مصیبت سمجھتا ہے۔ اور اپنی برتری کا احساس اِس طرح دلاتا ہے کہ ”سارا کچھ تمہارے لئے کرتا ہوں۔“ یہ تو عورت پر جیسے احسان ہوا۔ ایسا مرد کبھی بھی بیوی سے مخلص نہیں ہو سکتا۔ وہ عورت جو بیوی بن کر ہمارے پاس آتی ہے۔ وہ صرف ہمارے لئے ہوتی ہے ہماری مضبوط باہوں کے سہارے جینا چاہتی ہے۔ اُس پر احسان جتا کر ہم اُس کی ذات کی نفی کرتے ہیں۔ جس سے وہ ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ مردوں کو چاہیئے کہ سچے دل سے اُس کی قدردانی کریں۔ بدگمانی کے زہریلے ناگوں سے اپنی ازدواجی زندگی کو بچائیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ پہلے ہی ان دونوں فریقوں میں یہ طے پا جانا چاہیئے کہ سماج کی نظروں میں ہم جس طرح ایک ہوئے ہیں۔ اُسی طرح اپنے دل و نظر میں بھی ایک رہیں گے۔ دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہونے دیں گے۔ ایک دوسرے کی ذات پر مکمل بھروسہ ہی زندگی کو خوشگوار بنا سکتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دونوں کو خوش خلق ہونا چاہیئے۔ ازدواجی... زندگی کے لئے خوش اخلاقی کی اتنی ہی شدید ضرورت ہے جتنی موٹر کار کے لئے پٹرول کی۔“

”بالکل! بہت خوبصورت بات کی تم نے۔ اور سُنو میں نے بھی ایک جگہ پڑھا تھا کہ اگر دُلہا کو شیرینی گفتاری نہ آتی ہو تو ہرگز اُس سے شادی نہیں کرنی چاہیئے۔“

”میری طبیعت سے تو آپ واقف ہی ہیں انکل! کیسا خوش مزاج ہوں؟“ معاذ نے مُسکرا کر آفاق احمد کی طرف دیکھا۔ جن کے لب مُسکرا رہے تھے۔

”میں تمہاری سب باتوں سے متفق ہوں جان انکل! تمہاری سوچ بہت خوبصورت اور مثبت ہے تم حقیقت پسند ہو۔ اور مجھے بھی سچی اور کھری باتیں اچھی لگتی ہیں۔ جو کچھ تم نے کہا اُس کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ زندگی کا کوئی بھی نظریہ کوئی فلسفہ حیات اُس وقت تک کامیاب نہیں سمجھا جاتا۔ جب تک کہ اِس میں خارجی حقائق اور داخلی سچائی، دُھوپ چھاؤں کی مانند ملی جُلی نہ ہو۔ آسمان پرستاروں کی جگہ اپنے خواب ٹانک دینا اور اُن کے سہارے زندگی بسر کرنے کا خیال... ہے تو بڑا نازک مگر خطرناک بھی تو ہے۔ بڑی ٹھوکریں لگتی ہیں۔ اس سے تو اچھا ہے انسان کو نازک خیالی سے سابقہ نہ پڑے۔ کھاتے پیتے، ہنستے اور کھیلتے آدمی کی زندگی کٹ جائے... کیوں؟“ آفاق احمد نے آخری جملہ کہتے ہوئے شوخی سے کھوئے کھوئے معاذ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہاں انکل! ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ اِنسان کو خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں۔ کون ساری عمر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتا رہے۔ یہ دُنیا اور اِس کے لوگ بہت ظالم ہیں“ معاذ کی ہمت جواب دینے لگی۔

”ارے، ارے... معاذ جان! منزل کے قریب آ کر تمہیں سراب کا گمان کیونکر ہوا؟ واپس کیوں لوٹ رہے ہو؟ اگر تم ابھی سے حالات کے آگے جھک گئے تو صبا تمہاری شخصیت پر آئندہ کبھی اعتماد نہیں،

کر سکے گی۔ مردوں والا حوصلہ پیدا کرو، عورتوں کی طرح نخرے مت کرو۔ مرد جو فیصلہ کرتا ہے۔ اُس پر عمل بھی کرتا ہے۔"

"انکل! جو حالات والدین نے پیدا کر دیئے ہیں۔ اُس صورت میں یہ سب ناممکن لگتا ہے۔ شاید میں اُن کی خواہشوں کے آگے مجبور ہو جاؤں۔" معاذ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا وہ بہت دل گرفتہ اور مایوس لگ رہا تھا۔

"بیٹا جی! تم کو یہ جان لینا چاہیئے کہ ہم کو جیسا ہونا چاہیئے۔ اُس کے لئے ہم نیم بیدار ہیں۔ ہم اپنی قوتِ جسمانی اور دماغ سے بہت ہی کم کام لیتے ہیں۔ زیادہ صاف اور واضح طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان بالکل گئی گزری حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ حالانکہ اِس میں ہر قسم کی قابلیت اور صلاحیت موجود ہے لیکن اُس سے کام لینے میں اپنی طبعی کمزوری کے باعث وہ ناکام ہے۔ جانِ انکل بہت سا فاصلہ تو طے ہو گیا ہے۔ مغائرت کا صحرا سمٹ کر بس ایک نقطہ رہ گیا ہے۔ پھر قُرب کی منزل ہے۔ ایک قدم اور اُٹھاؤ۔۔ راستے جگمگا اُٹھیں گے اور تمہارے دل سے اندوہ نارسائی کی گرد ڈھل جائے گی۔"

"وہ کیسے انکل۔۔۔؟" معاذ چونک کر سیدھا ہو گیا۔

"ایسے میری جان کہ تم دِل میں نااُمیدی کی بجائے۔ اُمید کو جگہ دو۔ عقل مند اِنسان وہ ہے جو اپنے سابقہ تجربوں سے کچھ سیکھے میرے تجربے نے مجھے وہ کچھ سمجھا دیا ہے جو میں آج کرنے جا رہا ہوں۔ بار بار غلط فیصلے کرنا عقلمندی کی پہچان نہیں ہے۔ میں آج ایک پُرخلوص باپ بن کر اپنے بیٹے کی خواہش پوری کروں گا۔ اور بیٹے کی خواہش میں باپ کی مرضی کا دخل بھی ہو گا۔"

"لیکن انکل، وہ ممی۔۔۔ ڈیڈی۔۔۔" معاذ گھبرا گیا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا تم گھر جاؤ۔ میں صبح آؤں گا تمہاری۔۔۔ طرف، تم بالکل فکرمند نہ ہونا۔ ایک دوست کی موجودگی میں پریشان نہیں ہوا کرتے۔" آفاق احمد نے معاذ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔ اور معاذ ممنونیت سے اُنھیں دیکھتا ہوا خُدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

معاذ کے جانے کے بعد آفاق احمد نے باہر دیکھا تو سرمئی شام سیاہ رات میں ڈھل چکی تھی۔ کہرا گرنے لگا تھا۔ بڑی تاثرانگیز رات تھی۔ وہ خود کو بہت تھکا تھکا محسوس کر رہے تھے۔ آج اُن کا دِل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ اُداسیاں اُن کے وجود پر مسلط ہونے لگیں تو وہ بغیر کچھ کھائے پیئے اپنے بیڈ رُوم میں آ گئے۔ لائٹ آف کر کے جب سونے کی کوشش کی تو یادیں دل کے دریچوں پر دستک دینے لگیں۔

"ارے کوئی ہے؟"

آفاق احمد نے اِن آوازوں سے پیچھا چھڑانا چاہا لیکن آوازیں لمحہ بہ لمحہ تیز ہونے لگیں۔

"ارے کوئی ہے؟"

تیز ہوا کا جھونکا دل کے کواڑ کھول چکا تھا۔ یادوں کی وادیوں میں آندھیاں چلنے لگی تھیں۔

آفاق احمد نے تھک کر دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔

"بے فائدہ ہے۔۔۔ آج نیند ہرگز نہیں آئے گی۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے پاؤں کی کڑیاں گننے لگے۔

ویرانیاں زندگی میں سنگ میل بنتی ہیں۔ ویرانیاں جو رُوح کی ظلمتوں کو ایک نئے نور سے معمور کرتی ہیں۔ تب دل کا اندھیرا ہولے ہولے غائب ہو جاتا ہے۔ جھلسی ہوئی چٹانوں میں، رنگین پھول کھلتے ہیں۔ تپتی ہوئی فضا خنک عطر بیز جھونکے لاتی ہے اور ابدی خاموشیاں نئی نئی راگنیوں سے گونج اُٹھتی ہیں۔ تب انسان اپنے آپ سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اس کے دل کے نہاں خانوں سے وہ راز نکلتے ہیں۔ جو مدتوں سے مدفون ہوں۔

اور آج وہ بھی سوچ رہے تھے کہ یہ کون ہے؟ جو سائے کی طرح میرے پاس سے گزر رہا ہے۔

کبھی پاس سے، کبھی دُور سے۔

یہ کون ہے جو مجھے میری تنہائی کا احساس دِلا رہا ہے اور پھر۔۔۔ مجھ میں ایک خالی پن چھوڑ جاتا ہے۔

میں اُسے دیکھنا اور جاننا چاہتا ہوں۔

اُس کے قدموں کی آہٹ سنتا ہوں، دیکھتا ہوں اور پھر تصویر بن جاتا ہوں۔

یہ آج رات کِس کا آنچل میرے چہرے پر لہرا رہا ہے۔ یہ میری سانسوں سے کِس کی خوشبو آ رہی ہے؟ یہ کون مجھ پر برسات کی خوشبو کی طرح چھا رہا ہے۔

اوہ۔۔۔ تو صبوحہ علی یہ تم ہو؟

تم صبوحہ علی تم ہر لمحہ میرے ساتھ ہو۔ تمہیں ہر دھڑکن میں یاد کر رہا ہوں۔

جی چاہتا ہے تمہیں سب کچھ کہہ دوں کہ یہ بیقراری یہ بے چینی کاہے کی ہے۔

تم ہر خواب میں تمام رات میرے ساتھ ہو۔ میں نے تمہیں بارہا اپنے ساتھ دیکھا۔ کبھی شبنم سے بھیگی گھاس پر، کبھی ساحل کی گیلی ریت پر قدموں کے نشان بناتے ہوئے۔ تب جی چاہتا ہے اِس رات کی پو

کبھی نہ چھٹے، صبح کبھی نہ ہو۔ مگر پھر صبح ہوگی، رات کا اسی شدت سے انتظار کرتا ہوں۔ کم از کم میرے خوابوں میں تو تم ہو۔ میرا شدت سے جی چاہتا ہے، ہمارے قدم ایک ساتھ اٹھیں، ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ہم تمام عمر چلتے رہیں۔ ہمارے دل ایک ہی تال پر دھڑکیں۔ کبھی کھلے بادبان کے ہمراہ پُرسکون نیلے سمندر میں۔

تمھیں یاد ہے صبوحہ علی! ایک دفعہ ہم نے کہا تھا کہ فاصلے جب ذہنی ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کے قریب ہونے کے باوجود ہم کوسوں دور ہوتے ہیں لیکن جسمانی فاصلے ذہنی قربتوں کو کبھی ختم نہیں کرسکتے۔ اور پھر ہماری تو ذہنی قربتیں ہیں۔ جو سدا رہیں گی۔ ہم نے تو کبھی بھی... جسموں کے سہارے ایک دوسرے کو جیتنے کی کوشش نہیں کی اور جب تک ہم میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے ہم نزدیک ہی رہیں گے۔

لیکن صبوحہ علی! آج زندگی کے اتنے برس گزر جانے کے بعد مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ہمارا فلسفہ کتنا غلط تھا۔ بلکہ اب تو مجھے اس فلسفے سے بھی خوف آرہا ہے۔ بلکہ جدائی کا وہ دکھ جسے میں بہت سہل اور آسان سمجھتا تھا۔ بہت کٹھن اور صبر آزما تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں دوسروں کی خواہشات تلے کچل کچل کر بھی زندہ ہوں لیکن ایسی زندگی جسے میں اپنی مرضی سے نہیں گزار پایا اور آج تنہائی نے اِن جان لیوا لمحوں میں۔ اپنی المیہ زندگی کے اس دور میں مجھے تمہاری کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ جسمانی فاصلے ہماری ذہنی قربتوں پر حاوی ہو رہے ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ کاش ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے۔ یہ جدائیاں ہماری اپنی نادانی کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ ہماری انفرادی سوچ نے ہمیں کچھ نہیں دیا۔ سوائے پچھتاوں اور غموں کے۔

آفاق احمد اپنے دو بھائیوں حامد احمد اور اشفاق احمد سے بڑے تھے۔ اُن کے گھر کا ماحول اتنا پاکیزہ اور منفرد تھا کہ وہ والدین کے چہیتے اور لاڈلے ہونے کے باوجود بھی بااخلاق اور ذہین تھے۔ ان کا اخلاق بے مثال اور پاکیزہ کردار اُن کی اعلیٰ تعلیم اور نیک فطرت کا مرہونِ منت تھا۔ یونیورسٹی سے ایم۔اے اکنامکس میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے کے بعد انھوں نے آکسفورڈ جانے کا پروگرام بنالیا تو ان کے والد جنہیں وہ آغا جان کہتے تھے۔ وسوسوں میں گھر گئے۔ انھیں یہ خوف دامن گیر تھا کہ ان کا باکردار بیٹا بہت نفیس ذہن کا مالک ہے۔ کہیں وہاں کی چنچل تتلیاں انھیں بے نہ اڑیں۔ جب آغا جان نے اپنے اندیشوں کا اظہار آفاق احمد سے کیا تو انھوں نے تڑپ کر جواب دیا۔

"آغا جان! خاندان کی شرافت اور روایتی جفاکشی کبھی مجھے وہ پھل کھانے کی اجازت نہ دے گی جو خود ٹوٹ کر میری گود میں گرے۔ میں ایسی چٹان ہوں جس میں بڑے سے بڑا طوفان بھی دراڑ نہیں ڈال سکتا۔ فرنگیوں کے ڈھائے ہوئے ستم اور ظالم سے میری مادرِ وطن کا سینا ابھی تک چھلنی ہے۔ غیرت مند قوموں کے سینے پر لگے ہوئے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے۔ چاہے اُن کے نشان تک مٹ جائیں۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ میں وہاں سے صرف اعلیٰ تعلیم کے بیش قیمت خزانے لے کر لوٹوں گا۔"

اور پھر گوروں کے دیس آکر بھی حسن، آزادی اور دولت کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو تمام مروجہ برائیوں سے پاک رکھا۔ جو ماں... انگلستان کی نیلی آنکھوں اور مست چال بھی اُن کے قدم نہ ڈگمگا سکی۔ وہ اپنے کردار کی اِن ساری خوبصورتیوں کے لئے اُس ماورائی ہستی کے احسان مند تھے جو جانے کب آپ ہی آپ مسند دل پر جلوہ افروز ہوگئی تھی۔ اُن کی تمام تر رومانی قوتیں ساری چیزوں کے آگے رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔

بے پناہ وجاہت اور بے نظیر کردار کی بدولت جلد ہی معروف ہوگئے۔ اُن کی بے نیازی نے اُن کی کشش کو دوچند کردیا۔

اُن کے دوست اُن کی اِس طرح لئے دیئے رہنے والی شخصیت کو دیکھ کر اکثر انھیں اِس شعر سے چھیڑتے کہ...

میں ولی سمجھوں گا اِس انسان پختہ ظرف کو
جس کا سالم رہ گیا ایمان انگلستان میں

لیکن وہ خود سمجھتے تھے اُن کی شخصیت کی بنیادیں اتنی کمزور نہیں ہیں جو دوسروں کے تابع کردیتے۔ اُن کی شخصیت پر اپنے والد کا بہت اثر تھا۔ آغا جان بہت بااصول اور صاحب کردار انسان تھے وہ وقتاً فوقتاً زندگی کے اہم اصولوں سے آفاق احمد کو روشناس کرواتے رہتے تھے۔ وہ کبھی بیٹے کو نصیحتیں نہیں کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اپنے ذاتی تجربے بیان کرنے والے بزرگ کو نئی نسل کے بچے پسند نہیں کرتے۔ وہ زمانہ شناس تھے۔ اُن کی باتیں ایسی نہ تھیں جو زندگی کے مختلف موڑ پر آفاق احمد کی راہنمائی نہ کرتیں۔ انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ کوئی کام اِس وجہ سے نہیں کرنا چاہیئے کہ ہمارے دوست ہمیں طعنے دیتے ہیں یا ہماری مردانگی کو جگاتے ہیں۔ کچھ چیزیں ہماری فطرت کی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ جن میں عورت بھی شامل ہے اور اپنے آپ کو طاقت ور ظاہر کرنے کے لئے کمزوریوں کی پناہ لینا کوئی عقلمندی نہیں۔ جب آدمی اپنی کمزوریوں کی نفی کرتا ہے اور اپنے دوستوں کے آگے انکار کردیتا ہے تو وہ ان ہی دوستوں میں ممتاز اور منفرد ہوجاتا ہے۔ اور اپنی نظر میں بھی اُس کا مقام اونچا ہوجاتا ہے۔

اور یہی ہوا۔ آفاق احمد کے دوست ہر نیلی آنکھوں والی لڑکی کو

دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کرتے، اُن کا اشارہ آفاق احمد کی طرف ہی ہوتا کہ شاید آفاق کسی وقت کسی کمزور لمحے کی ندمیں آجائیں لیکن آفاق احمد اُن کا اشارہ بھانپ کر انتہائی اطمینان، تمکنت اور غرور سے وہاں سے اُٹھ کر چل دیتے۔ جیسے انھیں اِس گوری چمڑی سے کوئی واسطہ نہیں اور اُن کا یہی غرور اُن کی شخصیت کو سب سے منفرد اور ممتاز کر گیا۔

ہر انسان کی زندگی میں کچھ ایسے ڈرامائی لمحات بھی آتے ہیں جب تمام تخمینے، اندازے، پروگرام ایک لمحے میں تہہ و بالا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جنوبی ہوائیں شمال کا رُخ اختیار کر لیتی ہیں اور بلند و بالا چوٹیاں آناً فاناً خلا کے مہیب اندھیروں میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں اور کچھ اسی قسم کے لمحات آفاق احمد کی زندگی میں بھی آگئے اور وہ کسی گوری کے دمکتے چہرے کو سراہنے کی بجائے، اپنے دیس کی ایک نمکین سی لڑکی کے آگے ہار گئے لیکن اس ہار میں بھی ان کا غرور شامل تھا کہ اپنے دیس کی مٹی کا ذرہ بھی اُن کے آگے بہت باوقعت تھا۔ وہ آفاق احمد کے ساتھ ایک دن لائبریری جاتے ہوئے ٹکرا گئی تھی۔ آفاق احمد بُری طرح نروس ہو گئے کیونکہ وہ لڑکیوں سے بے پناہ کتراتے تھے لیکن وہ مُسکرائی۔

آفاق احمد معذرت کے لئے الفاظ ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ وہ "سوری" کہہ کر گری ہوئی کتابیں اُٹھانے لگی۔

"تھینک یو مس ... آپ نے میری مشکل آسان کر دی۔ ورنہ میں ابھی معذرت کے لئے مناسب الفاظ ہی سوچ رہا تھا۔"

"مشکل کیسی؟ میں خود اِن روائتی جملوں کو اہمیت نہیں دیتی۔ اصل چیز تو چہرے کا خلوص ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

آفاق احمد کو یوں محسوس ہُوا جیسے ایک ساتھ کئی جھرنے بہہ رہے ہوں۔ وہ آفاق احمد کو دوسری تمام لڑکیوں سے بالکل مختلف لگی۔ اُس کے متناسب جسم اور نازک سی کمر پر ساڑھی بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ آفاق احمد کو شاید اس سے پہلے کبھی احساس ہی نہیں تھا کہ لڑکیاں ساڑھی میں کیسی لگتی ہیں لیکن اِس لڑکی کو نفیس سی ساڑھی میں دیکھ کر انھیں یوں محسوس ہُوا کہ ساڑھی کے علاوہ اور کوئی خوبصورت پیرہن ہی نہیں ہے۔

"مجھے آفاق احمد کہتے ہیں۔ کراچی کا رہنے والا ہوں۔" جانے کیسے آفاق احمد کے مُنہ سے نکل گیا۔

"مجھے صبوحہ علی کہتے ہیں۔ میں حال ہی میں آئی ہوں راولپنڈی پاکستان سے۔"

"کیا آپ یہاں پڑھتی ہیں؟" آفاق احمد نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل..." صبوحہ علی نے اعتماد سے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ مسلمان لڑکیاں باہر بہت کم ہی آتی ہیں پڑھنے کے لئے۔"

"اب آپ کی حیرانی ختم ہو جانی چاہیئے۔" صبوحہ نے شوخی سے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ ہنسی تو آفاق احمد کو یوں محسوس ہُوا۔ جیسے ساری کائنات نغمہ بار ہو گئی ہو۔ اِس ملاقات سے وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد متاثر ہوئے اور اس لئے آئندہ ملنے کی راہیں اُن پر کُھل گئیں۔ آفاق احمد کے دوست حیران تھے کہ سفید مہکتی ہوئی لڑکیوں کو چھوڑ کر اُنھوں نے ایک نمکین سی لڑکی کو اہمیت دی جو بے حد مغرور بھی ہے۔ لیکن آفاق احمد سوچتے کہ حسین لڑکیوں کا یہی غرور اُن کے حُسن کی حفاظت کرتا ہے۔ اچھوتی اور پاکیزہ لڑکیاں اپنے حُسن کی حفاظت اس طرح سے نہ کریں تو راہ چلتے ڈاکو ان خزانوں کو نقب لگانے سے گریز نہ کریں۔ اُس کا مغرور رویّہ بالکل بجا ہے۔

وہ پہلا احساس جو شعلۂ شہاب کی طرح لپکا تھا۔ اُس نے اُنھیں سمجھا دیا تھا کہ اُن دونوں میں بہت زیادہ ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اور اس ذہنی ہم آہنگی نے اُنھیں سمجھا دیا کہ ایک ساتھ رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے بات نہ کریں تو اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یعنی دونوں میں ذہنی ہم آہنگی اور ابلاغ۔ اس قدر گہرا ہے کہ وہ صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی ابلاغ کر لیتے تھے اور ایسے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب ذہنی رفاقت میسّر ہو تو لفظوں کے بغیر بھی بہت کچھ کہا اور سُنا جا سکتا ہے۔ صرف ایک نظر دیکھ لینا کافی ہے لیکن اس کے باوجود بھی آفاق احمد چاہتے تھے۔ لفظوں کا سہارا لے کر ایک دوسرے سے کُھل کر بات کر لی جائے۔

"تو پھر کیا سوچا آپ نے میرے بارے میں صبوحہ علی؟"

"کیا یہ دُنیا کا واحد مسئلہ ہے آفاق احمد؟" صبوحہ شوخی سے مُسکرائی۔ وہ سمجھتی تھی کہ آفاق احمد جیسے نفیس اور آئیڈیل شخص کو ستانا زیادتی ہے لیکن ذہنی قُربت کے سبب وہ اُن پر اپنا حق سمجھتی تھی۔ اس لئے وہ شوخی سے باز نہ آئی۔

"کیا اِنسان کا اپنی زندگی کی سنجیدہ ترین حقیقت کے بارے میں سوچنا فضول اور ناپسندیدہ امر ہے؟" آفاق احمد نے تیکھے لہجے میں پُوچھا۔

"آفاق احمد! دراصل زندگی اتنی گنجلک، اتنی مصروف اور غیر منطقی ہو گئی ہے کہ اِنسان اِن فضولیات کے لئے وقت ہی نہیں نکال سکتا۔ زندگی کی تیز رفتاری کا تو یہ عالم ہے کہ جتنے عرصے میں ہم ایک دوسرے کو "ہیلو" کہتے ہیں، ایک راکٹ زمین کے گرد آدھا چکر لگا لیتا ہے۔ یہ محبت اُس زمانے تک تو ٹھیک تھی جب لوگوں کو طویل فرصتیں میسّر تھیں۔ اِن فرصتوں میں شاعر اور عاشق حضرات چاند کو دیکھ کر محبوب کے فراق

ٹھنڈی آہیں بھرا کرتے تھے۔ اور اب جب کہ چاند ایک ٹھنڈی اور بن ثابت ہو چکا ہے تو شاعروں کی ساری نازک خیالی بھی دم توڑ رہی ہے۔ کچھ عرصہ بعد ہم بھی چاند پر پہنچ جائیں گے۔ تب شاعری بالکل ہی ہو جائے گی۔"

آفاق احمد کچھ یوں تک رہا تھا کہ جیسے صدافکن کی دلیل "اکھو" لے نہیں ستانے کی قسم کھائی ہو۔

"آپ نے فزیالوجی پڑھی ہے؟" آفاق نے اچانک سوال کیا۔

"جی...!" صبوحہ علی کچھ نہ سمجھتے ہوئے گویا ہوئی۔

"تو کیا آپ اس چیز پر یقین رکھتی ہیں کہ انسان کے سینے میں دھڑکنوں سے بھرپور ایک دل ہوتا ہے؟"

"لیکن یہ بھی تو میں نے پڑھا ہے کہ انسان کے سر میں عقل و دانش سے بھرپور ایک دماغ بھی ہوتا ہے۔" صبوحہ علی نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے بمشکل کہا۔

"صبوحہ علی! آپ کی یہی ذہانت اور حاضر جوابی مجھے پسند ہے۔" آفاق احمد نے نرم لہجے میں کہا۔

"لوگ تو مجھے مغرور سمجھتے ہیں۔" صبوحہ علی شوخی سے بولی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" آفاق احمد مسکرا کر بولے۔

"تو کیا آپ بھی مجھے مغرور سمجھتے ہیں آفاق احمد؟" صبوحہ علی یونانی دیویوں کی سی اونچی ناک کو غصے سے سکوڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بالکل... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر میں آپ کو مغرور سمجھتا تھا لیکن اب پتہ چلا کہ آپ معصوم بھی بہت ہیں۔ اور جب یہ دونوں باتیں مل جائیں تو نسوانیت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ آپ واقعی اچھوتی ہیں۔ نسوانیت کا نازک سا تغیر اور یہ نازک نازک سی لڑکیاں ہم جیسے مردوں کو کتنی جلدی اور غیر متوقع طور پر پگھلا دیتی ہیں۔ آپ نے میرے دل میں جیتی رندیں جگائی ہیں۔ مجھے اُن کا تصور کرنا بھی نہیں آتا۔ لیکن اگر کسی جذبے کا جامع اور مکمل اظہار نہ کیا جا سکے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔"

"ہاں جی اور جو لوگ دل کی کہانیاں با آواز بلند سناتے ہیں۔ انھیں جذبات کی لطافت و نزاکت کا عرفان نہیں ہوتا محبت کا لفظ ایسے بھی آج کل بہت بے آبرو ہو گیا ہے۔ محبت کی بساط ہی کتنی ہے اور آج کل تو یہ اعتیادی جذبہ بن گیا ہے۔ جو ہر چوبیس گھنٹے بعد دم توڑ دیتا ہے یا بیزاری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔"

"آپ تو انسانی فطرت کو سمجھنے میں مہارت رکھتی ہیں صبوحہ علی! پھر آپ یہ بھی جانتی ہوں گی کہ ہر انسان کے اندر ایک جذبہ ہوتا ہے۔ جستجو کا ناممکن کو ممکن بنانے کا، اَن دیکھے خطرات مول لینے کا۔ اسی جذبے کے تحت انسان پہاڑوں کو سر کرتا ہے۔ سمندروں کی گہرائی میں غوطے لگاتا ہے۔ لق و دق صحرا اور جنگلوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ میں نے اسی جذبے کے تحت آپ کو چاہا ہے۔ مجھے اس شخصیت کی کھوج تھی۔ جو میرے جذبوں کو سمجھ سکے۔ میرے لوح دل پہ لکھے حروف کو پڑھ سکے۔ یہی جذبہ مجھے آپ کے قریب لے آیا۔ مجھے آپ میں وہی عظمت اور بلندی نظر آئی جو کسی کوہ پیما کو ماؤنٹ ایورسٹ میں نظر آتی ہے اور پھر جو اسے اُس چوٹی کو سر کرنے پر اکساتی ہے۔ صبوحہ علی! یوں تو آپ روئی کے گالے کی طرح ہلکی پھلکی ہیں لیکن میرے سینے پر چٹان بن کر بیٹھی ہیں۔ میری رضا آپ کا غرور بن گئی ہے۔"

"مگر تم نے اس کی نوبت ہی کیوں آنے دی۔ تمھاری ساتھوں نے ہی تو مجھے سرکش بنا دیا ہے۔ تم اپنے سینے پر دھرے میرے وجود کا شکوہ مجھ سے کیوں کرتے ہو۔ خود کیوں نہیں اس لطیف بوجھ کو اٹھا کر اپنے دل کے اندر رکھ لیتے۔ ہنسے ہلکے ہو جاؤ گے۔"

"وہ کیسے صبوحہ علی؟" آفاق احمد صبوحہ کے "آپ" سے "تم" پر آجانے سے حیران ہو کر بیوقوفوں کی طرح پوچھ رہے تھے۔

"تم جو اتنے فاصلوں سے مجھے آواز دے رہے ہو آفاق احمد! میرے قریب آنے کی اجازت طلب کر رہے ہو۔ یہی بات مجھے کھٹکتی ہے۔ یہ اجنبیوں کی طرح فاصلوں میں کھوئے کیوں بیٹھے ہو؟ میرے مقابل آ کر کھڑے ہو جاؤ۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو۔ اگر تمھیں خود پر... اپنے جذبوں پر اعتماد ہے تو اس کے گداز سے مجھے پگھلاؤ۔ مجھ سے اتنے احترام سے بات نہ کرو۔ یہ مؤدب لہجہ مجھے تم سے دور لے جاتا ہے۔ مجھ پر حق جماؤ، پیار کے اس بھرپور انداز میں اپنائیت کا کیا نشہ ہے، کتنی لذت آمیز سرشاری ہے تمھیں اندازہ ہی نہیں آفاق احمد۔"

"بڑی خراب ہو تم۔" خوشی اور جوش مسرت سے آفاق احمد نے بے خبری میں آپ سے "تم" کا فاصلہ ایک جست میں طے کر لیا اور اس کے بیچ کی ساری منزلیں غائب ہو گئیں۔

"دل کی کہانی سننے کے لئے تو عمر بھر کا ساتھ چاہیئے اور تم لمحوں کی پرستار بنی بیٹھی ہو۔"

"انسان بڑا خود غرض ہے صبوحہ علی! میں بھی انسان ہوں۔ میں بھی خود غرض ہوں اور تمھاری ساری نزاکتوں سے اپنی چاہتوں کی تکمیل چاہتا ہوں۔ تمھیں میرا ساتھ دینا ہے۔ آگے بڑھ کر میری پذیرائی کرنی ہے۔ کیونکہ یہ میرا حق ہے۔"

آفاق احمد نے بڑھ کر بڑے تیقن سے اُس کے ہاتھ تھام لئے۔

"آفاق احمد! میں عورت ہوں، میری فطرت میں محکومی ہے

آج مجھے بڑا سکون ملا ہے کہ تم مجھ پہ حکومت کر سکتے ہو۔ تم مجھ سے برتر ہو۔ اور عورت ایک برتر مرد کو پسند کرتی ہے جو اُس کی حفاظت کر سکے۔ میں جو محبت میں سپردگی کی قائل ہوں، چاہتی ہوں کہ جس سے پیار کروں، اُس سے ڈروں بھی۔ وہ مجھے ڈانٹ سکے کہ اُسی میں بلندی ہے۔ تو پھر تم کیا جانو آفاق، سر خم کرنے میں بڑی لذت ہے۔

تم... میں صبوحہ علی! اپنی پہلی محبت کا سر خم کرتی ہوں۔ تم میری زندگی کی دھڑکن ہو۔ میرا اپنا آپ ہو۔ میں تمہیں پا کر ہی مکمل ہو سکتی ہوں۔"

"صبوحہ علی!" آفاق احمد نے بڑھ کر اُس کے جھکے ہوئے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"ہٹو آفاق احمد!" اُس نے گلال چہرے کو پرے ہٹا لیا۔ "اب تم جاؤ۔"

"ارے بھئی کہاں چلا جاؤں؟ کمال ہے، ابھی ابھی تو خانۂ دل میں سیٹ ریزرو کروائی ہے۔ ایک زمانے کے بعد اتنی جلدی کیسے چھوڑ دوں؟ کچھ ایڈوانس بھی چاہیے تمہیں؟" اب آفاق احمد شوخی پر آمادہ تھے۔

"شرم نہیں آتی؟" وہ سمٹ کر چھوئی موئی بن گئی۔

"نہیں، بالکل نہیں۔" آفاق احمد نے بے باکی سے کہا اور پھر اُس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر گنگنانے لگے۔

ہمیں ہے شوق کہ جی بھر کے تم کو دیکھیں گے
تمہیں ہے شرم تو آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لینا۔

صبوحہ علی کے چہرے پر شرم کے گلال کھل اُٹھے۔ وہ آفاق احمد کی اتنی شوخیاں اور بے باکیاں برداشت نہ کر سکی۔ اور خود ہی اُٹھ کر بھاگ گئی۔

'اے مشرق کی بیٹی! تیرے حیا سے تپتے رخساروں اور شرم سے جھکی پلکوں کے سامنے مغربی دُنیا کی ساری خوبصورتیاں ہیچ ہیں۔'

آفاق احمد، صبوحہ کے جانے کے بعد خود سے مخاطب تھے۔

وقت جیسے آفاق احمد پر بہت مہربان ہو گیا تھا۔ ایک طرف تو وہ صبوحہ علی کی صورت میں مل جانے والی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ دوسری طرف اُن کی محنت اور ذہانت رنگ لائی۔ اور انھوں نے ڈی فل امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ تو اُن کے ہم وطن طلبا و طالبات کے سر فخر سے بلند ہو گئے۔ اُن کے تحقیقی مقالے نے اکنامکس کی دُنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ یونیورسٹی پریس سے شائع ہونے والے سارے صحافیوں نے اُن کے بارے میں بہت سے مقالے شائع کیے اور اُن کی ذہانت کے اعتراف کے طور پر یونیورسٹی سے منسلک کالج میں انھیں بی فل کے لیے لیکچر شپ کی پیشکش کی گئی۔ آفاق احمد نے اس اعزاز کو خوشی سے قبول کر لیا۔ اُن کے اپارٹمنٹ میں مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ اور اس ہجوم میں صبوحہ علی کی شخصیت سب سے ممتاز اور نمایاں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سب مہمان رخصت ہو گئے تو انہوں نے صبوحہ کو روک لیا اور اس سے خواہش کی کہ وہ اُن کے لئے اپنے ہاتھ سے کافی بنا لئے۔

اور پھر کافی پی کر آفاق احمد، صبوحہ علی کا ہاتھ تھام کر کھڑکی کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے پردہ ہٹایا تو برف بوریں شیشے سے پھسل پھسل کر نیچے گر رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ لفظوں کا سہارا لئے بغیر وہ ایک دوسرے کو محسوس کر رہے تھے۔

صبوحہ علی، آفاق احمد کی آنکھوں کو اپنے چہرے پر ٹکے دیکھ کر دل ہی دل میں گنگنا رہی تھی۔

چہرہ میرا تھا نگاہیں اُس کی
خامشی میں وہ باتیں اُس کی
میرے چہرے پہ غزل لکھتی گئیں
شعر کہتی ہوئی آنکھیں اُس کی

اس وقت صبوحہ علی کا چہرہ الوہی رنگوں سے مزین تھا۔

"صبوحہ جان! تمہیں معلوم ہے میں اِس وقت کیا سوچ رہا ہوں؟" اُنھوں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"کیا...؟"

"سوچ رہا ہوں کہ ہمارا ایک چھوٹا سا پھولوں میں ڈھکا ہوا مہکتا سا گھر ہوگا۔ جس میں ہم دونوں ہوں گے اور جب شام کو میں دفتر سے تھکا ہارا گھر لوٹوں گا تو تم... بالوں میں پھول سجائے میری منتظر ہو گی۔ اور میں آتے ہی بیتابی سے تمہارے مہکتے بالوں میں چہرہ چھپا کر آنکھیں بند کر لوں گا۔ اور اِن لمحوں میں ہمیں ایسا محسوس ہو گا۔ جیسے اس دُنیا میں ہم... دونوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"ارے... خواب دیکھنے والے پاگل سے لڑکے۔ جن بالوں میں چھپ کر تم خواب دیکھنے کو کہہ رہے ہو نا۔ یہ اُس وقت تک تو درست ہے۔ جب تک میں تمہاری بیوی نہیں بنتی لیکن جب تمہاری بیوی بن کر تمہارے سامنے کوئی چیز رکھوں گی۔ کھانے کے دوران اگر اُس میں سے ایک بال بھی نکل آیا نا تو تم غصے سے وہ کھانا میرے چہرے پر ہی پھینک دو گے۔ اُس وقت یہ سارے خواب اور نازک دنیا ختم ہو جائے گی اور تم سخت گیر شوہر بن کر جھگڑو گے کہ بال کھول کر کیوں رکھتی ہو پھوہڑ عورت...!"

"میں مذاق نہیں کرتا صبوحہ علی! میں نے اپنی زندگی اسی طرح گزارنے کا فیصلہ کیا ہے اور تم... تم یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دیکھو گی ہم میں اتنی خوشیاں ہوں گی کہ عالی شان محلوں میں رہنے والے لوگ بھی اِن...

خوشیوں سے محروم ہوں گے جو ہمیں حاصل ہوں گی؟"

"آفاق احمد یوں تو خواب کانچ سے بھی نازک ہیں لیکن خدا کرے کہ تمہاری یہ خواہش پوری ہو، یہ خواہش اتنی معصوم اور بچکانہ ہے کہ اگر پوری نہ ہوئی، تو مجھے دلی صدمہ ہوگا۔"

"صبوحہ جان یوں تو قدرت نے میری ذات کو بے حد نوازا ہے۔ میں اُس ذات کے سامنے سراپا شکر ہوں۔ اُس ذات نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ لیکن لیکن... اگر تمہیں دے دے تو میں جانوں کہ اس نے مجھے مکمل کر دیا۔"

"کاش کہ ہم کبھی موڑ پر بھی الگ نہ ہوں۔ ہماری ذہنی قربتیں سلامت رہیں آفاق احمد۔" صبوحہ علی کا سر آفاق احمد کے کندھے پر ٹک گیا۔

اور پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ خواہش نہ صرف بچکانہ تھی۔ بلکہ دنیا کی حقیقتوں سے بھی دور تھی۔ وہ جو ان خواہشوں تلے دب گئے تھے۔ اپنی تمنا کو پورا کرنے کی کوشش میں تن تنہا بھٹکتے رہ گئے۔ ان کی منزل کے نشان ہی مٹ گئے۔

آفاق احمد کے کسی دوست نے ان کے گھر صبوحہ علی اور آفاق احمد کے تعلقات کی خبر پہنچا دی۔ جواباً آفاق احمد کو اپنے والد کا ناراضگی نامہ وصول ہوا۔

"برخوردار...!

تم نے جو یقین مجھے دلایا تھا بالکل کچا دھاگا ثابت ہوا جانے مجھ سے تمہاری تربیت کی کونسی بنیاد کمزور رہ گئی تھی کہ تم بہک گئے۔ اپنے والد کا برسوں کا اعتماد تم نے پل بھر میں ختم کر دیا۔ تمہارے پیچھے تمہاری والدہ کا انتقال ہو گیا لیکن میں نے تمہیں اس لئے اطلاع نہ دی کہ تمہاری پڑھائی کا حرج ہوگا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو چکے ہو۔ شکر ہے تمہاری ماں زندہ نہ تھی ورنہ تمہارے ان کرتوتوں سے زندہ درگور ہو جاتی۔ اُس نے تمہاری بات طے کر دی تھی۔ تم اگر میرے ساتھ کوئی تعلق رکھنا چاہتے ہو تو فوراً لوٹ آؤ۔ ورنہ ہمارا تمہارا تعلق ختم۔"

"اوہ میرے خدا، یہ کیا ہو گیا ہے؟" آفاق احمد نے خط صبوحہ علی کی جھولی میں ڈال سر تھام لیا۔

"آہ میری قسمت! کتنے شاندار انسان سے میں نے محبت کی ہے لیکن اُسے پانا میری قسمت میں نہیں۔ وہ تو فرشتوں کی طرح برائیوں سے پاک ہے۔ دیوتاؤں کی طرح حسین ہے۔ وہ تو اس قابل ہے کہ اُس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کی پوجا کی جائے۔ وہ تو اتنا قیمتی ہے کہ اس کے ساتھ گزرے ہوئے ایک لمحے کے عوض ساری زندگی بھی دے ڈالوں تو قیمت ادا نہ ہو۔ جانے کس خوش قسمت کو اس کی رفاقت نصیب ہوگی۔" صبوحہ علی اس حقیقت پر ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔

"ہماری خواہش کتنی بچکانہ تھی آفاق احمد، خیالوں کی دنیا کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو، اس کے ٹوٹنے... میں محض ایک لمحہ صرف ہوتا ہے اور ہماری زندگی کا ہر دن ہزاروں لمحوں پر مشتمل ہے۔ جب خیالات کے ہزاروں برس کا تصور حقیقتوں کے ایک لمحے سے شکست کھا جائے اور تمہارا ایک لمحے کا قرب مجھ پر ہزاروں کانٹوں کی خراش ڈال دے گا۔ تب دل بھر خوشگوار تصورات اور خیالات کو دل میں دبا کر بھی میں آنکھوں سے بہتے آنسو نہیں روک سکوں گی۔ اور اپنے پاؤں کو راستوں کی دھول سے بھر کر اس پتھر کی تلاش کرنے لگوں گی جس سے ٹیک لگا کر میں ذرا آرام کر سکوں۔ کیونکہ اب تمہارا سینہ میری پناہ گاہ نہیں بن سکے گا۔" صبوحہ علی کی آواز بھر آئی۔ اور گلا رندھ گیا۔

"صبوحہ جان، خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ اُنھیں ٹوٹ جانے دو۔ کوئی بات نہیں۔ بس انسان کو نہیں ٹوٹنا چاہیئے۔" آفاق احمد نے بکھرتی ہوئی صبوحہ کو سنبھالا دیا۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو بہلا کر اُسے تسلی دے رہے تھے۔ وہ خود سمجھ رہے تھے کہ ان کے لفظ بہت کھوکھلے اور بے جان ہیں لیکن وہ صبوحہ علی کو بکھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"گویا آفاق احمد آپ کو خواب ٹوٹنے کا غم نہیں ہے۔" صبوحہ علی نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے تیکھی چتون سے اُنہیں دیکھا۔

"ضرور ہوگا، مگر وقت بہت مہربان اور چارہ گر ہے۔"

"کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں آفاق احمد۔ جہاں وقت کی چارہ گری کام نہیں آتی۔ تم تو اب بھی تصورات کی دنیا کے باسی نظر آتے ہو آفاق احمد اور میرے پاؤں کے نیچے حقیقتوں کے نوکیلے پتھر پڑے ہیں۔ میں ذہنی طور پر تم سے اس قدر متاثر تھی کہ ہمیشہ جسمانی قربتوں کو تمہاری ذہنی.. قربتوں میں جکڑتی رہی اور پھر وہی میری آسودگی کا سبب بن گیا۔

آؤ... ہم اب بھی اس ذہنی قربت کو ...... کو اپنا ہمسفر بنا لیں، فاصلے جب ذہنی ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ہم کوسوں دور ہوتے ہیں لیکن جسمانی فاصلے ذہنی قربتوں کو کبھی ختم نہیں کر سکتے۔ اور پھر ہماری ذہنی قربتیں ہیں صبوحہ علی۔ جو سدا رہیں گے۔ ہم نے تو کبھی بھی جسموں کے سہارے ایک دوسرے کو جیتنے کی کوشش نہیں کی۔ اور جب تک ہم میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ ہم نزدیک ہی رہیں گے۔"

"ہاں آفاق احمد! ہم تو ذہنی قربتوں کے پجاری ہیں۔ ہم اپنے ذہنوں اور اُن کے تصورات کو چھپا کر پروان چڑھا سکتے ہیں۔" وہ دونوں اپنے اپنے فلسفے سے جیسے خود کو ہی بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

صبوحہ علی رخصت ہوئی تو آفاق احمد نڈھال نڈھال سے کھڑکی کے آگے آ کھڑے ہوئے اور باہر دیکھنے لگے۔

درخت پر ابھی تک برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ انھوں نے سوچا کہ شاید آئندہ دو ایک ہفتوں میں کچھ دھوپ نکلے اور یہ برف قطرہ قطرہ ہو کر پانی بن کر بہہ جائے۔

"آغاجان! کاش آپ نے میری زندگی کے سارے اختیار اپنے ہاتھ میں رکھے ہوتے صرف... صرف یہ اختیار مجھے دیا ہوتا کہ میں صبوحہ علی کو اپنا سکتا لیکن آپ بھی اس معاملے میں روایتی باپ بن گئے۔ میرا اپنا پن میرے آدھے وجود کا ایک حصہ مجھ سے چھین لیا۔ اب میں اس نامکمل شخصیت کے ساتھ ہی زندہ رہوں گا۔"

آہ... صبوحہ! ہماری سوچیں بھی ہماری طرح اکیلی رہ گئیں...

آفاق احمد نے درد سے چٹختے سر کو ٹھنڈی کھڑکی سے ٹیک دیا۔

پھر آفاق احمد نے یونیورسٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ جس کا انھیں بہت رنج ہوا۔ یہاں اُن کی زندگی کا ایک باب ختم ہوگیا۔ اور پھر ایک دن وہ صبوحہ علی کا نازک سا ہاتھ تھامے اُس سے اجازت لے رہے تھے۔ صبوحہ علی کی آنکھوں میں ایک یخ بستہ خاموشی تھی۔

"ہمارے ذہنی رشتے منقطع نہیں ہوئے صبوحہ علی! جسموں کی دوری سے مفاہمت کرنا ہی ہوگی اور پھر تم خود یہ جانتی ہو کہ محبت جب تقاضائے جسم و جان سے ماورا ہو جائے تو الہام بن جاتی ہے؟"

"محبت تو شوریدہ سری سکھاتی ہے۔ اس کے حصول کے لئے انسان شیر بن جاتا ہے۔ ہاتھ نہ آئے تو جلتا ہے۔ سلگتا ہے، دہائی دیتا ہے۔ تقاضا کرتا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ مگر ہم... تم اپنی شخصیت کے گرد مضبوط فصیلیں تانے یونہی فتح مند اور سرشار رہیں گے۔" صبوحہ علی کا چہرہ پُرعزم تھا۔

"تمھیں مجھ سے کوئی شکایت تو نہیں نا صبوحہ علی؟" آفاق احمد نے اُس کے دونوں ہاتھ اپنی جلتی آنکھوں پر رکھ لئے۔

"نہیں... نہیں آفاق احمد میں کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ جیون ہے۔ اس جیون کا یہی... رنگ و روپ ہے کہ کبھی خوشی کبھی غم۔ مجھے تم سے کیسے کوئی گلا ہو سکتا ہے۔ اور شکوہ بھی اس شخص سے جس کی یاد کے نام میں نے زندگی انتساب کر دی ہو۔ تم جیسا باکردار، پُرخلوص اور ذہین شخص کب کسی کو شکایت کا موقع دیتا ہے۔" صبوحہ علی نے مسکرا کر اُس کا ہاتھ دبایا۔

اور آفاق احمد ممنونیت سے اُس شعلہ و شبنم سی لڑکی کو دیکھتے رہ گئے۔

"آفاق احمد! جہاں بھی جس وقت بھی تمھیں میری ضرورت محسوس ہو مجھے اطلاع دینا۔ ہماری ایک دوسرے سے کوئی اُمید وابستہ نہیں ہے۔ ہمیں کوئی لالچ نہیں ہے۔ پھر بھی کسی نے ہمیں دُکھ پہنچایا تو سب سے پہلے ہم ایک دوسرے کے زخموں پر مرہم رکھیں گے۔ اگر ممکن ہوا تو تمھاری طرف پھینکا ہوا پتھر میں اپنے سینے پر روک لوں گی اور ہو سکے تو تم میرے لئے ڈھال بن جانا۔"

اور پھر آفاق احمد الوداعی بوسہ اس کی پیشانی پر ثبت کر کے وطن واپس لوٹ آئے۔ اُن کے غم کو چار چاند لگ چکے تھے لیکن وہ خود کو اندر سے بہت خالی خالی تصور کر رہے تھے۔ اُن کا اپنا آپ جیسے اُن سے چھن چکا ہو۔ اُن کے والد اُن کی پیشانی پر بوسہ دے کر رو پڑے۔

"مجھے تم پر بہت بھروسہ تھا آفاق بیٹا! تم میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔ تم اسی طرح واپس آؤ گے جس طرح گئے تھے۔ تمھاری شادی یہیں ہمارے اصولوں اور روایتوں کے ساتھ ہوگی۔" آغاجان کی باتوں کے جواب میں اپنی آنکھیں میں نے نمکین آنسوؤں کو اپنے

اور اتار کر وہ غمگین سی ہنسی ہنس دیئے۔

پھر آغا جان کی اجازت لے کر انھوں نے قالینوں کا بزنس شروع کر دیا۔ "آفاق کارپٹ ہاؤس" کے نام سے خوبصورت شوروم بنوایا۔ اچھے کاروباری اصول و ضوابط کی بنا پر جلد ہی ان کا شمار ملک کے سرکردہ ایکسپورٹرز میں ہونے لگا۔ اور جب وہ کامیابی کے اونچے مقام پر ایستادہ ہوئے تو انھیں صبوحہ علی بہت یاد آئی۔ جس کے سنگ انھوں نے بہت سے سپنے بنے تھے۔

آفاق سے چھوٹے دونوں بھائی، حامد اور اشفاق احمد اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر چلے گئے تو آغا جان کو تنہائی کا احساس ستانے لگا۔ اس لئے انھوں نے آفاق احمد سے شادی کر لینے کی التجا کی۔ ان کی بیوی اپنی نند کی بیٹی بانو کو آفاق احمد کے لئے پسند کر چکی تھیں۔ آفاق احمد بانو کو نہ جانتے تھے اور نہ ہی کبھی انھوں نے بانو کو دیکھا تھا۔ ان کی تعلیمی مصروفیت نے انھیں کبھی مہلت ہی نہ دی تھی کہ وہ اپنے رشتے داروں کے متعلق کچھ جان سکتے۔

لیکن اب ان کے لئے کچھ فرق نہ پڑتا تھا کہ چاہے بانو ان کی زندگی میں آتی یا کوئی اور کیونکہ صبوحہ علی کے بعد ان کے دل میں کوئی آئیڈیل شخصیت نہیں رہ گئی تھی۔ والدہ کی خواہش کے آگے انھوں نے سر جھکا دیا۔ اور جب حجلۂ عروسی میں پہنچ کر انھوں نے بانو کا گھونگھٹ اٹھایا تو بانو کے خوبصورت چہرے کو دیکھ کر انھیں احساس ہوا کہ میرے ساتھ جو ٹریجڈی ہوئی ہے اس میں بانو کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ایک مشرقی عورت کی طرح اس کے دل میں بھی کئی ارمان اور تمنائیں ہوں گی۔ جنھیں وہ اپنے شوہر کے توسط سے پورا کرنا چاہتی ہوگی۔ اپنی محرومیوں کا اس معصوم سے بدلہ لینا فضول ہے۔ اور ویسے بھی ایک بہادر مرد کو اپنی محرومیوں اور کمزوریوں کا بدلہ ایک نازک اور کمزور عورت سے نہیں لینا چاہیئے۔ ہر عورت صبوحہ علی ہے۔ انھوں نے دل میں یہ نیت کی کہ وہ ہر غم کو بھلا کر اب صرف ایک مشرقی عورت کا حق اسے ادا کریں گے۔ وہ سپنے جو حقیقت نہ بن پائے تھے، انھیں بھولنا ہی بہتر ہے۔ انھوں نے بانو کا ہاتھ تھام کر اسے یقین دلایا کہ بانو! انسان گو کہ دنیا کی نظر میں ایک بار جنم لیتا ہے لیکن اگر انسان خود محسوس کرے تو وہ اس دنیا میں کئی بار جنم لیتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرا نیا جنم ہے۔ آج سے مجھے اپنی زندگی ایک نئے سرے سے شروع کرنا ہے۔ میں اپنی سابقہ زندگی کا کوئی واقعہ تم سے نہیں چھپاؤں گا۔ یہ وہ دور تھا جب میں جذباتی تھا۔ میں نے بھی کچھ سپنے دیکھے لیکن جب حقیقتیں ان سپنوں سے ٹکرائیں تو وہ سپنے ٹوٹ گئے۔ اب تمہارا یہ فرض ہے کہ مجھ پر اعتماد رکھو۔ میاں بیوی کے درمیان سب سے مضبوط تعلق ذہنی رشتہ اور رفاقت ہے۔ ازدواجی تعلقات کی نوعیت ہر جوڑے کے لئے مختلف ہو سکتی ہے لیکن اگر ذہنی رفاقت اور ایک دوسرے کے احساسات کا شعور و لحاظ موجود نہیں ہے تو گھریلو زندگی محض ایک اذیت ہے۔

ہمیں ایک دوسرے کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی خامیوں کو بھی فراخ دلی سے قبول کرنا ہوگا۔ خامیوں کو خوبیوں میں بدلنے کا یہی طریقہ خوبصورت ہے۔ جس طرح میں تم پر بھروسہ کروں گا۔ اسی طرح تمھیں بھی میرے لئے دل میں اعتماد پیدا کرنا ہوگا۔ یہ سفر ایسا ہے جو خوبصورت لفظوں سے نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں عمل کر کے شروع کرنا ہوتا ہے۔ زندگی میں اگلے پل کا کسی کو پتہ نہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ بجائے مختلف قسم کے جھگڑوں میں الجھنے کے میں زندگی کو اس کی تمام تر خوبصورتی سے گزارنے پر یقین رکھتا ہوں۔ یہ خوبصورتیاں اسی وقت سچی معلوم ہو سکتی ہیں۔ جب ہم ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی خامیوں کو درگزر کریں۔ اور معمولی اختلاف اور رنجشوں کو حوصلے سے سہیں۔

اعتماد شرط ہے سفر زیست میں کے تحت ہمیں یہ سفر کرنا ہے۔

آفاق احمد کی باتوں کے جواب میں بانو کا سر جھکا رہا۔

لیکن شادی کے کچھ ہی عرصے بعد بانو کی شخصیت آفاق جیسے ذہین شخص پہ کھلنے لگی۔ بانو صرف شکل کی ہی حسین تھیں۔ ان کی تعلیم صرف چند ابتدائی کتابوں تک ہی محدود تھی۔ وہ مکمل طور پر ایک ایسی گھریلو لڑکی... تھیں جو شوہر کو قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ اور زبان چلا کر شوہر کا ناک میں دم کر دیتی ہے۔ آفاق احمد اور بانو ہر بات میں ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھے۔ تعلیم، افتادِ طبع، ذوق و مذاق، ذہنی وسعت میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ لباس پہننے کا ڈھنگ، بننے سنورنے کا سلیقہ... پارٹیوں میں جانے کے اصولوں سے وہ بالکل نابلد تھیں۔ ان میں بس ایک ہی خوبی تھی کہ وہ سارا دن گھر کے کاموں میں جتی رہتیں۔ سارا سارا دن بلا تکان کام کر سکتی تھیں۔ گندے کپڑوں اور برتنوں کے ڈھیر میں دفن رہتیں جبکہ گھر میں کئی نوکر موجود تھے لیکن وہ گھر کے کام کو نوکروں پر چھوڑنا مناسب نہ سمجھتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں۔ گھر کا پورا کنٹرول ان کے ہاتھوں میں رہے اور کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہو۔ انھیں آفاق احمد کے دوست احباب کی آمد بہت کھٹکتی تھی۔ جب ان کا کوئی دوست گھر میں آتا اور وہ چائے کے لئے کہتے تو وہ چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیتیں کہ کیوں ایسے ویسے لوگوں کو اٹھا لاتے ہو۔ آفاق احمد انھیں سمجھاتے کہ بانو! ہم کاروباری لوگ ہیں۔ ہمیں ایسا کرنا پڑتا ہے۔ گھر میں نوکر کس لئے ہیں۔ آپ ان سے کام لیں لیکن وہ اور بگڑتیں۔ وہ ہر کام اپنی مرضی سے کروانا چاہتی تھیں۔

آفاق احمد مطالعے کے شوقین تھے اور انھوں نے کبھی یہ سپنے بنے تھے کہ وہ اپنی لائبریری میں بیٹھ کر اپنی شریکِ سفر کے ساتھ کتابوں کا

مطالعہ کیا کریں گے اور پھر مختلف مسائل کو ایک دوسرے سے ڈسکس کیا کریں گے۔ اس صورت حال سے بکھر گئے۔ چاندنی رات ہو یا بیابانوں میں کوئل سریلے راگ الاپ رہی ہو۔ بانو کو ان چیزوں سے ذرا سی بھی سروکار نہ تھا۔

آفاق احمد جیسا جمالیاتی ذہن رکھنے والا شخص اپنی بیوی کے اس طرز عمل سے سخت مایوس ہوا۔ انھیں یوں لگ رہا تھا کہ حیات کا ہر لمحہ ان سے روٹھتا جارہا ہے۔

وہ سوچتے کہ آغاجان نے میرے لیے یہ انتخاب کیوں کیا جبکہ وہ جانتے تھے کہ میرا مزاج کس طرح کا ہے۔ کاش کہ وہ یہ فیصلہ میرے ہاتھ میں دے دیتے لیکن والدین کبھی بھی اولاد کی آسودگی کی چابی ان کے حوالے نہیں کرتے۔ خود ہی ہر تالا کھولتے ہیں۔ آغاجان نے شادی کے فوراً بعد یہ کہہ دیا تھا کہ آفاق بیٹے! تمھارے سامنے ایک بہت بڑا جہان ہے۔ اور میرا دل چاہتا ہے میرے سہارے کے بغیر تم اس جہان کو تلاش کرو۔ تاکہ تمھیں بھی معلوم ہو کہ تم کتنے پانی میں ہو۔ میں نے ہمیشہ ضرورت سے زیادہ تمھاری رفاقت کا دم بھرا ہے۔ شاید وہ میری شفقت پدری کا تقاضا تھا۔ مگر اب میں چاہتا ہوں کہ تم میرے بغیر رہو تم... تم بڑے ہو گئے ہو۔ اپنی مرضی سے رہو۔ آج کے بعد اپنی خوشیاں تم خود چنو گے۔ آج سے تمھیں اپنی زندگی میں جینے کا حق ہے۔"

آفاق احمد کا جی چاہا کہ کہیں آغاجان آپ والدین پوری زندگی کا پتوار اپنے ہاتھوں میں لے لیا کریں۔ بس بس... ایک خوشی ایک خواہش۔ ایک فیصلہ اپنے بچوں کو دے دیا کریں کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی کے ہمسفر کا انتخاب کر سکیں لیکن آپ بزرگ لوگ زندگی کا یہی اہم فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں اور پھر بعد میں کہتے ہیں۔ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ نبھانا اب تمھارا کام ہے ہماری بلا سے اب جیو یا مرو۔

ہر مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے چاہا جائے، اسے سراہا جائے۔ مرد کی ضروریات اور تقاضے بالکل سادہ اور بنیادی نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن ان کی تکمیل وہ اس طرح چاہتا ہے کہ اس کی انا کو ٹھیس نہ لگے۔ وہ طالب ہوتے ہوئے بھی عورت کو اپنی نظر میں مطلوب دیکھنا چاہتا ہے لیکن جب عورت بیوی کے روپ میں آ کر اس گھر پر اپنا سکہ جما کر شوہر کی طرف سے لاپروا ہو جائے تو مرد عورت کی طرف سے بدظن ہو جاتا ہے۔ اور بانو بیگم نے بھی یہی وطیرہ اپنا رکھا تھا۔ انھیں آفاق احمد کے احساسات کا خیال تک نہ تھا۔ وہ محبت کرنے کے سلیقے سے ناآشنا تھیں۔ جب آفاق احمد تھکے ہوئے گھر آتے تو وہ کسی نہ کسی بیماری کا بہانہ کر کے لیٹی ہوئی ملتیں یا ان کے آتے ہی ان سے الجھ پڑتیں اور وہ اپنے احساسات کو دل میں دبا کر لائبریری کا رخ کر لیتے۔

اب انھوں نے آفاق احمد کا یہ کہہ کہہ کر ناک میں دم کر رکھا تھا کہ وہ الگ گھر لے کر رہیں۔ آفاق احمد سمجھ گئے کہ انھیں آغاجان کی... موجودگی کھل رہی ہے لیکن آفاق احمد کبھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ آغاجان کو اس طرح اکیلا چھوڑ کر چل دیں لیکن بانو کے روز روز جھگڑا کرنے کی خبر آغاجان کو بھی مل گئی اور انھوں نے آفاق احمد کو مجبور کر دیا کہ وہ دلہن کی خواہش ضرور پوری کرے۔ ہر عورت کے خواب ہوتے ہیں اور وہ صرف شوہر ہی پورے کر سکتا ہے۔ اس لیے تم ضرور الگ ہو جاؤ۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ لہٰذا اب کی آفاق احمد کو آغاجان کی خواہش پر مجبور ہونا پڑا۔ اور انھوں نے ایک بہت خوبصورت گھر خرید لیا۔ اور بانو کے ساتھ اس میں شفٹ ہو گئے۔ بانو بیگم اپنی بات منوا کر خود کو بہت اہم تصور کر رہی تھیں۔

پڑھے لکھے مردوں کی اکثریت ایسے جیون ساتھی کی تلاش میں ہوتی ہے جو ان کی الجھنیں سنے، انھیں تسلی دے۔ ان کی ہمت بڑھائے۔ ان کی کوششوں کو سراہے۔ ایسا نہیں کہ صرف اپنی کہے جاتا ہے۔ جب ایک مرتبہ ان کی سن لی جائے تو وہ سننے کو بھی تیار ہو جاتا ہے اور وہی وقت ہوتا ہے جب اس سے کچھ منوایا بھی جا سکتا ہے لیکن اکثر عورتیں ایسی ہیں جو مرد کے گھر آتے ہی اپنے دکھڑے اور فرمائشیں لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور ان کے شوہر کچھ کہنے کی پیاس لیے در بدر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ عورت اور مرد کی رفاقت محض چند لمحوں کی نہیں بلکہ وقت کے بہت بڑے اور وسیع ٹکڑے پر پھیلی ہوتی ہے۔ جس میں گفتگو... جذبۂ رفاقت، ہمدردی، غمگساری سلیقہ تفریح اور مطالعہ وغیرہ شامل

ہے۔ جو وہ تیں اِس بات پر توجہ نہیں دیتیں۔ وہ ازدواجی زندگی کی تمام خوبصورتیوں کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کر لیتی ہیں۔

بانو کی معیت میں آفاق احمد کو یہی احساس رہتا تھا کہ ان سے تعلق صرف جسمانی ہے۔ روح کا ناتا نہیں۔ اور نہ ہی بانو ایسا چاہتی ہیں۔ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی۔ ان میں صدیوں کے فاصلے تھے۔ اُن کی سوچیں، خیالات اور اُمنگیں بالکل متضاد تھیں۔ آفاق احمد بڑی محنت اور خداداد حُسن و ذہانت سے آج بلندیوں کے اعلیٰ مقام پر استادہ ہوئے تھے۔ اُنھیں ایسا لگتا تھا جیسے اُن کے پر کاٹ دیئے گئے ہوں۔ اُن سے جینے کا ولولہ چھین لیا گیا ہو۔ اور اُن کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہوں۔

صبوحہ علی کو کھونے کے باوجود اُنھوں نے بانو کے حق میں انصاف کا فیصلہ کیا تھا لیکن وہ تو اُن کی سوچوں کے بالکل برعکس ہی نکلی۔ وہ بہت ضدی، بخیلی اور شکی مزاج عورت تھیں۔

جب ایک دِن ثانی کی گرہ کھولتے ہوئے اُنھوں نے بانو سے کہا کہ وہ کچھ ہفتوں کے لئے بزنس ٹور پر جاپان جا رہے ہیں تو جواباً بانو بیگم کے عجیب سے لہجے پر چونک پڑے۔

"ٹور پر جا رہے ہیں یا اپنی سابقہ محبت کے درشن کرنے؟"

"بانو... کیا آپ کو میری ذات پر اعتماد نہیں ہے؟" اُن کا لہجہ رُندھ گیا۔

"ہونہہ... اعتبار کون کرے؟" بانو بیگم نے بل کھا کر سرد لہجے میں حقارت سے کہا۔

"نفرتوں کے لئے خدا جانے اور کتنے موقع آئیں گے بانو بیگم! آپ اظہارِ نفرت میں اتنی عجلت سے کام نہ لیجیے۔"

بانو، غرور، تکبر، بے زاری اور بیگانگی کے خود ساختہ خول میں چھپی اُن کے سامنے تنی کھڑی تھیں۔

آفاق احمد نے اِسی لمحے محسوس کر لیا کہ اُن کا گلشنِ ازدواج.. اعتماد کے عروسِ بہار کی بجائے حسد اور طعن و تشنیع کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ آفاق احمد تو چاہتے تھے کہ وہ جب بھی کسی بیرونی ٹور پر جایا کریں گے تو اُن کی شریکِ سفر پہلو بہ پہلو اُن کے ساتھ ہوا کرے گی لیکن وہ جان گئے کہ بانو ازدواجی زندگی کے اِس سفر میں ہمسفری کو بالکل پسند نہیں کرتیں۔ وہ صرف چند رشتوں کے سوا ہر جگہ جانے سے کتراتی ہیں۔ اور جب وہ دُکھی دُکھی اور بجھے ہوئے دل سے جاپان کے میلے میں گھوم رہے تھے تو دیس دیس سے آئے ہوئے خوبصورت مسکراتے چہروں کے درمیان بھی وہ خود کو تنہا تنہا سا محسوس کر رہے تھے۔ ایسے میں اُن کی یہ خواہش شدت اختیار کر گئی کہ کاش! اُن کی شریکِ حیات اُن کے ساتھ ہوتی اور ایک ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے وہ اِن خوبصورتیوں سے لطف اندوز ہوتے۔

جب وہ ٹور سے واپس لوٹے تو وہ ایک بیٹی کے باپ بن چکے تھے۔ وہ بے انتہا خوش ہو کر اپنی بیٹی شفق کے چہرے پر جھک آئے۔ لیکن جب اُنھوں نے نظریں اُٹھائیں تو بانو کی شک و شبہات سے اسیر آنکھوں سے کانپ سے گئے۔

آفاق احمد بانو کی تنہائی کے خوف سے آغا جان کو بانو کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ اُنھیں پتہ چلا کہ بانو بیگم نے اُن کے پیچھے آغا جان سے کئی دفعہ جھگڑا اور بدتمیزی کی ہے۔ اور آغا جان، آفاق احمد کی واپسی تک کے لئے مجبوراً وہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور جب آفاق احمد واپس آگئے تو آغا جان، آفاق احمد کو بتائے بغیر اپنے گھر واپس لوٹ گئے۔ آفاق احمد کو اپنے والد سے بے انتہا محبت اور عقیدت تھی۔ اُنہی کی خواہش پر وہ بن باس کاٹ رہے تھے اُن کے اِس طرح چلے جانے سے وہ تڑپ کر رہ گئے اور اسی وقت اُن سے معافی مانگنے کے لئے اُن کے ہاں چل دیئے۔

"چاند میرے! تم کیوں معافی مانگ رہے ہو۔ معافی تو تم سے مجھے مانگنی چاہیئے کہ میں نے تمہاری خواہش پوری نہ کی۔ اور بدمزاج بانو جیسی ضدی اور خود سر لڑکی کو تم سے بیاہ دیا۔ یہ جانتے بوجھتے کہ میرا بیٹا بہت مختلف مزاج کا مالک ہے۔ اور آج جس کی زندگی ایک دردناک انگیز کہانی بن گئی ہے۔" آغا جان کی آواز بھر آئی۔ آج بیٹے کے دُکھ کو وہ دل سے بہت قریب محسوس کر رہے تھے۔

"آپ سب لوگ اپنے دِل کا حال کہہ کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیتے ہو آغا جان! میں جس ضبط سے گزر رہا ہوں۔ میں کس کس کو بتاؤں کہ میں محرومیوں کا بن باس کاٹنے پر مجبور ہوں۔ کیا زندگی کی سچی خوشیاں حاصل کرنے کا مجھے کوئی حق نہ تھا۔ میں کیسے بتاؤں کہ میں نے کن... خوشیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے۔ آپ لوگوں کی خواہشوں میں یہ عہد قبول کیا ہے۔ جسے اب نبھانا بھی چاہتا ہوں لیکن میری شریکِ سفر میری ہم خیال نہیں ہو پاتی" وہ سوچتے رہے۔

"کاش بیٹے! تم نے وہاں شادی کر ہی لی ہوتی۔ میں وقتی طور پر گرچہ ضرور ناراض ہوتا لیکن آخر مان بھی جاتا۔ کب تک اپنے لہو سے خفا رہ سکتا تھا لیکن بیٹے تم نے کچھ بھی تو نہ کہا۔ کوئی ضد نہ کی۔ کاش کہ تم نے مجھ سے دِل کا حال کہا ہوتا۔" آغا جان آفاق احمد کو سوچتے پاکر رندھے گلے سے کہہ رہے تھے۔

"آغا جان! آپ پریشان مت ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" آفاق احمد والد کو تسلی دے کر واپس آگئے۔

بانو بیگم کو آفاق احمد کی ہر بات اور ہر حرکت سے اختلاف تھا اور وہ ہر چھوٹی چھوٹی بات کو لڑائی کا بہانہ بنا لیتی تھیں۔ اُن کے مطالعے سے اُنھیں جیسے چڑ سی ہو گئی تھی۔ اُن کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ آفاق احمد کی لائبریری کو آگ لگا دیں یا اُن کی ساری کتابیں ردّی میں دے دیں۔ وہ ہمیشہ ہر کسی کے سامنے اپنے شوہر کا گلہ شکوہ کرتیں۔ اور بدنامی کا ڈھنڈورا پیٹا کرتیں۔ اُنھیں اپنے شوہر کی کوئی حرکت بھلی نہ لگتی۔ اُن کا مزاج بدگمان اور وحشی تھا۔ اور اس بدگمانی نے اُنھیں چڑچڑا بنا دیا تھا۔ جب آفاق احمد مطالعے میں غرق ہوتے تو وہ کسی نہ کسی بہانے جاتیں کہ آیا وہ لائبریری میں موجود ہیں یا کچھ اور کر رہے ہیں، اور پھر لائبریری کی پُرسکون فضا میں اتنے زور سے بولتیں کہ آفاق احمد کے مطالعہ میں خلل پڑتا لیکن وہ جب تک دل کی بھڑاس نہ نکال لیتیں مطمئن نہ ہوتیں۔ وہ سمجھتیں کہ آفاق احمد نے کسی اور سے تعلقات قائم کرلئے ہیں اور پھر عشق، امانت اور بدگمانی۔

وہ اپنے میکے جاکر رو رو کر شوہر کی شکایتیں کرتیں اور اُن کو برا بھلا کہتیں اور دھمکیاں دیتیں اور آفاق احمد نہایت تحمل اور بُردباری سے ایک لفظ مُنہ سے نکالے بغیر اور انکسار و فروتنی سے خاموش بیٹھے رہتے۔ بانو کو اُن کی چُپ بھی بہت کھلتی تھی کہ وہ ضرور کسی محبوبہ کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔ آفاق جیسے بلند خیالات کے مالک شخص کو اِس قسم کی گندی باتیں بہت بُری لگتی ہیں لیکن وہ اپنی زبان کھول کر خود بھی بانو بیگم جیسا بننا نہیں چاہتے تھے۔

آغا جان، اُن سے کہتے کیوں خاموش تماشائی بن کر بزدلی کا ثبوت دے رہے ہو۔ کچھ ڈانٹو۔ اور جواباً آفاق احمد کہتے کہ میں بزدل نہیں ہوں آغا جان! جھگڑنا مجھے بھی آتا ہے لیکن میری اعلیٰ تعلیم، میری تربیت مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں گری ہوئی حرکتیں کروں۔ پڑھے لکھے لوگوں کو عموماً بزدل سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات بہت غلط ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ اگر میں بھی اَن پڑھ اور جاہل لوگوں کی طرح جھگڑے اور دنگا فساد کروں گا تو ہم دونوں میں فرق کیا رہ جائے گا۔ میں اسی وجہ سے خاموش رہتا ہوں۔

لیکن جب آفاق احمد شفق کے بعد ایک بیٹے کے باپ بنے تو اُنھوں نے نرم لفظوں میں بانو کو سمجھایا کہ اب اِن لڑائی جھگڑوں کو ختم کردو۔ اس قسم کا ماحول ہمارے بچّوں کے ذہنوں پر اچھا اثر نہیں ڈالے گا۔ میں اُنھیں معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام دلانا چاہتا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ اُن کی ابتدائی تربیت ہی میں کوئی کمی رہ جائے۔

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" بانو نے بیگانی سے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"میں کسی غیر ملکی زبان میں گفتگو نہیں کر رہا بانو بیگم اور نہ ہی آپ اتنی چھوٹی ہیں جو میری بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ... بے اعتمادی اور شک کے ناگ گھروں کی خوشیاں چاٹ جاتے ہیں۔"

"شک کے بیج آپ نے خود بوئے ہیں آفاق احمد۔ آپ مرد ہوتے ہی ایسے ہو۔ ناقابلِ اعتبار۔"

"بانو... میں سمجھتا تھا کہ یہ میری مخلصی ہے کہ میں نے اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اور آپ سے آئندہ زندگی خوشگوار بنانے کے لئے تعاون چاہا لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ میں نے یہ سب کچھ بتا کر زندگی کی سخت ترین غلطی کی ہے۔ اگر میں یہ بات راز میں بھی رکھ لیتا تو آپ میرا کچھ نہ بگاڑ لیتیں۔ لیکن یہ میری محبت اور مخلصی کا ثبوت تھا۔ اور اس کے بعد اگر آپ میرے ساتھ اعلیٰ... خوشیوں کی خواہاں ہوتیں تو اِس بات کے بعد مجھے گھریلو سکون مہیا کرتیں۔ اپنی محبت اور چاہت سے میرے دل سے ہر کمی کو پورا کرنے



کی کوشش کرتیں۔ لیکن آپ نے اِس بات کو میری پوری زندگی پر محیط کر دیا۔ اور میرا حال، میرا مستقبل، شک و شبہات سے مزین کر دیا۔ بلو! آپ خود اپنے اور ہمارے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی کر رہی ہیں یا پھر آپ پتھر ہیں کہ جسے کسی کے سچے نیک جذبے کی تپش بھی پگھلا نہیں سکی۔" آفاق احمد کے چہرے پر تبسم کا سالا خون چھلک آیا۔ وہ ضبط کی جانے کتنی ہی حد سے گزر رہے تھے لیکن بانو ان کی ہر خواہش اور ہر تمنا کو پاؤں تلے روند کر جانے کب کی جا چکی تھی۔

وہ خود نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ بانو ایسا کیوں کرتی ہے؟ انھیں اِس عورت میں کوئی روزن ایسا نہ مل سکا۔ جس سے جھانک کر وہ اُس کے اندر کا حال جان سکتے۔ وہ سوچتے شاید اُسے کسی قسم کا کوئی احساس کمتری ہے لیکن میں نے تو کبھی اُسے یہ احساس نہیں دلایا۔ میں نے تو ہمیشہ اِس بات پر عمل کیا ہے کہ نکتہ چینی کرنا بالکل فضول حرکت ہے۔ کیونکہ ہر شخص اپنی بے گناہی اور بچاؤ کا خواہاں ہے اور اپنے کئے ہوئے کام کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نکتہ چینی بہت خطرناک فعل ہے۔ اس سے انسانی خودداری مجروح ہوتی ہے اور اِس کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ اور اس کے غصے کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ آفاق احمد وسیع ذہن و دل کے مالک تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر انسان کو اپنی زندگی اپنے طریقے سے گزارنے کا حق حاصل ہے۔ اس لئے وہ بانو کے کسی چھوٹے سے فعل کی بھی قدردانی کرتے۔ اور فراخدلی اور تعریف کرنے میں عالی حوصلگی سے کام لیتے۔ وہ کہتے کہ عمل جذبات کے تابع ہیں۔ عمل اور جذبات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ گو عمل جذبے کے تحت ہے مگر جذبہ عمل کے تحت نہیں۔ اس لئے عمل کر کے جذبہ کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ یہی زندہ دلی کی شاہراہ ہے۔ اگر ہماری شادمانی ختم ہو جائے تو ہم کو چاہیئے کہ عمل اور خوش کلامی میں مُردہ دلی سے کام نہ لیں۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ ایک قطرہ شہد سے جتنی مکھیاں پکڑی جا سکتی ہیں۔ اتنی ایک گیلن سرکے سے نہیں پکڑی جا سکتیں۔

آفاق احمد خود کو قلعہ بند کئے یونہی اپنی شخصیت کے دھرن سمیٹے سب پر اپنی چاہتیں لُٹاتے رہے۔

اُن کے دونوں بھائی شادی شدہ ہو چکے تھے۔ حامد تو اپنی دُلہن کے ساتھ کویت میں سیٹل ہو گیا تھا جب کہ اشفاق اپنی دُلہن کے ساتھ آغاجان کے پاس مقیم تھا۔

آفاق احمد کے دونوں بچے پڑھ رہے تھے۔ وہ اُن کی پڑھائی پر خاص توجہ دینا چاہتے تھے لیکن بانو اس سلسلے میں بھی اُن کے خیال سے متفق نہ تھیں۔ وہ بچوں پر بھی اپنی مرضی تھوپنا چاہتی تھیں جبکہ آفاق احمد کا نظریہ اس سے مختلف تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بچوں کو اُن کا ذہنی رجحان دیکھ کر اُن کی تعلیم پر توجہ دیں۔ وہ بانو کو سمجھاتے لیکن وہ ہتھے سے اکھڑ جاتیں۔ اور دوُ ہر کر بچوں کو اُن کے باپ کے خلاف کان بھرتیں۔ اور سہمے بچے سہم کر ماں سے لپٹ جاتے۔

بچے جوں جوں بڑے ہو رہے تھے۔ اپنی ماں کے رنگ میں رنگے جا رہے تھے۔ باپ کا احترام اُن میں مفقود تھا۔ ایسے میں آفاق احمد سوچتے کہ جانے کیوں لوگ لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ ہر والدین کو لڑکیوں کی تعلیم یہ سوچ کر دلوانی چاہیئے کہ ایک مرد کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہے۔ اور ایک عورت کی تعلیم پورے کنبے کی تعلیم ہے۔ آج اُن کے بچے اپنی ماں کی تربیت سے بگڑتے جا رہے تھے۔

آفاق احمد جو دوسروں سے کچھ حاصل کرنے کی تمنا چھوڑ کر... دوسروں کو کچھ دینے کے قائل ہو چکے تھے۔ اُن کی ذات ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھی۔ اتنا عظیم اور ذہین شخص یونہی ضائع ہو رہا تھا۔ اُن کے حال اور مستقبل نے انھیں خوشیوں اور غموں کے پیچھے دوسروں کا تابعدار بنا دیا تھا۔ وہ سوچتے کہ میں گہرے پانی میں ڈوب چکا ہوں۔ اور ایک کاغذ کی کشتی کی طرح ڈول رہا ہوں۔ اب جبکہ سارے سپنے بکھر گئے تھے۔ وہ اپنے زخموں کے لئے کہیں سے مرہم فراہم نہ کر سکتے تھے۔ وہ راہیں جو کبھی سایہ دار تھیں۔ آج کانٹوں بھری راہوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اور اب اُنھیں ساری عمر شاید اِنہی کانٹوں پر سے ہی گزرنا تھا۔

ہمارے ہاں عورتیں شادی کو ایک مستقل بندھن سمجھتی ہیں۔ اور نکاح پڑھوانے کے بعد اُن کا خیال ہوتا ہے کہ اب یہ رشتہ اٹوٹ ہے حالانکہ شادی سب سے نازک رشتہ ہے اور اگر اسے روز نئے تخیل اور محبت کے زاویوں سے استوار اور مضبوط نہ کیا جائے تو یہ کمزور ہو جاتا ہے۔ گرم جوشی کی جگہ سرد مہری آ جاتی ہے اور زندگی کی رنگینیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور بالآخر زندگی محض چند تلخ حقائق ذمہ داریوں اور ناگواریوں کا ایک بوجھ بن جاتی ہے۔ انسان بہت جلد تھک جاتا ہے۔ مایوس ہو جاتا ہے۔ اُکتا جاتا ہے۔ ایسے میں محبت کے چند جملے۔ دل خوش کن قرب اور سچی رفاقت ہی وہ نعمتیں ہیں جو انسان کو زندگی میں پھر پورا حصہ لینے کے لئے آمادہ کرتی ہیں۔ اور یہ سارا کام بیوی کا ہے کہ وہ شوہر کو کس طرح تر و تازہ رکھے۔ ہمارے ہاں چونکہ عورتوں کی تعلیم کم ہے اور تعلیم یافتہ عورتوں کا مطالعہ بھی کچھ زیادہ وسیع نہیں ہوتا۔ اس لئے اُن کی محدود سوچ اپنے شوہر کی بلند خیالی کے ساتھ پرواز نہیں کر سکتی۔ نتیجتاً شوہر اپنی بیوی سے دور ہو جاتا ہے اور جہاں اُسے اپنے مزاج کی عورت ملے وہ اُس کی طرف جُھک جاتا ہے اور پھر عورتیں سر پکڑ کر روتی ہیں اور شوہر کو آوارہ ہرجائی اور جانے کیا کیا کہتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات ایک اَن پڑھ عورت میں بھی وہ خوبیاں ہوتی ہیں جو کہ پڑھی لکھی میں کیا ہوں

کی وہ شوہر کی آنکھ کے اشارے سے ہی اُس کے دل کا حال سمجھ لیتی ہیں۔ اور گھر آنے پر اُس کا خوش دلی سے خیر مقدم کرتی ہیں۔ اگر مرد میں ناپسندیدہ بات یا خامی بھی موجود ہو تو اُسے اِس انداز سے نظر انداز کرتی ہیں کہ اُس کی اچھی خصوصیت کو اُجاگر کر اُن کی تعریف کرتی ہیں۔ اس طرح مرد کا اعتماد بھی بحال ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بیوی سے بھی خوش ہوتا ہے۔

لیکن بانو کی حد سے بڑھی ہوئی زیادتیوں، طعنہ و تشنیع اور شک نے آفاق احمد کے مزاج کو جھنجلا دیا تھا۔ آفاق احمد نے سب کو خوش رکھنے کے لئے خود کو مٹا ڈالا تھا۔ مگر فاصلے جو درمیان میں تھے۔ اُسی طرح قائم تھے۔ اُن کے ہر شوق اور ہر خواہش پر پہرے لگ گئے تھے۔ وہ اپنے دل کی بات کرنے کے لئے کسی دمساز اور ہمراز کو بھی ترس گئے تھے۔ ایسے میں اُنھیں صبوحہ علی یاد آتی اور وہ سوچتے کہ صبوحہ علی! میں تو لوگوں کی تمنائیں پوری کرتے کرتے تن تنہا رہ گیا ہوں۔ تمہاری ذہنی قربتیں بھی کچے دھاگے کے جال کی مانند کب کی اپنا وجود کھو چکی ہیں۔ اب تو میں ہر پل زندہ انسانوں کی تمنا کرتا ہوں۔ مجھے اب معلوم ہوا ہے زندہ وجود جسمانی طور سے ہم پر حاوی ہوتے ہیں۔ وہی ہمارے ذہنوں کو عذاب اور انعام دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور آج اگر تم میرے قریب ہوتیں تو میری زندگی کتنی مختلف ہوتی۔ صبوحہ علی نے رخصت ہوتے سمے اُن سے کہا تھا کہ اگر دُنیا والوں نے تمہیں تنگ کیا تو مجھے یاد کرنا۔

لیکن آفاق احمد اپنے بیوی بچوں سے اس حد تک مخلص تھے کہ اُنھوں نے کبھی لبوں پر صبوحہ علی کا نام تک نہ لایا۔

لیکن جب بانو نے اپنی مرضی سے ہی اپنے بچوں کی شادی کی۔ اُن سے پوچھا تک نہیں تو ایسے میں آفاق احمد کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ بن اولاد کے باپ تھے۔ اُن کا بچوں پر کوئی حق نہ تھا۔ آج اُس عورت نے اُن کی ذات کی بھی نفی کر دی تھی۔

اُنھوں نے بمشکل لفظوں کو مجتمع کر کے اُس خودسر عورت سے شکوہ کیا تو وہ حسبِ توقع چیخ اُٹھیں۔

"کیا حق تھا تمہارا بچوں پر؟ جب ساری عمر تم اُن کی ماں پر ہی حکم چلاتے رہے۔ اُسے ہی کوئی سکھ نہ دے سکے تو بچوں کے لئے کیا کر سکتے تھے۔ میں تو کوستی ہوں اُس وقت کو جب میرے ماں باپ نے تم جیسے شخص سے مجھے بیاہ دیا تھا۔"

بانو کے نشتروں نے آفاق احمد کے دماغ کی رگوں کو چیر کر رکھ دیا۔ آج وہ تمام احترام بھول کر اُن کے منہ پر انھیں طعنے دے رہی تھی۔ تب انھیں لگا کہ اُن کا پوری زندگی کا جوگ بیکار گیا۔ اُن کی قربانیاں، محنتیں ضائع ہو گئیں۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئے اور سر تھام کر گر سے گئے۔ آج اُن کا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ اُنھیں اپنا آپ بہت حقیر لگ رہا تھا۔ وہ اپنی ساری ذہانت، کردار اور عظمتوں کو ایک عورت کے چند جملوں سے بھول گئے تھے۔

"اوہ صبوحہ علی... تم تو کہتی تھیں کہ میں فرشتوں کی طرح بُرائیوں سے پاک ہوں۔ دیوتاؤں کی طرح حسین ہوں۔ اس قابل ہوں کہ میرے قدموں میں بیٹھ کر میری پوجا کی جائے۔ آج آکر دیکھو میں جسے تم دیوتا کہتی تھیں خود ہی پتھروں کی زد میں ہوں۔ دل لہولہان ہو رہا ہوں۔

تم کہاں ہو میری ہم نفس! میری دوست مجھے میرے اپنے ہی بہت ستا رہے ہیں۔ مجھے اِن ظالموں کی ٹھوکروں سے بچا لو آکر آج میرے دل نے تمہیں پکارا ہے صبوحہ علی! کاش کہ تم کہیں میری آواز سنتی ہو۔"

اب آفاق احمد کی تنہائیاں اِس سوچ سے اکثر لوٹ جاتیں کہ جانے میرے بنا صبوحہ علی کی راتیں کیسے کٹتی ہوں گی۔ اُنھیں تو دور رہ کر بھی صبوحہ علی کی باتیں تھامے رہتی تھیں۔ بہت عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اُنھیں اپنی سانسوں سے اُس کی خوشبو آتی تھی۔

آفاق احمد سوچتے کہ لوگ غلط کہتے ہیں کہ مرد ذات بے اعتبار ہوتی ہے۔ یہ اِدھر اُدھر منہ مارتے ہیں جبکہ اس میں خود عورت کا ہاتھ ہے۔ وہ خود اپنا گھر اجاڑتی ہے۔ اگر گھر میں مرد کو پوری چاہت اور محبت ملے تو وہ کبھی اِدھر اُدھر تانک جھانک نہیں کرتا۔ وہ عورتیں بے وقوف ہیں جو ہر وقت مرد کو طعنہ تشنیع کا نشانہ بنائے رکھتی ہیں۔ اور اس کے گھر داخل ہوتے ہی اپنی زبان کی زد میں اُسے محصور کر لیتی ہیں۔ ایسی عورتوں کے مرد گھر کے ماحول سے تنگ آکر باہر پناہیں ڈھونڈتے ہیں۔ اور جب کوئی عورت مرد کی ذات کی ہی نفی کر دے تو پھر مرد کیا کرے؟

آفاق احمد کی پوری ازدواجی زندگی میں کوئی فرحت آمیز ساعت جن میں اُن کی رفیقِ زندگی اُن کی شریکِ رنج و راحت ہوئی ہو۔ اُن کی ہمدرد اور مشیر بنی ہو، نہیں آئی تھی۔

آفاق احمد سوچتے کہ کاش کہ وہ معمولی پڑھے لکھے ہوتے۔ لیکن اُنھیں بیوی اچھی ملتی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جس معمولی شخص کی ازدواجی زندگی شاداں و فرحاں ہے۔ وہ تنہائی میں رہنے والے غیر معمولی ذہین اور فہیم شخص سے زیادہ بہتر ہے۔

آفاق احمد خود سے کہتے کہ کیا دیا ہے میری تعلیم اور ذہانت نے مجھے۔ بلکہ ازدواجی تلخیوں نے تو میرے ذہنی سکون و اطمینان کو ہی تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ کاش بانو بھی دمساز اور غمگسار ہوتی تو آج اُن کے بچوں کا مستقبل کتنا شاندار ہوتا۔ اور گھر میں خوشیاں عروج پر ہوتیں لیکن اب تو سب بکھر کر رہ گیا تھا۔ بیٹی بیاہ کر پشاور چلی گئی تھی۔ اور بیٹا بیوی کے ساتھ الگ گھر بسا بیٹھا تھا۔

آغا جان جو بیٹے کی اندوہ ناک زندگی کی تلخی سے بہت رنجیدہ رہتے تھے۔ ایک دن اسی غم کو دل میں لئے قبر میں اتر گئے اور آفاق احمد کو بہت تنہا اور رنجیدہ کر گئے۔ ایسے میں ان کے بھائیوں نے ان کی تنہائی بانٹی، ان کے بھائی اشفاق کے بیٹے معاذ نے ان کی بہت دلجوئی کی۔ ان کے اپنے بیٹے تو ان کے اتنے قریب نہ رہے تھے۔ لیکن معاذ کی سوچیں اور کردار بالکل آفاق احمد کا سا تھا۔ آفاق احمد اسے اپنا جگر گوشہ ہی سمجھتے تھے۔ اور بھائی بھی اس کی بہت فکر کرتے تھے۔ معاذ بھی اپنے انکل کی صحبت میں بہت خوش رہتا تھا۔

زندگی کے کتنے ہی برس ان ہی سنگینیوں میں بیتے گزر گئے تھے کہ ایک دن بانو بیگم بھی خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

مجبوریوں کے جال میں جکڑے ہوئے تیس... اذیت ناک سال بیت چکے تھے اور آفاق احمد تنہا رہ گئے تھے۔

تنہا تو وہ گزشتہ تیس سالوں سے ہی تھے صرف ایک بے نام سے جسمانی رابطے نے انہیں کسی رشتے میں باندھ رکھا تھا۔

بانو کی طرف سے دی گئی کوئی خاص قدر اور یادگار بات ایسی نہ تھی جسے وہ یاد رکھتے۔ سوائے تلخ اور اذیت ناک یادوں کے جنہیں وہ یاد کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بچوں کو ماں پہلے ہی باپ کے خلاف کر چکی تھی۔ وہ باپ کو اپنا اور ماں کا دشمن سمجھتے تھے۔

اُن کی تنہائی کے تصور سے اُن کے بھائی نے کہا کہ معاذ آپ کا بیٹا ہے۔ آپ اکیلے ہیں اسے اپنے ساتھ لے جائیں لیکن آفاق احمد کو یہ بات گوارہ نہ تھی کہ وہ ایک باپ سے اُس کا بیٹا جدا کرے۔

ویسے معاذ دفتر کے بعد ان ہی کے پاس آ جاتا۔ وہ یا لائبریری میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے۔ لان میں بیٹھ کر چائے کے ساتھ گپ شپ لگاتے یا کوئی باہر کا پروگرام بنا لیتے۔ اس طرح معاذ شام کو اپنے گھر جاتا۔ وہ ایک دوسرے کے ہم مزاج اور ہم خیال تھے۔ اور اسی دوستانہ رویے کی وجہ سے معاذ نے انہیں صبا کے متعلق بھی بتا دیا تھا۔ آفاق احمد جب صبا سے ملے تو انہیں صبوحہ علی بے حد یاد آئی۔ کیونکہ اس کی باتوں سے انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کے خیالات صبوحہ علی سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ انہیں صبا بے حد اچھی لگی۔ انہوں نے سوچا کہ معاذ کے لئے صبا سے بہتر کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی۔

لیکن آج جب انہیں پتہ چلا کہ وقت ایک دفعہ پھر سے خود کو دہرانے لگا ہے۔ اس روشن ارض پر آج پھر وہی ہونے لگا ہے جو تیس سال پہلے ہوا تھا تو آفاق احمد کانپ گئے۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اب ایسا نہ ہونے دوں گا۔ صبا معاذ کو ضرور ملے گی۔ میرا معاذ میرا بیٹا مزاج میں تو میرا جیسا ہے مگر اس کا نصیب میرے جیسا نہیں ہونا چاہئے۔"

انہی سوچوں نے انہیں آج گزشتہ کہانیاں یاد دلائی تھیں۔ وہ لمحے جو کھو گئے تھے۔ صدیاں بیت گئی تھیں۔ انہی کھوئی ہوئی صدیوں میں انہوں نے وصال و ہجر کے لمحے گنوا دیئے تھے۔ وہ سوچتے کہ یہ لمحے اب مجھے نہیں مل سکتے میں نے اپنے حصول کے لئے تو کچھ کیا۔ لیکن اب میں اپنے بیٹے کو خواہشات کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا۔ اس کا اپنا پن اسے دلاؤں گا۔ وہ جسمانی اور ذہنی رابطے اسے میسر ہوں گے جو مجھے میسر نہ آ سکے۔

میں آج اپنی زندگی کا اگلا قدم اٹھاؤں گا۔ جس کو کوئی نہیں کاٹ سکے گا۔

صبح کی پہلی کرن جب اُن کے چہرے پر پڑی تو انہوں نے اپنے جسم کو کانٹوں بھرے بستر سے آزاد کر لیا۔ پہلے تو وہ چند لمحے خالی الذہن سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ دل میں اٹھنے والی شدید درد کی لہر انہیں غنودگی سے نکال کر ہوش کی دنیا میں لے آئی تو انہیں احساس ہوا کہ کس قیامت کی رات تھی جس کا ابھی ابھی اختتام ہوا تھا۔

آج کی صبح ہر صبح سے مختلف تھی۔ وہ اپنی زندگی کا نیا اُٹھایا جانے والا قدم اپنے معاذ کی خاطر اٹھانے جا رہے تھے۔ جب وہ تیار ہو کر اپنے بھائی کے گھر داخل ہوئے تو سب سے پہلے معاذ کے کمرے میں آ گئے۔ معاذ اپنے بیڈ پر گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ اُس کا چہرہ تھکا تھکا اور دھواں دھواں تھا اور اس کی آنکھیں رت جگوں کی کہانی سنا رہی تھیں۔ انہوں نے لبوں پر ہنسی بکھیر کر معاذ کو پکارا لیکن وہ اداسی سے صرف انہیں تکتا رہ گیا۔

"معاذ! میری جان۔ میرے بیٹے تمہیں معلوم ہے کہ صرف تمہارا وجود ہی میری سانسوں کا سلسلہ قائم رکھنے کا ذمہ دار ہے۔ تمہارے چہرے پر دکھ کا ہلکا سا سایہ دیکھ کر بھی میرا دل ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ اپنے انکل کی خاطر ہنس دو میرے بیٹے۔" انہوں نے محبت سے بھرپور لہجے میں التجا کی تو ایک زخمی سی مسکراہٹ معاذ کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"مجھے تمہاری پریشانی کا احساس ہے بیٹے جی! میں اپنے ذہن اور دل کی تمام قوتیں بروئے کار لا کر یہ مسئلہ حل کروں گا۔ تم فکر مند کیوں ہوتے ہو۔" آفاق احمد نے معاذ کی سرخ آنکھوں کو چوم کر اسے... دلاسہ دیا۔

"پتہ نہیں انکل وہ کونسی خفیہ طاقتیں ہیں جو انسانوں کو پرسکون ساحلوں اور کناروں سے اٹھا کر بپھرے ہوئے سمندروں میں پھینک دیتی ہیں۔ انسان کی ذات اپنی تکمیل کے لئے خود ہی دہکتے ہوئے الاؤ تیار کرتی ہے اور پھر دھیرے سے اُن میں اتر جاتی ہے اور پھر یہ بھی

چاہتی ہے کہ زمانے کی آنکھ اس کی طرف مبذول نہ ہو۔ چشم زمانہ میں تو یہ بھی ارتکاب ہے اور یہ جرم قابل گرفت ہے۔ گردن زدنی ہے۔ لیکن کیا واقعی یہ جرم ہے کہ ایک پھول دوسرے پھول کی طرف اپنی پتیاں پھیلا دے ایک شاخ دوسری شاخ پر جھک آئے۔ قوس قزح ایک رنگ دوسرے رنگ میں اتر آئے۔ کیا یہی حقیقتیں عین فطرت نہیں ہیں۔ زمانے کی آنکھوں میں جو معتوب نگاہ ہے کیا وہ بذات خود انسان کے لئے باعث عار نہیں۔ جو اتنی دامن کش اور گریز پا ہے کہ ایک خاص سطح سے ہرگز بلند نہیں ہو پاتی۔ زندگی کے سوراخ کی دو کرنیں آپس میں پیوست ہو جائیں۔ تو بھی زمانہ انہیں شرمسار کر دیتا ہے لیکن ایسی رنگت ہو اور خستہ رائے دیکھنے پر زمانے کو کوئی مورد الزام کیوں نہیں ٹھہراتا۔ کون مجرم ہے؟ کوئی بتائے کہ ہم بیتاب و مضطرب کرنوں کے لئے سکون چاہیں یا چشم زمانہ کے معیار کا بدل ڈھونڈیں۔“

”یہ ابیٹا بہت جذباتی ہو رہا ہے۔“ آفاق احمد نے اس کی بات ختم ہونے پر مسکرا کر کہا۔

”ہر نارمل انسان تھوڑا بہت جذباتی ہوتا ہے۔“ معاذ نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہم ابنارمل ہیں۔“ آفاق احمد نے شگفتہ لہجے میں کہا تو وہ صرف انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

”بیٹا جی! تمہاری باتوں سے مجھے اختلاف نہیں میرے خیالات تم سے مختلف نہیں ہیں لیکن یہ لوگ جو ہیں نا۔ جو ہمارے اردگرد ہیں۔ ہمارے اپنے ہیں۔ یہ ہم سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم ان کی کسی رائے سے اختلاف نہ کریں۔ اور اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو ہمیں گھر بدر، زمانہ بدر ہونے کا بھی حکم مل جاتا ہے۔ یہ دنیا ہمیں بن باس کاٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میری جان... یہاں اس دنیا میں انسان کو بہت سے حالات سے واسطہ پڑتا ہے ہمت ہار دو گے تو آنے والے کل کا سامنا نہ کر سکو گے۔ یہ مان کر بھی کہ ہر طرف منجمد اندھیرا ہے۔ راستہ نہیں ہے۔ پھر بھی ایک باوقار انسان اس یقین پر زندہ رہتا ہے کہ برف کے پگھلنے میں، پو پھٹنے کا وقفہ ہے۔ اس کے بعد سورج کی کرنوں کو کون روک سکتا ہے۔“

”آپ بہت عظیم ہیں انکل، کاش کہ میرا حوصلہ آپ جیسا بلند ہوتا۔“ معاذ نے ان کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر چوم لئے اور آفاق احمد اسے پیار بھری تھپکی دے کر اپنے بھائی کے کمرے میں چلے گئے۔

”آئیے آئیے آفاق بھائی! مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کافی دیر سے آئے ہوئے ہیں۔“

”ہاں معاذ کے کمرے میں تھا۔“ آفاق احمد نے بیٹھتے ہوئے بھائی کی بات کا جواب دیا۔

”ارے آفاق بھائی! آپ ہی اسے کچھ سمجھائیں۔ اس لڑکے نے تو ہمیں گھن چکر بنا دیا ہے۔......... بھئی ٹھیک ہے صبا اچھی لڑکی ہے۔ ہم سب اسے پسند کرتے ہیں لیکن یہ کیا کہ والدین کی پسند اور مرضی پر اسے ترجیح دی جائے۔ معاذ کی امی نے لڑکی پسند کر لی ہے۔ ہم نے انہیں اپنے گھر آنے کو کہا ہے۔ اور یہ صاحبزادے رضامند ہی نہیں ہو پاتے۔“ اشفاق احمد نے بیٹے کی شکایت کی۔

”اشفاق احمد! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا تم میرے گھریلو حالات سے واقف نہیں۔ میری ازدواجی زندگی کی تلخی کا سبب یہ تھا کہ میرے اور بانو کی سوچوں، خیالات و مزاج میں بہت فرق تھا۔ آغا جان کی بات کی لاج نبھانے کے لئے میں نے آخری دم تک اس رشتے کو نبھانے کی کوشش کی۔ اپنے مزاج اور خیالات کو بدل کر بھی دیکھا لیکن بانو بیگم نے کسی قسم کے حالات سے سمجھوتہ نہ کیا۔ اور نتیجہ آپ سب کے سامنے ہے میری پوری زندگی جن محرومیوں اور اذیتوں میں گزری اشفاق! اس کا شاید تمہیں اندازہ نہیں جو ذہنی اذیتیں میں نے برداشت کی ہیں اس کا کوئی احساس بھی نہیں کر سکتا۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ معاذ بھی یہی کچھ برداشت کرے۔

اشفاق، خدا کے لئے تم تو معاذ کے مخلص بن کر سوچو اولاد کی سوچ اور خواہش پر پہرے مت بٹھاؤ۔ اگر تمہیں اپنی اولاد کی خوشی عزیز ہے تو اس کی محبت کا حق ادا کرو۔ اس کی شخصیت جو ابھی بن رہی ہے اس کو راستے میں ہی نہ توڑو۔ وہ بلندیوں سے گر جائے گا۔ تو کیا تم اس کی لہولہان شخصیت کو دیکھ سکو گے۔“

”ہم... میں نے معاذ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے بھائی جان! لیکن اس کی ماں نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے کہ معاذ کی شادی ہماری مرضی سے ہو گی۔“

”اشفاق! بیوی کو رضامند کرو۔ ہمیں اولاد کے معاملے میں اور منکسر المزاج ہونا چاہیئے۔ آپ اور میں، دونوں اس دورِ فانی کو چھوڑنے والے ہیں۔ بچوں کو ان کا حق ملنا چاہیئے۔ اگر ہم ان سے اپنی عزت کروا سکتے ہیں۔ ان کے دل میں اپنی محبت قائم رکھ سکتے ہیں تو اسی طرح سے کہ اپنے فیصلوں میں ان کی پسند اور مرضی کو ضرور ملحوظ خاطر رکھیں۔ ان کی راہ کی دیوار بننے سے بہتر ہے کہ ان کے لئے راستے میں پھول برسائیں۔“

”بھائی جان پلیز... آپ مزید شرمندہ نہ کریں۔ آپ بالکل صحیح فرما رہے ہیں۔ آغا جان ہمیشہ آپ کی وجہ سے دکھی رہے کہ ان کا ہیرے جیسا بیٹا مٹی کے مول بک گیا۔ میں جانتا ہوں کہ معاذ کی ممی

کبھی اپنی ضد سے پیچھے نہیں ہٹے گی۔ ہم یوں کرتے ہیں کہ معاذ کا نکاح صبا سے کردیتے ہیں۔ اس کی والدہ کو ابھی نہیں بتاتے ہاتھ دن معاذ آپ کے ہاں رہے گا صبا کے ساتھ۔ اور تب تک وہیں رہیں گے جب تک معاذ کی والدہ رضامند نہیں ہو جاتیں۔ مجھے اُمید ہے کہ جلد ہی رضامند ہو جائے گی۔ وہ غصے کی بُری ضرور ہے۔ دل کی بُری نہیں۔ آخر معاذ اس کا خون ہے۔ اشفاق احمد نے مسکرا کر بیوی کی طرف دیکھا تو ...

بتایا۔ اور آفاق احمد شاد و فرحاں وہاں سے لوٹ گئے۔

اور جس دن صبا دلہن بن کر معاذ کے سنگ آفاق احمد کے آنگن میں آئی تو وہ بے تحاشہ خوش تھے۔ اس دن انھوں نے اتنے قہقہے لگائے کہ کبھی سابقہ زندگی میں نہ لگائے ہوں گے۔ بہاریں کھلے ہوئے وہ پھول جو انھیں خزاؤں سے مشابہ لگتے تھے۔ آج وہ سب پھول سمیٹ سمیٹ کر وہ نئے اور ان راہوں میں بچھا دیئے جہاں سے دو پیار کرنے والوں نے گزرنا تھا۔

آج آفاق احمد سوچ رہے تھے کہ دکھ انسان کی زندگی میں ... سنگ میں بنتی ہیں۔ بعض دکھ ہماری زندگی میں اس لیے آتے ہیں کہ ہم ان سے کچھ سیکھ سکیں۔ شاید آج اگر میں شادو خوشحال ہوتا تو اپنے آغا جان اور اشفاق بھائی کی طرح کی سوچ رکھتا۔ اور ان ہی کی طرح کا ہی فیصلہ کرتا۔ لیکن میری محرومیوں اور دکھوں نے مجھے یہ سبق دیا کہ میں اس قسم کا فیصلہ کروں۔

وہ معاذ اور صبا کے لیے لائے ہوئے تحائف لے کر اُن کے کمرے میں آگئے۔ جب انھوں نے پردہ ہٹایا تو اُن کی نظر معاذ اور صبا پر پڑی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں کے سہارے کھڑے تھے۔ آفاق احمد کی نگاہیں اُن پر ٹک گئیں۔ معاذ آج قدیم ہسپانیہ کے طرحدار شہزادوں کی ساری تمکنت اور یونانی دیوتاؤں کا سارا حسن اپنی جگمگاتی شبیہہ میں سجائے نیوی بلیو سوٹ میں ملبوس کھڑا تھا۔ اور اس کی بانہوں کے بیچ اور نگاہوں کے سامنے صبا کی صورت حُسن و محبت کا ایک ... سیلاب تھا۔ اور معاذ اسے یوں عقیدت و محبت سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی معبد کی مقدس دیوی ہو۔

عروسی مسہری کے گرد پھولوں کی لڑیاں اُن دو ساتھیوں کو دیکھ رہی تھیں جو صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کر کے ایک دوسرے کے ... بے انتہا قریب آچکے تھے۔ آفاق احمد نے سوچا کہ انھیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔ وہ واپس پلٹنے والے تھے کہ معاذ نے انھیں دیکھ لیا اور آواز دے دی۔ وہ مسکراتے ہوئے دوبارہ کمرے میں آگئے۔

"بھئی بچو! بُرا نہ ماننا تمھاری خلوت میں مخل ہو رہا ہوں۔"

"انکل کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔" معاذ شرما گیا۔

"یہ تم دونوں کے تحائف تھے۔" انھوں نے دونوں کو تحائف دے کر پیار کیا۔

"انکل ... ! میں ابھی ابھی صبا سے کہہ رہا تھا کہ یہ آج تمام سابقہ دنوں سے پیاری لگ رہی ہے لیکن یہ مانتی ہی نہیں۔ انکل آپ بتائیں نا لگ رہی ہے نا پیاری؟" معاذ شوخ ہو رہا تھا اور صبا شرما کر آفاق احمد کے کندھے سے لگ گئی۔

"معاذ بیٹا ... ! میری ایک بات یاد رکھنا۔ شادی سے پہلے ایک خاتون کی تعریف کرنا تمھاری خوشی پر منحصر ہے بلکہ شادی کے بعد اس کی تعریف کرنا تم پر لازم ہے۔ اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ شادی میں صاف گوئی لازمی نہیں ہے بلکہ وہاں بعض اوقات صرف حکمت عملی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمیشہ اس کے گھر داری کی تعریف کرو۔ سمجھ کر کہ ایک رشک زلیخا مہ وش و مہ جبیں تمھاری دلہن بنی ہے۔ اس کے لیے خود کو مبارک باد دو۔ اور اگر کھانا بدمزہ ملے تو بڑبڑانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ آج کا کھانا کل کے کھانے کی طرح خوش ذائقہ نہ تھا۔ اس طرح کہنے سے وہ اس قدر خوش ہوگی کہ جان تک فدا کر دے گی۔"

آفاق احمد نے مسکرا کر صبا کو دیکھا۔

"انکل آج آپ بے انصافی کر رہے ہیں۔ ساری ہی ہدایات آپ کی صبا کے لیے وقف ہوگئیں۔ کچھ ذمہ داریاں اِن محترمہ کے لیے بھی تو ہوں نا۔" معاذ نے پیار بھرا شکوہ کیا۔

"صبا بیٹی! تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ باہمی اعتماد سے زندگی خوشگوار رہتی ہے۔ اعتماد شرط ہے سفر زیست کی کے تحت ازدواجی زندگی کا آغاز کرنا۔ ازدواجی مسرتوں کا راز اسی اعتماد میں پنہاں ہے میری بیٹی۔"

آفاق احمد نے صبا کی افشاں بھری مانگ کو چوم لیا۔

اور دونوں کو نیک تمناؤں سے خدا حافظ کہہ کر باہر چلے گئے۔

آج وہ اس قدر خوش تھے کہ اپنی سابقہ زندگی کی محرومیوں کو بھی بھول گئے تھے۔ انھیں آج محسوس ہو رہا تھا کہ صبوحہ علی اور آفاق احمد بچھڑے نہ تھے۔ بلکہ آج اُن کی منزل ایک ہوگئی ہے۔ اُن کے آنگن کی بہار اُن کے قدم چوم رہی تھی۔

سلسلہ خیال سے

تجدیدِ وفا

مشتاق احمد قریشی

تم اپنے اندر کے لاکھ موسم چھپا لو مجھ سے
میں اپنے جذبوں کی چاندنی سے
نقاب سارے سمیٹ لوں گا
محبتوں کی کتاب کا بھی
میرے ہی نام
انتساب ہوگا
میں چاہتوں کی مسافتوں سے
جو لوٹ آیا تو دیکھ لینا
ہر ایک دل سے
محبتوں کے
نصاب سارے سمیٹ لوں گا
تم اپنی چاہت کے سنگ ایک دن
میری نگاہوں میں تیرنا پھر
میں اپنی آنکھوں میں اِک دن
حجاب سارے سمیٹ لوں گا
وفا کی تجدید کر رہا ہوں
میں بن کے بادل
تمہاری خاطر
سراب سارے سمیٹ لوں گا
میں چاہتوں کے کٹھن سفر کے
عذاب سارے سمیٹ لوں گا۔

کیا پیار اس نے ستانے کی خاطر
جفاؤں کے تیر آزمانے کی خاطر
وفاؤں کے مفہوم سے بے خبر تھا
ملائیں تھیں آنکھیں چرانے کی خاطر
کہاں یاد ہوگا یہ تم نے کہا تھا
کریں گے محبت نبھانے کی خاطر
ہے تخریب کے بعد تعمیرِ اے دل
اُجاڑی ہے بستی بسانے کی خاطر
تبسم کا میں نے سہارا لیا ہے
خود اپنے غموں کو چھپانے کی خاطر
جبیں میں نیازِ جنوں مضطرب تھا
تری رہ میں سجدے بچھانے کی خاطر
وہ خلوت کدے سے نکل آئے ہوں گے
ذرا چاندنی میں نہانے کی خاطر
زمانہ تو خود ہی بہت بے وفا ہے
نہ ٹھکراؤ مجھ کو زمانے کی خاطر
اے ناہید سوچوں میں ترمیم کر لو ا
کسی بے وفا کو بھلانے کی خاطر
محمودہ ناہید۔ کلور کوٹ

دل پہ کب ہوگیا اثر جاناں
چھوڑ کر چل دیئے کدھر جاناں
گل کے گجرے میں زندگی سے دور
زیبِ تن اُن کے ہیں مگر جاناں
آخرش پوچھ ہوگی پرستش بھی
لوگ کتنے ہیں بے خبر جاناں
چار دن کی حیات کی خاطر
جھوٹ اور مکر کا سفر جاناں
مر گئے ہم تو کی پذیرائی !!!
روتے آئے وہ قبر پر جاناں
بے نیازی نیاز ہے اُن کا
لب رہے تشنہ عمر بھر جاناں
قسم جھوٹی ہے اور قیامت ہے
دستِ قاتل ہے میرے سر جاناں
لوگ ہم سے عناد رکھتے ہیں
ہم ہیں نسرین بے ضرر جاناں
نسرین تیز ضعانی۔ کراچی

آ! تبسم کی تبسم سے سحاب پیدا کر
اُبھر رہے زیست میں یہ انقلاب پیدا کر
چمن چمن میں رزاں ہے رنگ و بو کیسے
شعورِ عشق، کوئی انتخاب پیدا کر
مزاجِ دہر میں احساس بیقراری ہے
نظامِ نو کے لیے انقلاب پیدا کر!!
چمن اُجڑ رہا، اب دیدۂ تر نہ رکھ
نہ چھوڑ، بہار کا دل میں گلاب پیدا کر
تصوراتِ حقیقت میں یوں کہ پیدا کر!
نگاہِ شوق میں تیری طلب فروزاں ہو!
نگاہِ ناز میں وہ آب و تاب پیدا کر
سراغ دل سے سحر کا جواب پیدا کر
جمالِ عزم کی ٹھوکر سے آب پیدا کر
تصورات کی دُنیا میں کچھ نہیں رضیہ
خودی بلند، نظر کامیاب پیدا کر!
رضیہ داؤد۔ ساؤتھ افریقہ

بھلا شکوہ کریں گے کیا زمین و آسماں ہم سے
خیالوں کے اُفق پر کوندتی ہیں بجلیاں ہم سے
پھرے ہیں عشق کی خود رفتگی میں دربدر برسوں
نہ جانے اور کتنی دور ہیں کون و مکاں ہم سے
بدن اب ٹوٹتا جاتا ہے برسوں کی مسافت سے
رہے گا کب تلک یونہی جدا وہ جانِ جاں ہم سے
حکایاتِ غمِ دل ان سے کہئے بھی تو کیا کہئے!
سبب ہم کیا بتائیں کیوں ہوئے وہ بدگماں ہم سے
نہ پوچھو سرکشیدہ کیوں ہیں ہم راہِ محبت میں
ہوئی ہے منزلِ حسنِ تمنا جاوداں ہم سے
ملکہ افروز روحیلہ۔ کراچی

پھولوں کی زباں سیکھ کے آتے ہیں کئی لوگ
کانٹوں کو خطا کار بتاتے ہیں کئی لوگ
دیکھے جو گریبان میں منہ ڈال کے انسان
ایندھن کی طرح خود کو جلاتے ہیں کئی لوگ
ہے نہ کوئی کہتا تو کہتا ہے کوئی نیک!
دُنیا میں ہمیں یونہی ستاتے ہیں کئی لوگ
امرس ہمیں جان کے رکھتے ہیں کبھی پاس
پاؤں میں ہمیں روند کے جاتے ہیں کئی لوگ
سنتا ہے کوئی حالِ دلِ زار کی کیا خاک
اپنے ہی قصے جو سُناتے ہیں کئی لوگ
اپنے بھی کئی دیکھے تو دیکھے ہیں کئی غیر
احساں بہت آج جتاتے ہیں کئی لوگ
طاہر ہی لئے پھرتا ہے اب سچی محبت
یزداں کو شب و روز بھلاتے ہیں کئی لوگ

طاہر محمود طاہر۔ دینہ

اُن نظاروں کی بات یاد کرو!
آپ تھے کس کے ساتھ یاد کرو!
تم نے اپنا کیسے بنایا تھا!!
اداؤں الفت کے بھولنے!! والے
پچھلی وہ مشکلات!! یاد کرو
کس نے دل میں چبھائے تھے نشتر
کس کا تھا التفات یاد کرو
ہم نے کس روز زندگی چاہی
کس نے چاہی حیات یاد کرو
حسرتوں کے چراغ روشن تھے
وہ شبِ شبِ برات یاد کرو!
زندگی ہی ہے موت کا پیغام
کچھ حیات و ممات یاد کرو
شاعرہ سے میاں شفق تم نے
کتنی کھائی تھیں مات یاد کرو!

محمد میاں صدیقی شفق۔ کوپن ہیگن ڈنمارک

راہِ الفت کی نہ جانے کب ڈگر ہے
پریشاں ہے یہاں کوئی کوئی بھٹکا اُدھر ہے
کوئی مجنوں ہوا ہے اور کوئی لیلیٰ بنی ہے
تڑپتا ہے کہیں فرہاد کہ شیریں کدھر ہے
بنی ہیں یادگاریں عشق کی جن سے زمانے میں
محبت تھی وہ، صادق اب تک جو امر ہے
محبت مانگتی ہے بس فقط قربانیٔ عاشق
کہ بال و پر سے پروانے کی پاؤں میں قبر ہے
نظر پہلا ہے زینہ عشق کی منزل پہ چڑھنے کا
کرے پھر فیصلہ دل یہ کہ کیا حسنِ نظر ہے
رہے قائم محبت تب تلک بالکل ہی ایسے
بحر میں جیسے اندر سیپ کے قائم گہر ہے
عیاں ہوتے ہیں رازِ دل نگاہیں جب تڑپتی ہیں
نگاہوں کے تصادم کا یہی گہرا اثر ہے
اُجالا روز ہی پیدا کرے شب کی سیاہی کو
نتیجہ جلوۂ خورشید کا دیکھو سحر ہے

خورشید ناز۔ لاہور کینٹ

میں نے اُسے کب اپنا دشمن سمجھا تھا
اُس نے مجھ کو کانچ کا برتن سمجھا تھا
ویرانے میں پھول کھلائے چاہت کے
ویرانے کو گھر کا آنگن سمجھا تھا!
دیکھا، دُنیا والے اب کیا کہتے ہیں
تو نے تو کچھ اور ہی ساجن سمجھا تھا
اب تو وہ بھی بھول گیا سب رشتوں کو
جس کو اپنے دل کی دھڑکن سمجھا تھا
دیکھا عاطر تیز ہوا کے قدموں میں
ایک دیا کہ جس کو روشن سمجھا تھا

رانا محمد حنیف عاطر۔ چھڈو

یادگار لمحے

مدیرہ: [illegible] علوی

زندگی کیا ہے؟

بعض لوگوں سے سنا ہے زندگی حسن و شباب کا نام ہے۔ کچھ کا... خیال ہے کہ زندگی صرف اور صرف دولت ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی خوشیوں کی انمول گھڑی کا نام ہے۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے کچھ کا خیال ہے کہ زندگی کچھ بھی نہیں۔ زندگی دو دلوں کے دھڑکنے کا نام ہے۔ زندگی نام ہے دو محبت بھرے دلوں کے ملاپ کا۔ زندگی محبت ہے اور کچھ فرماتے ہیں۔ زندگی اُن آرزوؤں اور خواہشوں کا نام ہے جو کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ اور وہ جذبے بھی زندگی سے موسوم ہیں جن کا نام حسرتوں اور دکھ کے سوا کچھ نہیں۔ یا پھر زندگی ایک سفر ہے جہاں لوگ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔ اسی سفر میں کچھ لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے دل میں بس جاتے ہیں اور جن کی جدائی ہمیشہ کے لئے سوگوار کر جاتی ہے۔ زندگی کے دوراہے پر چلتے چلتے کبھی ایسے لمحات بھی آجاتے ہیں جب اپنے جذبات کو کچل کر دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ زندگی کا یہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ زندگی خوشی، غمی کی مشترکہ تحریر ہے۔ زندگی ایک ایسا حسین اور خوبصورت سپنا ہے جو آنکھ کھلنے پر اوجھل ہو جاتا ہے اور جو لوگ غموں سے ناآشنا ہیں وہ زندگی کی مسرتوں کی قدر و قیمت کیا جانیں! خوشیوں کے لمحات ہماری زندگی میں مختصر کیوں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تھوڑی سی خوشیاں بھی ہماری زندگی کا سرمایہ بن جاتی ہیں۔ زندگی دُکھ سُکھ کے امتزاج کا نام ہے زندگی کا اصل مقصد تو دوسروں کے دُکھ سُکھ میں کام آنا مشکل وقت میں اُن کی مدد کرنا ہے۔ وہ زندگی ہی کیا جو صرف اپنے لئے ہو، زندگی ایک مقصد ہے انسانیت کی خدمت کا مقصد ہمیں اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے جینا چاہیے۔

مراسلہ: فوزیہ رحمٰن۔ کراچی۔

خوشبو صفت لوگ

زندگی کا سمندر بڑا وسیع، بڑا بے درد، بڑا ظالم اور بڑا ہی پیارا ہے اُس کے ساحل پر پہنچو تو بہت سے لوگوں سے شناسائی ہوتی ہے۔

پیارے پیارے لوگ

نرم سیپیوں جیسے لوگ
دہکتی ریت جیسے لوگ
نوکیلے کنکروں جیسے لوگ
حسین سنگریزوں جیسے لوگ

اور ان لوگوں میں سے کچھ تو سیپیوں پر جمی ریت کی مانند وقت کی دھوپ پاکر ہاتھوں ہی سے نہیں دل سے بھی اُتر جاتے ہیں۔ لیکن کچھ خوشبو صفت لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کی انگلیوں کا لمس اُن کے لہجوں کی حلاوت ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔

مراسلہ: آر۔ نابیل۔ سیالکوٹ۔

سقراط

- سقراط کو جو دنیا کا پہلا عظیم فلسفی شمار کیا جاتا ہے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لکھنا ہی نہ جانتا تھا۔
- سقراط انتہائی بدصورت تھا۔ اس کے ایک شاگرد نے اُس کی مثال ایک ایسے مجسمے سے دی تھی جو اوپر سے تو نہایت مضحکہ خیز تھا لیکن اُس کے اندر دیوتا کی تصویر ہوتی تھی۔
- سقراط کی ماں دایہ تھی اور وہ خود پیشے کے لحاظ سے مجسمہ ساز۔
- سقراط کبھی پیسے کمانے کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوا۔ اس لئے اس کی بیوی جو بہت چڑچڑی تھی۔ ہمیشہ اُس سے لڑتی رہتی تھی۔
- سقراط کی قوت برداشت کمال کی تھی۔ شہر میں وہی ایک تھا جو ننگے پیر برف پر گھومتا تھا۔
- سقراط نے نوجوانی میں میدان جنگ میں بہادری کا انعام حاصل کیا تھا۔

مراسلہ: انیقہ علی کھاریاں

خوش بختی و بدبختی

- خوش بختی ایک نٹ کھٹ، البڑ دوشیزہ کی طرح غلاف جوئی آتی

ہے۔ جس نے بے کبھی ایک جگہ رہنا ممکن نہیں۔ وہ چھوٹی ہوتی کلیمیں کرتی کرسی کی پشت سے تمہارے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتی ہے۔ اور شرما کر کھلکھلا کر چہچہاتی ہوئی بھاگ جاتی ہے۔

- بچپن کا سب دبدبہ ہی کچھ اور ہے۔ بڑھاپا تو رکے رکے قدموں چلتا آتی ہے دھیرے دھیرے سبک قدموں کے ساتھ، اور پھر تمہارے نرم نرم بستر پر دھرنا دیئے بڑے آرام سے بیٹھ جاتی ہے۔ اور پھر ان سلائیوں نے تمہارے لئے کبھی نہ ختم ہونے والا سوئیٹر بننا شروع کر دیتا ہے۔

مراسلہ: ... لاہور

خاموشی

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ دو چیزیں عقل کو حاکر نے والی ہیں ایک بولنے کے وقت خاموشی اختیار کرنا اور دوسرے خاموشی کے وقت بولنا اس قول میں بڑی صداقت پوشیدہ ہے مگر شاید لوگوں کی نظر اسیات پر نہیں گئی کہ خاموشی کے فوائد اس قدر ہیں کہ اگر انسان کو اس کا اندازہ ہو جائے تو شاید بولنے کا ارادہ ہی ترک کر دے۔ اسی لئے امام غزالیؒ نے خاموشی کو بغیر محنت کی عبادت کہا ہے۔ ایک طرف عبادت کا لطف اور دوسری طرف بہت سی مہلک برائیوں سے پاک و محفوظ رہتا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا کہ زبان کی لغزش قدموں کی لغزش سے زیادہ مہلک ہے کیونکہ قدموں کی لغزش صرف ایک انسان کی تباہی کا موجب ہوتی ہے لیکن زبان کی لغزش سے کتنے قدر کے بندوں کو ... نقصان پہنچ سکتا ہے۔ خاموشی کا مطلب یہ ہے کہ انسان بلاضرورت زیادہ بولنے سے محفوظ رہ سکے۔ جہاں دوسرے فوائد ہیں۔ وہاں .. خاموشی غصے کا بہترین علاج بھی ہے۔ انسان کے لئے سب سے بہتر فضا تنہائی ہے جہاں وہ زبان کو خاموش کر سکتا ہے اور اپنے دماغ اور نگاہوں کے رشتے کو استوار کر لیتا ہے۔ خاموشی کا یہی پیغام ہے جو شاعر مشرق نے شمع کی زندگی سے حاصل کیا کہ وہ خاموشی سے جلتی رہتی ہے۔ مگر دوسروں کو روشنی دیتی ہے۔

مراسلہ: معین نیازی۔ کندیاں

یاد رکھئے

- بنی ہوئی راہ پر چلنے والے تو سب ہی ہوتے ہیں مگر دوسروں کے لئے راستہ صاف کرنے والے دنیا میں کم ہیں۔
- تندرستی، نیک بیوی، فرمانبردار لڑکا۔ اور مآل اندیش دماغ، یہ چیزیں انسان کے لئے گھر ہی کو بہشت بنا دیتی ہیں۔
- جس کے دل میں معنی کی اعلیٰ صفات موجود ہو۔ بدخواہ لوگ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔
- جو بات تمہارے دل میں پیدا ہو اس کو پہلے ہی درست نہ سمجھو بلکہ اس کی اصلیت پر غور کرو۔
- موت زندگی کا تاج ہے۔ اگر موت نہ ہوتی تو غریبوں کی زندگی بے فائدہ تھی۔ اگر موت نہ ہوتی تو جینے کا نام زندگی نہ ہوتا۔
- متقی لوگ ریاضت کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ صابر مرتے ہیں۔

مراسلہ: طیبہ آنند۔ فیصل آباد

عظمت انساں

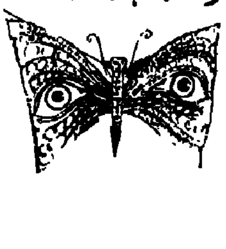
جب میں نے ایک عظیم انسان سے پوچھا کہ ایک عظیم انسان کی جامع تعریف کیا ہو سکتی ہے؟ تو اس نے مجھے جواب دیا کہ عظیم انسان ایک بند کتاب کی مانند ہوتا ہے۔ جس کے اندر کچھ اور تحریر ہوتا ہے اور ٹائیٹل کچھ اور ظاہر کرتا ہے۔ عظیم انسان بظاہر سمندر کی طرح پرسکون رہتا ہے لیکن اس کی گہرائی میں ہزار ہا تمنائیں اور حسرتوں کے طوفان دم توڑ رہے ہوتے ہیں۔ اس کی آرزوئیں نازک شیشے کی کرچیاں بن کر اس کے سارے وجود کو مجروح کرتی رہتی ہیں۔ عظیم انسان اپنی ناتمام حسرتوں کے بوجھ تلے دبتا چلا جاتا ہے۔ اس کی مسکراہٹ سے سارا زمانہ فریب کھاتا ہے اور وہ انسان جو کہ عظیم ہے۔ اس وقت خوشی شادمانی کی آخری معراج پر چلا جاتا ہے جب اس کے لئے اپنی پسندیدہ شے کا حصول ناممکن بن جاتا ہے۔ اس شخص نے بڑی ہی جامع اور مکمل تعریف کی تھی۔ میں نے ستائشی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ناکام آرزوؤں اور کچلی ہوئی تمناؤں کے ستارے چمک رہے تھے اور لبوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ۔

عظمیٰ عزیز خان۔ لاہور

اعتراف

جانے کب تک تیری تصویر نگاہوں میں رہی
ہوگئی رات تیرے عکس کو تکتے تکتے
میں نے پھر تیرے تصور کے کسی لمحے میں
تیری تصویر پہ لب رکھ دیئے آہستہ سے...

مراسلہ: ناہید مجید۔ لاہور



بیاضِ دل

نگہت ناز

ابنِ عندلیب ــــــــــ ڈیرہ مستی

لوگ کس شدت سے دن تکمیل کے گنتے رہے
جب مکمل ہوگیا بُت گر گیا فنکار سے!

محمد سہیل ــــــــــ ڈیرہ اسمٰعیل خان

بکھر کے ریزہ ہوا درد کا مجسمہ کیوں؟
کہ ٹوٹتے نہیں برسوں کے شہکار کبھی!

نزہت شاہد ــــــــــ لالہ موسیٰ

وہ ہمیں جب تک نظر آتا رہا تکتے رہے
بھیگی آنکھوں اکھڑے لفظوں سے دعا دیتے ہوئے

عبدالخالق زاہد ــــــــــ بھبرا (اے کے)

بہار آتے ہی کنج قفس نصیب ہوا!
ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا!

ذکیہ میمن ــــــــــ تھرپارکر

تیرے بغیر بہاروں میں دلکشی کیسی
چمن اداس ہے' پھولوں میں تازگی کیسی

سید اطہر گیلانی ــــــــــ ملہار

صبح ہوتے ہی فنا ہو جائے گا تیرا شباب
مختصر سے حسن پر کیوں چاند تجھ کو ناز ہے

ہما علی ناہید علی ــــــــــ ٹنڈو محمد خان

پھر آتا ہو نہ ہو آئے ہو فاتحہ پڑھ لو!!
شکستہ قبر ہے ممکن ہے کل نشان نہ رہے

وجیہہ پروین ــــــــــ جہانیاں

فرشتے مبتلائے آزمائش ہوں تو چیخ اٹھیں!
یہ انساں ہے جو دیتا آ رہا ہے امتحاں اپنا

اُمِ سبیط سحاب ــــــــــ فیصل آباد

یہ ہوائے یادِ رفتہ' دل وجاں مہک رہے ہیں
نہ کسی چمن سے گزرے' نہ تیری گلی سے آئے
نہ چھپا سکے جہاں سے' نہ دکھا سکے جہاں کو
وہی زخم جو نگاہ کو تیری بے رخی سے آئے

آر۔ مانا بوبی ــــــــــ سیالکوٹ

آج دنیا نے ستم ڈھائے تو دل ٹوٹ گیا
تیری باتیں' تیرا اندازِ وفا یاد آیا!!
کاش ہم غم کو منا لیتے' نہ جانے دیتے
مدتوں بعد یہ احساسِ خطا یاد آیا!!

فوزیہ رحمٰن ــــــــــ عزیز آباد

دل ہجر کے درد سے بوجھل ہے اب آن ملو تو بہتر ہو
اس بات سے ہم کو کیا مطلب' یہ کیسے ہو یہ کیونکر ہو

بشریٰ رمضان ــــــــــ کراچی

خدا کرے کہ تیری عمر میں گنے جائیں
وہ دن جو ہم نے تیرے ہجر میں گزارے ہیں

زیبا بدر ــــــــــ سندھ

ملتے نہیں وہاں تو یہاں ڈھونڈ لیں گے ہم
وہ چھوڑ دیں گے گھر کی طرح رہ گزر بھی کیا؟

پروین بھٹی ــــــــــ نواب شاہ

حادثوں سے ہار جانا فطرتِ آدم نہیں!
حادثے تو کھیلتے ہیں عظمتِ آدم کے ساتھ

ناہید بلوچ ــــــــــ سرگودھا

غم کی جاگیر وراثت میں ملی ہے مجھ کو
اپنی جاگیر میں رہتا ہوں نوابوں کی طرح

امتیاز طاہرہ ــــــــــ ملتان

میرے آنسو تیرے دل کو کہیں تکلیف نہ دیں
وقتِ رخصت بھی نہ دیکھا تجھے مڑ کر میں نے

محمد نصیب ناز ــــــــــ کراچی

گئے ہوئے بھی اُسے مدتیں ہوئیں لیکن نازؔ:
مہک رہے ہیں ابھی تک گلاب آنکھوں میں

انیقہ علی ــــــــــ کھاریاں

جہاں سے کون پیاسا اُٹھ گیا ہے
کہ یہ سیلاب جس کو ڈھونڈتے ہیں!

مسعود نیازی ——— گندیاں

خواب بکھرے تو ہم بھی جان گئے
لوگ روتے ہیں کس لئے اتنا!

طارق ظفر ——— فیصل آباد

خزاں کی دھوپ سے شکوہ فضول ہے محسن
میں یوں بھی پھول تھا آخر مجھے بکھرنا تھا!

مصباح الماس ——— ملتان

آنچل میں پھول لے کے کہاں جا رہی ہوں میں
جو آنے والے لوگ تھے وہ لوگ تو گئے

شہناز مغل ——— ڈیرہ اسمٰعیل خان

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شب فراق تجھے گھر ہی لے چلیں!

یگانہ عثمان ———

ٹھوکر بڑے خلوص سے کھائی کبھی کبھی
یوں بھی وفا کی رسم نبھائی کبھی کبھی

یاسمین اقبال ——— کراچی

جلے گی کیسے بساط یاراں کہ دل سر شام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شب نگاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
وہ تیرگی ہے رہ بتاں میں چراغ رخ ہے نہ شمع وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

خورشید انور ناز ——— لاہور

اس طرح قلب میں پنہاں ہے تصور تیرا
جس طرح چاند گھٹاؤں میں چھپا ہوتا ہے!
سینہ مسرور ہے یوں تیری حسین یادوں سے
آسماں جیسے ستاروں سے بھرا ہوتا ہے

شہناز پروین ہاشمی ——— کراچی

خالی ہاتھوں میں لئے اپنی کتاب ہستی
ایک قاری کی طرح پڑھتے چلے جاتے ہیں
نارسائی کی قسم، ایسا کھلونا ہے حیات
جس کو بس دیکھ لیا، چوم لیا، چھوڑ دیا!

عطیہ ثمینہ ——— چکوال

اس کی باتیں بھی دلآویز ہیں صورت کی طرح
میری سوچیں بھی پریشاں میرے بالوں جیسی:
اس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
رونے والوں کی طرح، جاگنے والوں جیسی

نسرین جویج ——— جوہر آباد

اے دوست میرے ظرف محبت کی داد دے
ہے دل کی چوٹ لب پہ تبسم بنی ہوئی

شیخ محمد ادریس ——— کراچی

بھلا کس طرح ممکن ہو صنم دل تیرا ٹھکانہ!
انہی بجلیوں کا طالب جو جلا دیں آشیانہ
نہ طلب کا شوق رکھنا، یہاں کون سا ہے شیوہ
بڑی خود غرض ہے دنیا، بڑا بے وفا زمانہ

روشی نیازی ——— لاہور

مجھ سے اب میری محبت کے فسانے نہ کہو
مجھ کو کہنے دو میں نے انہیں چاہا ہی نہیں
اور وہ مست نگاہیں جو مجھے بھول گئیں
میں نے ان مست نگاہوں کو سراہا ہی نہیں

سیدہ نرجس شیرازی ——— ڈیرہ اسماعیل خان

یادوں کے چمن مہکے سنسان فضاؤں میں
پھر دل کے اندھیرے میں چاندنی سی اتر آئی
شاید کہ میرے لب پہ پھر نام تیرا آیا
کیوں صحن تمنا میں ہے بجنے لگی شہنائی

ٹی۔ ایس شکیل الرحمٰن ——— کراچی

نہ دیکھ ایسی نظروں سے ستم ہو جائے گا
نہ جانے اس دل کو کیا ہو جائے گا
نظر بچا کے چپل آنکھیں ہیں کنول تیری
پتھر نہیں یہ دل ہے مچل جائے گا

عذرا انداز بخاری ——— ڈیرہ اسمٰعیل خان

رہ وفا میں کچھ ایسے بھی ہم سفر تھے کہ جو!
نظر سے دور رہے، دل میں بس کے ساتھ چلے
نصیب گرد سفر تھی، کہ ہم آبلہ پا!!
ٹھہر ٹھہر کے ہر اک ہم نفس کے ساتھ چلے

طاہر آمائیں ——— بلوچستان

صورت کے آئینے میں دل پائمال دیکھ!!
الفت کی واردات کا حسن مثال دیکھ
جب اس کا نام آئے کسی کی زبان پہ
اس وقت غور سے میرے چہرے کے خال دیکھ

آپ کے خط

پیاری باجی... آداب و تسلیمات۔

جنوری ۱۹۸۴ء کا آنچل ملا تو یہ محسوس ہوا کہ آپ نے اپنے قارئین اور قلمکاروں کو اس شمارے کے روپ میں بہترین تحفہ پیش کیا ہے۔ "سرگوشیوں" میں آپ نے جو دعائیں کی ہیں۔ اللہ رب العزت انہیں شرف قبولیت عطا کرے۔ آمین! محترمہ سلمیٰ کنول سے مشتاق احمد قریشی کا مختصر مگر جامع انٹرویو دریا کو کوزے میں بند کر کے سمیٹ لینے کا شاندار نمونہ تھا۔ بہت پسند آیا۔ سلمیٰ کنول صاحبہ کے ناول ہر خوش ذوق گھرانے کی لائبریری کی زینت ہیں تاہم اچھا ہوتا اگر انٹرویو میں موصوفہ کے ان سترہ ناولوں کی فہرست بھی دے دی جاتی جو اب تک شائع ہو چکے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا جاتا کہ کون سا ناول کس سن میں شائع ہوا۔ اور اس کے اب تک کتنے ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ سلمیٰ کنول اس وقت ہماری زبان اور ادب کا گراں قدر اثاثہ ہیں۔ اپنی کمزور صحت اور غم حیات کے باعث وہ شمع کی مانند پگھلتی رہی ہیں۔ مگر ساتھ ہی دنیائے ادب میں بھی روشنی پھیلاتی رہی ہیں... خدائے کریم اس شمع کو تادیر روشن اور تابناک رکھے۔ اسماء اعجاز صاحبہ کی کہانی "اندھیرے اُجالے" میں وہ شفق رنگ دھیمی آنچ ملتی ہے جو تیرگی کا بھی جگر چیر کر رکھ دیتی ہے۔ یہ ایسی آنچ ہے جو بجھ جائے تو راکھ بن جائے اور بھڑک اٹھے تو شعلوں کے قالب میں ڈھل جائے۔ یہ کہانی تحلیل نفسی کی ایک کامیاب کوشش ہے... زیب ملیح آبادی نے قرآنی حکایات کی تمام بصیرت افروزیوں اور رعنائیوں کو "دامن یوسف" میں عمدگی کے ساتھ پیش کیا۔ "گلابی رات" تنہا کی خوبصورت تحریر ہے۔ "گھر کا چور" میں حقیقت نگاری کا اور "دل کے دریچے" میں قدرے مبالغہ آرائی کا عکس دکھائی دیتا ہے! "عائشی"... دلچسپ ہے مگر شب عروسی میں دلہن سے پراٹھا پکوانا کچھ جچا نہیں۔ "سایوں کا تعاقب" اور "اب کے برس میں تنہا" میں غم کی فراوانی ہے مگر ضبط غم کے تقاضوں نے چیخوں کو آہوں اور سسکیوں میں مدغم کر دیا۔ ناولوں کے سلسلے بہت اچھے جا رہے ہیں۔ ابن آدم کی متاثر کن کہانی "بدگمان" پر صحیح تبصرہ اسی وقت ممکن ہے۔ جب کہ وہ مکمل ہو جائے۔ "ضرورت کا دن" جیسے دینی مضامین ہماری مذہبی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

والسلام:۔ سیدہ مسرت جہاں۔ جدہ

پیاری باجی... تسلیمات

جنوری کا شمارہ ملا۔ سرورق پاکستانی ثقافت کی نمائندگی کرتے ہونے بڑا ہی دلفریب لگا۔ آنچل میں چھپا ہوا ادب کا باغ بڑا ہی بہار دے رہا ہے۔ پھولوں کی طرح مسکراتے افسانے، خوشبو کی مانند معطر غزلیں اور پھر آئینے میں اپنے خط کا عکس دیکھا۔ بہت بہت شکریہ۔ سلمیٰ کنول صاحبہ کا انٹرویو خوب رہا۔ مذہبی کہانی "ضرورت کا دن" اچھی کاوش ہے۔ "دامن یوسف" زندہ و تابندہ کہانی عفو و درگزر کی جامع مثال ہے اس سے قبل اس قدر تفصیل کے ساتھ میں نے حضرت یوسفؑ کا قصہ نہ پڑھا تھا۔ "اندھیرے اُجالے" اسماء اعجاز کی بہت ہی خوبصورت تحریر ہے۔ یہ اُجالے ہی انسان کو اندھیروں کی نذر کرتے ہیں۔ جب والدین کے حالات زندگی اولاد کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں تو خوشیوں کے اُجالے نہیں بلکہ نفرتوں کے اندھیرے ہی پھیل جاتے ہیں۔ "سایوں کا تعاقب" مادہ پرستی کے اس موڈرن دور میں یادوں پر پہرہ بٹھانے کی ایک کامیاب کوشش۔ راحت وفا کی تحریر "گلابی" بہت خوبصورت تھی۔ ناول "زنجیر" اس مرتبہ کچھ آگے کی طرف بڑھا ہے۔ جس طرح کریم ترقی کر رہے ہیں۔ اسی طرح ناول کی کہانی کو بھی ذرا ترقی ہو جانا چاہیے۔ شمیم نقوی کا افسانہ "دل کے دریچے" ایک عمدہ کاوش تھی۔ "گھر کا چور" ایک پیارا اور پُر لطف افسانہ۔ "اب کے برس میں تنہا" ایک دکھی اور پُر اثر کہانی۔ ناول "اجنبی" نے ایک نیا موڑ لیا۔ اب اجنبیت دور ہوئی مگر در پردہ کیا ہے۔ یہ تو آگے چل کر ہی پتہ چلے گا۔ "عائشی" ایک دلچسپ شاہکار، قسمت نے یہ کس موڑ پر لا کھڑا کیا کہ وہی عادت اور نفرت محبت میں اور زندگی خوشیوں میں ڈھل گئی۔ "باغی" کا شدت کے ساتھ انتظار تھا اور اس انتظار میں پنہاں اس کی دلچسپ کہانی ہے۔ کیا یہ سلسلے وار ناول ہے یا ایک طویل افسانہ؟ اسی طرح "بدگمان" کے کئی موڑ پر خوبصورت پیچ پڑھنے کو ملے۔ غزلوں میں ثروت نازاور مشتاق احمد قریشی کی غزلیں خوب ہیں۔ باقی کی ساری غزلیں اچھی فکر کی غماز ہیں۔ "بیاض دل"، "یادگار لمحے" "دو جواب آں" اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ اگلا شمارہ سالگرہ نمبر ہے۔ اگر سالگرہ اپنے آفس میں مقامی قلمکاروں کو بلا کر منائی جائے تو رسالے کی ترقی اور بہتری کے لئے بہت سی راہیں نکل آئیں گی بلکہ تحریر کے ذریعے دور بیٹھے قاری بھی... آنچل کی اس ادبی محفل میں شریک ہوں گے۔ قلمکار اپنی چیدہ چیدہ تحریروں کے ساتھ شامل ہو کر اس تقریب میں اپنی تحریر سے رونق افروز ہوں۔ اور اپنی اپنی رائے دے کر آنچل کو خوب سے خوب تر بنائیں۔

والسلام:۔ حنیفہ نازلی۔ کراچی

آئینہ

مراسلہ نامہ

محترمہ باجی ... نیک تمنائیں۔

تنہائی کی زنجیریں پہنے، حسرتوں کے صحرا میں خواہشوں کا دریدہ بدن، نیم جان پنچھی زیست کی آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ کرب کا آتش محیط بیکراں تھا۔ محرومیوں کا آفتاب غم و آلام کے شعلے برسا رہا تھا۔ بدگمانیوں کی تیز و تند بادِ سموم کے بگولے چار سو محو رقصاں تھے۔ دیو عظیم الجثہ عفریت ہر سمت سے بڑھتے چلے آرہے تھے۔ انہوں نے گیاہ آنند کے تو سے زخمی کر چکے تھے۔ اندیشوں کے سراب قوتِ گویائی و بینائی سلب کر چکے تھے۔ بے چارگی کی تپتی ہوئی ریگ جسم کو جلا رہی تھی۔ ناامیدی کے دہشت زدہ آہو آنکھوں میں حزن و ملال کی پرچھائیں لئے ہوئے میرے حالِ زبوں پر نوحہ کناں تھے۔ بوجھل پلکیں اٹھائیں تو دیکھا کہ دھنک رنگ آنچل اپنے خلوص بھری وفا ... اور محبت کی ٹھنڈی چھاؤں میں مژدہ وصل آمیز کئے ہوئے مانند سراب میری ڈوبتی ہوئی نگاہوں کے روبرو ایستادہ تھا۔ میں نے بے ساختہ اپنے سلگتے ہوئے ہونٹ منزہ کرنے کے لئے آنچل کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ من مندر میں دیوالی ہوگئی۔ حسین قربتوں کی دھیمی دھیمی مہک جسم میں سرایت کر گئی۔ آنکھوں کو ٹھنڈک اور روح طمانیت آشنا ہوئی۔ بادِ سموم کی جگہ بادِ صبا نے لے لی۔ ہر سو مسرتوں کے گجر بج اٹھے۔ آنچل میں میرے خونِ دل کو جگہ دینے کا شکریہ۔ بہت سی امیدوں کے ساتھ تازہ غزل ارسال کر رہا ہوں۔ اس سے قبل کہ دوبارہ ان کیفیات کا سفر کروں۔ آنچل میں جگہ دے کر خواہشوں کا قتل ہونے سے بچائیے۔ خدا کرے آنچل ہمیشہ ہمیشہ ہنستا رہے اور اس کی پیشانی پر آپ کا نام بھی کہکشاں کی طرح چمکتا رہے۔

——— حمید الزماں راز۔

پیاری باجی ... تسلیمات۔

آنچل کے لئے خداوند قدوس کی بارگاہِ عالیہ میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک صاحب لولاک کا صدقہ آنچل کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی سے نوازے اور بھٹکے ہوئے لوگوں کے لئے راہِ نجات بنائے۔ آمین۔

باجی! آج اس نفسا نفسی کے عالم میں جب کہ خوشیاں بالکل ناپید ہو چکی ہیں۔ اور غم و آلام کے سانپ اپنے پھن پھیلائے اس دنیائے فانی کو ڈسنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ آپ کا پیارا سا آنچل واقعی سر پر آنچل کا کام دے رہا ہے اور اس آنچل کی گھنی چھاؤں میں ایسے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کڑی دھوپ کا سفر طے کرتے۔ اچانک بدلی نے سایہ کر دیا ہو۔ آنچل کو پڑھتے پڑھتے جب کوئی افسانہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے تو دل سوز و گداز سے لبریز ہو جاتا ہے اور کئی لمحات خاموشی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ میں دل میں سوچتا ہوں کہ واقعی محبت ایسا جذبہ ہے جو دو دلوں کو سچی خوشیوں سے ہمکنار کرتے ہوئے حقیقی محبت سے آشنا کر دیتا ہے کیونکہ ...

ہماری عشق پرستی پر اعتراض نہ کر
صنم پرست خدا آشنا بھی ہوتے ہیں

میں دنیاوی محبت سے ناآشنا ہوں لیکن حقیقی محبت سے تھوڑا بہت آشنا ہوں جس کی بدولت میرا دل ہر وقت احساس میں رہتا ہے۔ پیاری باجی! ایک انسان جو تھوڑا بہت احساس رکھتا ہے آپ کا آنچل اس کے لئے حقیقی مسرت کا باعث بنتا ہے ... آنچل کا پرانا پرستار ہوں۔ کئی رسائل نظر سے گزرے۔ مگر مرکز نگاہ آنچل ہی رہا۔ اور اب یہ حال ہے کہ آنچل کے سوا کوئی اور رسالہ نگاہ میں جچتا ہی نہیں۔ جب آنچل مل جاتا ہے تو اس کو آہستہ آہستہ پڑھتا ہوں کہ کہیں ختم نہ ہو جائے کیونکہ پورا ماہ تنہائی کے عذاب کون جھیلے۔ اگر دو تین دن میں پڑھ لوں تو سارا مہینہ کیسے گزرے جب کہ دوسرے رسائل کو نظر بھر کر دیکھنے کو دل نہیں چاہتا لیکن اس مرتبہ آنچل جلد ختم کر لیا کہ اپنے دل کی بات آپ کے گوش گزار کر سکوں لہٰذا اب یہ چند سطور بطور ایک خط آپ کے پیش نظر ہے۔ آپ کے آنچل کے تمام ہی افسانے معیاری ہوتے ہیں۔ خاص کر تاریخی کہانی بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ درخشندہ مہر، نسرین قریشی، روبینہ یاسمین، شمیم نقوی، نبیہ نقوی، اسماء اعجاز، ابنِ آدم، زیب ملیح آبادی۔ یہ تمام رائٹرز حضرات بہت اچھا لکھتے ہیں۔ سب کو دلی مبارک باد۔ باجی! آپ کے رسالے میں افسانوں کا جو لطف ہے۔ وہ کسی اور کے یہاں نہیں۔ اس سے زیادہ کیا کہوں۔ کہ آپ کا رسالہ اردو ادب میں شاہکار رسالہ ہے۔ تمام افسانوں میں الفاظ کی ادائیگی اور تسلسل خوبصورت طریقے سے قائم رکھا جاتا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ جس طرح درخشندہ مہر کے افسانوں میں تھوڑا سا دیہاتی ماحول دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی چند اور افسانے دیا کریں۔ اس ماہ کا پیارا سا آنچل میرے ہاتھوں میں ہے۔ ایک، ایک افسانے اور ایک ایک سطر پسندیدگی کے عروج پر ہے۔ ٹائٹل بہت ہی خوبصورت ہے۔ تاریخی کہانی "دامن یوسف" کے زورِ بیان کا نتیجہ ہے۔ بہت سی باتوں کی وضاحت معلومات میں اضافے کا سبب

بی۔ باقی شاہیں کا تعاقب، گلابی، دل کے دریچے، گھر کا بھید، اب کے برس میں تنہا" بہت خوبصورت افسانے ہیں۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کی غزل خوب تھی۔ اشعار اور دوسرے موضوعات بہت اچھے ہیں۔ حتیٰ کہ سارے کا سارا آنچل ہی بہت خوبصورت ہے۔ پرستار پڑھتا ہوں۔ شاید اپنے آنچل میں جگہ دیں یا نہ دیں۔ آپ کی مرضی۔ البتہ اپنے دل کی آواز آپ تک پہنچانا فرض سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ خوش آمدید کہیں گے۔ آئندہ بھی حاضری دیتا رہوں گا۔ اے میرے پیارے آنچل تو سدا سلامت رہے اور لاکھوں دلوں کو خوشیوں سے ہمکنار کرتا رہے۔
(آمین ثم آمین)

———— عظمت اللہ نوشاہی نوشہرہ

بہت ہی پیاری پیاری بہن... دعائیں، محبتیں، پیار۔
عرصے سے آنچل کو خط لکھنا نہیں ہوتا۔ بس پڑھ لیتی ہوں دل خوش کر لیتی ہوں۔ اور خط لکھنے کا سوچ سوچ کر رہ جاتی ہوں۔ اس دفعہ غزل والے حصے نے خط لکھنے پر آمادہ کیا۔ لکھنا یہ ہے کہ شاعری کا مردانہ حصہ بہت ہی خوب ہے مگر زنانہ حصہ میں... اور تو سب ٹھیک ہے مگر نادرہ ناز ملتان کینٹ کی غزل شائع کر کے آپ نے نہ صرف شعری تعلق رکھنے والے قارئین بلکہ درحقیقت شاعری کو بھی نہایت منفرد طریق سے متاثر کیا ہے۔ اور کیا لکھوں۔ سلمیٰ کنول کے انٹرویو نے آنکھیں آنسوؤں سے بھر دیں۔ ویسے ان کے چاہنے والوں کے لئے یہ ساری باتیں متوقع سی تھیں کیونکہ ان کی تحریروں سے ہی اپنے قارئین کو نازک نازک... احساسات لیے منفرد اور معصوم ہستی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ان کے پڑھنے والے ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ جیسے وہ کوئی ماورائی سی مخلوق ہیں۔ اللہ ان کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ آمین۔ اچھا زیب جی! اب اجازت۔ آنچل کو درحقیقت چار چاند لگانے جا رہی ہوں۔

———— نسرین نیر نعمانی۔ کراچی

پیاری باجی... !آداب۔
جنوری کا شمارہ خوبصورت دلکش رنگوں اور نکہتوں کا مجموعہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ایک بک اسٹال پر دیکھا سوچا کہ اس ماہ آنچل کا شمارہ خرید لیا جائے۔ دوسرے ہی لمحے آنچل ایک مہکتے ہوئے پھول کی طرح ہاتھوں میں تھا جس کی ہر کلی کا حسن لاجواب تھا۔ اس رسالے میں انوکھی جاذبیت اور کشش محسوس ہوئی۔ سرورق بہت خوبصورت تھا۔
کہانیوں میں "دل کے دریچے" "عائشہ" خاص کر اچھی لگیں۔ باقی بھی تمام افسانے بہتر تھے۔ یادگار لمحے، "غزلیں" اور "بیاض دل" یہ تینوں سلسلے اس رسالے کی جان ہیں۔ اب تو سوچا ہے کہ اس رسالے کی مستقل قاری بن جاؤں۔

———— مصباح الماس۔ ملتان

کیوٹ آپی... !آداب ــــ

دُنیا میں یوں تو جلوہ نما تھے ہزاروں رنگ
تیرا جُدا تھا رنگ جہاں تک نظر گئی!

اس امید کے ساتھ خط شروع کرتی ہوں کہ آپ اپنے تمام اسٹاف سمیت بخیریت ہوں گی۔ "بہت دیر کی مہرباں آتے آتے" یہ ہم اپنے رسالے کے لیے بھی کہہ رہے ہیں اور سلمیٰ کنول کے انٹرویو کے بارے میں بھی۔ جو بصد مسرت چاند بن کر آنچل کے صفحات پر جگمگایا۔ اور بے حد پسند آیا۔ اب تو اسما اعجاز سے بھی انٹرویو ہو ہی جانا چاہیئے۔ ہم انتظار کر سکتے ہیں۔ اور آپ ہمارے اس چھوٹے سے معمولی سے مطالبے پر غور کریں۔ اب آیئے افسانوں کی طرف۔ اسما اعجاز کا افسانہ "اندھیرے اُجالے" بہت پسند آیا۔ "گلابی"، "گھر کا بھید" اور "عائشہ" بھی بُرے نہ تھے لیکن "دل کے دریچے" میں نیلما کی ہوشیاریاں زیادہ ہی پسند آئیں۔ سلسلے وار ناول زنجیر اور اجنبی چل تو ٹھیک ٹھاک ہی رہے ہیں لیکن کہانی کچھ زیادہ آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔ "ہائی اور بدگمان" بھی اچھے جا رہے ہیں۔ ایک بہت ہی خاص بات اور وہ یہ کہ "آئینہ" میں خورشید انور ناز کا خط پڑھا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ انھوں نے مبارک باد کس نئے سال کی دی ہے۔ ہم مسلمانوں کا نیا سال تو تقریباً چار ماہ پیشتر شروع ہو چکا ہے۔ اس قدر تاخیر کے ساتھ مبارک باد؟ کچھ سمجھ نہ آئی۔ آخر ہم لوگوں کی اپنے مذہب اسلام سے دوری کا کیا انجام ہوگا؟ آخر میں پیارے پیارے آنچل کے لئے ــــ

تُو کہیں بھی ہو تیرے پھول سے ورقوں کی قسم
میری آنکھیں تیرے چہرے پر جھکی رہتی ہیں

———— ذکیہ تبسم صدیقی۔ کوپن ہیگن

ڈیئر باجی... !سلام عقیدت۔
جنوری کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ سرگوشیاں میں جو دعائیہ کلمات آپ نے تحریر کئے، پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ محترمہ سلمیٰ کنول کی شخصیت نے بے حد متاثر کیا۔ تصور میں قوس قزح کے رنگوں میں ملبوس پُر وقار صبر و استقلال کی پیکر کے حضور آنکھیں جھکا دیں۔ ہم تو پہلے ہی ان کے پرستار تھے۔ ان کے لئے دل میں محبت و احترام تھا۔ انٹرویو پڑھ کر یہ محبت اور بڑھ گئی۔ یہ وہ کنول ہے جس پر زندگی کی تیز دھوپ کا بھی اثر نہ ہوا۔ بلکہ خدا کے فضل و کرم سے کنول گلِ لالہ بنا! خدا کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی راز پنہاں ہے ہم ناچیز بندے کیا جانیں۔ اس کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ عجز و انکسار، رحم و شفقت کی اس دیوی کو فرشتے بھی سلام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ محترمہ سلمیٰ کنول کو اس صبر و استقلال اور عجز و انکساری کا اجر ضرور دے گا انشاء اللہ! آمین۔
محترم مشتاق احمد قریشی کی غزل۔ ش م۔ جاناں کے شعر، یادگار لمحے

طرزِ کلام، موتیاں، اہم باتیں پسند آئیں۔ باقی پڑھ کر بھی تشنگی قائم رہتی ہے۔ رفیق صاحب اور ان کے بیٹوں کا کردار پڑھ کر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ "بدگمان" ہمیشہ کی طرح ابنِ آدم کی خوبصورت تخلیق جس میں حجاز نے اپنی بدگمانیوں کا جال بچھایا۔ خدا کرے کہانی کا انجام اچھا ہو اور بدگمانی ختم ہوجائے اور سب ہی کہانیوں نے متاثر کیا۔۔۔ ناول اور افسانے بھی اچھے جارہے ہیں۔ زنجیر بھی کمال کررہی ہے۔

——— طیبہ آرزو۔ فیصل آباد

محترم مدیرہ صاحبہ۔۔۔ آداب۔

سب سے پہلے تو شکریہ کہ آپ نے دسمبر کے شمارے میں میرا شعر شائع کیا۔ مجھے تو امید نہیں تھی کہ میں پہلی مرتبہ شریک ہوئی تھی بہرحال بہت بہت شکریہ۔

دسمبر کے رسالے میں سب سے پہلے سلمیٰ کنول کا انٹرویو پڑھا بہت خوشی ہوئی۔ میری دیرینہ خواہش تھی کہ ان کے بارے میں جانوں اور ان کو دیکھوں۔ لیکن تصویر نہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ اس کے باوجود ان کی باتیں دل کو چھو گئیں۔ انٹرویو اچھا بھی تھا اور قابلِ تعریف بھی۔ میں تو ہمیشہ یہ دعا مانگتی ہوں کہ ان جیسی قابلِ فخر ادیبہ کا سایہ ہم سب پر قائم رہے۔ (آمین) افسانوں میں مجھے جو پسند آئے وہ "سایوں کا تعاقب" "گلابی"۔ "اندھیرے اجالے"، "گھر کا چور"، "عاشی" اور "دولت" میں باقی بچھا رہا ہے "بدگمان" کا کیا کہئے۔ اب محترم ابنِ آدم سے گزارش ہے کہ اس کا اختتام ذرا جلد کردیں۔ "یادگار لمحے" میں خورشید انور ناز کا "طرزِ کلام" اور آمنہ نایاب کا "موتیاں" بہت پسند آئے۔ اشعار سارے ہی اچھے لگے۔ عشرت آفاق احمد قریشی کی غزل بھی خوب تھی۔

——— انیقہ علی سکھاریاں

پیاری باجی۔۔۔ آداب۔

جنوری کا آنچل قبول کیا۔ آپ کو سلمیٰ باجی اور تمام اسٹاف کو سال نو مبارک ہو۔ نیا سال نئے سال کی خوشیاں اور بہت پیار سے۔۔ سرورق پر آنچل کا پاکیزہ سایہ ہو تو ایسے میں ایک بات بڑی کھٹکتی ہے۔ وہ یہ کہ ہم مسلمان اور ہماری قوم آج تک انگریزوں اور ہندوؤں کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ انگریزوں کی طرح نئے سال کی آمد پر پارٹیاں ہلہ گلہ کیا یہی ہیں مسلمانوں کی اقدار؟ یا انھیں فخر محسوس ہوتا ہے ایسا کرنے میں۔ یا اپنی کسی انا کی تسکین کرتے ہیں، وہ اس طرح سے کیا ہم اپنے سال کا آغاز اسلامی مہینے سے نہیں کرسکتے؟ ہمارا پیارا آنچل بھی جنوری ہی کو اپنا سال نو کہنے پر مصر ہے۔ بہرحال قصہ مختصر یہ کہ آنچل کا جنوری کا شمارہ دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ حالانکہ میں اپنے بھائی جیسے دیور کی شادی میں مصروف رہی، مگر میں آنچل کے مطالعے پر مجبور ہوں کیونکہ یہ روزِ اول سے میرا پیارا رہا۔ سلمیٰ باجی سے ملاقات یوں لگا کہ سامنے بیٹھ کر کررہی ہوں۔ اسماء اعجاز کے ناول میں اسلامی رجحان دیکھ کر ذوقِ مسلمانی کی تسکین ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ میں بہت بڑی مسلمان ہوں۔ بلکہ آنچل صرف رسالہ ہی نہیں ایک مکمل تسکین دل وجان کا سامان بھی ہے۔

——— صائمہ شہزاد فیصل آباد

پیاری سی باجی۔۔۔ آداب

کیسی ہیں؟ میں نے آپ کو نہیں لکھا مگر پیاری لکھ دیا۔۔۔ دراصل یہ پیاری کا لفظ ذہن کی سوچ اور الفاظ میں ڈھل کر قلم تک۔۔۔ تحریری طور پر آیا۔ اور ساتھ ہی سوچ کے تحت یہ اپنائیت ہے۔ ویسے ایک بات ہے کہ آپ کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے ضرور بتائیے کہ آپ کی روحانی جھلک دیکھ کر ہی۔۔۔ کچھ لکھیں آپ؟ میری طرف سے آپ کو اور آنچل کے تمام اسٹاف و قارئین کو آنچل کی ساتویں سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ اسے ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ (آمین) سالگرہ نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔ نگار باجی کے انٹرویو کا انتظار بھی ہوگیا ہے۔ سال کا پہلا پرچہ ملا۔ ٹائٹل بلاشبہ خوبصورت تھا۔ تربیت کا منفرد رنگ اس میں نمایاں تھا مگر اس کے باوجود اس سے اپنے دیس کی خوشبو نا آرہی تھی کیا ہمارے دیس کا حسن آنچل کے لئے ختم ہوگیا؟

سرگوشیاں اور درجواب آں، کافی دلچسپ تھے۔ "ضرورت کا دن" کرنل اعجاز قدیر کی خوبصورت کاوش تھی۔ جس نے کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ محترمہ سلمیٰ کنول کا انٹرویو دیرینہ خواہش تھی جو یک بیک پوری ہوئی۔ بہت دلچسپ مختصر مگر جامع تھا۔ اسماء اعجاز کا افسانہ "اندھیرے اجالے" ایک نمائندہ تحریر تھی۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ والدین کا اثر بچے کی ذات پر زیادہ ہوتا ہے۔ دیب ملیح آبادی کی "دامنِ یوسف" اس ماہ کی نمایاں منفرد اور نیا اثر تحریر رہی۔ حالانکہ یہ قصہ کئی دفعہ کا سنا ہوا ہے مگر اسے پڑھا تو یوں لگا کہ جیسے پہلی مرتبہ پڑھ رہے ہوں۔ رخشندہ مہر کا "سایوں کا تعاقب" آج کے دور کی کہانی ہے۔ باقی افسانوں میں "گلابی"، "دل کے دریچے"، اب کے برس میں تنہا پرانے موضوعات پر اچھی کاوشیں تھیں۔ ابنِ آدم کا "بدگمان" امید تھی کہ اس ماہ پورا ہوجائے گا مگر طویل افسانے کے آخری الفاظ "جاری ہے" منہ چڑا رہے تھے۔ خیر دیکھتے ہیں ابنِ آدم نے بدگمانی کی رسی کہاں تک ڈھیلی چھوڑی ہے۔ ایم۔ اے راحت کا باغی کب تک بغاوت کرے گا علم نہیں۔ میری دعا ہے سلمیٰ کنول کا "اجنبی" شناسا ہوجائے۔ اسماء اعجاز کی "زنجیر" بڑی مضبوط اور دیرپا ہے۔ "آبگینہ" "نباضِ دل"، یادگار لمحے بہترین رہے۔

——— شہلا نگار ڈار فیصل آباد

وہ ہر میدان کا کھلاڑی تھا
ایک اچھا کھلاڑی میدان میں اپنے حریف کو چت کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ ہر فن مولا ہے مگر صرف ایک آدمی . .



شفیق، توفیق صاحب سے ناراض تھا۔ رفیق کی تو قسمت کھل گئی تھی اور اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں تھی حالانکہ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ اگر اسے بھی اجازت مل جاتی تو کیا حرج تھا۔ باپ بہت سخت تھے لیکن شاہدہ بیگم نے ہمیشہ ناز برداریاں کی تھیں اور جا بے جا مانتی چلی آئی تھیں۔ یہ شکایت ماں سے ہی کی جا سکتی تھی۔

"یہ ناانصافی نہیں ہے میرے ساتھ؟" وہ نتھنے پھلا کر بولا۔

"کیسی ناانصافی؟" شاہدہ بیگم چھالیہ کی چٹکی منہ میں رکھ کر بٹوے سے بند کرتی ہوئی بولیں۔

"وہ تو کل چھچھورے اٹھا رہا ہے نشاط کے ساتھ اور میں بے وقوفوں کی طرح ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا ہوں۔"

"ارے ارے کیا اوائی توائی بک رہا ہے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔ نہ شرم نہ حیا آخر تو چاہتا کیا ہے؟"

"دیکھو اماں جی! میں بھی جوان ہوں۔ میرے اندر بھی جوانی کا جوش ہے۔ رہی بات شرم و حیا کی تو وہ جو کچھ کر رہا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے؟ اور ادھر جو ڈرامہ ہو رہا ہے وہ اس لئے جائز ہے کہ ابا جی کی ڈائرکشن میں ہو رہا ہے۔"

"ارے تیرا ستیا ناس... زبان کو لگام دے ناس پیٹے۔ سب کیا دھرا چوپٹ کرے گا کیا۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کسی نے سن لیا تو باوا زمین میں گڑھا کھود کر گاڑ ڈالے گا۔" شاہدہ بیگم دانت بھینچ کر بولیں . . .

"صبر و سکون سے سنو اماں جی۔ دیکھو ہم دونوں بھائیوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ آج تک دونوں نے کبھی ایک دوسرے کی کاٹ نہیں کی لیکن تم لوگ ہمارے بیچ نفرت کا بیج بو رہے ہو۔"

"وہ کیسے...؟"

"رفیق نے نشاط کو پھانس لیا ہے۔ آج نہیں تو کل ان دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ رفیق کو جہیز میں دولت ملے گی اور مجھے؟ میں کیا کروں گا؟"

"جو کچھ رفیق کو ملے گا اس میں تیرا کچھ نہ ہو گا؟" شاہدہ بیگم کی آواز میں سرور پیدا ہو گیا۔

"گھنٹی... گھنٹی ملے گی مجھے۔ تم تو بھول جاتی ہو اماں جی۔ بیس روپے کی سائیکل خریدی تھی اس نے اور گھنٹی میں نے لگائی تھی۔ آپ کو یاد نہیں ہے تمہیں، جب میں نے سائیکل چلانے کو مانگی تو اس نے گھنٹی اتار کر میرے ہاتھ میں دے دی تھی۔"

"خدا کے بندے او خدا کے بندے۔ کچھ تو وقت کا خیال کر۔ ہم دونوں تمہاری زندگی بنانے کی کوشش میں مرے جا رہے ہیں اور تم اپنی نادانیوں سے سب کچھ خراب کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ بنو۔ تو کر ایک بھائی کی شادی ہوئی جس گھر میں تو کیا دوسرے کی خود بخود نہ ہو جائے گی۔ ایک ہی گھر کے دو داماد ملیں گے مہر النساء بیگم تو پھولے نہیں سمائیں گی۔ مجال ہے ان کی کہ دوسری بیٹی کی شادی کر دیں کسی اور سے پھر



تو ہمارا زور ہو گا اُن پر۔ مجھے تو یہ افسوس ہے کہ ہمارا کوئی تیسرا بیٹا نہ ہوا۔ ایک پیسہ گھر سے باہر نہ جاتا لیکن خیر اس کا بھی حل سوچ لیا جائے گا کوئی ایسی ترکیب۔ تیسری کو کوئی پوچھنے نہ آئے تو مجھے بُرا تو ہونے دے۔ اپنی بے وقوفی سے سارے کام خراب نہ کر دینا

شفیق منہ بنا کر خاموش ہو گیا۔ ماں کی باتوں میں وزن تو تھا لیکن جوانی اس صلاحیت کو قبول نہیں کرتی تھی۔ رفیق تو جھولوں کے کنج میں ... میں چھت پر محبت کے کھیل کھیلے اور وہ سب لمحوں کی طرح وقت گزرتا رہا ہے۔ اسے بھی تو چاہئے تھا ... یا جاتا۔ نزہت تو مقابل تھی لیکن ... کے لئے تو کوشش کی جا سکتی تھی۔ بہت زیادہ تو فرق نہیں تھا ان کی عمروں میں۔

موسم صبح سے ہی ابر آلود تھا۔ جوں جوں شام ہوتی گئی بادل گہرے ہوتے گئے۔ پانی کے بوجھ سے بدمست ہوائیں ... سیلاب کی مانند لڑکھڑاتی پھر رہی تھیں۔ فضاؤں میں نشہ گھلا ہوا تھا اور موسم شفیق کو اور پریشان کر رہا تھا۔

باہر دالان میں نکلا تو ننھی ننھی بوندوں نے دل میں آگ سی لگا دی۔ بھیگتا ہوا پائیں باغ میں آ گیا۔ بوندیں تیز ہوتی گئیں۔ اسے بھیگنے میں بہت سرور مل رہا تھا۔ پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ لیکن اس نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا سارا لباس بھیگ گیا۔ بدن سے پانی کی دھاریں چھوٹنے لگیں۔ اسی وقت ملازموں کے کوارٹروں سے ایک لڑکی باہر نکلی اور حویلی کے اندرونی حصے کی طرف چل پڑی۔ اس نے ٹاٹ کی بوری اوڑھی ہوئی تھی اور گویا بڑی عجیب سی چال سے آگے بڑھ رہی تھی۔ دفعتاً اس کی نگاہ شفیق پر پڑی اور وہ ٹھٹک گئی۔ ایک لمحہ اپنی جگہ کھڑی رہی جیسے کسی کشمکش میں گرفتار ہو پھر آہستہ قدموں سے وہ شفیق کی طرف بڑھ آئی۔ اس کی رفتار میں پہلے جیسی تیزی نہیں رہی تھی جیسے وہ بارش کو بھول گئی ہو۔

شفیق مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ لڑکی اس کے بالکل نزدیک آئی تو وہ چونک پڑا۔ یہ تو اچھی خاصی شکل تھی بالکل نوجوان اور الہڑ۔

"پانی .. پانی برس رہا ہے صاحب جی۔" وہ نزدیک آ کر فکرمند سے انداز میں بولی۔

"معلوم ہے مجھے۔" شفیق بولا۔

"بھیگ کر بیمار ہو جاؤ گے۔" اس نے کہا۔

"تو پھر...؟" شفیق کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"مر جاؤ گے۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"مر جانے دے تجھے کیا۔" لڑکی کے ہونٹ کھلے ... دم بند ہو گئے۔ پھر وہ آہستہ سے بولی۔

"نہیں جی آپ ہمارے مالک ہو۔ ہمارا تو فرض ہے جی۔ لو یہ اوڑھ لو اور اندر چلے جاؤ۔" اس نے بوری سر سے اتار کر شفیق کی طرف بڑھا دی۔

"میں تیرا مالک کیسے ہو گیا؟"

"دیکھو بُری طرح بھیگ گئے ہو۔ جلدی کرو۔ یہ بارش اچھی نہیں بخار آ جائے گا۔"

"اور اب تو تُو بھیگ رہی ہے۔" شفیق نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا اور دھک سے رہ گیا۔ بھیگا وجود دھڑکنیں بند کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی حسین ہو گی۔ لڑکی اس کی نگاہوں کی گستاخی سے شرما گئی اور پھر اس نے خوفزدہ ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ پھر دانت پیس کر اسے اور اس کے بعد تیز تیز قدموں سے حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بھاگ گئی۔

شفیق گہری نگاہوں سے اسے دوڑتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے اعتدال ہو گئی تھیں کون ہے یہ۔ کون سی؟ کوئی ملازمہ ہی ہو سکتی ہے لیکن کتنی خوبصورت ہے۔ واقعی کتنی حسین ہے۔ اس کے دل میں میرے لئے یہ احساس کیوں جاگا۔ وہ کشمکش کا شکار کیوں ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک کیوں گئی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس کے ذہن نے نہ جانے کیا کیا خاکے پیش کر دیے۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ نظر آئی۔ کوئی چیز پلاسٹک میں چھپائے آ رہی تھی۔ اسی طرف آ گئی اور پھر اسے دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"بوری تو دے دو میری، بڑا ہی بھگو دی۔"

"ایک شرط پر۔" شفیق نے کہا۔

"شرط کیسی جی؟"

"چائے بنا کر پلاؤ مجھے۔ ورنہ میں سچ مچ بیمار ہو جاؤں گا۔"

"چائے کا سامان نہیں ہے میرے کوارٹر میں۔ پکوڑے کھاؤ گے؟"

"اوہ پکوڑے... اس موسم میں۔ ضرور کھاؤں گا۔"

"آؤ...." اس نے کہا اور شفیق کے دل میں پنکھے لگ گئے۔ اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ اسے اپنے کوارٹر میں لے آئی۔ تنہا تھی، بھیگی ہوئی تھی۔ عجیب سماں تھا۔ ایک ... کا کوارٹر تھا سامنے دالان اور پھر صحن۔ دالان میں چولہا تھا جس پر کڑاہی چڑھی ہوئی تھی اور اس میں تیل کھول رہا تھا جس میں بارش کی کوئی بوند جا پڑتی تو ایک شور اُبھرنے لگتا تھا اور پھر ہلکا ہلکا دھواں۔ نزدیک ہی پتیلے کے تسلے میں پیاز ملا بیسن گھلا رکھا تھا۔ گویا پکوڑوں کی مکمل تیاریاں تھیں۔

"زیرہ نہیں تھا چٹنی کے لئے، وہ لینے گئی تھی۔ بھیگ گئی

سدی کی ساری اور وہ بھی تمہاری وجہ سے خود بھی بھیگ گئے پوری بھی بھگو دی۔ اب ضرور بیمار پڑ جاؤ گے دیکھ لینا۔"

"بھیگ تو تم بھی گئی ہو۔" شفیق لرزتی آواز میں بولا۔

"اسے ہماری اور بات ہے۔ ہمارا کچھ نہ بگڑے گا۔ تم مالک لوگ کمزور ہوتے ہو۔"

"میں تو مہمان ہوں یہاں، مالک کہاں سے ہو گیا؟"

"مالک کے مہمان ہو نا۔ مالک ہی ہوئے۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"چھیمو۔"

"میرا نام شفیق ہے۔"

"جانتے ہیں۔" وہ چولہے کے پاس بیٹھ گئی۔ شفیق تھوڑے فاصلے پر پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

"ارہو۔ وہ کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"بس کیسے ہی معلوم ہو۔ معلوم ہے۔" اس نے بیسن کے پکوڑے کڑاہی میں ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر ہنس کر بولی۔ "نزہت اور صوفیہ بی بی کو پکوڑے بہت پسند ہیں مگر بڑی بیگم صاحبہ کسی کو ایسی چیزیں نہیں کھانے دیتیں۔ اس لئے میری شامت آتی ہے۔ چھپ کر پکا رہی ہوں۔ چھپا کر لے جاؤں گی اندر۔"

"تم اس کوارٹر میں تنہا رہتی ہو؟"

"کیوں بھیڑیے کھا جائیں گے مجھے؟"

"نہیں۔ میرا مطلب تھا۔"

"ماما کرم دین بھی رہتا ہے میرے ساتھ، پر ہر وقت نہیں۔ اس کا اپنا بھی ایک گھر ہے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ گیا ہوا ہے ورنہ پکوڑے نہیں بنتے۔ لو کھاؤ۔" اس نے گرم پکوڑوں کی ایک پلیٹ بھر کر شفیق کے ہاتھ میں تھما دی۔ شفیق کی کیفیت عجیب ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے، کیا کرے۔ کچھ نہ بن پڑا تو پکوڑے کھانے لگا۔

"چھیمو تمہاری اس اپنائیت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور سنو میں مالک والک نہیں ہوں مجھے اب شفیق کہا کرو۔"

"اور دوں؟" چھیمو نے کہا۔

"اوہ۔ نہیں یہ بہت ہیں۔ مگر ایک اجازت دو۔ میں تم سے ملتے رہنا چاہتا ہوں۔"

"پکوڑے بہت اچھے لگے ہیں؟"

"نہیں۔ پکوڑے تو اچھے . . . لیکن تم بہت اچھی ہو۔"

"جلدی کھاؤ۔ مجھے گرم گرم اندر لے جانے ہیں۔ چٹنی بھی پیسوں گی ابھی۔" وہ بولی۔ آگ کی تپش سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"تم نے مجھے اجازت نہیں دی چھیمو۔"

"اچھا اچھا ملتے رہنا۔ اٹھا بیٹھ گئی تو؟ ماما کرم دین کو دیکھ لینا، بس اب جلدی کرو مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔"

شفیق باہر نکل آیا لیکن اس کے دل میں گدگدیاں ہو رہی تھیں۔ باہر بارش شباب پر تھی۔

رات کو وہ چھیمو کے کوارٹر کے پاس گیا لیکن اندر سے حقے کے تمباکو کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ دوسرے دن چند لمحات کے لئے چھیمو سے ملاقات ہوئی لیکن دور سے توفیق صاحب نظر آ گئے تھے۔ تیسرا دن بھی بس یونہی رہا لیکن چوتھا دن خوش بختی کا دن تھا۔ اس دوران میں شفیق کرم دین پر بھی ڈورے ڈالتا رہا تھا۔ بڑا گھاگ بوڑھا تھا۔ شفیق کو ہوشیار ہونا پڑا۔ پھر اس نے کرم دین کو سائیکل پر کہیں جاتے دیکھا اور وہ چھیمو کو تلاش کرنے لگا۔ چھیمو کوٹھی میں ہی مل گئی تھی۔

"یہ تمہاری دوستی ہے چھیمو؟" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"ارے ارے، پچھلے کمرے میں بیگم صاحبہ موجود ہیں۔"

"مجھے تو تم سے ملنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"وہ کرم دین چچا۔"

"آج تو وہ گئے ہوئے ہیں۔ چھٹی لے گئے ہیں۔ اوہ بیگم صاحبہ آواز دے رہی ہیں۔" وہ جھپاک سے باہر نکل گئی لیکن شفیق کے کانوں میں رس گھل گیا تھا۔ یہ دعوت تھی، کھلی دعوت۔ آج تو وہ گئے ہوئے ہیں۔ گویا۔۔ گویا۔ اس کا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ یہ اس کی ذاتی کوشش تھی۔ اس کے لئے اس نے توفیق صاحب کا سہارا نہیں لیا تھا ورنہ۔ یہ ابا جی مجھے بالکل ہی ناکارہ سمجھتے ہیں۔ جیسے میں کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

نہ جانے کس طرح وقت گزرا۔ ایک ایک پل طویل ہو گیا تھا۔ بہت سے خیالات اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے۔ چھیمو اس گھر کی نوکرانی ہے۔ اس کا عشق کوئی حل تو نہیں دے سکتا لیکن وقت گزاری کے لئے کیا بری ہے۔ جب تک ابا جی نزہت یا صوفیہ کی طرف اشارہ نہیں کرتے، وہی ٹھیک ہے۔ کچھ نہ کچھ تو جاری رہنا چاہیئے۔

رات ہو گئی۔ اس سے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ جلد سے جلد پوری کوٹھی تاریکی میں ڈوب جائے۔ سب لوگ سو جائیں لیکن اس رات حویلی والوں کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ توفیق صاحب شاہدہ بیگم سے نہ جانے کیا گفتگو کر رہے تھے۔

اور یہ رفیق نہ جانے کہاں گم گیا تھا۔

نشاط آج شام اُس ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے پر تُلی ہوئی تھی اُس سلسلے میں منگنوں پر منگنیں ہو رہی تھیں۔ صوفیہ اور نزہت بزدل تھیں کسی بھی سلسلے میں نشاط کا جرات سے ساتھ نہیں دے سکی تھیں۔ نشاط بے چاری تنہا ہی سب کچھ کر رہی تھی۔ ہاں چھیو اسے کام کی لڑکی مل گئی تھی۔ وہ بڑی بے خوبی اور کامیابی سے اپنا فرض انجام دے رہی تھی۔ ایک ایک لمحے کی رپورٹ نشاط کو مل رہی تھی۔ اور نشاط اُس کی کارکردگی سے مطمئن تھی۔ اس وقت بھی تینوں ایک تاریک کمرے میں بیٹھی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ صوفیہ اور نزہت کے رنگ فق تھے۔ نزہت کہنے لگی۔

" نشاط کہیں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ اچھی طرح سوچ لو۔"

" میں تو تمہاری اس بزدلی سے پریشان ہو گئی ہوں۔ ابا جان شیر کے شکاری تھے اور بیٹیاں اتنی بزدل۔ میں کہتی ہوں، کیا حادثہ ہو سکتا ہے۔ کوئی قتل ہو جائے گا کیا، گولیاں چلیں گی۔"

" ہم بدنام ہو جائیں گے۔ نوکروں کو بات پتہ چلے گی چھیو کا مسئلہ دوسرا ہے۔ وہ بے چاری نوکرانی ہے اور ہم لوگ اسے سنبھال لیں گے۔ لیکن امی کا مسئلہ۔۔۔"

" بس بس۔ تم انہی خدشات میں پھنسی رہنا زندگی بھر اور کوئی کام کی بات نہ کر پانا۔ میں ان لوگوں سے کس طرح نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں کہ پھر ان کا سایہ بھی نہ پڑ سکے اس گھر پر۔ دوسری شکل میں تو کوئی امکان بھی نہ رہے گا لیکن اس کے بعد جناب خالو جان اور خالہ جان ایسے بھاگ کے اڑیں گے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔"

" میری تو بُری حالت ہے۔" صوفیہ بولی۔

" تم آرام سے اپنے کمروں میں گھس کر سو جاؤ، میں تم سے کیا کہہ رہی ہوں۔"

" لیکن نشاط تمہیں یقین ہے کہ رفیق رات کو نشہ کرتا ہے؟"

" جی نہیں، بکواس کر رہی ہوں۔ ارے میں نے دس بار دیکھا ہے۔۔۔ بلاناغہ نشے میں ہوتا ہے کمبخت۔۔۔ ۔۔۔ نیند نہیں آتی صاحبزادے کو اس کے بغیر۔ ماں باپ معصوم سمجھتے ہیں۔ ابھی تو بچے کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔" نشاط دانت نکوس کر بولی۔

" نشے میں تو کبھی نہیں دیکھا۔" نزہت بولی۔

" آج دیکھ لینا۔ میں نے زبردست انتظام کیا ہے اور پھر وہ کمبخت نشے کے بعد نظر ہی کہاں آتا ہے سو جاتا ہے اس کے بعد۔"

" تجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

" تمہاری طرح گھر کی بدھو نہیں ہوں۔ ہوش میں رہتی ہوں۔ ایک سے ایک شاطر لڑکی کے ساتھ۔ تمہیں کیا معلوم یہ لڑکیاں کیا کیا باتیں کرتی رہتی ہیں۔"

" خدا خیر کرے نشاط! میرا تو دل ہولے جا رہا ہے۔" نزہت نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

" تو پھر قبول کیوں نہ کر لیتے عقیدت کے پھول۔ ٹھکرا کیوں دیا انہیں۔ کوئی دقت نہ ہوتی۔ خالو میاں کوئی نہ کوئی جال پھینک کر امی کو بھی رام کر ہی لیتے اور خیر سے تمہارے ہاتھ پیلے ہو جاتے۔ شوہر کو جام بھر بھر کر پلایا کرتیں۔۔۔۔ ۔ مجھے تم جیسی لڑکیوں پر سخت غصہ آتا ہے۔ نزہت بس، بے زیادہ میرا دماغ خراب مت کرو۔ مجھے بہت کام کرنا ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

رات خوب گہری ہو گئی تھی۔ گھر کے لوگ تقریباً سو گئے تھے ویسے آج خاص طور سے خاصی دیر تک جاگا گیا تھا۔ بات کچھ نہیں تھی بس باتیں ہوتی رہی تھیں اور خواب گاہوں کا رخ دیر میں کیا گیا تھا۔

رفیق اور شفیق ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کے رازدار تھے اور دونوں کی برائیاں ایک دوسرے کے علم میں تھیں۔ نشاط نے بڑی ذہانت سے آج کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ اسے علم تھا کہ آج شفیق بھی کمرے میں نہیں ہوگا۔

بہرحال وہ دبے قدموں رفیق کی خواب گاہ پر پہنچ گئی۔ اس نے آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دی۔ رفیق کے کمرے کی روشنی ابھی ابھی بجھی تھی لیکن دوسرے لمحے وہ دوبارہ جل گئی اور کچھ سرسراہٹیں ابھری تھیں۔ پھر رفیق کی آواز آئی۔

" کاؤن ہے ابھی سے آ گئے۔ کام نہیں بنا کیا؟" اور پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ کام تو بن گیا تھا۔

" ارے۔ نشاط۔۔۔ تم۔۔۔؟" رفیق نے اسے پہچان لیا۔

" ۔۔۔ کیا کر رہے ہو؟"

" اوہ۔ اوہ۔ کچھ نہیں۔ سونے کی۔۔۔" رفیق نے رک کر آنکھیں پھاڑیں "سونے کی تیاری کر رہا تھا۔"

" مجھے نیند نہیں آ رہی۔"

" آؤ۔ بیٹھو۔۔۔" رفیق بہکے ہوئے لہجے میں بولا۔ نشاط کی باتوں کی تصدیق ہو رہی تھی۔ وہ نشے میں مدہوش تھا۔

" آؤ نا۔ میں امی کے کمرے میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" نشاط

سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"اوہ نشاط۔ ... یہیں آجاؤ نا۔ شفیق یہاں نہیں ہے۔ آجاؤ۔" رفیق کی آواز لرزنے لگی۔

"نہیں ہے تو آجائے گا۔ میں جاتی ہوں۔ تم بھی دلیرہ سمجھا کر امی کے کمرے میں آجاؤ۔"

"امی کے کمرے میں کیا دوں۔ تمھارے کمرے میں کیا دوں نہیں؟"

"اوہ بحث مت کرو۔ امی میرے کمرے میں ہیں اور میں اُن کے کمرے میں سو رہی ہوں۔ کیوں یہ بعد میں بتادوں گی۔"

"ہوگئے ... ہوگئے ... زندہ باد ... ابھی۔ بس ابھی آیا۔" رفیق نے ہنستے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور نشاط جلدی سے واپس پلٹ پڑی۔ اس نے واپسی میں مہرالنسا بیگم کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے دھکیل کر دیکھا۔ دروازہ حسبِ معمول اندر سے بند نہیں تھا۔ نشاط نے پُرسکون انداز میں گردن ہلائی اور پھر دوڑتی ہوئی نزہت کے کمرے میں گھس گئی۔ جو مہرالنسا بیگم کے کمرے کے قریب تھا۔

دونوں لڑکیاں اندر سے لرزرہی تھیں۔ اُن کے مُنہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ "خدا تم لوگوں سے سمجھے۔ ہم نے تو حد کردی ہے۔ لے آؤ دیکھیں تو سہی۔" وہ دروازے کے پاس آگئی اور اس میں تھوڑی سی جھری کرکے باہر دیکھنے لگی۔

"جارہا ہے۔ خدا کی قسم جارہا ہے۔ آؤ تو سہی باجی، نزہت پلیز آؤ مزا کر کرامت کرو۔" بدقت تمام، دونوں لڑکیاں دروازے کے پاس پہنچ گئیں۔

باہر تاریکی میں رفیق کا ہیولا نظر آرہا تھا۔ امی کا کمرہ سامنے تھا۔ وہ رکا اور دوسرے لمحے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ لڑکیوں کے سانس رُکے جارہے تھے۔ نشاط البتہ مطمئن تھی۔ ایک ایک لمحہ سنسنی خیز تھا۔ دماغ پھٹے جارہے تھے۔ پھر جب امی کے کمرے میں ایک ہولناک چیخ گونجی تو صوفیہ بھی بے اختیار چیخ اٹھی۔ نشاط نے لپک کر صوفیہ کا مُنہ بھینچ لیا تھا۔

"خدا کی پناہ صوفیہ باجی، کہیں قتل تو نہیں کردیا امی کو۔ قابو میں رکھیں خود کو۔" اس نے بھینچی بھینچی آواز میں کہا۔ امی کے کمرے میں روشنی ہوگئی تھی۔ دوسری چیخ یقیناً رفیق کی تھی۔ پھر دروازہ بھڑاک سے کھلا اور رفیق نے باہر چھلانگ لگائی لیکن چوکھٹ میں اُلجھ کر اس بُری طرح گرا کہ نانی یاد آگئی ہوگی۔

دروازے میں امی نظر آئیں۔ شب خوابی کے لبادے میں ملبوس تھیں۔ "توفیق بھائی، توفیق بھائی۔ باہر آئیے۔ شاہدہ باہر آؤ۔ باہر آؤ تم لوگ ...۔" رفیق ایک بار پھر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف دوڑ پڑا تھا۔

■ شجاع احمد صاحب کی زندگی میں ایک جھگڑا نہیں تھا۔ دولت کی ہوس تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ وہ سارے ملک کی دولت اپنی تجوریوں میں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ اندر کا آدمی کبھی کبھی جاگتا تھا لیکن وہ اس پر حاوی تھے۔ اس کی بات پر اُنھوں نے کبھی کان نہیں دھرے تھے۔ یہ اندر کا آدمی تو ہمیشہ بہکاتا ہے۔ فضول باتیں کرتا ہے۔ نیکو کاروں کی بہت سی بستیاں آباد ہیں۔ جن میں بھوک، فلاس، بیماریاں پرورش پاتی ہیں۔ نورانی چہرے مفلسی سے زرد نظر آتے ہیں۔ اُنھیں یہ زرد چہرے ناپسند تھے۔ زردی ہو تو سونے کے انبار کی اور وہ سونے کے انبار لگالینے تھے ہر جائز اور ناجائز طریقے سے۔ چالاک آدمی تھے۔ ہمیشہ پہلو بچاکر کام کرتے رہے تھے۔ شہر میں ان کی کئی ملیں اور فیکٹریاں کام کررہی تھیں۔ ان فیکٹریوں میں مختلف چیزوں کی پروڈکشن ہوتی تھی۔ صاف ستھرا مال باہر نکلتا تھا۔ اور بڑی ایمان داری سے صحیح داموں فروخت ہوتا تھا۔ حکومت کو کبھی اُن سے ٹیکس کی شکایت نہیں ہوئی تھی لیکن درپردہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ملک کی مارکیٹ میں شجاع احمد صاحب کا کتنا ناجائز مال پھیلا ہوا ہے۔ اسمگلنگ کے ذریعے جو کچھ باہر سے آتا تھا، وہ ان بڑی بڑی عظیم الشان فیکٹریوں کے نیچے بنے ہوئے تہہ خانوں میں اسٹور ہوجاتا تھا اور ان فیکٹریوں کی طرف کوئی بھی نگاہ اُٹھاکر نہیں دیکھتا تھا چونکہ بڑی اچھی ساکھ تھی ان کی۔ پھر یہ مال بازار میں پھیل جاتا تھا۔ اس طرح کے نظام قائم کررکھے تھے شجاع احمد صاحب نے اپنے چند دوستوں کی مدد سے کہ کوئی آنچ ان پر نہ آئے۔ بہت ہی چالاکی سے اُنھوں نے اپنا یہ کاروبار آگے بڑھا رکھا تھا۔ ایک طرف تو حکومت کی نگاہ میں اُن کی شخصیت انتہائی ارفع و اعلیٰ تھی اور وہ ایک انتہائی ایمان دار تاجر گردانے جاتے تھے لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی تھا جو ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہوا تھا۔ سوائے ان چند افراد کے کہ جو اس سلسلے میں براہِ راست ملوث تھے۔ کسی ایک آدمی کے بارے میں شجاع احمد صاحب نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ بُرے آدمی ضرور تھے لیکن اُن کی بُرائیوں میں ایک خاص بات تھی۔ وہ قتل و غارت گری اور خونریزی سے پرہیز کرتے تھے۔ وہ اسمگلنگ ضرور کراتے تھے لیکن اُن کے کارکنوں کو ان کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ دہشت گردی اور درندگی نہ کریں۔ اگر کبھی مال پکڑا جائے تو وہ جان بچاکر فرار ہوجائیں۔ پولیس پر ایک بھی فائر نہ کریں۔ یہ ان کی ذہانت کی ایک اور مثال تھی۔

اپنی اولاد کے لئے بہت اچھے باپ تھے۔ بچپن سے حسام احمد صاحب سے ڈرتے تھے اور آج تک یہ خوف قائم تھا۔ مجموعی طور پر وہ کیا تھے۔ اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا۔

آج کل زاہدان کے ذہن کی خلش بن گیا تھا۔ گھر میں وہ ایک

حکیم الطبع بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ بچوں کے معاملات میں مداخلت ضرور کرتے تھے لیکن ایک حد تک تاکہ بچوں کو ناگوار نہ گزرے۔ فضول خرچیوں کی اجازت نہیں دیتے تھے اور جائز ضروریات میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ چنانچہ اس طرح ایک معتدل نظام قائم تھا۔ اس کوٹھی میں لیکن حسام احمد صاحب کا یہ نیا شوق ان کو بہت گراں گزر رہا تھا۔ یہ صرف انتظامیات تھی

فرسٹ ایڈ ہاؤس نے بظاہر تیزی سے ترقی [illegible] پیش کیے تھے جس کا [illegible] زاہد تھا۔ یہ دشمن کون ہے۔ یوں اس کوٹھی میں [illegible] رکھا ہے۔ یہ بات شجاع احمد صاحب کے لیے پریشان کن تھی۔ [illegible] وہ تھے اس بات سے کہ کہیں یہ کوئی گورنمنٹ کا آدمی نہ ہو [illegible] ان کی [illegible] لیکن جب [illegible] پر نگاہ ڈالتے تو [illegible] بات [illegible] کہ [illegible] ایسا [illegible] سے [illegible] چلے [illegible] کہ گئے نام افراد ان سے متاثر تھے اور خود [illegible] ان کا دست [illegible] تھے۔ [illegible] ایسا [illegible] تھا جس نے اپنا [illegible] ان کے [illegible] بکھیر دیا تھا۔ اگر یہ دشمن کسی انتظامی محکمے سے متعلق نہیں، [illegible] تو پھر یہ کوئی جرائم پیشہ آدمی ہو سکتا ہے جو دولت کے [illegible] یہاں آ گھسا ہے۔ ٹرین میں اس کی بے باکی شجاع احمد صاحب کو عجیب لگی تھی لیکن دل ہی دل میں انھوں نے اعتراف بھی کیا تھا کہ عجیب سا نوجوان ہے پرکشش شخصیت کا حامل۔ البتہ انھیں یہ گمان نہیں تھا کہ ٹرین کا یہ ہم سفر ان کی کوٹھی تک پہنچ جائے گا۔

لیکن اس [illegible] تھے یعنی حسام احمد صاحب جب تک وہ زندہ تھے شجاع احمد صاحب کو یقین تھا کہ وہ کبھی اپنی بات ان کی بات سے اونچی نہ کر سکیں گے اور آج وہ اس شخص کے بارے میں بڑی گہرائی سے سوچ رہے تھے۔

زاہد ذوالفقار زیدی۔۔۔ اگر اس شخص کے ذہن میں کوئی خطرناک منصوبہ ہے تو اس سے ہوشیار ہونا ضروری ہے گھر کے لوگ تو ناتجربے کار اور احمق ہیں۔ ابا جان تو بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اب ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں تقریباً ختم ہو گئی ہیں۔ پھر یہ شخص کیا چکر چلا رہا ہے گھر کے لوگوں کو مٹھی میں لے کر اس نے کیا جال پھیلا رکھا ہے۔

ایک بار تو ان کا دل چاہا کہ اس کا قصہ ہی پاک کرا دیں۔ خواہ کسی دوسرے ملک پہنچوا دیں اور ہدایت کر دیں اپنے آدمیوں کو کہ یہ شخص دوبارہ یہاں داخل نہ ہونے پائے لیکن ہمت [illegible] ٹوٹتی تھی۔ وہ اس احساس سے ہی خوفزدہ ہونے لگتے تھے

لیکن اب تو یہ زاہد ذوالفقار زیدی بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ بات اگر صرف حسام احمد صاحب کی ضروریات تک محدود رہتی تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن اس بزنس کانفرنس نے شجاع احمد کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ شخص اتنی دور تک جا سکتا ہے اس بارے میں شجاع احمد صاحب نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تعمیر کالونی، اس زمین پر حسام احمد صاحب کا قبضہ یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں جو شجاع احمد کسی طور برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں کیا بلکہ کروڑوں روپے خرچ ہو گا اور اس کے بعد [illegible] ہوتا ہی رہے گا۔ بھلا ایک ایسا [illegible] جو غریبوں کی اعانت کے لیے بنایا گیا ہو ذاتی بنیادوں پر کیسے چل سکتا ہے حکومت سے لے کیا مل جائے گا [illegible] اپنے بارے [illegible] ساری چیزیں تو دکھاوے کی ہوتی ہیں اخبارات میں خبریں اور [illegible] چھپوانے کے لیے اس قسم کے [illegible] کیے جاتے ہیں۔ حقیقتیں تو کچھ اور ہی ہوتی ہیں اور ان حقیقتوں سے شجاع احمد صاحب جیسے شخص واقف نہ ہوتے تو اور کون ہوتے۔

گھر کے ایک ایک فرد پر زاہد اس طرح چھایا ہوا تھا کہ کوئی اس کے خلاف ایک لفظ سننے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ بیگم شجاع جیسی سنجیدہ خاتون جو بہت کم کسی پر ایمان لاتی تھیں اس کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگی تھیں۔

شجاع احمد صاحب کو ان ساری باتوں کی بہت زیادہ پروا نہ ہوتی لیکن بس یہ احساس انھیں مارے دے رہا تھا کہ کہیں یہ نوجوان کوئی بہت گہری چال نہ چل رہا ہو۔ کافی دیر تک وہ سوچتے رہے پھر انھوں نے اس سلسلے میں حسام احمد صاحب سے ہی بات کرنا مناسب سمجھی اور وہاں سے اٹھ کر ان کے پاس پہنچ گئے۔

اتفاق ہی کی بات تھی کہ زاہد ذوالفقار اس وقت۔۔ حسام احمد صاحب کے پاس موجود نہیں تھا وہ کہیں گیا ہوا تھا چنانچہ۔۔۔ حسام احمد صاحب انھیں تنہا مل گئے۔

"ابا میاں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں کہو۔ آؤ۔۔۔" حسام احمد نے نرم لہجے میں کہا۔

"ابا میاں آپ نے بڑی محنت سے یہ گھر تعمیر کیا ہے۔ بڑی مشقت کی گئی ہے اس کی بنیادوں میں۔ آپ ہی کی وجہ سے آج ہمارے باغ میں پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ میں اس بات کا معترف ہوں ابا میاں کہ آپ نے ہمیشہ مجھے ذہانت کے راستے دکھلائے اور آپ ہی کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر آج میں اس مقام تک پہنچا ہوں لیکن ابا میاں کیا آپ اس بات کو

تسلیم نہیں کرتے کہ گزرنے والا ہر لمحہ گزرنے ہونے بھلے سے زیادہ ذہانت کا حامل ہوتا ہے۔ وقت انسان کو بہت سے تجربات دیتا ہے اور ان تجربات کے لئے تھوڑا وقت دیتا ہے۔

"دیکھو بھائی میں جاہل قسم کا آدمی ہوں۔ مجھ سے فلسفے کی زبان مت بول، جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔" حسام احمد صاحب چکرا دینے والے انداز میں بولے اور شجاع احمد صاحب جلدی سے سنبھل گئے۔ یہ زبان حسام احمد صاحب کے غصے کا احساس دلاتی ہے چنانچہ انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

"ابا میاں میں کالونی والی زمین کی بات کر رہا ہوں۔ اتنی قیمتی زمین ہے وہ اور اتنا بڑا پروجیکٹ ہے وہ میرا کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔"

"پھر وہیں آ گئے تم... آخر کیا مصیبت آ جائے گی تم پر اگر میں اس زمین کو استعمال کر لوں تو...!"

"اوہو نہیں ابا جان میرا یہ مقصد نہیں ہے۔ آپ تو میرا جو کچھ موجود ہے وہ سب استعمال کر ڈالیں تب بھی میری پیشانی پر شکن نہیں آئے گی۔ آخر یہ ہے کس کا دیا ہوا۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ پسند کریں تو میں کوئی دوسری جگہ اس کام کے لئے مختص کر دوں!"

"ہاں ہاں کر دو... کر دو شہر سے تقریباً دو سو میل پرے۔ وہاں جہاں چڑیا کا بچہ بھی پر نہ مار سکے۔ تم کوئی جگہ ہمارے حوالے کر دو۔ ہم وہاں فرسٹ ایڈ ہاؤس بنا لیں گے لیکن وہاں تک پہنچنے والوں کے لئے شہر ہی سے طبی امداد فراہم کرنا ہو گی۔ کیا خیال ہے تمہارا...؟"

"نہیں نہیں ابا میاں اتنی دور نہیں۔ بس یہیں کہیں مناسب جگہ، آپ اس کے لئے مجھے موقع تو دیں۔"

"دیکھو بھائی جو کچھ فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ اس پر میں اٹل ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات کرنا ہو تو حاضر ہوں۔"

"آخر آپ اس احمقانہ کام کو کر کے کیا حاصل کر لیں گے ابا میاں؟"

"کیا مطلب؟ ہوش درست ہیں تمہارے؟" حسام احمد غرائے۔

"نن... نہیں میرا مطلب ہے ابا میاں آپ کو یہ تمام راستے ...ی زاہد نے دکھائے ہیں نا؟ ابا میاں ایک بار پھر میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس شخص پر نظر ثانی کر لیں۔"

...

...ی بات کر رہا ہوں۔"

... مجھے نظر ثانی کرنی پڑی بیٹا تو اس سے پہلے میں تم پر نظر ثانی کرنا پسند کروں گا اور میں یہ غور کروں گا کہ میری تربیت میں کہاں خامی رہ گئی تھی جو تمہارے اندر یہ فطرت پیدا ہو گئی۔"

شجاع احمد صاحب ایک لمحے کے لئے جھلا گئے لیکن باپ کے سامنے تھے، جانتے تھے کہ آج بھی حسام احمد صاحب کے بدن میں بڑی جان ہے اور آج بھی انہیں اپنے ذہن پر قابو پانا اسی طرح مشکل ہو گا جس طرح شجاع احمد صاحب کے بچپن میں۔ جوتا اٹھائیں گے اور پل پڑیں گے اور اس کے بعد تماشہ دیکھنے کے قابل ہو گا۔ اس لئے خود کو سنبھال کر بولے۔

"بڑا سرمایہ خرچ ہو گا ابا میاں، آپ کا ہو یا میرا، بہر صورت الگ الگ تو نہیں ہے۔ آپ کو اس سے ملے گا کیا۔ چند روز کے بعد پریشان ہو جائیں گے۔ سارے بھوکے ننگے آپ کو گھیر لیں گے۔ آپ اس قوم کے بارے میں نہیں جانتے۔ محنت کرنے کی بجائے یہ ہاتھ پھیلانا پسند کرتی ہے۔ شہر میں لاکھوں ایسے مناظر آپ کو دیکھنے کو ملیں گے کہ ہٹے کٹے تندرست لوگ کسی بھی ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوں گے یا بیٹھے ہوں گے کہ کوئی آئے اور انہیں محتاج سمجھ کر کھانا کھلا دے۔ یہ ہے فطرت ہماری اس قوم کی ابا میاں لوگ کام کی بجائے آپ کے اس فرسٹ ایڈ ہاؤس کو گھیر لیں گے۔ آپ کی زندگی عذاب ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے بھائی میں انہی بھوکے ننگوں کے درمیان زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ اگر میں تمہاری کوئی خدمت کر سکتا ہوں تو حاضر ہوں۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس اس کالونی والی زمین پر تعمیر ہو گا جس میں تم کوئی ... بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے وسائل سے کام لے کر میرا نقشہ جلد از جلد پاس کرا دو اور ہاں ایک بات سن لو میں یہ بھی اندازہ کر چکا ہوں کہ تم اس کے مخالف ہو۔ نقشہ پاس کرانے کے سلسلے میں تم تساہل ہی سے کام نہیں لو گے بلکہ اس کی مخالفت بھی کرو گے۔ تو سنو میرے بیٹے، میرے بچے یہ نقشہ جلد ہی پاس ہو جانا چاہئے ہر قیمت پر۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے کاموں میں کوئی پیچ نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو تم جیسے لوگ اسے دور کر لیتے ہیں سمجھے۔ نقشہ پاس کرا کے اسے جلد سے جلد میرے حوالے کر دو۔ میں نقشہ بنانے کے لئے دے چکا ہوں۔" حسام احمد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"جی ابا میاں۔" شجاع احمد صاحب ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ بولے۔ اب کوئی ترکیب نہیں رہ گئی تھی سوائے اس کے کہ اس کڑوے گھونٹ کو پی لیا جائے لیکن یہ کڑوا گھونٹ اگر یہیں تک محدود رہتا تو ٹھیک تھا لیکن زاہد ذوالفقار زیدی نجانے اور

گیا یا سوچ رہا تھا۔ وہ بس اسی کے لئے پریشان تھے۔ آپا میاں کے پاس سے بالکل ناکام اور مایوس ہو کر آئے تھے اور اب ان کے سامنے اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

☆

مہر النساء بیگم کی زوردار ایک ایسی خونخوار گرج تھی کہ اس سے قبل لڑکیوں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ صوفیہ نے لپک کر باہر نکلنے کی کوشش کی تو نشاط نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے روک لیا۔

"ارے ارے کیا کر رہی ہیں صوفیہ باجی، ابھی نہیں ابھی نہیں ذرا ڈرامہ آگے بڑھنے دیجئے۔" وہ بدستور سرگوشی کے انداز میں بولی

اور صوفیہ رک گئی۔ اس کا بدن بدستور ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ بمشکل تمام اس نے کہا۔

"نشاط کی بچی تو تو بڑی عجیب ہے۔"

"بس بس آپ خاموش رہیں تو بہتر ہے میری بہن ہو کر اتنی بزدلی۔ کمال کی بات ہے۔ ایسے مزے سے بیٹھئے۔ اس ڈرامے کو دیکھئے تو سہی میں نے کیا کر دکھایا ہے۔ وہ کام کیا ہے میں نے جو سکندر اعظم نے بھی نہ کیا ہوگا۔" نشاط کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔

وہ اپنے اس کارنامے پہ بے حد خوش تھی اور باہر توفیق صاحب درشاہدہ بیگم حیران و پریشان مہر النساء بیگم کے سامنے پہنچ گئے تھے۔

"کیا ہوا... کیا ہوا؟ بات کیا ہے؟" توفیق صاحب گھبرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "کوئی چور گھس آیا ہے کیا؟ کیا ہو گیا؟"

"جو کچھ ہو گیا ہے توفیق بھائی آئیے ذرا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں آئیے میرے ساتھ...!" مہر النساء بیگم نے توفیق صاحب کا بازو پکڑ کر انہیں آگے دھکیلتے ہوئے کہا اور توفیق صاحب ٹھٹک گئے بازو پر جو گرفت تھی اس سے انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ گرفت دوستانہ نہیں ہے۔ کوئی خاص ہی بات ہو گئی ہے۔ مہر النساء انہیں گھسیٹتی ہوئی رفیق کے کمرے میں لے گئیں۔ دروازے پر لات ماری۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بے چارہ رفیق دروازہ اندر سے بند بھی نہیں کر سکا تھا۔

مہر النساء بیگم نے توفیق صاحب کو کمرے میں دھکیل دیا اور خود بھی ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئیں پھر انہوں نے دیوار پہ لگا ہوا سوئچ دبا دیا۔

رفیق مسہری کے نیچے گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مہر النساء بیگم نے انتہائی تلخ آواز میں کہا۔

"نکالئے اسے، نکالئے باہر نکالئے، میں کہتی ہوں۔ اسے فوراً باہر نکالئے۔" انہوں نے غراتی ہوئی آواز میں کہا اور توفیق صاحب پھٹی پھٹی نگاہوں سے رفیق کو دیکھنے لگے۔ پھر سنبھل کر بولے۔

"ابے کیا کر رہا ہے وہاں، باہر نکل... نکل باہر۔" وہ متحیر تھے رفیق مسہری کے نیچے گھس گیا تھا لیکن اس کی دونوں ٹانگیں باہر ہی تھیں۔ توفیق صاحب کو اور کچھ نہ سوجھا تو انہوں نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اسے باہر کھینچ لیا۔ رفیق تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"کھڑا ہو جا۔ میں کہتا ہوں کھڑا ہو جا۔ کیا کیا ہے تو نے، کیا کیا ہے؟"

"میں بتاتی ہوں کہ کیا کیا ہے اس نے۔ آپ کو شراب کی تمیز تو ہو گی توفیق صاحب پہلے ذرا اس کا منہ سونگھیے۔"

"ایں، اوہ، آخ تھو" توفیق صاحب حیرت سے اچھل پڑے۔ پھر انہوں نے رفیق کا گریبان پکڑ لیا اسے اپنی طرف گھسیٹا اور اس کا منہ سونگھنے لگے۔ دوسرے لمحے انہوں نے گریبان چھوڑ کر منہ پیچھے ہٹا لیا تھا۔

"تت تو نے... تم نے... نے... کیا ہے؟" انہوں نے سخت غصیلے لہجے میں پوچھا۔

"نن نہیں ابا۔ قسم لے لو قسم لے لو ابا میں نے... مم میں نے... نہیں ابا...!"

"ہوں، قسم تو میں اچھی طرح لے لوں گا"

"یہ شفیق کہاں مر گیا؟ میں کہتا ہوں شفیق او شفیق...!"

لیکن شفیق کمرے میں ہوتا تو بولتا۔ وہ تو کمرے میں موجود ہی نہیں تھا۔ توفیق صاحب چاروں طرف دیکھنے لگے۔ "شفیق کہاں ہے؟" انہوں نے غراتے ہوئے لہجے میں رفیق سے پوچھا۔

"وہ... وہ... پتہ نہیں ابا۔ مم مجھے اللہ قسم مجھے نہیں معلوم۔" رفیق نے جھوٹ بولا۔ شاید یہ بھائی کو بچانے کی کوئی کوشش تھی۔

لیکن ابھی یہ بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ کوٹھی کے بیرونی حصے سے شور و غل کی آوازیں سنائی دیں۔ اچھی خاصی زوردار آوازیں تھیں۔ سب ہی چونک پڑے۔ خود مہر النساء بیگم بھی... انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر کوٹھی کے صدر دروازے کی جانب چل پڑیں۔ ان آوازوں نے انہیں ایک لمحے کے لئے اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات سے غافل کر دیا تھا۔ وہ صدر دروازہ کھول کر باہر نکلیں اور اب لڑکیوں نے اپنے کمروں میں گھسے رہنا مناسب نہیں سمجھا۔ نشاط نے صوفیہ اور نزہت کو اشارہ کیا تو وہ تینوں باہر نکل آئیں... توفیق صاحب، رفیق، شاہدہ بیگم ہکا بکا کھڑے ہوئے تھے۔ توفیق صاحب بھی رفیق کے کمرے سے نکل آئے تھے پھر وہ صورت حال جاننے کے لئے

مہرالنساء بیگم کے پیچھے چل پڑے۔

شور و غل کی آوازیں ملازموں کے کوارٹروں کی طرف سے آرہی تھیں اور زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دو تین ملازم شفیق کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے صدر دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ صدر دروازے پر پیلے رنگ کا ایک بلب لگا ہوا تھا۔ اس کی روشنی میں بیگم مہرالنساء سامنے گھور رہی تھی۔

سب سے آگے چھیمو روتی پیٹتی بین کرتی آرہی تھی۔ "بچالیے سرکار۔ بچ گئے ہم تو۔ ورنہ عزت لٹ گئی تھی ہماری سرکار ہم غریب لوگ محنت کرتے ہیں عزت نہیں بیچتے۔ اگر یہی کام کرنا ہوتا سرکار تو ہم بازاروں میں جاکر بیٹھتے سرکار دہائی ہے دہائی۔"

"مہرالنساء بیگم کا پورا بدن غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ شفیق کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا وہ آگے بڑھیں چھیمو کے قریب پہنچ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا ہوا چھیمو کیا ہوا؟"

"سرکار عزت لوٹنے لگا تھا یہ پاپی۔ وہ تو سرکار اللہ نے بچالیا ہم کو۔ بتائیں سرکار بس چلا ہم کیسے رہ سکتے ہیں آپ خود سوچیں سرکار ہماری عزت اتنی سستی تو نہیں ہوتی۔" چھیمو آنسو بہاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ پھر ایک اور ملازم نے آگے بڑھ کر کہا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے سرکار، اس حویلی کی تو شان ہی نرالی تھی۔ یہاں یہ سب کچھ کیا ہونے لگا۔ بڑے سرکار کے مرتے ہی یہ سب کیا ہوگیا۔ بتائیے سرکار ہم کیا سوچیں اس بارے میں۔ ہم کیا سوچیں، اگر یہی سب کچھ ہونا ہے ہمارے ساتھ تو ہمیں اجازت دیں کہ ہم یہاں سے اپنی عزتیں بچاکر باہر نکل جائیں"

مہرالنساء بیگم سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ توفیق صاحب کے بدن کا تمام لہو جیسے خشک ہوگیا تھا اور شاہدہ بیگم ایک دیوار کا سہارا لئے کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے صوفیہ، نزہت اور نشاط خاموش کھڑی تھیں۔ اب اس سلسلے میں استفسار کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی جو کچھ ہوچکا تھا سب کے سامنے تھا۔

شفیق ابھی تک ملازموں کی گرفت میں تھا اور کسی بھیگے ہوئے چوہے کی مانند نظر آرہا تھا۔ ملازموں نے شاید اس کی خاصی خاطر تواضع کردی تھی۔ چہرے پر خراشیں اور جابجا نیلے دھبے نظر آرہے تھے۔

مہرالنساء بیگم نے چھیمو کا بازو پکڑا اور اسے لئے ہوئے اندر کی سمت چل پڑیں۔ نشاط، صوفیہ اور نگہت بھی ان کے پیچھے چل پڑی تھیں۔ پھر مہرالنساء بیگم، چھیمو کو اپنے کمرے میں لے آئیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"نہیں بیٹے روتے نہیں ہیں۔ خدا نے تمہیں بچا دیا نا۔"

"جی بڑی سرکار اللہ نے ہماری عزت بچالی پر بڑی سرکار اب تو ہم دشمنوں کے بیچ آگئے ہیں۔"

"نہیں ہرگز نہیں۔ تم بھروسہ رکھو۔ جو کچھ ہوچکا ہے۔ آئندہ کبھی نہیں ہوگا کبھی بھی نہیں اور اگر ایسا ہوا تو میں خودکشی کرلوں گی میرے بعد تم لوگ یہاں سے چلے جانا، جہاں دل چاہے چلے جانا لیکن اس وقت حویلی کی عزت ہے، تمہیں زبان بند رکھنا ہوگی۔" مہرالنساء بیگم نے کہا۔

"بڑی سرکار آپ بےفکر رہئے۔ آپ کے لئے تو ہم اپنی جان دے سکتے ہیں۔"

"کسی سے نہیں کہوگی تم اس واقعہ کو چھیمو کوئی بھی کسی سے نہیں کہے گا۔ میں آج ہی سے کوشش کروں گی۔ یہ حویلی کی عزت کا سوال ہے۔ جو کچھ ہوا ہے میری غفلت اور لاپروائی کی وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے افسوس ہے۔ مجھے افسوس ہے۔" مہرالنساء بیگم کی آواز مدھم پڑ گئی اور چھیمو کے آنسو خشک ہوگئے۔ اس نے گردن جھکالی تھی۔

* * *

بہت کم وقت ایسے ہوتے تھے جب شجاع احمد صاحب کو باہر کے کاموں سے فرصت ہو اور وہ گھر میں وقت گزاریں۔ گھر والے ان کی غیر حاضری کے عادی ہوگئے تھے اور اب گھر میں کوئی تقریب ہو یا کوئی بھی ایسی تقریب جس میں سارا گھر حصہ لے رہا ہو شجاع احمد صاحب کی کمی کو محسوس نہیں کیا جاتا تھا خود بیگم شجاع احمد بارہا اس سلسلے میں شجاع احمد سے شکایتیں کرچکی تھیں لیکن وہ اپنی مصروفیات کا بہانہ کردیتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اب اس کی عادی نہیں رہی تھیں۔ جن دنوں شجاع احمد گھر میں رہتے ان سب کو حیرت ہوتی تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ الجھن سی محسوس کرتے تھے سب کے سب۔ حالانکہ بیٹے اور بیٹیاں باپ سے محبت کرتے تھے لیکن بس ایک عادت بن چکی تھی ان کی۔

ان دنوں شجاع احمد گھر پر وقت گزار رہے تھے۔ شاید کوئی مصروفیات نہیں تھی ان کی یا پھر تھک گئے تھے اور آرام کرنا چاہتے تھے یا پھر کوئی تیسری بات جو ان کے ذہن کی گہرائیوں میں ہی پوشیدہ ہوسکتی تھی یہ ہوگی کہ اس دوران وہ زاہد ذوالفقار کی نگرانی کررہے تھے، وہ اس شخص کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے اور اس بات کو معلوم کرنے کے خواہش مند تھے کہ اس کی آمد

کی وجہ کیا ہے یا اس کی مقبولیت کا کیا راز ہے۔ اکثر وہ کوٹھی کے مختلف حصوں میں نکل جاتے تھے۔

اس وقت بھی وہ ٹہلتے ہوئے اوپری منزل پر اس جگہ آ گئے جہاں قدسیہ نے اپنا نگار خانہ بنایا ہوا تھا۔

نگار خانے کا وسیع و عریض ہال گوناں گوں تصویروں سے سجا ہوا تھا لیکن یہ تصویریں ایسی تھیں جنہیں دیکھ کر شجاع احمد صاحب سر پیٹنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ بڑے بڑے مصوروں کی تجریدی پینٹنگز جو دیواروں پر آویزاں تھیں۔ یہ تجرید ابھی تک دوسروں کی طرح ان کی سمجھ میں بھی نہیں آ سکی تھی لیکن جدید رجحان اسی سمت تھا۔ ایک دو بار انھیں ایسی نمائشوں میں مدعو کیا گیا تھا جو کسی بڑے مصور کی تصویروں کی تھیں اور وہاں شجاع احمد بھی سوچتے رہ جاتے تھے کہ آرٹ گیلری میں لگی ان تصویروں کا مقصد کیا ہے۔ ایک دو بار انھیں اس سلسلے میں مہمانِ خصوصی بنانے کی پیشکش کی گئی تو انھوں نے صاف گوئی سے کہا۔

"بھائی میں کسی ایسی تقریب کا مہمانِ خصوصی کیسے بن سکتا ہوں جو میری سمجھ ہی سے باہر ہو۔ اگر تم لوگ مجھ سے ان تصویروں کے بارے میں کچھ کہلوانا چاہو گے تو یقین کرو کہ میں بھی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کروں گا کہ ان تصویروں کی اہمیت ہی ختم ہو جائے گی۔"

لیکن اب یہ مرض ان کے گھر تک پہنچ چکا تھا۔ سامنے ہی انھوں نے اس نوجوان مصور کو دیکھا جو شکل و صورت سے اچھا خاصا اور شریف نظر آتا تھا۔ وہ عقب میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے عین سامنے قدسیہ ایک کینوس بورڈ پر ایک تصویر بنا رہی تھی۔

غالباً اس تصویر کو وہ آخری ٹچ دے رہی تھی۔

شجاع احمد صاحب جب اندر داخل ہوئے تو نوجوان مصور اُٹھ کھڑا ہوا۔ شجاع احمد صاحب کو اس نے سلام کیا تھا اور شجاع احمد صاحب نے شرافت سے اس کا جواب بھی دیا تھا لیکن اس کے بعد وہ اس کی جانب متوجہ نہ ہوئے اور قدسیہ کے قریب پہنچ گئے۔ قدسیہ باپ کو دیکھ کر مسکرانے لگی تھی پھر اس نے کہا۔

"آئیے ابو، زہے نصیب کہ آپ نے آج ہمارے اس نگار خانے کا رُخ کیا۔"

"ہاں بھئی دیکھنا چاہتا تھا میں کہ تم نے جس زور و شور سے جو کام شروع کیا ہے، اس کی کیفیت کیا ہے؟"

"تو دیکھ لیجئے ابو۔ اُستاد صاحب کا کہنا ہے کہ میں قدرتی فنکار ہوں۔"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ اُستاد صاحب یہ نہ کہیں گے تو اور کون کہے گا؟" شجاع احمد صاحب طنزیہ انداز میں بولے۔

"دیکھئے ابو میں نے یہ تصویر مکمل کر لی ہے۔ یوں سمجھیے کہ یہ میری پہلی مکمل تصویر ہے۔ اب میں لاتنوں کی ڈیلے نکل آئی ہوں۔"

"ٹھیک ٹھیک ٹھیک۔ تو یہ تصویر ہے۔" شجاع احمد صاحب رنگوں کے اس ملغوبے کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی ابو۔ ذرا بتائیے تو سہی یہ کیسی ہے؟" قدسیہ نے پوچھا۔

"میں تو اسے اپنی تقدیر سمجھتا ہوں۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"جی... میں سمجھی نہیں ابو۔"

"ہاں ہاں بھئی تصویر اور تقدیر میں تھوڑا سا ہی فرق ہے۔ تصویر کی خرابی ہے یا میری تقدیر کی خرابی کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"اوہ ابو میں آپ کو سمجھاتی ہوں۔ براہ کرم اس طرف آئیے۔" قدسیہ نے کہا۔

"بھئی بدلتے ہوئے ادوار ہیں یہ۔ کل کی مصوری خود بخود سمجھ میں آتی تھی۔ کسی بھی تصویر کو دیکھ لو۔ پتہ چل جاتا تھا کہ مصور کا ذہن کس طرف چل پڑا ہے اور آج کی تصویر کے لئے مصور کو سمجھانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر وہ کسی کو نہ سمجھائے تو خدا کی قسم کوئی کچھ نہ سمجھے۔" شجاع احمد صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر ہنستے ہوئے بولے۔ "سمجھاؤ بھئی سمجھاؤ یہ کیا ہے؟"

"یہ سراب ہے ابو۔" قدسیہ نے کہا۔

"س والا یا ش والا؟" شجاع احمد بولے۔

"سراب... سراب... دھوکا، فریب...!"

"خوب۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے، یہ میں نے مان لیا۔ فنِ مصوری کے لئے تجریدیہ سب سے بڑا دھوکا ہے۔" شجاع احمد صاحب بولے۔

"ابو آپ اُستاد صاحب کے سامنے یہ بات کہہ رہے ہیں۔ ہمارے اُستاد ایک عظیم مصور ہیں۔"

"بہت خوب... بہت خوب۔ واقعی میں ان کی عظمت اس کینوس پر دیکھ رہا ہوں۔" شجاع احمد صاحب طنزیہ انداز میں سرفراز کی جانب مڑ کر بولے۔ سرفراز خاموش کھڑا تھا۔

بہت ہی حسّاس نوجوان تھا۔ ذرا ذرا سی بات کو دل پر لے لیتا تھا۔ شجاع احمد صاحب کی طنزیہ گفتگو اسے اپنے سینے پر نشتر کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔

"کیوں نوجوان مصوّر، کیا سمجھا ہے ہو اس پینٹنگ کو؟" انھوں نے سوال کیا۔

"غالب خود کبھی اپنے کسی شعر کی تشریح نہ کر سکے۔ شاعر شعر کہہ دیتا ہے اور اسے سمجھنے والا صحیح معنوں میں اس کا قدردان ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری کے بارے میں اگر کسی سے پوچھا جاتا تو وہ بہادر شاہ ظفر یا استاد ذوق تھے جو اس شاعری کی روح میں اتر سکتے تھے۔" دروازے سے آواز آئی اور شجاع احمد صاحب چونک کر پلٹے۔ زاہد مسکراتا ہوا اندر آ رہا تھا۔

شجاع احمد صاحب کے ہونٹ بھنچ گئے۔ "آپ کی آمد کا مقصد؟" انھوں نے سوال کیا۔

"سراب کی رونمائی۔" زاہد نے فوراً گردن خم کر کے جواب دیا۔

"لیکن میں آپ سے اس کا خواہش مند نہیں ہوں۔" شجاع احمد صاحب جتا کر بولے۔

"میں نے عرض کیا نا کہ غالب کے شعر کا صحیح حسن استاد ذوق کی نگاہ میں دیکھا جائے۔ دیکھیے یہ سراب ہے۔ رنگوں کی اپنی زبان اپنی کہانی ہوتی ہے۔ پرانے دور کے عکاس ان رنگوں کو دوسرے درجے کی چیز سمجھتے تھے اور انھیں صرف اس لیے استعمال کرتے تھے کہ تصویر خوشنما معلوم ہو۔ جیسے جیسے رنگوں کی زبان سمجھی گئی۔ لائنیں بے مقصد ہو کر رہ گئیں۔ ہر رنگ اپنی زبان خود رکھتا ہے۔ اپنی کہانی خود کہتا ہے۔ یہ زرد رنگ نفرت اور مایوسی کا علمبردار ہے۔ سرخ رنگ میں تیزی اور شدت پائی جاتی ہے۔ نیلا رنگ امن پسندی اور مسکراہٹوں کا امین ہے۔ سبز رنگ میں نرمی اور بزرگی پائی جاتی ہے۔ سو جناب محترم ہر رنگ کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے اور پھر ان مخصوص لائنوں سے ہٹ کر زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں کو برش کی مدد سے نمایاں کیا گیا ہے جن پر چلتے ہوئے انسان اپنی شخصیت کھو بیٹھتا ہے۔ وہ ان راستوں سے اپنی منزل کا تعین کرتا ہے حالانکہ یہ راستے اس قدر ناہموار ہوتے ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان ناہموار راستوں کے جال میں انسان بھٹک تو سکتا ہے منزل کبھی نہیں پا سکتا۔ یہ رنگ اس بات کے عکاس ہیں کہ انسان خود کو سمجھے۔ نیلے رنگ کی کشادگی اپنائے۔ سرخ رنگ کی تیزی اور تندی سے بچے۔ اس تصویر کے ہر پیچ و خم میں نصیحتیں پنہاں ہیں۔ بس اس کی ضرورت ہے کہ انسان انھیں سمجھ لے۔ اور اپنے راستے بدلنے کی کوشش کرے۔ یہ تمام راستے سراب ہیں۔ ایک دھوکا ایک فریب جو کبھی منزل کو سامنے نہیں لاتے بلکہ انسان کو بھٹکا کر بجانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔"

زاہد اپنی ترنگ میں بولے جا رہا تھا۔ سرفراز اور قدسیہ حیرت سے منہ پھاڑے زاہد کو دیکھ رہے تھے۔ جو کچھ زاہد نے کہا تھا۔ وہ ایسا دل کو لگتا تھا کہ بس اس سے آگے اور کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ سرفراز کے وہم و گمان میں بھی یہ تشریح نہ تھی۔ وہ بے چارہ مصوّر تھا ہی کب۔ وہ تو زاہد نے کھینچ کھانچ کر اسے مصوّر بنا دیا تھا۔ اور زاہد ہی کے کہنے پر وہ قدسیہ کو الٹی سیدھی تصویریں بنانا سکھا رہا تھا۔

جہاں تک قدسیہ کا تعلق تھا اس نے بھی اس تصویر کی اسکیچنگ پر یہ غور نہیں کیا تھا لیکن اب جو اس نے اس تصویر کو دیکھا تو درحقیقت زاہد کی باتیں اسے بالکل سچ نظر آئیں۔

دوسری طرف شجاع احمد صاحب بھی زاہد کو گہری نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ بجانے ان کے ذہن میں کیا تھا۔ پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بھئی واقعی، تم نے تو میری آنکھیں کھول دیں زاہد۔ میں نے اس انداز میں اس تصویر کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس سے ایک اندازہ مجھے اور ہوا۔"

"وہ کیا جناب؟" زاہد نے پوچھا۔

"یہ کہ تم مصوّری پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہو۔ کبھی کرتے رہے ہو مصوّری؟"

"نہیں جناب! میں نے بس فن کاروں کے فن پاروں کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ شاعروں کے اشعار کی گہرائیوں پر غور کیا ہے۔ ادیبوں کی نثر پر توجہ دی ہے۔ مصوّروں کی فطرت کو میں نے پڑھا ہے اور اس سے مجھے ان سب کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ بس یہی وجہ ہے کہ میں ہر معاملے میں تھوڑی بہت شُدبُد رکھتا ہوں۔" زاہد نے جواب دیا۔

"بھئی تم سے کچھ گفتگو کرنی ہے مجھے بھی۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"حاضر ہوں جناب۔ خادم ہوں آپ سب کا، جب بھی حکم فرمائیں۔"

"فرصت کس وقت ہے تمھیں؟" شجاع احمد صاحب بولے۔

"میں نے عرض کیا نا میں تو حکم کا غلام ہوں جب حکم دیں حاضر ہو جاؤں۔"

"تو پھر آج دوپہر کے کھانے کے بعد میرے کمرے میں

نشست ہے ہی ہی۔"

"تنہا میں ہی ہوں گا یا۔۔۔"

"نہیں بھئی صرف تم۔۔ بات تم ہی سے کرنی ہے۔" شجاع احمد صاحب نے کہا اور زاہد نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ شجاع احمد صاحب باہر نکل گئے تو قدسیہ زاہد کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بڑی عجیب نگاہوں سے زاہد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"زاہد بھائی آج آپ نے لاج رکھ لی میری۔ میں اتنی تفصیل سے ابو کو یہ سب کچھ نہیں بتا سکتی تھی جو آپ نے بتایا اور اس کا ذمہ دار میں اپنے استاد صاحب کو قرار دوں گی۔"

"وہ کیوں؟" زاہد نے پوچھا۔

"اس لئے کہ استاد صاحب نے اس تصویر کی اسکیچنگ تو کر دی تھی لیکن مجھے اس کی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ آپ ان سے میری سفارش کر دیجئے کہ آئندہ جب بھی یہ مجھ سے کسی چیز کی اسکیچنگ کرائیں تو مجھے اس کے ہر پہلو سے آگاہ کر دیں۔"

"ہاں بھئی، اتنی سفارش تو میں آپ سے ضرور کر دوں گا سرفراز صاحب۔" زاہد نے کہا اور سرفراز بے چارہ مشینی انداز میں گردن ہلانے لگا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس نے کیا بنایا ہے اور کیا بن گیا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد زاہد شجاع احمد صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ تنہا تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"آؤ۔۔" انھوں نے نرم لہجے میں کہا۔ ذہن میں تو زاہد کے لئے نفرت تھی۔ اس کی چرب زبانی کو دیکھ چکے تھے۔ تصویر کے معاملے کو اس نے جس خوبی سے سنبھال لیا تھا۔ شجاع احمد صاحب کی جہاندیدہ نگاہیں اسے سمجھ چکی تھیں۔ انھیں اندازہ ہو گیا کہ یہ نوجوان آفت کا پرکالہ ہے اور اس سے جیتنا خاصا مشکل کام ہو گا۔

بہرحال جہاندیدہ انسان تھے۔ سمجھدار تھے، زیرک تھے اور اپنے کاروباری مخالفین کو کاروباری ہتھکنڈوں سے شکست دیتے آئے تھے۔ اس لئے اس نوجوان سے ہار تو نہیں مان سکتے تھے چنانچہ انھوں نے پینترا بدل لیا تھا۔ زاہد کو بیٹھنے کی پیش کش کی گئی تو وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔

"میں تم سے تمھارے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔" انھوں نے کہا اور زاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بس یہی ایک پہلو ہے دنیا کا جو میری نگاہوں سے تاریک ہے۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا جناب کہ زیرِ بحث بنوں جب میں خود ہی اپنی ذات کی شناخت نہیں کر سکا تو دوسروں کو اس کے بارے میں کیا بتاؤں۔"

"دیکھو بیٹے میں زندگی کا طویل عرصہ گزار چکا ہوں۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ بہت سے لوگوں سے میرا سابقہ پڑ چکا ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ کون شخص کس انداز میں کس وقت بول رہا ہے۔ تم خود کو چھپانے کی کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں کر رہے اور میں اس کوشش کو مشکوک سمجھتا ہوں۔"

"شاید۔ ایسا ہو۔" زاہد نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن یہ بھی تمھیں بتانا چاہتا ہوں زاہد کہ بہرطور یہ میری مملکت ہے۔ انسان اپنے گھر کی چہار دیواری کو اپنی مملکت سمجھتا ہے۔ یہاں صرف ایک شخصیت ایسی ہے جو مجھ سے منحرف ہو سکتی ہے اور وہ ہیں حسام احمد صاحب۔۔ اور میں تمھیں داد دیتا ہوں کہ تم نے وہیں سے ابتدا کی ہے۔ یہ کسی معمولی آدمی کا کام نہیں لیکن تم یہاں جو کچھ کر رہے ہو یا کرنا چاہتے ہو، بہرطور کسی نہ کسی دن وہ میرے علم میں ضرور آئے گا اور اس وقت جب مجھے یا اس کوٹھی میں رہنے والوں کو کسی نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا تو میں وہ تو پاور بھی استعمال کر سکتا ہوں کیونکہ یہ میری مملکت ہے۔ تم جانتے ہو اس وقت تمھارا کیا بنے گا؟"

"جانتا ہوں جناب والا، درحقیقت اس وقت میری پوزیشن انتہائی نازک ہو جائے گی اور میں کوئی پناہ گاہ نہ حاصل کر سکوں گا لیکن یہ اس وقت ممکن ہو گا نا جب میں اس کوٹھی کے لئے یا اس کوٹھی کے مکینوں کے لئے کوئی غلط کام کروں گا۔ اگر ایسا سرے سے ہی نہ ہو تو پھر آپ کو میری مخالفت کا سودا کیوں سمانے لگا۔" زاہد نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم ان خوبصورت باتوں سے دلوں کو موہ لینے کی قوت رکھتے ہو لیکن میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ میری نگاہ میں تمھاری شخصیت مشکوک ہے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح تمھیں پیار کرنے لگوں تو پھر یہ تمھارا فرض بنتا ہے کہ تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔"

"میں نے عرض کیا نا، میں ایک سادہ سا ورق ہوں جس پر کوئی تحریر نہیں ہے۔ ملازمت چاہتا تھا، سو اس گھر میں آ گیا یہاں کے لوگوں کی خدمت کی انھوں نے مجھے اپنا لیا۔ آپ کے ذہن میں جو شکوک و شبہات ہیں، آنے والا وقت یقیناً انھیں زائل کر دے گا اور میں اپنی تقدیر میں اس روشنی کا انتظار کروں گا ورنہ یہاں پر باقی لوگوں کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" زاہد نے جواب دیا۔

"تو تم کچھ نہ بتاؤ گے اپنے بارے میں؟"

"میں نے عرض کیا نا، اگر کچھ ہوتا تو ضرور بتاتا۔ آنے والے وقت میں بھی اگر میری زندگی میں کوئی ایسی چیز شامل ہوئی جو کسی کو بتائی جائے تو میں آپ کے سامنے عرض کردوں گا۔"

"ہوں! اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے اپنی ذہانت بھی آزمانی ہوگی تمہارے سلسلے میں۔ بہرطور تم اس گھر میں ایک فرد کی حیثیت سے رہتے ہو۔ کیا تم مجھے اس گھر کا بڑا تسلیم نہیں کرتے؟"

"یقیناً کرتا ہوں جناب والا۔" زاہد نے جواب دیا۔

"تو پھر میرا بھی کچھ حق بنتا ہے تم پر۔"

"بسر و چشم، بسر و چشم۔"

"میں تم سے کچھ کام لینا چاہتا ہوں۔"

"حکم فرمایئے بندہ حاضر ہے۔" زاہد سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔

"تم تمام آپ اور [illegible] فرسٹ [illegible] کی تعمیر [illegible]"

شجاع احمد صاحب نے کہا اور زاہد کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے رنگ آیا لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل گیا۔

"دیکھئے جناب! انسان کی زندگی میں روٹیاں یا بدن کا کپڑا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ ہم اپنے ضمیر کے لئے بھی زندہ رہتے ہیں۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے اغراض و مقاصد میری اپنی زندگی سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ مجھ جیسے بے سہارا نوجوان جو میری طرح خوش نصیب نہیں ہوتے اور انہیں ایسے کسی اچھے خاندان میں جگہ نہیں ملتی زندگی اور موت کی کش مکش کا شکار ہو کر سڑکوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ مجھے ان کا کرب معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ سب پہلی امداد کے ضرورت مند ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی پشت پر ہاتھ رکھ کر انہیں بس اتنا سہارا دے کہ وہ اس ذہنی کرب سے نجات حاصل کر کے معاشرے میں اپنا کوئی مقام حاصل کرلیں تو آپ یقین فرمائیے کہ وہ معاشرے کے بہترین افراد ثابت ہوسکتے ہیں۔ بصورت دیگر ان کی ذاتی پریشانیاں ذہنی الجھنیں انہیں برائی کے راستے پر لے جاتی ہیں۔ وہ چور، قاتل، ڈاکو، خونی، اسمگلر، جیب کترے، بلیک میلر نجانے کیا کیا بن جاتے ہیں۔ یہ تو ایک قومی خدمت ہے جناب! جس کا حکم دین بھی دیتا ہے اور دنیا بھی۔ میں وطن پرست ہوں، یہ میرا وطن ہے۔ میرے وطن کے سربراہ اور وہ لوگ اگر میرے انداز میں نہیں سوچتے تو جو شخصیت میرے سامنے اس انداز میں سوچتی ہوئی سامنے آئے، میں بھلا اس کی مخالفت کیسے کرسکتا ہوں۔" زاہد نے جواب دیا۔

"زاہد میں بہت غلط آدمی ہوں۔ چرب زبانی کسی بھی طور قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ میں چاہتا ہوں کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس تعمیر نہ ہو اور تمہیں اس سلسلے میں میری مدد کرنا ہوگی۔"

"نہیں شجاع احمد صاحب! آپ اس بات کو ذہن سے نکال دیں کہ میں اس سلسلے میں آپ کا معاون ہوسکتا ہوں بلکہ یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں دادا میاں کو آپ کے اس عندیے سے آگاہ کردوں۔"

"کیا، کیا بکواس کررہے ہو؟" شجاع احمد بوکھلائے ہوئے انداز میں بولے۔

"فرض، فرض ہے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس ابھی تعمیر بھی نہیں ہوا اور اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔ میں اس سے جذباتی لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں اس مخالفت کی اطلاع دادا جان کو دوں۔" زاہد کھڑا ہو کر بولا۔

"اگر تم نے ایسا کیا تو یہ نمک حرامی ہوگی۔ تم ہمارے درمیان تفرقے کا باعث بنوگے۔"

"تو پھر آپ وعدہ کریں کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کی مخالفت نہیں کریں گے۔" زاہد نے کہا اور شجاع احمد صاحب اسے گھورنے لگے پھر بولے۔

"تمہاری تعلیمی حیثیت کیا ہے؟"

"بس ضرورت پوری ہوجاتی ہے۔"

"میں تمہیں اپنی ایک فرم میں ایک بڑا عہدہ پیش کروں تو اسے قبول کروگے؟"

"فرسٹ ایڈ ہاؤس کے عوض سارے جہان کے عہدے ٹھکرا دوں گا۔ یہ میرا عزم ہے۔" زاہد نے جواب دیا اور شجاع احمد صاحب دانت پیسنے لگے۔ پھر گردن ہلا کر بولے۔

"تم لوگوں کے لئے یہ ادارہ مصیبت بن جائے گا۔ اس کے اخراجات برداشت نہیں کرسکو گے اور ہزاروں نئی مخالفتیں مول لوگے۔ لوگ طرح طرح کے الزامات رکھیں گے تم پر۔ دیکھ لینا، میری بات کو گرہ میں باندھ لینا، بعد میں پچھتاؤ گے۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ آپ اطمینان رکھیں۔" زاہد نے کہا اور پھر باہر نکل گیا۔

شجاع احمد گہری گہری سانسیں لیتے رہے۔ انہیں شدید غصہ آرہا تھا زاہد ذوالفقار پر لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ معتدل ہوگئے۔ وہ اس کی شخصیت پر غور کرنے لگے تھے۔ ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا مجھ سے۔ اس کی فطرت میں ملازموں جیسی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ کون ہے یہ۔ آخر کون ہے؟"

☐

توفیق صاحب شدید غصے میں تھے۔ شاہدہ بیگم کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور رفیق و شفیق گردن جھکائے ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ [illegible] چلے گئے تھے۔ چھپو بدستور بیگم مہرالنساء کے کمرے میں تھی

اور بیگم صاحبہ دوبارہ توفیق صاحب کے پاس نہیں آئی تھیں۔ وقت ایک گھٹن کے عالم میں گزر رہا تھا۔

"کچھ بولو گے نہیں جیالو۔ رات کی تاریکی میں یہ کیسی مہم سر کرنے نکلے تھے تم دونوں؟" توفیق صاحب تقریباً آدھے گھنٹے خاموش رہنے کے بعد بولے۔

"معاف کردو ابا غلطی ہوگئی۔" رفیق بولا۔

"ارے نہیں بیٹے۔ کوئی بات نہیں غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے اور پھر یہ تو کوئی غلطی بھی نہیں۔ تم نے سوچا گھونٹوں پر ہاتھ ملنے کے بجائے گلے پڑی کیوں نہ ہاتھ مارا جائے۔ تمہاری خالہ جان بیوہ ہیں ممکن تھا تمہارے جال میں پھنس جاتیں۔ اس طرح کوئی خطرہ ہی نہ رہتا پھر یہ لڑکیاں کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ کیوں۔۔۔ یہی بات سوچی تھی نا تم نے۔۔" توفیق صاحب کانپتے ہوئے بولے۔

"نن نہیں ابا۔۔۔ یہ بات نہیں تھی۔"

"پھر کیا ہوا تھا میرے لعل؟"

"وہ۔۔۔ وہ نشاط نے مجھے خود بلایا تھا۔" رفیق ہکلاتے ہوئے بولا۔

"اپنی امی کے کمرے میں۔۔۔ کیوں۔۔۔ یا پھر تم ۔۔۔ نشے میں نشاط کے بجائے مہرالنساء بیگم کے کمرے میں جا گھسے تھے۔ یہی بات تھی نا؟" توفیق صاحب پیار بھرے لہجے میں بولے۔ "دیکھا شاہدہ تم نے یہ اپنا رفیق کتنا معصوم بچہ ہے۔" شاہدہ بیگم کی تو آواز ہی بند تھی۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"وہ ابا۔ مجھے نہیں معلوم۔ اس نے مجھ سے یہی کہا تھا۔ یقین کریں ابا، بڑی گہری سازش ہوئی ہے۔" رفیق بولا۔

"ہاں ہاں۔ سی آئی اے کام کررہی ہے تمہارے خلاف۔ بے شک ارے مردود اب کیا ہوگا۔ یوں لگتا ہے سارا کھیل بگڑ گیا اور کیوں میاں۔ تم وہاں اپنی امی کو تلاش کرنے گئے تھے کیا۔ کیوں گئے تھے اس ملازمہ کے کوارٹر میں۔ کیا ہوگیا تھا تمہیں۔ کوئی خواب دیکھا تھا کیا۔ کوئی ڈراؤنا، بھیانک خواب اور وہاں اس کی آغوش میں پناہ لینے گئے تھے۔"

"ابا جی وہ میں۔۔۔ میں۔۔۔"

"تمہارا ستیاناس مردود، تمہاری بدچلنی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ یہ سوچ کر کشتیاں جلادی تھیں کہ شمشیر زماں کے خاندان میں پہنچ کر خود کو اُن کے قدموں میں ڈال دوں گا اور تمہارا مستقبل بنادوں گا۔ یہی سوچا تھا کہ اس خاندان کی دامادی مل جائے گی تمہیں تو ساری زندگی عیش کروگے لیکن یہ تو نصیب کی باتیں ہوتی ہیں۔ تم سڑکوں کے بھکاری سڑکوں پر ہی رہنے کے لئے پیدا ہوئے ہو۔ یہاں اگر بھی تم نے اپنی اصلیت دکھادی۔ کیا کر ڈالا تم نے مردود دو۔ اب یہ سب کچھ سنبھالنا میرے لئے کتنا مشکل ہوگا۔ ارے شاہدہ تم ہی بتاؤ۔ تمہاری اولاد نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ان کا سدباب کیسے ہو۔ کیا کہوں میں مہرالنساء بہن سے، کس طرح میں معافی مانگوں گا اُن سے۔ ارے ان کی ساری اصلیت اُن کی نگاہوں میں آگئی، کہتا ہے مردود کم بخت کہ نشاط نے بلایا تھا۔ ارے ان لڑکوں نے تو میری عزت دو کوڑی کی کردی۔"

"ابا آپ میری بات تو مانتے ہی نہیں۔" رفیق نے کمال پھلا کر کہا اور توفیق صاحب نے پاؤں سے جوتا اتار لیا۔

"شمسر لے ایسی ماروں گا تیری بات کہ سر پر ایک بال بھی نہیں رہے گا۔ یہ بات کبھی منہ سے نکالیو بھی نہیں۔ اگر تو نے یہ الزام لگایا نشاط پر تو پھر سارا کھیل ہی بگڑ جائے گا اور تو مجھے یہ بتا کہ یہ تو نے نشہ کرنا کب سے شروع کیا ہے؟"

"بس ابا۔۔۔ کبھی کبھی۔۔۔۔" رفیق نے جواب دیا۔

"بے غیرت، بے شرم۔ شریف خاندانوں میں یہ سب کچھ ہوتا ہے، مگر میں بھول گیا۔ ہم شریف خاندان کہاں ہیں۔ ہم تو شریف بننے کی کوشش کررہے ہیں۔" توفیق صاحب جنون کے عالم میں نجانے کیا کیا بکتے رہے۔

ساری رات اسی طرح گزر گئی تھی۔ نہ وہ خود سوئے نہ دوسروں کو سونے دیا۔ منتظر تھے اس بات کے کہ صبح کو ایک ہنگامہ ہوگا ایک خوفناک ہنگامہ۔

صبح ہوگئی۔ شاہدہ بیگم کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ معمول کے مطابق اُٹھ کر بہن کے پاس پہنچ جائیں۔ جو کچھ ہوچکا تھا اس کے بعد تو بڑی مشکلات پیش آگئی تھیں ان کے لئے۔ واقعی بیٹوں نے سارا پروگرام چوپٹ کردیا تھا۔ وہ خود بھی ان دونوں بڑے سہانے خواب دیکھ رہی تھیں لیکن نجانے اب ان سہانے خوابوں کا کیا بنے گا؟

ناشتے کا وقت ہوگیا۔ نہ اُدھر سے کوئی بُلاوا آیا اور نہ ہی ان لوگوں کو جانے کی ہمت پڑی۔ توفیق صاحب کی پیشانی شکن آلود تھی۔ رفیق اور شفیق کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آگئے تھے اور توفیق، شاہدہ بیگم کے سامنے بیٹھے اُلو کی طرح دیکھ رہے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہیں رفیق کے ابا۔ نیند آرہی ہے تو تھوڑی دیر آرام کرلیں۔ ساری رات بیٹھے بیٹھے گزر گئی۔"

"بکواس مت کرو نام مت لینا ان مردودوں کا۔ مجھے ان کا ابا نہ کہو۔ ارے اتنے بُرے کردار کا مالک تو میں بھی نہیں تھا۔ مجھے تو اب تم صرف یہ بتاؤ کہ میں کیسے سرخرو ہوں گا، کیسے کہوں گا مہرالنساء بیگم

سے کہ بچے میں بھول ہوگئی۔ ارے بچے کہیں ایسے ہوتے ہیں بھول بھلا ایسے ہوتی ہے اور پھر شراب اور سونے پر سہاگہ، کم بخت سیدھا مہرالنساء کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اگر لڑکیوں میں سے کسی کے پاس پہنچا ہوتا تو بات سنبھالی بھی جاسکتی تھی لیکن مہرالنساء کے کمرے میں... معاف کردے گی وہ، معاف کردے گی؟"

"تت... تو میں جاکر دیکھوں؟" شاہدہ بیگم نے کہا۔

"دیکھو دیکھو۔ جوتے کھا کر بھاگتی ہوئی چلی آنا۔ جاؤ دیکھو دیکھو جلدی کرو۔" توفیق صاحب نے کہا۔ شاہدہ بیگم چند لمحات انھیں دیکھتی رہیں پھر ہمت کرکے اٹھ گئیں۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے بالوں میں الٹی سیدھی کنگھی کی اور پھر اٹھ کر باہر نکل آئیں۔

شاہدہ بیگم کا دل بُری طرح لرز رہا تھا۔ درحقیقت جو کچھ ہوا تھا اُس کے بعد بہن کے پاس جانے کو منہ نہیں تھا لیکن یہ سونے کی کان ایسے بھی تو چھوڑی نہیں جاسکتی تھی۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ مہرالنساء کے کمرے کی جانب چل پڑیں۔ مہرالنساء اپنے کمرے میں موجود تھیں تینوں بیٹیاں بھی وہیں تھیں۔ کوئی بات ہو رہی تھی۔ انھیں دیکھتے ہی خاموشی چھا گئی۔ شاہدہ بیگم گردن جھکائے اندر پہنچ گئیں۔

"ناشتہ کرلیا تم لوگوں نے...؟" انھوں نے پوچھا۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو شاہدہ بیگم آگے بڑھیں اور وہیں کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"مہرالنساء کیا کروں اب اس سلسلے میں، کیا سوچا ہے تم نے ہم لوگوں کے بارے میں۔ یہ اولاد کبھی کبھی کس طرح رسوا کرتی ہے۔ میں تو تم سے آنکھیں ملانے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" شاہدہ بیگم نے کہا۔ مہرالنساء نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شاہدہ بیگم تھوڑی دیر خاموش رہ کر جواب کا انتظار کرتی رہیں پھر بولیں۔ "میں ناشتہ منگواتی ہوں پہلے ناشتہ کرلو۔ بھوکی ہوگی اب تک۔"

"کیوں۔ بھوکے کیوں ہوتے ہم لوگ، اپنے گھر میں ہیں اور پھر ہم بھوکے کیوں رہیں۔ تم نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی ہے۔" مہرالنساء بیگم رکھائی سے بولیں۔

"تو ناشتہ کرلیا تم لوگوں نے؟"

"جی..."

"اچھا کیا۔ کم نصیب تو ہم ہیں۔ تقدیر تو ہماری پھوٹی ہے۔ کچھ بولو تو سہی مہرالنساء اب کیا کیا جائے؟"

"زیادہ اہم مسئلہ نہیں ہے باجی۔ آپ لوگ فوری طور پر یہ حویلی چھوڑ دیں۔ مجھے تو حیرت ہوئی ہے آپ لوگوں کو ابھی تک یہاں دیکھ کر، میرا تو خیال تھا کہ آپ رات ہی کے کسی حصے میں جاچکے ہوں گے۔" مہرالنساء نے کہا۔ اور شاہدہ بیگم ہکا بکا رہ گئیں۔ کچھ بھی تھا، یہ جواب اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"ہاں ہونا تو یہی چاہیے تھا مگر ہم محبت کے مارے ابھی تک نہیں مرے ہوئے ہیں۔" وہ بولیں۔

"میرے خیال میں اب اس کی گنجائش نہیں ہے شاہدہ باجی۔ براہ کرم آپ فوری طور پر حویلی خالی کردیں۔"

"معاف نہیں کروگی مہرالنساء؟" شاہدہ بیگم بولیں۔

"عرض کرچکی ہوں باجی۔ اب اس کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے۔"

"تھوڑا سا غور کرلو ہم کم نصیبوں پر۔"

"ساری رات غور کرنے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔" مہرالنساء بیگم نے کہا۔

"اچھا۔ مہرالنساء اچھا۔ جو تمہارا حکم۔ میں تمہارا یہ مطالبہ تمہارے بہنوئی تک پہنچا دیتی ہوں۔"

"براہ کرم جلدی کریں۔" مہرالنساء بیگم نے منہ پھیر کر کہا۔ اور شاہدہ بیگم باہر نکل گئیں۔ حالات بے شک سنگین تھے لیکن مہرالنساء اس حد تک چلی جائے گی۔ یہ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو توفیق صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

"ملیں ان لوگوں سے...؟"

"ہاں..."

"کوئی بات ہوئی؟"

"ہاں..." شاہدہ بیگم نے کہا۔

"اب یہ پوچھوں کہ کیا بات ہوئی، پھوٹتی کیوں نہیں منہ سے۔" توفیق صاحب جھلائے ہوئے انداز میں بولے۔

"نکل جانے کو کہا ہے ہم لوگوں سے۔ کہا ہے فوراً حویلی خالی کردیں۔"

"ایں..." توفیق صاحب اُچھل پڑے۔ "کس نے کہی یہ بے ہودہ بات؟" وہ بولے۔

"مہرالنساء نے۔"

"کھُل کر کہی ہے۔ یعنی اتنی سخت بات؟"

"جی۔ کہہ رہی تھیں کہ تعجب ہے آپ لوگ اب تک یہیں ہیں۔" شاہدہ بیگم بولیں۔

"سنک گئی ہے مہرالنساء۔ اتنی احمقانہ بات اس کے منہ سے نکلی ہے۔ تم نے کچھ نہ کہا اس کے جواب میں؟"

"کیا کہتی؟"

"تو کیا نکال چلو گی اس حویلی سے۔ سارے سنہرے خواب نکال دو گی آنکھوں سے؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"ہاں۔ ساری ذمہ داری میری ہی تو ہے۔ ان مردودوں کو پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی مجھے ہی سونپ دیتیں۔ بلاوجہ تم نے کیوں تکلیف اٹھائی۔ آج تک جتنے تصور کیے تم نے کیے ہیں۔ میں نے تو ہی نہیں پیدا کیے۔ اب جب تک زندہ ہوں ساری ذمہ داریاں سب شانوں پر ہی تو ہیں۔ ارے میں کہتا ہوں کیا چاہتے ہو تم ماں بیٹے۔ خود کشی کر لوں میں۔ تم لوگ معاملے کو ہموار کرنے کی کوشش نہیں کر سکتی تھیں؟"

"حالات بہت خراب ہیں۔ ناشتہ وغیرہ بھی کر چکے ہیں، وہ لوگ ہمیں پوچھا بھی نہیں۔ اسی سے اندازہ لگاؤ۔"

"ہیں۔ یعنی حد ہو گئی بد اخلاقی کی۔ اب تو یہ ضرورت سے زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ بہرحال منہ دھو رکھیں مہرالنساء بیگم، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اب ہم یہاں سے چلے جائیں۔ میں بھی تو ذرا بات کر لوں مہرالنساء سے۔" توفیق صاحب اٹھ گئے۔ یہ صورت حال واقعی میاں بیوی کی توقع سے زیادہ تھی۔ مہرالنساء سے اتنی سختی کی امید نہیں تھی انھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ مہرالنساء کے کمرے کے دروازے پر تھے: "اندر آسکتا ہوں؟" وہ غمزدہ انداز میں بولے۔

"آئیے۔۔" اندر سے مہرالنساء کی آواز سنائی دی اور توفیق صاحب اندر داخل ہو گئے۔

"ماشاء اللہ۔ سب ہی یہاں۔ بچیو تم لوگ باہر جاؤ۔ میں اپنی بہن سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

"بچیوں کو یہیں رہنے دیں بھائی صاحب۔ جو کچھ کہنا ہے ان کے سامنے ہی کہہ دیں۔" مہرالنساء نے کہا۔

"بڑوں کی باتیں ہیں مہرالنساء۔ بچوں کو ان کے درمیان نہیں ہونا چاہیے۔"

"مجھے اپنی بچیوں پر مکمل اعتماد ہے۔ میں ان کے بغیر ایک قدم نہیں چلنا چاہتی۔"

"اپنے بھانجوں کو معاف نہیں کرو گی مہرالنساء؟"

"معاف کیجیے بھائی صاحب۔ مجھے اپنے عزیزوں سے زیادہ اپنی عزت عزیز ہے۔ میرے شوہر جو بنا کر گئے ہیں میں اسے ملیامیٹ نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں معذرت خواہ ہوں۔"

"یہ ان کی پہلی غلطی تھی۔"

"آپ اسے غلطی تصور کرتے ہیں۔ تعجب ہے۔ رفیق نے رات کو پہلی بار شراب پی ہوگی۔ شفیق نے پہلی بار کسی کی عزت لوٹنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ ایسی حرکتیں عادی لوگ ہی کرتے ہیں۔"

"ایسی بات نہیں ہے مہرالنساء۔ بس بے دردی سے گفتگو نہ کرو۔ وہ بھی تمھارے بچے ہیں۔"

"نہیں توفیق بھائی۔ میں اتنی اعلیٰ ظرف نہیں ہوں کہ بعض اخلاقی بھی اپنا مان لوں۔ میں چاہتی ہوں توفیق بھائی کہ اس سلسلے میں ہم کوئی تلخ گفتگو نہ کریں۔ آپ جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں سے چلے جائیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ اس کام میں ایک دو گھنٹوں سے زیادہ صرف نہ ہوں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے مہرالنساء۔ تمھیں معلوم ہے کہ ہم اپنا سب کچھ چھوڑ کر تمھاری محبت میں بھاگے چلے آئے ہیں۔ میں تو اپنا گھر بھی بیچ آیا ہوں، اس خیال سے کہ اب باقی زندگی تمھاری خدمت

کرول تھا۔"

"تم نے آپ سے اس کی درخواست نہیں کی تھی توفیق صاحب!"

"فرض سمجھا تھا ہم نے آپ۔"

"تو اس غلط فہمی کو دور کر لیجئے۔ مجھے آپ کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن ہم حماقت کر بیٹھے ہیں۔ اب ہمارے پاس سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"وہ رقم تو آپ کے پاس ہوگی جو آپ نے گھر بیچ کر حاصل کی تھی۔ اس سے کوئی دوسری جگہ خرید لیں۔"

"مہرالنساء اس وقت تم غصے میں ہو۔ ٹھنڈے دل سے غور نہیں کر رہی ہو۔ تمہیں علم ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔"

"میں سمجھی نہیں بھائی صاحب۔"

"نشاط نے رفیق کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔" توفیق صاحب بولے اور مہرالنساء کے وجود میں آگ بھڑک اٹھی۔

"کیا بکواس کر رہے ہیں آپ؟" وہ غرا کر بولیں۔

"جی۔ یہ سچ ہے۔" توفیق صاحب بولے۔ دوسرے لمحے نشاط اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے نیچے رکھی ہوئی جوتی اٹھائی اور دروازے کی طرف لپکی۔ دوسرے لمحے وہ غڑاپ سے دروازے سے باہر نکل گئی۔ لیکن یہ رفیق کی خوش بختی تھی کہ دونوں بھائی دروازہ اندر سے بند کئے بیٹھے تھے۔ واردات سنگین تھی کسی اور کا تو نہیں توفیق صاحب کا خطرہ تھا انہیں کہ چراغ پا ہو کر بداخلاقی پر نہ اتر آئیں اور اس وقت یہ دور اندیشی کام آگئی تھی۔

ہارون شجاع احمد بی۔ اے کے آخری سال میں تھا سیدھا سادا شریف سا نوجوان نئی نئی جوانی آئی تھی اور وہ اس کی جاذبیت سے آشنا نہیں تھا سمگوں بھرا دل تھا۔ گو ابھی غلط راستوں کی جانب مائل نہیں ہوا تھا لیکن کئی شوق ذہن میں جاگزیں ہو گئے تھے۔

اسے موسیقی سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ ایک انتہائی خوبصورت ٹیپ ریکارڈر اس نے اپنے کمرے میں رکھا ہوا تھا اور مغربی موسیقی کے بے شمار کیسٹ اس کے پاس موجود تھے۔ رقص سے بھی دلچسپی رکھتا تھا لیکن شجاع احمد صاحب سخت آدمی تھے انہیں کسی شوق کو بے مہار نہیں ہونے دیا گیا تھا البتہ جب بھی تنہائی ہوتی تو وہ دھیمے سروں میں کیسٹ لگا کر رقص کی مشق کیا کرتا تھا اور اس وقت بھی یہی صورت حال تھی۔

کمرے کے قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور ایک خوبصورت کیسٹ دھیمے سروں میں لگا۔ پھر وہ کمرے کے وسط میں قالین پر رقص کرنے لگا۔ اچھے خاصے اسٹیپس تھے حالانکہ کسی سے رقص سیکھا نہیں تھا۔ کیسٹ کی دھنیں اسے مست کر رہی تھیں۔ چند لمحات کے بعد وہ ماحول کو بھول گیا۔

اس کا بدن متحرک رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کھلے ہوئے دروازے سے کون داخل ہوا۔ کیسٹ کے ختم ہونے تک اسے احساس نہ ہو سکا پھر جب کیسٹ ختم ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھلیں تو اپنے سامنے کسی کو پا کر اس کا دل دھک سے رہ گیا لیکن جب اس شکل پر نگاہ پڑی تو خوف کا احساس دل سے نکل گیا۔ یہ ایک انتہائی قابل اعتماد صورت تھی۔ زاہد ذوالفقار زیدی زاہد متحیرانہ انداز میں اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

ہارون جھینپے ہوئے انداز میں ہنس پڑا۔ "مجھے شوق ہے زاہد بھائی۔" وہ بولا۔

"زاہد کو بے وقوف بنا رہے ہو؟"

"کیوں؟" ہارون تعجب سے بولا۔

"کتنا پرانا ہے یہ شوق؟"

"کافی پرانا... لیکن..."

"رقص کس سے سیکھا؟"

"سیکھا ہی کہاں ہے۔ بس موسیقی خود بخود تھرکا دیتی ہے۔"

"کیا میں ناقابل اعتبار ہوں ہارون؟" زاہد اندر آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہرگز نہیں۔ مگر میں سمجھ نہیں سکا۔"

"تمہارے رقص کا انداز ناتجربے کارانہ نہیں تھا۔"

"ایسے نہیں زاہد بھائی۔"

"زاہد کی معلومات کو چیلنج کر رہے ہو؟"

"اس کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔"

"ایک ایک قدم لاجواب تھا تمہارا۔"

"خدا کی قسم کسی سے نہیں سیکھا۔"

"تب پھر ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے۔ تم پیدائشی فنکار ہو۔"

"زاہد بھائی۔ کیوں گھس رہے ہیں۔"

"تم لوگوں سے اتنا مخلص ہوں کہ کسی کو گھس ہی نہیں سکتا اس گھر میں ایک بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔"

"کس بات کا؟" ہارون نے کرسی گھسیٹ کر زاہد کے سامنے

مجھے بتانے کہا۔

"تمہیں ایسے ناتراشیدہ ہیرے پڑے ہیں اس گھر میں کہ اگر ان کی تراش خراش ہو جائے تو دُنیا ان کی چمک دیکھ کر دنگ رہ جائے۔ مجھے انتہائی دُکھ ہے ہارون یقین کرو تم لوگ بے مثال ہو۔ ایسے کہ جو اپنی اصلی شکل میں سامنے آجائیں تو نجانے کیا ہو جائے تمہارا یہ رقص۔ خدا کی پناہ... اگر یہ کسی اسٹیج پر ہوتا تو یقین کرو نہیں نجانے کہاں سے کہاں لے جاتا۔" ہارون اب سنجیدہ ہوتا جارہا تھا۔ زاہد کی سنجیدگی دیکھ کر اب اُسے احساس ہوتا جارہا تھا کہ وہ واقعی پیدائشی فنکار ہے "لیکن زاہد بھائی ہم اپنی اس بدنصیبی کو کیا کریں کہ ایک دقیانوسی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابو گھر کی فضا کو قبرستان کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ سنجیدہ سنجیدہ ماحول، نہ کوئی ہنس سکے نہ بول سکے۔ نہ زندگی کی دُوسری تفریحات میں حصہ لے سکے۔ تمام چیزیں اخلاق کی بندشوں میں آتی ہیں۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ اپنے کسی شوق کی تکمیل نہ کرو۔ صرف وہ کرو جو شجاع احمد صاحب کو پسند ہے۔"

"ہاں مجھے اس کا احساس ہے لیکن ایک بات میں تمہیں بتا دوں کہ فنکار قدرتی طور پر فنکار ہوتا ہے۔ اس کے فن کی حیثیت کو جتنا دباؤ گے وہ اتنا ہی اُبھرے گی اور شجاع احمد صاحب اس بات سے واقف نہیں ہیں لیکن وہ فنکار کو دبا نہیں سکتے۔"

"مم... مگر میں کیا کروں زاہد بھائی؟"

"دیکھو دوست زندگی ایک مختصر سی چیز ہے۔ خواہشات اگر ذہن میں پیدا ہوں تو بلاشبہ وہ فطری ہیں۔ بلاشبہ کچھ خواہشات منفی بھی ہوتی ہیں لیکن گندگی اور غلاظت باآسانی عیاں ہو جاتی ہے اور جس چیز سے ذہن میں کراہت نہ پیدا ہو اور وہ ذہن کی گہرائیوں میں جنم لے تو اس کا مقصد ہے کہ وہ ایک جائز خواہش ہے اور جائز خواہشات کو پروان چڑھانے کے لئے تھوڑی سی سرکشی، تھوڑی سی بغاوت ضروری ہوتی ہے۔"

"میں نہیں سمجھا زاہد بھائی آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"بھئی سیدھی سی بات ہے۔ اگر فن سے شوق ہے تو اسے اپناؤ۔ موسیقی کا تعلق رُوح سے ہوتا ہے اور اگر رُوح کو قتل کر دو گے تو باقی کیا رہ جائے گا۔"

"میں کب اسے قتل کرنا چاہتا ہوں۔" ہارون کراہ کر بولا۔

"تم اور صرف تم اس کے قاتل ہو گے میری بات کو یاد رکھنا۔ آرے ایبرن کی داستانِ حیات معلوم ہے تمہیں؟"

"نہیں لیکن اس کے ریکارڈ موجود ہیں میرے پاس۔"

"پریسلے کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"صرف ایک بات کہ کسی نے اسے زندگی میں سیدھا کھڑے نہیں دیکھا۔ شاید وہ سوتے میں بھی متحرک رہتا تھا۔"

"کتنا بڑا فنکار تھا۔ یہ معلوم ہے؟"

"دُنیا جانتی ہے۔"

"راک شاٹن، سوان بک اور ایسے ہی دُوسرے یہ لوگ فطرتاً فنکار تھے۔ فن نے انہیں زندہ جاوید کر دیا۔ موسیقی کے قدردان ان کی پوجا کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی غلط اقدار نے بیشمار فنکار ذبح کئے ہیں۔ مجھے فنکار کی موت کا بہت دُکھ ہے ہارون تم کسی طور آرے ایبرن، ایلوس پریسلے، راک شاٹن اور سوان بک سے کم نہیں ہو۔"

"زاہد بھائی... زاہد بھائی۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن۔ لیکن میں کیا کروں؟"

"فن کی حیات چاہتے ہو تو اسیر بنو۔"

"کک... کس طرح؟"

"اس فن کو سیکھو، اسے جلا دو۔ کھلے عام اس کا پرچار کرو لیکن خوف کے عالم میں نہیں ہمت سے دلیری سے۔"

"زاہد بھائی۔ زاہد بھائی آپ میری مدد کریں۔ خدا کے لئے آپ میری مدد کریں۔" ہارون کا سانس پھولنے لگا۔

"شیو بناتے ہو؟"

"ایں...؟" ہارون اس بے تکے سوال پر چونک پڑا پھر بولا۔ "ہاں بناتا ہوں۔"

"آج سے چھوڑ دو۔ داڑھی اور سر کے بال بڑھاؤ۔ آج سے ان میں نہ تیل پڑے نہ کنگھی ہو۔ شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو کہ سوان بک نے تمہاری شکل میں نیا جنم لیا ہے۔ اس قدر مشابہہ ہو تم اس سے کہ کینیڈا کی لڑکیاں تمہیں دیکھ کر پاگل ہو جائیں۔ دُنیا بھر کی ڈیڑھ لاکھ لڑکیاں سوان بک سے عشق کرتی تھیں اور اس کی موت پر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھیں۔"

ہارون اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس نے زاہد کے پاؤں پکڑ لیے۔ "زاہد بھائی... زاہد بھائی۔ آپ کی مدد کے بغیر میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ میری رہنمائی کیجئے زاہد بھائی۔ میں اپنے فن کی بلندیوں کو پانا چاہتا ہوں۔ اپنی رُوح کی آسودگی چاہتا ہوں۔ مجھے میری منزل دکھا دیں زاہد بھائی میں آپ کا یہ احسان..."

"جذباتی نہ بنو ہارون۔ دُنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ کسی نے کسی کے لئے کچھ نہیں کیا۔ انسان نے ہمت اور لگن سے اپنی منزل پائی

ہے۔ اگر تم مجھ سے کچھ چاہتے ہی ہو تو صرف میرے مشوروں پر عمل کرو۔"
"میں آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں۔"
"ہمت ہے؟" زاہد نے پوچھا۔
"ہاں کچھ بھی ہو جائے۔ میں ستگر ہوں گا۔ میں رقاص ہوں گا۔"
ہارون نے کہا۔
"تو ابتدا کرو دو۔"
"کس طرح؟"
"میں تمہیں اس فن پر لٹریچر فراہم کروں گا۔ ان عظیم لوگوں کی تصاویر حاصل کروں گا کہیں نہ کہیں سے۔ یہاں سے نہ ملیں تو باہر سے منگواؤں گا۔ تم آغاز کرو۔ کل سے شیو نہیں بنے گی۔ بال نہیں کٹیں گے۔ لباس کے ڈیزائن میں تمہیں فراہم کروں گا سلواؤ گے تم خود۔ سب سے پہلے اپنا حلیہ وہ بناؤ جو تم ہو۔"
"او کے۔ میں عمل کروں گا۔" ہارون نے کہا۔
"ایک درخواست ہے ہارون۔" زاہد آخر میں بولا۔
"حکم حکم کہیں زاہد بھائی۔"
"میں اس گھر کا ملازم ہوں۔ کسی بھی وقت کان پکڑ کر نکالا جا سکتا ہوں۔ کسی بھی سلسلے میں میرا نام نہ آنے پائے۔ یہ میری محبت کا صلہ ہوگا تمہاری طرف سے۔"
"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ زاہد بھائی۔ اگر آپ پر اس گھر میں کوئی زیادتی ہوئی تو آپ تنہا اس گھر سے نہیں جائیں گے۔ ہم سب بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔"
"اس کی نوبت ہی کیوں آئے ہارون۔ تم جو کچھ کرو ٹھوس بن کر کرو اور کرنے سے پہلے سوچ لو۔ اگر ہمت نہ پاؤ تو قدم ہی مت اٹھاؤ۔"
"اب تو مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔"
"او کے۔ فنکار اسی طرح جنم لیتا ہے۔ ریاض جاری رکھو۔"
زاہد نے کہا اور ہارون سے اجازت لے کر نکل آیا۔ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اس نے شیلاک پائی کی آواز سنی۔
پیار کا درخت، آسمان کی وسعتوں میں۔
اور زاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

◙

سب ہکا بکا رہ گئے تھے۔ نشاط کی یہ حرکت کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ پھر مہرالنساء بیگم اٹھ کر باہر کی طرف دوڑیں۔ ان کے پیچھے ہی توفیق صاحب اور ان دونوں کے پیچھے صوفیہ اور نزہت۔ نشاط چیختی سے دروازہ پیٹ رہی تھی اس کی آنکھوں سے شعلے ابل رہے تھے اور وہ چیخ رہی تھی۔
"دروازہ کھولو۔ گندے کمینے انسان دروازہ کھولو غلیظ حیوان۔ دروازہ کھول دو۔ ورنہ... ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"
مہرالنساء بیگم نشاط کے پاس پہنچ گئیں۔ "نشاط... نشاط بیٹی خود کو سنبھالو۔ میری حماقت پر خود کو ہلکان مت کرو۔ چاند پر خاک نہیں ڈالی جا سکتی۔ میں نے ان لوگوں کو آسمان پر چڑھایا تھا۔ میں ہی انہیں زمین پر لے آؤں گی۔ نشاط خود کو سنبھالو۔"
"انہیں میری نگاہوں سے دور کر دیں امی۔ ورنہ... میں بھول جاؤں گی یہ کون ہیں۔ ہٹا دیں انہیں یہاں سے۔" نشاط نے خونی آنکھوں سے توفیق صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"براہ کرم آپ باہر چلے جائیے توفیق بھائی۔ جائیے باہر ورنہ میں نوکروں کو بلاتی ہوں۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ اور توفیق صاحب موقع کی نزاکت دیکھ کر وہاں سے کھسک گئے۔
"ان کتوں کو بھی یہاں سے نکال باہر کریں۔ ایک لمحہ نہ لگے۔ مجھے ان کمینوں کے وجود سے نفرت ہے۔"
"چلو تم اندر چلو۔ چلو نشاط بات حویلی سے باہر نہیں جانی چاہیے۔" بیگم صاحبہ نے کہا اور پھر دونوں بہنوں کو اشارہ کیا کہ نشاط کو اندر لے جائیں اور صوفیہ اور نزہت بمشکل نشاط کو اندر لے گئیں۔ وہ بے چاری ششدر تھیں۔ اس بات کی حقیقت انہیں معلوم تھی۔ اس لئے نشاط کا یہ غصہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔
"پانی پلاؤ یار۔ چیخ چیخ کر گلا خراب ہو گیا۔" نشاط نے اندر داخل ہو کر پرسکون لہجے میں کہا۔
"مگر تمہیں ہو کیا گیا تھا؟"
"افسوس دروازہ بند نکلا ورنہ..." نشاط ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ "کیسی رہی؟"
"خدا کی پناہ۔ تو یہ اداکاری تھی؟"
"ثانی نہیں رکھتی اپنا۔ ڈرامہ نگاری میں خود ہوں۔ جانتی ہوں کون سے موقع پر کیسے جذبات ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دیتے ہیں۔ سرخ لوہے پر پے در پے چوٹیں لگا کر ہی اپنی پسند کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔ دشمن کچا ہے۔ پے در پے حماقتیں کر رہا ہے۔ اور یہی حماقتیں ہماری مددگار ہیں۔"
"نشاط تجھے خدا سمجھے۔ پانی لاؤں؟" نزہت بولی اور پھر پانی لینے باہر نکل گئی۔
"بڑی محنت کر رہی ہوں باجی تمہارے لئے اس گھر کے لئے

ورنہ توفیق صاحب تو اسی کے کیبن میں پنجے گاڑ ہی چکے تھے۔ میں نے اس جونک کی کمر میں چنگاری لگائی ہے۔ ارے ہاں وہ ہمارا چوکیدار کہاں ہے؟"

"کون...؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"چھیمو..."

"میرے کمرے میں ہے۔ ڈری ہوئی ہے بے چاری کہ کہیں شفیق کوئی انتہائی کارروائی نہ کر بیٹھے۔"

"مجال ہے ان بزدلوں کی۔ دروازہ بند کئے بیٹھے ہیں بلالاؤ باجی اسے بھی۔ اب ذرا ماحول میں شگفتگی ہونی چاہئے۔ ڈرامہ تقریباً مکمل ہوگیا ہے۔"

"لاتی ہوں۔" صوفیہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ اتنی دیر میں نزہت پانی لے آئی تھی۔ نشاط نے پانی پیا۔ پھر چھیمو آگئی مسکرا رہی تھی۔

"ڈر رہی ہے چھیمو؟" نشاط نے کہا۔

"اللہ بڑی پشانی ہوگئی تھی اس بی بی۔ چوٹ تو نہیں آئی؟" چھیمو نے کہا۔

"زخم آگیا ہے کیا؟"

"نہیں چھوٹی بی بی۔ بس ڈر لگ رہا ہے۔"

"بدھو ہمت سے کام لو۔ مجال ہے کوئی بال بیکا کرسکے تیرا۔ مگر پورا واقعہ تو سنا۔" نشاط نے کہا۔

"بس بی بی۔ ہم نے کھیل پورا کر لیا۔ باقی تو ہم تمھیں بتا ہی چکے ہیں۔ رات کو پہنچ گیا۔ ہم سوتے بن گئے تھے۔ اندر آیا تو ہم چیخ پڑے اور پھر باہر بھاگ آئے۔ دروازہ باہر سے بند کرکے ہم نے شور مچادیا اور سب لوگ آگئے تو پہلے تو کوئی یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ نیسے چور سمجھ رہے تھے اور چور سمجھ کر ہی انھوں نے خوب گٹر بازی کی لات گھونسے اور تھپڑ... نیچے گر پڑا تھا۔ پھر جب اصلیت معلوم ہوئی تو انھیں جوش آگیا۔ ہم نے بھی خوب چیخ دھاڑ مچائی۔"

"تو بھی اونچی فنکار ہے چھیمو۔ بے چارے عبداللہ کا برا حشر کرے گی۔" نشاط نے کہا اور چھیمو ہنسنے لگی۔

دوسری طرف بیگم صاحبہ سکون تھیں۔ انھیں شدید غم و غصہ تھا کہ انھوں نے ان بلاؤں کو اپنی حویلی میں کیوں جگہ دی تھی۔ اب وہ اس قصے کو ختم کردینا چاہتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے شاہدہ بیگم کو جا پکڑا۔

"جو کچھ ہوچکا ہے شاہدہ باجی۔ کیا اس کے بعد کوئی گنجائش رہ گئی ہے۔ مجھے سخت اور برے الفاظ کہنے پر مجبور نہ کریں۔ بڑا گندہ خون ہے آپ کا۔ آپ لوگ فوراً یہاں سے جانے کی تیاری کریں کہیں میں آپے سے باہر نہ ہو جاؤں۔"

"میری آخری درخواست ہے مہرالنساء بیگم صبر و سکون سے معاملے کو ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ صرف اخلاق مدنظر رہا ہوں ورنہ ان باتوں کا جواب بھی دیا جاسکتا ہے۔" عقب سے توفیق صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ دوبارہ اندر گھس آئے تھے۔

"آپ کو اندر آنے سے منع کیا گیا تھا۔" مہرالنساء بیگم نے کہا۔

"صورت حال سمجھانے آیا ہوں آپ کو۔ بس بہت ہوچکا ہمارے لئے یہاں سے کہیں جانا مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اس لئے کہ کوئی جگہ ہی نہیں ہے ہماری۔ اوباش فطرت لوگ ہیں رفیق اور شفیق بدمعاشی کرتے رہے ہیں اپنے علاقے میں۔ ان حالات سے خوفزدہ نہیں ہوں گے۔ یہ صرف میرا خوف ہے جو وہ خاموش ہیں ورنہ اتنی بے عزتی برداشت نہ کرتے۔ نکلیں گے تو سہی ہم اس حویلی سے لیکن دو چار لاشیں گرا کر تاکہ جیل میں ٹھکانہ تو مل جائے۔ دوسری کوئی جگہ نہیں ہمارے ذہن میں۔"

"گویا آپ لوگ غنڈہ گردی کریں گے؟"

"میں نے کہا نا فطرت ہی ایسی ہے۔ کیا کیا جائے۔" توفیق صاحب بولے۔

"غلط فہمی کے شکار ہیں توفیق بھائی۔ ٹھیک ہے آپ غنڈہ گردی کا بندوبست کریں۔ میں اپنے تحفظ کی فکر کرتی ہوں اس کے بعد شاہدہ بیگم کسی مروت کی گنجائش نہیں رہتی۔" بیگم صاحبہ کمرے سے نکل گئیں۔

سنسنی خیز اور بدلتے واقعات کی کہانی کی آئندہ قسط آئندہ ماہ



اگر مرد بدگمان ہو جائے تو وہ جلد ہی عورت سے چھٹکارا پا لیتا ہے
لیکن اگر عورت بدگمان ہو جائے تو مرد کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے

یہ کہانی ہے عورت و مرد کی بدگمانی کی داستان سناتی ہے

بدگمان

ابن آدم

رات اپنے پنکھ پھیلائے جب اُجالے کو نگلنے آتی تو اُجالا سہم کر کونے کھدروں میں دبکا جاتا۔ ایسا ہی ایک کونا منزہ کا سہما ہوا پریشان دل تھا جو تاریکی ہوتے ہی اندھیری قبر بن جایا کرتا تھا وہ گھبرا اٹھتی۔ پچھلے کئی روز سے وہ ان گہرے اندھیروں سے خائف رہنے لگی تھی۔ اس کا خوف اس بزدل بچے کا خوف نہ تھا جو نانی اماں سے جنوں پریوں اور کانے دیو کی کہانیاں سننے کے بعد اندھیروں سے ڈرنے لگتا ہو۔ بلکہ اس کا خوف کچھ عجیب نوعیت کا تھا جس کے متعلق وہ خود بھی کچھ زیادہ نہ جانتی تھی اور جان لینے کے ڈر سے جاننے کی کوشش ہی نہ کرتی تھی، بات صرف اتنی سی تھی کہ گزشتہ کئی دنوں سے یہ اندھیرے اس کا مران کو چھین لے جاتے تھے۔ دن بھر وہ ڈسپنسری میں رہتا۔ تین چار بجے آتا منزہ کے ساتھ چائے پیتا، باتیں کرتا لیکن شام کے سائے جوں ہی گہرے ہونے لگتے کامران بالکل ریلوے انجن کی طرح ٹھیک وقت پر مقررہ پلیٹ فارم پر لگ جاتا اور منزہ اسے کچھ بھی نہ کہہ سکتی اور نہ ہی وہ کچھ کہنے سننے کی گنجائش چھوڑتا اور پھر وقت ہوتے ہی وہ چل پڑتا، اور منزہ ایسے کھڑی رہ جاتی جیسے پلیٹ فارم پر کوئی لڑکی اپنے محبوب کو الوداع کہنے کے بعد جاتی



ہوئی لڑیوں کی سُرخ بتیوں کو حسرت بھری نمناک آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ہر رات ایسے ہی ہوتا۔ وہ چلا جاتا اور منزہ تنہائیوں میں گھبرا جاتی۔ کتابوں سے دل لگاتی، ریڈیو سنتی اور جب کوئی چیز بھی اس کے دل کا اندھیرا دور نہ کر پاتی تو وہ ستاروں سے روشنی مانگنے کھڑکی کھول کر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھنے لگتی تھی۔

آج بھی باہر اندھیروں کا راج تھا۔ کمرے کے کسی کونے میں چھپا ہوا جھینگر بڑی دردناک آواز میں رو رہا تھا۔ منزہ کو ایسے لگا جیسے وہ کسی ویران قبرستان میں کھڑی ہے۔ عجیب بات تھی کہ وہ اندھیروں سے گھبراتی تھی مگر جب یہ ڈر انتہا کو پہنچ جاتا تو وہ کمرے کی عزت بخش ہلکی سی سبز روشنی یا کھڑکی کھول دیتی تھی جیسے باہر کے اندھیرے کو اندر آنے کی دعوت دے رہی ہو یا فطری طور پر ڈرانے والی چیز سے چمٹ جانا چاہتی ہو۔ جھینگر کی آواز کس قدر تلخ تھی۔ اس کا احساس تنہائی اسے اور بھی دحشت ناک بنا رہا تھا۔ تب ہی اس نے گھبرا کر کھڑکی کھول دی۔ تازہ ہوا کا جھونکا منزہ کے چہرے کی بلائیں لیتا اندر آیا۔ سامنے دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر تھر کنے لگا تھا۔ جیسے معطر ہوا کی آمد پر خوشی سے ناچنے لگا ہو۔ منزہ نے خشک بالوں کی بکھری ہوئی اپنی لٹ چہرے سے ہٹائی مگر وہ پھر گستاخی کرنے لگی تھی۔ اس کی گستاخی پر وہ سنجیدہ ہونے کے باوجود مسکرا اٹھی۔ غیر ارادی طور پر اس کی نگاہ مغرب کی پیشانی پر لٹکتے روشن ستارے پر پڑی یہ وہی ستارہ تھا جسے کامران نے دیکھ کر منزہ کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا تھا۔

"میرا ستارہ مغرب کے اس ستارے سے کہیں زیادہ حسین ہے۔"

منزہ نے نڈھال ہو کر اپنی جلتی ہوئی پیشانی کھڑکی کے ٹھنڈے کواڑ پر رکھ دی۔ عین اسی لمحے اسے اپنے کندھے پر ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا۔ منزہ کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی مگر دوسرے لمحے یہ لہر ادھوری رہ گئی۔ درمیان سے جیسے کاٹ دی ہو۔ اس کے سامنے لہروں کو برقرار رکھنے والا نہ تھا۔ جمال اپنی شریر آنکھوں میں مسکراہٹ لئے کھڑا اُسے گھور رہا تھا۔ منزہ کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی اور غائب ہو گئی جیسے سے اسے استقبال کرنا پڑا تھا۔

"کیا بات ہے تم کچھ پریشان دکھائی دیتی ہو۔۔۔؟" جمال نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ منزہ نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"نہیں تو۔۔۔" وہ مسکرانے کے انداز میں بولی۔ "کوئی ایسی بات نہیں ہے۔"

"پھر یہ تمھاری آنکھیں ویران کیوں ہیں۔۔۔؟" جمال نے کہا۔ "اوہ میں سمجھا کامران آج پھر غالباً کسی فرض کی ادائیگی میں مصروف ہوں گے۔"

"جی وہ کسی زمین کو دیکھنے گئے ہیں۔" منزہ نے کہا۔ یہ تو اس کی زبان نے اپنے کامران کا بھرم رکھنے کی خاطر کہا تھا۔ ورنہ منزہ کا دل رو رو کر کہہ رہا تھا۔ "کامران ۔۔۔ خدارا آ بھی جاؤ۔ دیکھو تمھاری غیر حاضریاں اب غیروں کی توجہ کا سبب بن رہی ہیں۔" اس کی ہنسی منزہ کو چبھ گئی۔ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔۔۔؟" وہ چڑ کر بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" جمال سنجیدہ ہو گیا۔ "مجھے بجائے ہنسنے کے رونا چاہئیے لیکن مجھے رونے کی عادت نہیں ہے۔ جب بھی مجھے رونا آتا ہے میں ہنسنا شروع کر دیتا ہوں اور ہنستے ہنستے رو لیتا ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہنسنے کی وجہ سے آنکھوں سے پانی بہہ نکلا ہے۔ یہ رونے کا بڑا اچھا طریقہ ہے۔"

"جانے آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔" منزہ کچھ نہ سمجھتی ہوئی خفت آمیز آواز میں بولی۔ "آیئے ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"ایسی باتیں جو اگر تم سمجھ جاؤ تو تم بھی میری طرح قہقہے لگانے شروع کر دو۔" جمال منزہ کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے بول رہا تھا۔

"اپنی معصومیت پر، اپنی حماقت اور انجان پنے پر، فرق صرف اتنا ہو گا کہ تم رونے کی آرزو میں پگلی کے رُوپ میں قہقہے لگاؤ گی اور میں آنسوؤں کو پینے کی خاطر ہوش مند قہقہے لگاتا ہوں۔۔۔"

"رونے کی آرزو میں، پگلی کے روپ میں قہقہے۔" منزہ رُک رُک کر ایسے بول رہی تھی جیسے خواب میں بول رہی ہو۔ "لیکن کیوں؟" وہ یکدم مڑ کر بولی۔

"اس کیوں کا جواب مجھ سے نہیں اپنے دل سے مانگو جو ایک ایسے بہروپئیے کی پرستش کرتا ہے جس کا اصل چہرہ بے حد ڈراؤنا ہے۔ اس کیوں کا جواب اپنی ان خوبصورت آنکھوں میں تلاش کرو جو محبت اور وفاؤں کی دہلیز پہ بیٹھی بانس کی ہوئی بھکارن کی طرح کسی کے قدموں کی چاپ سُننے کے لئے ہر وقت کانوں کے سامنے اپنی جھولی پھیلائے رکھتی ہے، اس کیوں کا جواب اپنی محبت کے چہرے پر پڑھو، اس کی مکار آنکھوں میں ڈھونڈو، ان آنکھوں میں جن میں ہر وقت شیطانیت رقصاں رہتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم جیسی پڑھی لکھی سوشل لڑکی حقیقی کا مادھو کیوں کر

بن کر رہ گئی ہے۔"

"آخر ان کچھ کہنے سے آپ کا مطلب کیا ہے۔۔؟" منزہ کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت و حقارت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اس کی آواز میں بلا کا رُعب تھا۔

"کاش۔۔!" جمال بیکا کھڑا تھا۔ اس پر منزہ کی کیفیات کا ذرہ برابر اثر نہ ہوا تھا۔ "کوئی مطلب نہ ہوتا۔ اگر میرا تم سے کوئی تعلق نہ ہوتا مگر کوشش کے باوجود میں اس تعلق کو توڑنے میں ناکام رہا ہوں جو تعلق ایک سرد اور اندھیری رات میں پیدا ہوا تھا تمہیں وہ رات یاد ہو گی جب میں نے تم سے ایک سودا کیا تھا۔ تمہیں اپنی وفاداری اور ہمدردی کا یقین دلایا تھا۔"

"جی ہاں۔" منزہ بیزاری سے بولی۔ "مجھے سب کچھ یاد ہے۔ مہربانی کر کے پہلے اپنا لب و لہجہ مہذب بنائیے۔" منزہ کو یہ گستاخی بُری لگی۔

"یہ مت بھولو کہ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا ہے۔" جمال نے سپاٹ آواز میں کہا۔

"لیکن تعلیم اور دوسری خوبیوں میں وہ آپ سے بہت زیادہ اونچے ہیں۔"

"ہوں۔ میں جانتا ہوں، جتنے پانی میں وہ تیرتا ہے۔ خیر تم میرے سوال کا جواب دو۔"

"یقینی اور بے یقینی کے چکر میں وہ لوگ پڑتے ہیں جن کو اپنی ذات پر یقین نہیں ہوتا اور ہمیشہ ہاں اور نا کے درمیان لٹکے رہتے ہیں خدا کا شکر ہے کہ میں ایسی نہیں ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر کامل بھروسہ ہے۔"

"وہ واپس کب تک آ جائے گا؟" جمال نے موضوع کی رسّی کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

"کوئی ٹھیک وقت نہیں۔" منزہ نے گول سا جواب دیا۔

"سُنا ہے وہ کئی راتیں باہر بھی گزار چکا ہے۔" جمال نے بھرپور وار کیا۔

"جی ہاں دو تین راتیں انھیں باہر رہنا پڑا تھا۔" منزہ نے اعتراف کر لیا۔

"تم نے وجہ پوچھی تھی؟"

"نہیں۔ اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی کیونکہ وہ خود وجہ بتا دیتے ہیں۔"

"اور تم یقین کر لیتی ہو؟" جمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں۔" منزہ معصومیت سے بولی۔ "وہ جھوٹ نہیں بولتے۔"

"اگر میں کہوں وہ جھوٹا ہے، مکّار ہے، پہلے درجے کا عیار اور عیاش ہے تو۔۔؟"

"جمال بھائی۔" منزہ احتجاجاً چیخ اُٹھی۔ "آپ ایک خاتون سے ہم کلام ہیں اور ایک ایسی خاتون سے مخاطب ہیں۔ یہ نہ بھولیے کامران مجھے سارے جہان سے عزیز ہے۔ کاش آپ مجھ سے بڑے نہ ہوتے۔ آپ کو میں بھائی نہ کہہ چکی ہوتی تو کامران کی شان میں گستاخی کرنے والی زبان کاٹ دیتی۔ کامران کو بُرا کہنے والے کا منہ نوچ لیتی۔ کامران پر الزام لگانے سے قبل آپ کو اپنا محاسبہ بھی کر لینا چاہیے تھا۔ اپنے گریبان میں جھانکیے جس میں جرم کی طویل داستانیں مرقوم ہیں۔ کتنے مظلوموں کی آہیں دبی پڑی ہیں ایک ڈاکو کی زبان ایک فرشتے پر اعتراض کیسے کر سکتی ہے۔ آپ غالباً مجھے ورغلانا چاہتے ہیں۔ آخر آپ نے اپنی صلاحیت ظاہر کر ہی دی ہے مگر یاد رکھیے میں منزہ ہوں جو اندھیری رات میں بھی جمال ڈاکو کے سامنے نہ جھکی تھی۔ میں کامران کو آپ سے کہیں زیادہ نزدیک سے دیکھ چکی ہوں۔ آپ جس کی آنکھوں میں شیطانیت بتا رہے ہیں میں نے ان کی آنکھوں میں شرافت، پاکیزگی اور ہمدردی کے لاکھوں چراغ روشن دیکھے ہیں۔ آپ جس چہرے کو مکّار کہہ رہے ہیں اس پر معصومیت کی مقدس کرنیں ہر وقت نورانی روشنی بکھیرتی ہیں جانے اور مجھے اس کا انتظار کرنے دیجیے۔ آپ تو چند لمحوں کی بات کرتے ہیں۔ بخدا جمال بھائی میں تو اپنی آنکھیں بچھو کر ویرانوں میں بھی تاقیامت اس کا انتظار کر سکتی ہوں۔"

"اُف۔۔!" جمال نے بے قراری سے پہلو بدل کر ادھ جلا سگریٹ مسل ڈالا۔ اس کے چہرے پر شکست خوردہ جھنجلاہٹ نمایاں تھی

"تم کتنی بھولی اور کس قدر نادان ہو منزہ۔ خدارا مجھ پر شک نہ کرو میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ یقین کرو۔ کامران پہلے پہل مجھے بھی عزیز تھا لیکن کامران کو جب سے میں نے پڑھا میرے اعتقاد کو بڑی ٹھیس لگی۔ کامران وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ وہ آگ کا دہکتا ہوا خوبصورت انگارہ ہے۔ ایسا خوش رنگ انگارہ جسے انجان بچے لپک کر پکڑ لیتے ہیں اور اپنا نرم و نازک ہاتھ جلا ڈالتے ہیں وہ خوش ذائقہ زہر ہے جو تمہاری رگوں میں سرایت ہو رہا ہے اور اگر تم نے عقل کی آنکھیں یوں ہی بند رکھیں تو یقین کرو ایک دن یہ آگ کا سرخ گولہ تمہارا یہ خوبصورت جسم پگھلا دے گا۔ تمہاری جوانی پگھل کر گندی نالی میں بہہ جائے گی۔ میری خاطر نہ سہی اپنی خاطر، اپنی جوانی کے لئے اپنی آنکھوں سے محبت کی پٹی اتار کر کامران کو پہچاننے کی کوشش کرو۔ میرے پاس اگر ٹھوس ثبوت نہ ہوتا تو کبھی زبان پر نہ لاتا۔"

"خدارا خاموش ہو جائیے۔" منزہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بے بسی سے بولی۔ "مجھے نہیں چاہئیے ثبوت کامران اگر آگ کا انگارہ ہے تو میں پھول سمجھ کر اسے اپنی قسمت کے دامن میں سجائے رکھوں گی۔"

"تم میری بات تو۔۔۔"

"جائیے۔" منزہ اس کی بات کاٹتے ہوئے دھاڑی۔ "چلے جائیے میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔"

"میں تو ہر روز کی طرح چلا ہی جاؤں گا۔" وہ اٹھتے ہوئے [illegible] مگر آج جانے سے پہلے تمہیں اتنا ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ کامران [illegible] تمہیں ہی انتظار نہیں رہتا بلکہ اس شہر میں دو اور عورتیں بھی اس کی منتظر رہتی ہیں۔ کامران صرف تمہارے ہی آسمان کا چاند نہیں۔ بلکہ وہ کسی کی مانگ کا بھی سیندور ہے، کسی کی امید کا سہارا بھی ہے۔ کوئی اور بھی اپنے ارمانوں کی مانگ میں سیندور سجائے اس کی منتظر رہتی ہے۔"

"جھوٹ ہے۔" منزہ چیخی۔ "یہ بہتان ہے، تم جھوٹے ہو۔"

"یہ سچ ہے۔" جمال گھور کر بولا۔ "وہ آج کل زیادہ وقت اپنی ایک نرس کے پاس گزارتا ہے جو اس کی ماں کے پاس بحیثیت ملازمہ رہتی ہے۔"

"تم بکتے ہو۔" منزہ دانت پیس کر بولی۔ "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

"اونہہ۔" وہ طنزاً غرایا۔ "ہو سکتا ہے۔ ہونے کو کیا کچھ نہیں ہو سکتا جس طرح جمال ڈاکو، منزہ کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر ڈاکو سے مہذب بن سکتا ہے۔ اسی طرح ایک شریف ڈاکٹر اپنی بیوی کی آنکھوں میں محبت کی ریت ڈال کر اپنی داشتہ سے تعلقات استوار کر سکتا ہے اس فریبی دنیا میں کیا نہیں ہوتا منزہ۔"

"اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتا دیتے۔" منزہ ابھی تک اعتماد کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ "بعض اوقات ہم جو کچھ بتانا چاہتے ہیں مصلحت کی مجبوری زبان بندی کا حکم لگا کر ہمیں خاموش کر دیتی ہے۔"

"اگر تم حقیقت جاننی ہے تو کچھ روز انتظار کرو۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس وقت اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ وہ خوش تھا۔ آج دوسرے اہم محاذ پر بارود کی سرنگ بچھانے میں کامیاب ہو گیا تھا اسے یقین تھا کہ یہ بارود دشمن کے گھٹنے ٹیک دے گا۔

آخری دنوں کا کمان نما چاند مشرق کے کھلے دریچے سے نیند میں ڈوبے ہوئے شہر اور چپ چاپ کھڑے درختوں کو دیکھ رہا تھا دھندلی دھندلی چاندنی اندھیرے کی عفریت پر غالب تھی۔ دور چھاؤنی پر گھڑیال نے تین بجائے تو صوفے پر آڑی ترچھی پڑی نیند میں ڈوبی ہوئی منزہ نے چونک کر پہلے ارد گرد دیکھا پھر اپنی کلائی باہر نکال کر وقت دیکھا۔ تین بجنے میں تین منٹ تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا جوں کا توں سرپوش میں چھپا آنے والے کا منتظر تھا کھانے سے ہٹ کر اس کی نگاہ کامران کے خالی آبنوسی پلنگ پر سفید براق [illegible] پڑی تھی جیسے تابوت، وہ خوف کی پتلی سی لہر [illegible] جیسے وہ ویران قبرستان میں تابوت کے سرہانے [illegible] دوسرے لمحے اس نے سفید چادر پلنگ سے [illegible] کونے میں پھینک دی۔ ایسا کرتے وقت اس کا سارا بدن [illegible] کی نمی سے نم آلود ہو گیا تھا۔ وہ ہانپتی ہوئی واپس صوفے پر گر پڑی۔

"اوہ میرے خدا۔" اس نے جلتی ہوئی پیشانی صوفے کی ٹھنڈی پشت پر رگڑی۔ "کہاں ہو کامران! اب آ بھی جاؤ۔" سسکتی ہوئی سرگوشی ابھری۔

"کوئی اور بھی اپنے ارمانوں کی مانگ میں سیندور سجائے اس کی منتظر رہتی ہے۔"

صوفے کے کونے سے کپڑے نے جیسے دانت نکال کر کہا اور منزہ نے اس جانی پہچانی آواز پر چونک کر صوفے کی طرف دیکھا۔ "کوئی اور بھی۔"

گلدان میں رکھا پلاسٹک کا پھول بول پڑا۔ "کوئی اور بھی، کوئی اور بھی، کوئی اور بھی۔" پلنگ، فرش پر پڑی چادر، میز پر،

تالم پیس، جگ، گلاس، اوندھی پڑی پلیٹیں، چھت، بے حس و حرکت پلنگ، یقین تھی کہ اس کے دل کی دھڑکنوں سے بھی کوئی اور بھی لوئی اور بھی سسکی سی، روئی آوازیں آ رہی تھیں، وہ ان بیاتی ہوئی ڈکیلی آوازوں کی چبھن سے بلبلا اٹھی۔ وہ تن تنہا اس یلغار کو کیسے روکتی۔

”نہیں، نہیں اور کوئی بھی نہیں۔ وہ میں ہوں صرف میں مجھے ہی اس کا انتظار رہتا ہے۔ میرے ہی ارمانوں کی مانگ میں اس نے سیندور بھرا تھا۔ اور کوئی نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ وہ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”اپنی گھڑی دیکھو۔“ یہ اس کی اپنی ہی آواز تھی لیکن اس آواز میں بلا کا زہر تھا۔

”تین بج چکے ہیں۔ وہ ابھی باہر ہے۔ بتاؤ کہاں ہے وہ؟ ضرور اسی کے پاس ہو گا۔ ایک، دو، تین۔“ اس نے ڈائیل کے ہندسے پڑھے۔

”لیکن وہ ہے کون؟“ اس کی مدافعت کی پہلا تار ٹوٹ گیا جب ہی تو اس نے ان کی آوازوں کی چوکھٹ پہ جھک کر سوال کیا تھا۔ ”اگر اور بھی کوئی ہے تو میں کیوں ہوں؟ مجھے اس نے کیوں جوانی کی نیند سے بیدار کیا۔ میرے ارمانوں کی معصوم وانجان دنیا میں وہ کیوں داخل ہوا۔ کیوں... کیوں... کیوں...؟“

وہ پوری قوت سے چلائی۔ ”مجھے کسی کا انتظار نہ تھا۔ میں پیار کے انداز سے نا آشنا تھی، میں نے پیار کی بھیک نہیں مانگی تھی۔ جو کچھ اس نے دیا میں نے خاموشی سے اپنا لیا۔ پھر وہ کسی اور کو کیا دے رہا ہے؟ کیا اس نے سب کچھ مجھے نہ دے دیا تھا۔۔۔؟“

کوئی جواب نہ پا کر صوفے کے ہتھے پہ سر رکھ کر رونے لگی۔ چند ثانیے بعد اسے اپنے بالوں پہ ہلکا سا بوجھ محسوس ہوا۔ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا کامران اس کے سر پہ جھکا اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔

”کامران۔۔۔!“ وہ اٹھ کر اس سے یوں لپٹ گئی جیسے کوئی بچہ خواب میں کالے دیو سے ڈر کر ماں کے سینے سے چمٹ گیا ہو۔ وہ بُری طرح رو رہی تھی اور کامران کی اپنی آنکھیں بھی ایسی ہو رہی تھیں جیسے دھوئیں میں کھڑا ہو۔

”کامران۔۔۔!“ وہ شکایتی لہجے میں کامران کی سفید قمیص پہ اپنا بھیگا ہوا چہرہ رگڑتے ہوئے سسکی۔ ”مجھے چھوڑ کر کہاں چلے جاتے ہو؟ کہیں نہ جایا کرو کامران۔ جب تم چلے جاتے ہو تو مجھے تنہا پا کر شیطان آ جاتے ہیں۔ یہ شیطانی عورتیں مجھے ڈرانے لگتی ہیں۔ وعدہ کرو تم کہیں نہیں جاؤ گے، کہیں بھی نہیں۔ میں تمہاری منتظر رہتی ہوں مگر تم نہیں آتے۔ کیوں نہیں آتے؟ کہاں کھو جاتے ہو؟ بتاؤ کامران کہاں رک جاتے ہو، کس کے پاس اتنا وقت گزارتے ہو، وہ کون ہے؟“ منزہ نے چیخ کر پوچھا اور پھر اپنی ہی آواز سے خود ہی سہم سی گئی۔

”کوئی بھی نہیں۔“ اس پہ دیوانگی طاری ہو گئی۔ کامران کا کوٹ دونوں مٹھیوں میں مضبوطی سے پکڑ کر اسے جھنجوڑتے ہوئے چیخی۔ ”کہہ دو کامران کوئی بھی نہیں۔ تمہارا اور کوئی بھی منتظر نہیں۔ ہاں کہہ دو تم کہیں نہیں جاتے۔ بولو۔۔۔ بولو، خاموش کیوں ہو؟“

کامران نے بے حد نرمی سے اپنا کوٹ اس کی مٹھیوں سے چھڑایا اور تھکے تھکے قدموں سے چلتا منزہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے جانا پڑتا ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں مجبور ہوں منزہ اور بدنصیب بھی۔“

”کیوں جانا پڑتا ہے؟“ وہ تیزی سے بولی۔ ”کہاں جاتے ہو؟“

”کہاں۔۔۔!“ کامران کا لہجہ خوابناک تھا۔ ”نہیں منزہ اس کا جواب میں نہیں دے سکتا۔ فرض کی آہنی زنجیر جکڑ کر لے جاتی ہے۔ بے بسی کی ملتی ہوئی تصویر دیکھتا رہتا ہوں اور پھر محبت کے ہاتھ واپس کھینچ لاتے ہیں۔“ وہ پلٹا۔ ”اور وہ ہاتھ، میری منزہ کے ہاتھ ہیں۔“ اس نے منزہ کے نرم گداز ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگائے۔ ”یہی ہیں وہ ہاتھ، یہی ہیں وہ آنکھیں جن کو میں کبھی بھی نہیں بھولتا۔“

”لیکن تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تمہاری جدائی میں ایک پل بھی برداشت نہیں کر سکتی۔“

”کاش ایسا ہوتا۔“ کامران نے آہ بھری۔ ”یہی تو ایک عذاب ہے کہ میں تمہیں کسی لمحے نہیں بھول پاتا۔ تمہارے انتظار کا احساس اور روز افزوں محبت اور وفا میرے دکھ میں اور بھی اضافہ کر دیتی ہے۔ میرا انتظار نہ کیا کرو جانِ آرزو، سو جایا کرو۔ تمہیں پا کر میں ابھی نہیں مرنا چاہتا مگر یہ غم، یہ طوفانی انداز میں بدلتے ہوئے حالات کا تیز دھارا مجھے مار دے گا۔“ کامران کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے تھے۔

”تمہیں کون سا غم ہے کامران۔۔۔؟“ منزہ اپنے محبوب کو حزن و ملال میں ڈوبتے دیکھ کر اپنا روگ بھول گئی۔ ”وہ کون سا ایسا راز ہے جسے تم اپنے من میں چھپائے یوں جل رہے ہو، مجھے بتا دو میرے سرتاج۔۔۔ اپنے سارے غم مجھ پر انڈیل دو میں کم مو نگی

مگر اپنے سرتاج کے دُکھوں کا بوجھ سہہ لوں گی۔ مجھے اپنا بنا کر بھی کیوں غربت برتتے رہے ہیں۔ میں تمھاری پارٹنر ہوں کامران۔ اکیلے نہ جلو، وہ آگ مجھے دے دو۔ میں تمھاری دی ہوئی آگ میں جلتے ہوئے بھی تمھارے لئے، اپنے کامران کے لئے مسکراتی رہوں گی۔ بتا دو کامران ورنہ میں یہ سمجھوں گی کہ تم نے ایک ساتھی نہیں بلکہ زرِ بیزار ہے"

"منزہ ۔۔۔!" کامران چیخا۔ "خاموش ہو جاؤ منزہ" شدّتِ جذبات سے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ "مجھے اکیلے اس آگ میں جلنے دو جو آج سے بہت برس قبل میرے ہی ایک جلیل القدر بزرگ نے جلائی تھی اور پھر یہ آگ ایک سے دوسرے دامن میں منتقل ہوتی رہی اور جانے یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا"

"کس قدر پُراسرار ہو تم ۔۔۔" منزہ جیسے اپنے آپ سے بولی:

"ہاں تم ایسا ہی سوچ سکتی ہو" وہ ہنس کر بولا۔ "آداب سو جائیں۔ کھانا تو تم نے کھا لیا ہو گا" اس نے گم سم کھڑی منزہ کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"شاید ۔۔۔" وہ سنبھل کر بولی۔

"میں جانتا تھا" وہ مغموم آواز میں بولا۔ "پر اب وقت گزر چکا ہے، کیا صبح تک صبر کر سکو گی؟" منزہ نے نگاہیں اٹھا کر کچھ اس انداز سے گھورا کہ کامران کو کھسیا کر نگاہیں چرانی پڑیں۔ منزہ کی نگاہیں جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہی ہوں: "میرے صبر کی انتہا تمھارے اوراک سے بھی بلند ہے"

"ٹھیک ہے" وہ جیسے نگاہوں کی زبان سمجھ گیا ہو۔ "صبح دیکھا جائے گا"

دس منٹ بعد منزہ کامران کی بانہوں کے مضبوط حصار میں آنکھیں موندے اس اطمینان سے پڑی تھی کہ جیسے ٹھٹھری ہوئی بلی مالک کی گرم آغوش میں آ کر سو گئی ہو۔

صبح کا سہانا اجالا رات بھر کی ستائی ہوئی عورت کی بوجھل آنکھوں کی طرح ڈر ڈر کے، رک رک کر ماحول کو گھور رہا تھا۔ پتوں میں دبکے ہوئے پرندے جاگ تو چکے تھے مگر اڑنے سے پہلے دن بھر ساتھ دینے والے پروں کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے پیشہ ور کاریگر کام پر جانے سے پہلے اپنے اوزاروں کو جھاڑ پونچھ کر دیکھا کرتے ہیں۔ اللہ کے وہ بندے جو قائلِ بندگی نہیں بلکہ قابلِ بندگی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں۔ وہ اقرارِ بندگی کے بعد خدا کے گھر سے نکل کر اپنے گھروں کی طرف آ رہے تھے۔ ان ہی بندوں میں کامران کا بوڑھا رحمت خان بھی تھا جو حقیقی اور مجازی آقاؤں کا وفادار تھا۔ وہ حقیقی آقا کی خوشنودی حاصل کر کے جب مجازی آقاؤں کی خدمت کرنے کے لئے لوٹا تو یہ دیکھ اسے بڑا تعجب ہوا کہ گرم پانی جوں کا توں ہی پڑا تھا۔ ۔ ۔ ۔ حالانکہ جب وہ مسجد سے لوٹا کرتا تھا تو کامران اور منزہ دونوں نماز کے بعد تلاوت کرتے ہوتے تھے مگر ہر طرف خاموشی تھی۔ کسی کمرے سے منزہ کی سُریلی تقدس بھری آواز نہ آ رہی تھی۔ ہر طرف نحوست سی برس رہی تھی۔ رحمت خان نے ناخوشگواری سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا پھر بھی اس نے سوچا آج اس گھر میں نحوست آئی ضرور ہے۔

آج ناشتہ رحمت نے ہی لشتم پشتم تیار کیا تھا کیونکہ منزہ دن چڑھے جاگتے ہی رحمت خان سے چھپتی چھپاتی، شرمندہ سی، نہانے باتھ روم میں چلی گئی تھی۔ رحمت خان خادم ہونے کے باوجود ان کا ہمراز تھا۔

کامران نے چائے پیتے ہوئے پیالی کے دُھندلے اُفق سے دیکھا وہ پلکوں کی جھالریں جھکائے پیالی سے نکلتی ہوئی بھاپ میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی اس کا چہرہ آج دلہنوں ہی کی طرح تھا جیسے آج اس نے اپنے چہرے سے گلاب کے پھول جیسا تر و تازہ رنگین خول اتار پھینکا تھا۔ یہ منزہ کا دوسرا رُخ تھا۔ ایک عورت کا دوسرا رُوپ نیا لبادہ، وہ ایک ہی رات میں کس قدر بدل گئی تھی۔ وہ منزہ کے رُوپ میں کتنی پیاری تھی مگر عورت کے رُوپ میں کتنی عجیب لگ رہی تھی یہ نیا رُخ، یہ نیا رُوپ اور تبدیلی کامران کے لئے تشویش کن تھی۔ وہ تو صرف منزہ کا پجاری تھا۔ اس نے منزہ کو صرف منزہ کے ہی رُوپ میں پسند کر کے اپنایا تھا وہ تو عورت سے ناآشنا تھا۔ اسے ایک عورت کی کبھی تمنا نہ تھی۔ وہ کچھ دنوں سے بے حد پریشان تھا۔ دُکھی تھا اسکے اندر غم کی آگ دہک رہی تھی مگر وہ اس آگ کو اپنے تک ہی روکے ہوئے تھا۔ اس نے من کے پٹ سختی سے بند کر رکھے تھے کہ کہیں کوئی شعلہ، کوئی اُڑتی ہوئی چنگاری اور اس کی ازدواجی زندگی کے دامن پر نہ پڑ جائے۔ وہ خود تو جل رہا تھا مگر منزہ کو بچائے رکھنے کا اسے خیال تھا مگر آج منزہ کے چہرے پر دھوئیں کی پرچھائیاں دیکھ کر وہ کانپ سا گیا تھا جیسے منزہ بھی آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔

"منزہ ۔۔۔!"

"جی ۔۔۔"

"کیا بات ہے ڈیئر؟ آج تم کچھ ڈری ڈری، سہمی سہمی سی دکھائی

"۔۔۔ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟"

منزہ نے بوجھل پلکوں کو اٹھایا اور بولی: "یہ آپ کہہ رہے ہیں؟ اپنے دل سے پوچھئے، منزہ کچھ چھپا رہی ہے یا ڈاکٹر کامران مداریوں کی طرح اداکاری کر رہا ہے۔"

"میں... میں..." وہ گڑبڑا گیا۔ "نہیں منزہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"میرے لہجے ڈاکٹر" منزہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "یہ کاش میں تمہارا غم بانٹ سکتی۔"

"وہ تو بٹ چکا ہے۔" کامران مردہ سی آواز میں بولا۔ "تمہارے چہرے پر میں اپنے غم کی لکیریں دیکھ رہا ہوں منزہ۔"

"کامران!" منزہ بولی۔ "تم نے مجھے کیوں اپنایا تھا؟"

"تم اپنے بالوں میں پھول کیوں لگاتی ہو؟"

"یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں۔"

"میرا تو خیال ہے یہ ایک مکمل جواب ہے جس طرح تم بالوں میں پھول سجا کر روحانی خوشی محسوس کرتی ہو اس طرح میں..."

"یعنی روحانی خوشی کی خاطر؟" منزہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔"

"کیا تمہیں وہ خوشی حاصل ہو گئی۔؟"

"بالکل۔" کامران پورے اعتماد سے بولا۔ "تمہیں پا کر مجھے سارے جہان کی خوشیاں مل گئی ہیں۔"

"لیکن پھر بھی تم دکھی ہو، ایسا کیوں ہے۔" منزہ نے اس سے جرح کی۔

"اوہ... وہ دکھ اور نوعیت کا ہے۔ اس کا تعلق تم سے نہیں۔"

"کیا میں اس دکھ کو دور نہیں کر سکتی۔؟"

"نہیں..." کامران دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "بالکل نہیں جس طرح بیلے کے تروتازہ پھول تمہیں زکام، کھانسی یا بخار سے نجات نہیں دلا سکتے اسی طرح تم میری روح کی گہرائیوں میں سما کر بھی مجھے اس دکھ سے نہیں بچا سکتیں میں مجبور ہوں کیونکہ مجھ پر انجانا سا خوف طاری ہے۔ تم مجبور ہو کر تم بے خبر ہو، آگ کی فطرت کو جلانے پر مجبور کیا ہے وہ جلائے گی۔"

"لیکن قدرت نے پانی کو آگ پر غالب بھی تو کر دیا ہے۔" منزہ نے دلیل دی۔

"ہاں..." کامران بولا۔ "پانی آگ کو بجھاتا ہے اور اگر پانی کم ہو اور آگ زیادہ ہو تو پھر وہ پانی بھی بھاپ بن کر عدم وجود کر دیتی ہے۔ یہ قدرت کا عجیب کھیل ہے۔ مگر میں نہیں چاہتا تم بھاپ بن کر میری دنیا سے دور ہو جاؤ۔ نہیں منزہ کبھی نہیں، تمہارا وجود مجھے اپنے سکون سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔"

"یعنی آپ کچھ بھی نہیں بتائیں گے؟" منزہ جیسے کچھ اگلوانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ "یہ بھی نہیں بتائیں گے کہ آپ کی امی بقید حیات ہیں یا..."

"منزہ...!" کامران ایسے کراہ اٹھا جیسے اس کے کسی دکھتے ہوئے پھوڑے پر منزہ نے نشتر چبھو دیا ہو۔ "اگر خدا نے تمہیں زبان دی ہے تو اسے زبان ہی رہنے دو۔ کیوں آج اس سے کانٹوں کا کام لے رہی ہو؟"

"آئی ایم ویری سوری ڈاکٹر..." وہ بولی۔ "مجھے معاف کر دو..."

وہ اٹھی اور باہر کی طرف چل پڑی، کامران کے ہاتھوں میں چمچہ کانپ رہا تھا۔

"منزہ... منزہ!" وہ زیر لب جیسے سسک کر بڑبڑایا۔ "بےکس بلے۔ تم نے ہماری اس مسکراتی دنیا کے دامن میں آگ لگا دی ہے۔"

وہ شاید کچھ اور بھی کہتا لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ منزہ ابھی دروازے سے دو تین قدم ہی باہر تھی گھنٹی کی آواز پر وہ بھی وہیں رک گئی تھی۔

"ڈاکٹر کامران..." کامران نے ریسیور میں بوجھل آواز میں کہا۔

"اوہ تنویر... بھئی معاف کرنا رات تمہیں حلقے گزری، بس ابھی اٹھ کر ناشتہ کی میز پر آیا ہوں۔"

کامران کی باتیں سن کر منزہ کو ایسے لگا جیسے در و دیوار ہل رہے ہوں۔ شاید وہ خود کانپ رہی تھی۔

"بھئی اس کا موڈ آج کچھ بگڑا ہوا ہے۔" کامران نے ہنس کر کہا۔ "ابھی غصہ سجائے باہر گئی ہے۔ نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں تم بے فکر رہو۔ میں اسے ٹھیک کر لوں گا۔ بس چند دنوں کی بات ہے۔ انجکشن۔ نہیں ابھی نہیں۔ ہاں میں خود ہی لگاؤں گا... گھبرانے کی کوئی بات نہیں تنویر بی بی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ ہاں میں پندرہ بیس منٹ تک آ رہا ہوں۔" کامران نے بات ختم کر کے جونہی ریسیور کریڈل پر رکھا۔ منزہ لڑکھڑاتی ہوئی صوفیوں کا سہارا لیتی ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ اس کا جسم جل رہا تھا۔ دل و دماغ میں دھماکے شروع ہو گئے تھے۔ اس کا رواں رواں

کامران کی باتوں کی بمباری سے جل اُٹھی شرارت جمال شنک کی جو چنگاری اس پر ڈال گیا تھا اس نے شعلے کی صورت اختیار کرلی تھی شنک کی شگاف زدہ دیوار یقین کے گارے سے مضبوط ہوچکی تھی۔

"جمال۔۔۔!" وہ بے قراری سے ٹہلتے ہوئے بڑبڑائی "میں ہی غلطی پر تھی، میری محبت یکواس تھی، میری آنکھوں پر اس جادوگر کے پیار کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کامران آگ کا دہکتا ہوا خوبصورت گولہ ہے۔ ہاں رنگین گولہ جس نے آج مجھے راکھ بنا دیا ہے۔ اوہ کامران" وہ ڈریسنگ ٹیبل کا سہارا لے کر کراہی "تم ایسے کیوں نکلے، ظالم، کچھ وقت تو ساتھ دیتے۔ اپنے پیار کے طلسم میں ڈوبا رہنے دیتے، تمہارا کچھ بھی نہ بگڑتا مجھے بہت کچھ مل جاتا۔ میں اسی خوش فہمی میں رہتی کہ تم میرے ہو۔ صرف میرے۔ آہ سب کچھ چھین لیا تم نے۔"

"منزہ۔۔۔!" کامران کی آواز پر اس نے فوراً دوپٹے کے پلو سے بہتے ہوئے آنسو صاف کئے اور چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ کا خول چڑھائے باہر نکلی۔ باہر کامران ہاتھ میں چرمی بیگ تھامے کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مسکرا پڑا۔ وہی مخصوص مسکراہٹ جس کی منزہ شیدائی تھی جس مسکراہٹ پر وہ جی جان سے مرمٹی تھی۔ جس واہ یہ مسکراہٹ کا ذکر بڑے فخر سے اپنی سہیلیوں سے کرتے نہ تھکا کرتی تھی لیکن آج اسے یوں لگا جیسے اس کے سامنے لمبی دانتوں والا ڈریکولا دانت نکوسے کھڑا ہو۔ اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور محبت کا تروتازہ پھول من کی لچکیلی شاخ سے ٹوٹ کر نفرت کے وزنی پاؤں تلے آکر بکھر گیا خلوص و اعتماد کا نرم و نازک وجود شک کی کھولتی بھٹی میں گر کر دھواں بن گیا اور منزہ جو کل تک کامران کے خیالوں کو چوما کرتی تھی۔ ایک بیوی جو شوہر کے پاؤں پہ سر رکھ کر عرش بریں کی بلندیوں کو دیکھا کرتی تھی۔ محبوبہ جو اپنے محبوب کی دید کی پیاسی تھی۔ آج اپنے شوہر کو دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ آج اپنے محبوب کی محبوبیت سے ہی منکر ہوگئی تھی۔ کاش! اس وقت بھی محبت کے داعی ایک محبوبہ کی آنکھوں میں جھانک کر محبت کی جلتی ہوئی چتا کے شعلے دیکھتے جانے لوگ کیوں محبت کو اٹوٹ، وانمنٹ جذبہ کہتے ہیں، حالانکہ محبت صرف ایک خمار ہے۔ وقتی خمار، یہ بہت بڑا کچا رنگ ہے جو ذرا سی نمی بھی برداشت نہیں کرتا۔ یہ ریشم کا بے حد نازک تار ہے جو اُلجھ جائے تو سلجھاتے سلجھاتے ٹوٹ جائے۔

"لنچ پر میرا انتظار نہ کرنا" کامران نے کہا "شاید میں شریک نہ ہوسکوں گا۔"

"رحمت بابا سے کہہ دوں گی" منزہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"میں باہر جا رہی ہوں۔"

"تمہیں کار کی بھی ضرورت ہوگی۔۔۔؟"

"جی نہیں" وہ تیکھی آواز میں بولی "شکریہ میں فون کرکے اپنی منگوا لوں گی۔"

"یہ کس کی ہے۔۔۔؟"

"آپ کی"

"تمہاری نہیں۔۔۔؟"

"تھی۔"

"یہ سوچنے کا کنڈا اور لوٹنے کا ٹیکھا انداز بدل ڈالو ڈیئر" کامران نے بزرگوں کے سے لہجے میں اس کے جھکے ہوئے شانے تھپتھپا کر کہا "حالات کے زخم مٹ جاتے ہیں مگر جلد بازی میں اٹھائے ہوئے ایک قدم کا فاصلہ پاٹنا مشکل ہوجاتا ہے۔ یہ تیکھے بول ناسور بن کر تمام عمر رسنے لگتے ہیں۔ اپنے آپ پر بھروسہ رکھو جانے"

منزہ نے جو آنسو روک لئے تھے اب کام آ گئے۔

"پاگل مت بنو" کامران نے اس کے گال پر اٹکا ہوا آنسو کا قطرہ انگلی کی پور سے صاف کیا اور سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ منزہ نے بولنا چاہا مگر آواز شدتِ گریہ سے حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی۔

مطب کا وقت ختم ہوچکا تھا مگر کامران ابھی تک کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کے سامنے تنویر بیٹھی نوٹس لے رہی تھی شگفتہ رو پیاری سی لڑکی کامران کے چھوٹے بھائی عمران کی منسوبہ تھی۔ جب سے اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا وہ کامران کی سرپرستی میں تھی۔ وہ لکھتے لکھتے بار بار بائیں ہاتھ کی پشت پین کی نب سے کھجا رہی تھی۔

"بُری عادت ہے" کامران بولا۔

"اُوں۔۔۔" وہ لاڈلے انداز میں ٹھنکی "خارش ہو رہی ہے ناخن آپ بڑھانے نہیں دیتے۔"

"ناخن تو بلیاں بڑھایا کرتی ہیں" کامران نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اتنی تو خارش ہوتی ہے" وہ پھر کھجاتے ہوئے بولی۔

"ادھر ذرا ہاتھ تو دکھاؤ" کامران کچھ یاد کرکے پریشان سا ہوگیا۔

"نہیں دکھاتے ہم" وہ مچل گئی "آپ ڈاکٹری جھاڑنے

ملیں گے۔"

"ادھر آؤ۔" کامران تحکمانہ لہجے میں بولا تب وہ ہونٹ کاٹتی ہوئی اس کی کرسی کے بازو پر جا بیٹھی۔ اس کا آدھا جسم کامران پر جھکا تھا۔ کامران نے بھیگی ہوئی روئی سے اس کا ہاتھ صاف کیا اور پھر پٹی کرنے لگا یا تھ پر اس کو جھکا ؤ ایسا ہی تھا جیسے چومنے جا رہا ہو یہی وہ لمحہ تھا جب تھوڑا سا پردہ ہٹا کر دو آنکھوں نے یہ منظر دیکھا تھا وہ منزہ تھی۔

"تنویر۔۔۔!" کامران بولا۔ "آخر تمہاری ضد رنگ لے ہی آئی نا مگر اب میں کچھ نہیں سنوں گا۔ آج ہی تمہیں ڈسچارج کرکے میرے پاس چلنا ہوگا۔"

"بالکل نہیں۔۔۔" تنویر بولی۔ "میں امی حضور کو ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ وہ کیا سوچیں گی کہ آخر تنویر بھی جان کے خوف سے بھاگ گئی۔ نہیں کبھی نہیں، نہ یہ وہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ۔۔۔"

"او مائی گاڈ۔۔۔!" کامران تڑپ کر بولا۔ "ایسا نہ کہو تنویر، تم ایک مقدس امانت ہو، تم میری عزیز ترین بہن ہو، ایک بجھتے ہوئے چراغ کی خاطر، میں تمہارے جیسی روشن شمع نہیں بجھنے دوں گا ہمارے مستقبل کو تمہاری روشنی کی ضرورت ہے۔ میری ان گنت خوشیاں تم سے وابستہ ہیں۔"

"لیکن امی۔۔۔؟"

"اندر آجایئے۔" کامران نے کہا اور تنویر بولتے بولتے رک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ پردہ زمین سے چند انچ اوپر تھا سیاہ چپل میں دو سفید پاؤں جھانک رہے تھے۔ دوسرے لمحے منزہ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی۔

"سرکار باہر کیوں رک گئی تھیں؟" کامران نے مسکرا کر کہا۔

"سوری ڈاکٹر۔" منزہ اجنبی لہجے میں بولی۔ "میں آپ کی تنہائی میں مخل ہوئی ہوں۔"

"لیکن مجھے آج اپنے نصیب پر رشک آرہا ہے۔" کامران پیار سے بولا۔ "ان سے ملو تنویر یہ ہیں تمہاری۔۔۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی نے بات کاٹ دی۔ کامران نے جھک کر ریسیور اٹھایا۔ تنویر نے مسکراتے ہوئے منزہ کو جھک کر آداب کہا مگر منزہ نے حقارت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا جسے بھولی بھالی تنویر بھی محسوس کر گئی۔ جب کامران نے ہاتھ کے اشارے سے منزہ کو بیٹھنے کو کہا تو وہ بولی۔

"شکریہ۔ میں بیٹھنے نہیں آئی۔ صرف یہ بتانا تھا کہ ابو جان کی طبیعت خراب ہے میں چند روز ان کے پاس رہوں گی۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے مڑی اور کامران اسے روک نہ سکا۔ آدھے منٹ بعد ہی کامران بیگ لئے جب دوڑتا ہوا باہر نکلا تو منزہ کار میں بیٹھ چکی تھی اور یہ دیکھ کر کامران لڑکھڑا گیا۔ منزہ جمال کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا اور جمال ہارن دیتا کار نکال کر لے گیا۔

"پلٹ آؤ منزہ۔" وہ بڑبڑایا۔

"کیا ہوا بھائی جان؟" تنویر نے عقب سے پوچھا۔

"کچھ نہیں بے بی۔" وہ بولا۔ "میں دیکھ رہا ہوں گھر کو گھر کے چراغ سے کس طرح آگ لگتی ہے خیر چھوڑو خود جو جلنا چاہیں انھیں کون بچا سکتا ہے۔ تم جاؤ کریم سے کہو ہم جا رہے ہیں۔"

"وہ تو میں کہہ آئی ہوں۔"

"گڈ۔" وہ قدرے سنبھل گیا تھا۔ "آؤ پھر چلیں۔" تنویر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑی اور وہ دونوں باہر سڑک پر آگئے۔

◘

شام کے چار بج رہے تھے۔ کامران اپنی کار پورچ میں ٹھہرا کر جب اندر داخل ہوا تو رانا صاحب کو ہشاش بشاش کھیلتے دیکھ کر چونک پڑا۔ رانا صاحب بھی اسے دیکھ کر جھینپ سے گئے تھے کیونکہ وعدہ کرنے کے باوجود ان کے سامنے ڈھیر سارے نوٹ پڑے تھے۔۔۔ علیک سلیک کے بعد کامران نے منزہ کے متعلق جب دریافت کیا تو رانا صاحب کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا کیونکہ وہ منع کرنے کے باوجود جمال کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ جواب دیتے ٹیلی فون کال نے ان کی بزرگی کی لاج رکھ لی۔ کامران گھنٹی سنتے ہی دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"ہیلو۔۔۔" کامران بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"اوہو۔۔۔!" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں ایک سہیلی کے ساتھ فلم دیکھ کر شام ذرا دیر سے آؤں گی۔" اتنا کہہ کر منزہ نے سلسلہ منقطع کر دیا اور کامران ریسیور ہاتھ میں پکڑے دانت پیس رہا تھا۔ آج پہلی بار اسے منزہ پر غصہ آیا۔ آج اس نے منزہ کے کئی رخ دیکھ لئے تھے۔ ریسیور رکھ کر وہ ہونٹ کاٹتا باہر نکلا اور کار میں بیٹھ گیا۔ کار کا انجن اسٹارٹ کرنے تک اس کا ذہن دھواں دھواں تھا۔ کان سائیں سائیں بج رہے تھے۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا لیکن جوں ہی کار گیٹ سے باہر نکلی تو اس کے ذہن کی دھندلی سطح

یہ ایک چہرہ ابھرا۔ بہنتا صاف ستھرا شگفتہ سا چہرہ اور پھر جیسے اسے اپنی منزل کا نشان مل گیا تھا۔ کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ ٹھیک دس منٹ بعد وہ راج کے خوبصورت چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا اور راج کی چھوٹی بہن شہناز راج کو اطلاع دینے اندر گئی ہوئی تھی۔

"باجی کہتی ہیں میں بہت مصروف ہوں۔" شہناز نے آکر بتایا اور کامران کو ایسے لگا جیسے شہناز کہہ رہی ہو۔ "باجی کہتی ہیں میں آپ کے منہ پر تھوکتی ہوں۔"

"تم نے میرا نام بتایا تھا ۔۔۔؟" کامران نے ایک سہارا لینا چاہا۔

"جی ہاں ۔۔۔" شہناز بولی۔

"ان سے کہو دو صرف دو منٹ کے لئے آجائیں۔" کامران جیسے رو دیا۔

شہناز کے جانے کے دو منٹ بعد ہولے سے پردہ ہٹا کر راج اندر آگئی کامران لرز کر گیا۔ . . . . راج کا سدا مسکراتا چہرہ نفرت سے تنا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے راج ۔۔۔!" کامران نے پوچھا۔ "کیا میرا آنا تمھیں ناگوار گزرا ہے ؟"

"بھائی کے لئے میرے دل کی طرح میرے گھر کے سب دروازے بھی ہر وقت کھلے رہتے ہیں لیکن آپ ڈاکٹر ہیں اور ہم ڈاکٹر اس وقت بلاتے ہیں جب کوئی بیمار ہو۔ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں ۔۔۔؟"

"راج ۔۔۔!" کامران اس کے طنزیہ لہجے کو برداشت نہ کر سکا "کیا ہو گیا تمھیں ۔۔۔؟"

"چلے جائیے ڈاکٹر صاحب۔" راج بھرائی ہوئی آواز میں بولی "وہ راج آج مر گئی ہے جس نے ایک اجنبی کی زبان سے بہن کا لفظ سن کر اپنے من کے پٹ کھول دیئے تھے۔ کاش میں جانتی یہ مطلب پرست دنیا بہن کے مقدس رشتہ کو بھی اپنی غرض کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے۔"

"راج ۔۔۔ راج ۔۔۔" کامران اپنے بال نوچتے ہوئے چیخا۔ "خدارا خاموش ہو جاؤ۔"

"ڈاکٹر پلیز ۔۔۔" راج رو کر بولی۔ "چلے جائیے . . . چلے جائیے ۔۔۔"

"اچھا راج۔" کامران بولا۔ "میں جانتا ہوں۔ ایک روز تم سے خوشیاں سمیٹ کر لے گیا اور آج مایوسیوں کی مالا پہن کر نکل جاؤں گا لیکن یاد رکھنا راج، ایک روز تم بھی اپنی جلد بازی پہلی کی طرح پچھتاؤ گی۔"

"یہ آپ کی دھمکی ہے ؟" راج نے غرا کر پوچھا۔

"نہیں۔" کامران سپاٹ لہجہ میں بولا۔ "بلکہ ایک حقیقت وہ حقیقت جس کے چہرے سے جب نقاب اٹھے تو مظلوم کامران اور آج کا یہ سلوک تمھیں یاد آئے گا۔"

"اونہہ ۔۔۔" وہ پھر غرائی۔ "مظلوم اور آپ ؟"

"ہاں راج میں صرف مظلوم ہی نہیں بلکہ بدنصیب بھی ہوں ۔۔۔"

"تو یہ سن کر خوش ہو جائیے کہ منزہ آپ کی راہ سے ہٹ چکی ہے۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ اور یہی افسوس ہے کہ وہ آج ایسی راہ پر چل پڑی ہے جو میری راہ سے دور ہے۔"

"جانے سے قبل میرے ایک سوال کا جواب دیتے جائیے۔" راج بولی۔

"پوچھو ۔۔۔" وہ چلتے چلتے رک گیا۔

"آخر وہ کون سی مصلحت تھی کہ آپ نے منزہ کو اپنانے کے لئے اتنے پاپڑ بیلے جب آپ کی امیدوں کا مرکز کوئی اور تھا تو منزہ کو برباد کرنے کا آپ کو کیا حق تھا ؟"

"راج ۔۔۔! تم بھی مجھے اتنا ذلیل سمجھنے لگی ہو ۔۔۔؟"

"اس کا جواب اپنے دل سے پوچھئے۔ اس کا جواب اپنی معصوم بیوی کے آنسوؤں سے مانگئے۔ جس نے آج اپنی آنکھوں سے آپ کی محبت کا شیطانی رقص دیکھا ہے۔ دیدہ دلیری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ اس لئے مظلوم ہیں کہ بیوی کو چھوڑ کر آپ راتیں باہر بسر کریں۔ آپ بدنصیب اس لئے ہیں کہ ابھی پہلی بیوی کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اتری اور دوسری کو گھر لا رہے ہیں۔ بولئے ڈاکٹر صاحب مظلوم آپ ہیں یا وہ جس کی دنیا اندھیری ہو گئی، بدنصیب آپ ہیں یا میں جس نے آپ پر بھروسہ کر کے اپنی سہیلی کو جیتے جی مار دیا ہے۔"

"آؤ راج ۔۔۔" کامران ہونٹ کاٹ کر بولا۔ "آؤ میری مظلومیت کی جیتی جاگتی تصویر دیکھو۔ میرے ساتھ چلو میں تمھیں اپنی بدنصیبی کا وہ داغ دکھاؤں جو آج تک چھپا رکھا ہے، آؤ تمھیں آج وہ راز بتاؤں جس نے مجھے منزہ کا مجرم بنا دیا ہے، جس نے مجھے تمھاری نگاہوں میں ذلیل کر دیا ہے۔"

پُراسرار علوم پر معلوماتی کتابیں

چہرہ شناسی	18/=	حسین اور پرکشش بنیئے	10/=
قیافہ شناسی	18/=	خود اعتمادی بڑھائیے	7/=
جادو کے اعداد	12/=	آسان یوگا	9/=
۹ خوفناک اعداد	12/=	ذاتی ترغیب کے کرشمے	6/=
پُراسرار اعداد	6/=	شعبدہ بازی	9/=
ٹیلی پیتھی	8/=	قد بڑھانے کے طریقے	8/=
شمع بینی	7/=	اپنا علاج خود کیجیے	6/=
آئینہ بینی اور عمل حاضرات	8/=	تحریر شناسی سے جیون ساتھی کا انتخاب	11/=
آئینہ بینی اور خواب	12/=	پیالی میں قسمت	6/=
قسمت کے پتے	6/=	اپنے جگر کی حفاظت کیجیے	6/=
ہپناٹزم کی پہلی کتاب	17/=	یادداشت بڑھانے کے عملی طریقے	8/=
ہپناٹزم کی آخری کتاب	10/=	نسوانیات	12/=

شکرانہ کا پتہ

کہکشاں بک سیلرز

پوسٹ بکس نمبر ۲۲۵۶
ناظم آباد، کراچی ۱۸

"مجھے معاف رکھئے ڈاکٹر صاحب" راج بولی "پہلا زخم ہی کاری ہے"

"نہیں۔ تمھیں چلنا ہوگا" کامران زور دے کر بولا "آج تمھیں کا... جانا ہوگا" کامران کے قہقہوں میں گھلی ہوئی چیخیں تمھیں سنا ہوں گی"

"چلئے" راج اُٹھتے ہوئے بولی "ایک بار اور سہی" راج نے جاتے ہوئے شہناز کو بتایا، اور چپ چاپ باہر آ کر کار میں بیٹھ گئی۔

تمام راستہ دونوں خاموش رہے۔ سات آٹھ منٹ بعد کار شہر کے بیرونی حصے میں نکل آئی تھی، اور اب ایک بڑی سڑک چھوڑ کر محلے کی گلیوں میں چلنے لگی تھی۔ آخر ایک دو منزلہ مکان کے سامنے کامران نے کار روکی۔ راج نے اِرد گرد کا جائزہ لیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ کامران نے بڑھ کر دروازے پر کال بیل کا بٹن دبایا۔ چند ثانیے بعد سترہ اٹھارہ برس کی ایک خوبصورت لڑکی نے دروازہ کھولا اور راج نے گھور کر اسے دیکھا جیسے اسے پہچان رہی ہو۔

"تشریف لائیے مس راج۔" کامران نے کہا اور راج چل کر قریب آ گئی۔

"اس سے ملو راج، یہ ہے تنویر۔" کامران نے تعارف کرایا۔

"انتخاب لاجواب ہے" راج جلے ہوئے انداز میں بولی۔

"بے بی تم نے سلام نہیں کیا اپنی باجی کو؟" کامران تنویر سے بولا اور تنویر نے شرما کر اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا، اور کامران نے ہنستے ہوئے اس کے سر پر تھپکی دی "آؤ راج اندر چلیں۔"

راج اس کے پیچھے چلتی ہوئی ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے اُجلے بستر پر ایک ضعیفہ گاؤ تکیے کا سہارا لئے اخبار پڑھ رہی تھی پاؤں کی آہٹ پا کر اس نے اخبار سے نگاہیں ہٹا کر دیکھا اور کامران کے ساتھ ایک اجنبی لڑکی کو دیکھ کر سہم گئی پھر اچانک اس کے جھرّیوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ کھل گئی۔

"خوش آمدید میرے عزیز بچو" بزرگ خاتون نے کانپتی آواز میں کہا۔

"راج ۔۔۔!" کامران مشکل سے بولا "یہ ہیں میری امّی حضور۔"

راج نے گھبرا کر کامران کی طرف دیکھا اور پھر اسی گھبراہٹ میں جھک کر آداب بجا لائی۔

"جیتی رہو بیٹی" انھوں نے ہاتھ اٹھا کر دُعا دی۔

"امّی حضور" کامران بولا "یہ ہے راج۔"

"اوہ ۔۔۔ اچھا میں سمجھی تھی شاید۔۔۔" بات ادھوری چھوڑ کر انھوں نے بڑے پیار سے راج کی طرف دیکھا۔

"میری بچّی کو یہاں کیوں لے آئے بیٹے؟" انھوں نے کہا۔

"معافی چاہتا ہوں امّی حضور" کامران سر جھکا کر بولا "اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مجھے حکم عدولی کا افسوس ہے"

"بیٹھو بیٹی" وہ بولیں "ہاں بیٹی یہ تو بتاؤ کہ میری منزہ کیسی ہے، یہ تو کچھ بتاتا ہی نہیں، جب پوچھتی ہوں سر جھکا لیتا ہے"

"امّی جان" تنویر ٹھنک کر بولی "بھائی جان سے وہی بات کہئے نا"

"تم دونوں کی ضد سے خدا بچائے" وہ بولی "بھائی بہن خود ہی فیصلہ کر لو"

"کوئی شکایت کی ہوگی اس نے" کامران نے اسے مارنے کے لئے ہاتھ اُٹھایا مگر تنویر دُور ہٹ گئی۔

"کچھ دن اور رہنے دو اسے" عالیہ بیگم بولیں "پھر اسے جانا ہی پڑے گا۔ میں تو صرف چند دن کی۔۔۔"

"امّی حضور ۔۔۔!" کامران نے ان کی بات کاٹ لی "آپ زیادہ نہ بولیں"

"ہاں بیٹا" وہ سرد آہ بھر کر بولی "تمھاری امّی صرف سُننے کے لئے ہی زندہ رہی ہے۔ بولنے کا حق دُنیا نے دیا اور نہ تم ہی دیتے ہو"

"اوہ امّی جی ۔۔۔!" کامران شرمندہ ہو گیا "یہ بات نہیں۔ بلکہ آپ کی صحت کے لئے زیادہ دیر بیٹھنا اور بولنا نقصان دہ ہے"

"راج بیٹی!" عالیہ بیگم اُسے دیکھتی ہوئی بولیں "میں مرنے سے پہلے اپنے کامران کی دُلہن دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم اسے کسی طرح یہاں لا سکو گی؟ مگر یاد رکھنا بیٹی اسے یہ نہ معلوم ہو کہ میں اس کی بدنصیب ساس ہوں۔ سُنا ہے وہ بڑی حساس لڑکی ہے کہیں میری حالت دیکھ کر میرے بچّوں کی زندگی تلخ نہ ہو جائے۔ یہ پگلا مجھ سے کئی بار ضد کر چکا ہے اسے بھی سمجھا دینا۔ یہ نہیں جانتا ہم عورتیں عقل سے زیادہ جذبات کی غلام ہوتی ہیں"

"لیکن امّی حضور ۔۔۔!" کامران بول پڑا "میں منزہ کے جذبات کی خاطر اپنے ضمیر کو کیسے ماروں۔ آپ جانتی ہیں مجھے آپ کس قدر عزیز ہیں۔ میں محض منزہ کے ڈر سے کب تک آپ سے لاتعلق رہ سکوں گا ۔۔۔؟"

"تمھیں کیسے سمجھاؤں بیٹے" عالیہ بیگم دُکھ بھری آواز میں بولیں "مجھے اس دُنیا کا بڑا تلخ تجربہ ہے۔ میں جانتی ہوں جب تمھاری دُلہن

کو علم ہوگا کہ تم ایک کوڑھی خاندان کے فرد ہو تو وہ تم سے بھی گھن کھانے لگے گی۔ کیا تم یہ برداشت کر سکو گے کہ تمہاری بیوی محض اس وجہ سے تمہیں ناپسند کرنے لگے کہ تم مجھ جیسی گلی سڑی ماں کے بیٹے ہو؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جو راز میں نے تم بچوں کے مستقبل کی خاطر دنیا سے چھپایا ہے۔ وہ منزہ کی بدولت فاش ہو جائے؟ نہیں میرے بچے میں تمہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ کچھ روز صبر کرو۔ بہت جلد اس بدنصیب خاندان کا یہ آخری بدنما دھبہ بھی مٹ جائے گا۔"

"امی جی۔۔۔!" تنویر چیخ اٹھی۔ "آپ ایسی باتیں نہ کریں، آپ تو ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ انسانیت کے لئے روشنی کا مینار ہیں۔ لوگ آپ کا نام بڑی بڑی محفلوں میں عقیدت و احترام سے لیتے ہیں۔ کاش ہمیں اجازت دیتیں۔ ہم لوگوں کو فخر سے بتاتے آؤ تمہیں وہ عظیم عالیہ بیگم دکھائیں جس کی تم غائبانہ پرستش کرتے ہو۔ وہ عظیم عالیہ بیگم ہماری ماں ہے۔"

تنویر بول رہی تھی اور کامران شدت جذبات سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا، اور پھر آنسو چھپاتا ہوا باہر نکل گیا۔

راج عجیب تذبذب میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ دھندلائی ہوئی نگاہوں سے کبھی عالیہ بیگم کے پُرتقدس چہرے کو دیکھتی، کبھی ان کے گلے ہوئے ہاتھوں کو اور کبھی روتی ہوئی سخو بخود تنویر کو، اس کا ذہن ماؤف سا ہو رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہنستا مسکراتا ہوا کا سجیلا کامران اپنے اندر کوئی دکھ بھی چھپائے پھرتا ہے۔

"راج بیٹی۔۔۔!" عالیہ بیگم بولیں: "جاؤ تم کامران کو سہارا دو وہ آج کل جانے کیوں اتنا دکھی ہو گیا ہے۔"

راج نے آنسو پلکوں میں دبائے ہوئے تھے۔ بہہ نکلے اور وہ کچھ بولے بغیر باہر کی طرف چل پڑی۔ کامران دوسرے کمرے میں عالیہ بیگم کی تصویر کے سامنے کہنیاں ٹیکے کھڑا تھا۔ ایسے جیسے کوئی پجاری دیوی کے حضور جھکا پرارتھنا کر رہا ہو۔

"بھائی جان۔۔۔!" راج کپکپاتی آواز میں بولی: "مجھے معاف کر دیجئے میں نے غلط فہمی میں آپ کو بہت کچھ کہہ ڈالا لیکن مجھے افسوس ہے آپ نے بہن سے بھی اپنا دکھ چھپائے رکھا۔"

"راج۔۔۔!" کامران اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "میں بہت ہی مجبور تھا میری بہن آج بھی اگر تم نے میری شرافت کے منہ پر تھوکا نہ ہوتا تو میں تمہیں یہاں تک کبھی نہ لاتا۔"

"کیا تنویر آپ کی بہن ہے؟"

"بیٹھ جاؤ راج۔۔۔" کامران نے کہا۔ "اب جبکہ تم کچھ حقیقت سے واقف ہو ہی چکی ہو۔ باقی کہانی بھی سن ہی لو۔ میری ماں تو تم نے دیکھ ہی لی ہے۔"

"جی۔۔۔"

"یہ ایک تاریخی عمارت کے کھنڈرات ہیں راج۔ یہ ہمارے خاندان کے ایک بھیانک رُخ کا سربستہ راز ہے۔ میری امی ایک دردناک کہانی ہے اور اس المیہ کا عنوان آج سے تیس برس قبل اس دن لکھا گیا تھا جب بھری عدالت میں عالیہ بائی نے اپنی سرپرست چندن بائی کے منہ پر تھوکتے ہوئے کہا تھا: میں طوائف زادی نہیں ہوں۔ میری رگوں میں کسی شریف خاندان کا خون ہے اور میں اس خون میں گناہ کی سیاہیاں نہیں ملاؤں گی۔"

"تو کیا آپ کی امی۔۔۔؟" راج کہتے کہتے رُک گئی۔

"ہاں راج۔۔۔ گو کہ اپنی ماں کی شان میں گستاخی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ امی حضور کو ایک طوائف نے پالا ہے لیکن مجھے اپنی مقدس ماں پر فخر ہے کہ انھوں نے تاریکی میں رہ کر اپنے آپ کو تعلیم کے نور سے منور کیا۔ غلاظت کے ڈھیر میں دب کر بھی من پاک رکھا اور اسی دامن کو بچانے کے لئے انھوں نے بغاوت کی اور اس بازار سے اپنا ناطہ ہمیشہ کے لئے توڑ لیا مگر شرافت کے جو سہانے تصورات وہ ساتھ لے کر نکلی تھیں وہ شرافت کے قریب آ کر بکھر گئے۔ شرافت کے اجارہ داروں نے ان پر ملازمت کے تمام دروازے بند کر دیئے کہ وہ طوائف تھیں۔ شریفوں نے سہارا نہ دیا کیونکہ ماضی مشکوک تھا، اور پھر ایک رات عالیہ بائی ہر طرف سے مایوس ہو کر راوی کی آغوش میں پناہ لینے گئیں۔ وہاں ان کی ملاقات ایک اور دکھی انسان سے ہوئی جو دولت، شہرت اور علم کے خزانے رکھنے کے باوجود دنیا کی نگاہوں میں حقیر تھا۔ وہ بھی اسی رات اپنے دکھوں کا علاج بوڑھے راوی سے کرانے گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اگر دو درخت ایک ساتھ ایک دوسرے کے اُوپر گریں تو دونوں ایک دوسرے کا سہارا پا کر گرنے سے بچ جاتے ہیں۔ دکھ نے دکھ کو سہارا دیا اور رات کی تاریکیوں نے دو جلتے ہوئے پھوڑوں پر پھاہا رکھ دیا۔ نوجوان اُسے گھر لے آیا اور اسی طرح عالیہ بائی کو ایک سہارا مل گیا۔ سعید کی نامُراد زندگی مُسکرا اٹھی۔"

"سعید کون تھا۔۔۔؟" راج نے پوچھا۔

"سعید میرے ابّو جانی کا نام تھا۔" کامران سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "ابّو جانی کوڑھ کے مرض میں بُری طرح مبتلا تھے۔

مرض یا انھیں اپنی ماں سے ورثے میں ملا تھا۔ اسی مرض کی وجہ سے ہر خوبی کے باوجود کوئی لڑکی ان سے شادی کرنے پر رضامند نہ ہوتی تھی اور یہی وہ احساس تھا جس نے انھیں خودکشی پر مجبور کردیا تھا۔"

"پھر کیا ہُوا۔۔۔؟" راج نے اشتیاق سے پُوچھا۔

"پھر۔۔" کامران دھواں نگلتے ہوئے بولا۔ "پھر عالیہ بیگم ان کا سہارا بن گئیں۔ دونوں نے مل کر ایک اسکول کھولا مگر لوگوں نے اسکول کا نام کوڑھیوں کا اسکول رکھ دیا۔ پھر دونوں نے ادب کی طرف رجوع کیا۔ ابو جانی نثر میں لاجواب تھے جبکہ امی حضور کا رجحان شاعری کی طرف تھا۔ امی حضور، عالیہ سعید کے نام سے لکھنے لگیں اور بہت قلیل مدت میں ان کا شمار ملک کے معروف شاعروں میں ہونے لگا۔ مگر وہ ہمیشہ پسِ پردہ ہی رہیں کیونکہ ماضی کا چور ان کے اندر چھپا بیٹھا تھا۔"

"اوہ میرے خدا۔۔" راج بولی۔ "کیا یہ وہی عالیہ سعید ہیں جن کی نظمیں ہمارے کورس میں تھیں۔۔؟"

"ہاں۔۔"

"لیکن ہمیں تو یہی بتایا گیا تھا کہ وہ گمنامی میں چل بسی تھیں۔"

"یہ خبر بھی امی حضور نے خود شائع کرائی تھی کیونکہ کچھ لوگ ان کی کھوج میں مصروف تھے۔"

"لیکن وہ ظاہر کیوں نہ ہونا چاہتی تھیں۔۔؟"

"کہا نا وہ چاہتی تھیں کہ ان کی اصلیت کسی پر ظاہر نہ ہو۔"

"اور تنویر۔۔؟"

"ہاں تنویر ہمارے نوکر رحمت خان کی لڑکی ہے اور امی نے اسے مانگ لیا ہے کیونکہ میرا چھوٹا بھائی جو آج کل امریکہ میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے اس گڑیا کو چاہتا ہے۔"

"لیکن منزہ نے مجھے تو کچھ اور ہی بتایا تھا۔"

"کاش وہ مجھ پہ اعتماد کرتی۔" کامران نے کہا۔

"اسے غلط فہمی ہوگئی تھی۔ اب میں اسے سب کچھ بتا دوں گی۔۔"

"نہیں راج نہیں۔" کامران نے کہا۔ "ایسا نہ کرنا۔"

"کیوں۔۔؟"

"کیا وہ میرے خاندان کے حالات سُن کر اور میری ماں کو اس حالت میں دیکھ کر مجھ سے تعلق رکھ سکے گی؟"

"کیوں نہیں۔" راج پُراعتمادی سے بولی۔ "وہ بڑی فراخدل اور دُوراندیش لڑکی ہے۔ وہ ضرور امی حضور کی عظمت کے آگے سر جھکا دے گی۔"

"پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔" کامران دُکھتے لہجے میں بولا۔ "مگر آج یا تو منزہ نے دوسرا رُوپ بدلا ہے یا انتقامی جذبے نے اسے مار ڈالا ہے کچھ بھی ہو آج کی منزہ بہت بدل چکی ہے۔"

"وہ آپ سے بدظن ضرور ہے مگر متنفر نہیں ہے۔"

"ایک بات بتاؤ راج، جمال کون ہے اور کیسا آدمی ہے۔۔؟"

"جمال۔۔" راج سہم گئی۔ "وہ شاید منزہ کا کوئی عزیز ہے۔"

"مجھ سے بھی کچھ چھپانا چاہتی ہو راج۔۔؟" کامران اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں ایک الجھن میں اُلجھ گیا ہوں اگر حقیقت بتا سکو تو شاید یہ کانٹا نکل ہی جائے۔"

"آپ نے یہ سوال کرکے مجھے بھی اُلجھا دیا ہے۔ ایک طرف سہیلی کا راز ہے تو دوسری طرف ایک بھائی کا سوال۔ کس کو رکھوں کس کو توڑوں۔"

"سچ بتا دو راج۔" کامران راز کا نام سُن کر چونک اُٹھا۔ "اب تمھیں بتانا ہی پڑے گا۔ ورنہ ہر لمحہ منزہ کو ہم سے دُور لے جائے گا۔"

"جمال ایک بدنام شخص ہے۔" راج نے دبی زبان میں کہنا شروع کیا۔ "یہ وہی ڈاکو ہے جس سے آپ نے اس رات منزہ کو بچایا تھا۔"

"کیا کہتی ہو راج۔۔؟" کامران دھاڑا۔ "جمال ڈاکو ہے۔۔؟"

"ہاں بھائی جان۔" راج بولی۔ "اس نے منزہ کو دھوکا کر بہن بنایا ہے۔"

"اوہ۔۔ بہن۔۔!" کامران غرّایا۔ "تو یہ تھا منزہ کا دُوسرا رُخ راج۔۔!" وہ زور سے بولا۔ "آج منزہ اپنے بھائی کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہی ہے۔"

"نہیں جھوٹ ہے۔" راج بھڑک کر بولی۔

"یہ سچ ہے راج۔۔" کامران نے طنزاً ہنس کر کہا۔ "اگر ثبوت چاہتی ہو تو جاؤ وہ دونوں تمھیں ناولٹی سینما میں ملیں گے۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوسکتا بھائی جان۔" راج نے کہا۔ "منزہ اس کے سائے سے بھی دُور رہنے کی کوشش کرتی ہے۔"

"لیکن آج سارا دن اس نے اسی کے پہلو میں بیٹھ کر گزارا ہے۔"

"بھائی جان!" راج چیخی۔ "اتنا گھناؤنا الزام لگانے سے پہلے ذرا سوچا ہوتا۔ منزہ آپ کی کون ہے؟"

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" کامران نے کہا۔

"چلیے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "ابھی چلیے، اگر آپ کی بات جھوٹی ثابت ہوئی تو وعدہ کیجیے کہ آپ میرے سامنے منزہ سے معافی مانگیں گے۔"

"لیکن ایک شرط میری بھی ہے۔" کامران بولا۔ "اگر میری بات سچی نکلی تو وہاں تم دونوں کو اس طرح نظر انداز کرو گی جیسے تم نے انھیں دیکھا ہی نہ ہو۔"

"منظور ہے۔" راج دو پٹہ درست کرتے ہوئے بولی اور پھر دونوں باہر آ کر کار میں بیٹھ گئے۔

■

فلم شروع ہونے میں ابھی چند منٹ باقی تھے، کامران ٹکٹ لینے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا گیلری میں آ گیا اور پھر اسی تیزی سے نیچے اتر کر اس نے دو ٹکٹ خریدے۔ راج کو اشارہ کر کے وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ابھی وہ گیٹ سے باہر ہی تھے کہ وہاں کی بتیاں بجھ گئیں۔ کامران راج کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ بڑھتا سیٹ پر بیٹھ گیا اور راج بھی سیٹ کو ٹٹول کر بیٹھ گئی۔ پردے پر نیوز ریلیز چل رہی تھیں، اور رنگین روشنی کی شعاعیں کامران اور راج کے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔ راج متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"یہ اگلی سیٹ پر تمھاری سہیلی ہے۔"

کامران نے جھک کر سرگوشی کی اور راج نے منزہ کو پہچان لیا وہ جمال کے ساتھ بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد فلم شروع ہو گئی۔ مگر راج پردے پر ناچتی کودتی تصویروں سے ایک ٹک لگائے منزہ کو دیکھے جا رہی تھی۔ چند منٹ بعد جمال کا ہاتھ سیٹ کی پشت سے سرکتا منزہ کے شانے پر چلا گیا۔ منزہ نے شاید کچھ محسوس کیا ہو مگر ظاہری طور پر رضامند ہی دکھائی دے رہی تھی۔ راج نے کامران کی طرف دیکھا وہ اپنے بالوں کو نوچ رہا تھا۔ جمال کا ہاتھ شانوں سے اوپر بالوں تک پہنچ چکا تھا۔ کامران کا خون کھولتے کھولتے جلنے لگا تھا، اور راج تو بالکل ہی بت بن کر رہ گئی تھی ■ راج اور کامران اس پر پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ جمال نے جھک کر شاید منزہ کا ہاتھ چوم لیا تھا جب ہی تو راج نے کامران کے دانت پیسنے کی آواز سنی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی غیر اختیاری حرکت کرتا انٹرول ہو گیا اور جمال نے عادتاً پلٹ کر دیکھا۔

"اوہ ڈاکٹر صاحب!" اس کے منہ سے یوں آواز نکلی جیسے ویرانے میں سانپ خطرہ قریب پا کر پھنکارا ہو۔ منزہ نے بھی پلٹ کر پیچھے دیکھا اور سیٹ میں ایسے دھنس گئی جیسے اس پر منوں بوجھ آ گیا تھا۔

"اگر آپ کا پروگرام تھا تو منزہ سے کہہ دیا ہوتا۔" جمال نے سنبھل کر کہا۔

"میرا ایسا کوئی پروگرام نہ تھا راج کی فرمائش پر آنا پڑا۔" کامران نے جواب دیا۔ "دراصل تفریح کا جب ہی لطف آتا ہے۔ جب ساتھ میں ہم مزاج ساتھی ہو۔"

کامران کی بات پر راج نے پہلو بدل کر کامران کی طرف دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو۔ "کامران بھائی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔؟"

جمال صرف مسکرا کر خاموش رہا۔

"منزہ۔۔۔!" راج نے جھک کر منزہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پکارا اور منزہ نے اس کا ہاتھ یوں جھٹکا جیسے وہ ہاتھ کسی غیر مرد کا تھا حالانکہ چند لمحے پہلے اس کے شانے پر غیر مرد کا ہاتھ تھپکیاں دے رہا تھا۔

"تم نے مجھ سے تو کہا تھا کہ میں گھر جا رہی ہوں۔" راج نے کہا اور منزہ جواب دینے کی بجائے تیزی سے اٹھ کر چل پڑی۔

"منزہ۔۔۔!" راج اٹھتے ہوئے بولی۔ "رک جاؤ منزہ۔" لیکن منزہ نے پلٹ کر بھی دیکھنا گوارا نہ کیا اور راج کو کامران نے پکڑ کر واپس بٹھا دیا۔

"مجھے جانے دیجیے کامران۔۔۔" راج بازو کو چھڑاتے ہوئے بولی۔

"اب فضول ہے راج۔۔۔" کامران بولا۔ "اسے جانے دو۔"

"ہاں اب فضول ہے مس راج۔" جمال نے کہا۔ "منزہ آپ کو دیکھ چکی ہے اور آپ اسے دیکھ چکی ہیں۔ آپ اسے میرے ساتھ دیکھ کر لڑنا چاہتی ہوں گی، اور وہ آپ کو اپنے خاوند کے ساتھ دیکھ کر جل کر بھاگ گئی ہے اور میں تم دونوں کا بے حد مشکور ہوں کہ دیوار خود بخود گر گئی ہے میرا اور منزہ کا درمیانی فاصلہ آپ کی وجہ سے سمٹ گیا ہے۔"

"جمال۔۔۔!" کامران دھاڑا۔ "راج۔۔۔" راج میری منہ بولی

بہن ہے۔"

"خوب ـــــ" جمال نے قہقہہ لگایا۔"منزہ جی تو مجھے بھائی کہتی ہے یہ رشتہ بھی خوب ہے۔ ند کے رند رہو اور ہاتھ سے جنت بھی نہیں جاتی۔"

"شٹ اپ ـــــ!" کامران نے مکہ جمال کے منہ پر جمایا۔"خاموش!"

"کامران ـــــ" راج تڑپ کر کامران سے لپٹ گئی۔

"یہ اچھا نہیں ڈاکٹر۔" جمال اٹھتے ہوئے بولا۔"جمال سے دشمنی تمہیں مہنگی پڑے گی۔ اس ایک مکے کی قیمت صرف منزہ ہے اور منزہ اب میری ہے۔"

"شٹ اپ۔" کامران نے ہاتھ اٹھانا چاہا مگر جمال دوسری طرف سے نکل کر چل پڑا۔ اس نے گیٹ سے نکلتے وقت پلٹ کر دیکھا اور باہر نکل گیا۔

◘

کامران پچھلے دو روز سے بخار میں جل رہا تھا۔ ڈاکٹر قریشی اپنے دوست کا پوری توجہ سے علاج کر رہا تھا مگر افاقے کی بجائے اضافہ ہو رہا تھا۔ کامران بیشتر وقت بے ہوش ہی رہتا تھا اور جب ہوش میں آتا تو اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ بار بار اپنی سرخ آنکھوں سے ہر ایک کو دیکھتا اور راج کے چہرے پر اس کی نگاہیں رک جاتیں، ہونٹ کپکپاتے، راج ڈاکٹر کی موجودگی سے بے نیاز اس پر جھک جاتی۔ اس کے جلتے ہوئے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بھرائی آواز میں بولتی۔

"بولئے نا کامران۔"

"اخبار میں تم نے پڑھا ڈاکو سب کچھ لوٹ کر فرار ہو گئے ہیں۔"

"نہیں تو ـــــ" راج نے کہا۔"وہ سب کے سب پکڑے گئے ہیں۔"

"جھوٹ۔" وہ چیخ کر بولا۔"تم جھوٹی ہو۔" اس نے راج کو دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ راج کو رحمت خان نے سنبھالنا چاہا مگر وہ خود ہی اٹھ بیٹھی۔ ڈاکٹر قریشی نے کامران کو پکڑ کر لٹایا اور نیند کا انجکشن دے کر اسے سلا دیا۔

"راج بیٹی ـــــ!" رحمت خان آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"بیگم صاحبہ کو اطلاع دے دو۔"

مگر راج آنسو سنبھالتی خاموشی سے باہر نکل گئی۔ وہ کیسے رحمت خان کو بتاتی کہ بیگم صاحبہ نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ راج جوں ہی ڈاکٹر قریشی کے لئے چائے بنانے کچن میں گئی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رحمت خان نے چونک کر اٹھا لیا۔

"جی میں رحمت بول رہا ہوں۔"

"رحمت بابا ـــــ!" دوسری طرف سے آواز آئی۔"میں منزہ بول رہی ہوں۔"

"اوہ بیٹی ـــــ!" رحمت خان خاموشی سے بولا۔"تم کہاں ہو گھر کیوں نہیں آتیں۔ کامران بیٹا کل سے سخت بیمار ہے۔ فوراً آ جاؤ۔"

"اب ان کی طبیعت کیسی ہے ـــــ؟" منزہ نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہ پوچھو بیٹی!" رحمت خان کی آواز بھرا گئی۔"اگر راج بیٹی نہ ہوتی تو خدا جانے میرے بچے کی کیا حالت ہوتی۔"

"وہ کب سے یہاں ہے؟"

"دو دن سے یہاں ہے۔ بیچاری ایک پل کے لئے بھی کامران کی پٹی سے جدا نہیں ہوتی۔"

"ہوں۔" منزہ غرائی اور رحمت چیختا رہ گیا مگر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

◘

جمال کا بیشتر وقت اب رانا صاحب کی چاپلوسی اور خوشنودی میں گزرتا تھا۔ وہ منزہ کی ہمدردیاں بھی کچھ کچھ حاصل کر چکا تھا۔ اس کی دلداری میں بھی پیش پیش رہتا تھا وہ ایک تجربے کار شکاری تھا۔ اس نے جس سنہری چڑیا کے لئے جال بچھایا تھا وہ اس کے پاس آ کر رک گئی تھی اور وہ ہر اس رکاوٹ کو خاموشی سے دور کرتا جا رہا تھا جو چڑیا کو جال میں پھنسنے سے روک سکتی تھی۔ ان رکاوٹوں میں سب سے بڑی رکاوٹ کامران اور منزہ کا پیار تھا جس میں بڑی حد تک وہ سوراخ پیدا کر چکا تھا۔ دوسری رکاوٹ منزہ خود تھی مگر غلط فہمی کی دھند میں وہ بھی اپنا راستہ بھول چکی تھی، اور اب دوراہے پر پریشان کھڑی تھی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے راہ کھوئی کی جا سکتی تھی۔ جمال کمال ہوشیاری سے صحیح راہ میں نوکیلی چٹانیں خاردار تاریں بچھا رہا تھا تاکہ اگر منزہ اپنی کھوئی ہوئی راہ کو پہچان بھی لے تو منزل کی طرف چل نہ سکے۔ تیسری رکاوٹ جو جمال کے شیطانی ارادوں میں مخل ہو سکتی تھی رانا صاحب تھے جو بیس ہزار کا بڑا حصہ تاش کے پتوں میں گم کر چکے تھے اور کچھ شراب کے خمار میں بہہ چکا تھا اب ان کی نگاہیں پرانی کار پر تھیں مگر اس آثار قدیمہ کو کوئی خریدنا پسند نہ کرتا تھا انہیں روپے کی اشد ضرورت تھی اور اس ضرورت کو جمال فراخدلی سے پورا کر رہا تھا۔ رانا صاحب اچھی طرح جانتے تھے یہ فیاضی محض منزہ کے لئے ہے مگر وہ مجبور تھے

حالات سے باخبر ہونے کے باوجود آنکھیں بند کئے ہوئے تھے کیونکہ آنکھیں بند رکھ کر ان کی مزدوروں کا کھلا ہوا منہ بند ہو رہا تھا اور وہ آنکھیں کھول کر مزدوروں کو بند نہیں کر سکتے تھے جمال اپنے بچھائے ہوئے جال کی کامیابی پر یقین رکھتا تھا اور حالات کا بہتا ہوا دھارا عین اس کی منشا کے مطابق تھا لیکن منزہ کی بے حسی اور خاموشی اسے اُمید و یاس کے درمیان الٹا لٹکائے ہوئے تھی۔ وہ کئی بار کھل کر اظہارِ محبت کر چکا تھا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں منزہ کو اپنانے کا اٹل فیصلہ کیا تھا مگر منزہ کے لب یوں بند تھے جیسے قبر۔ وہ پہروں بولتا رہتا۔۔۔ وہ چُپ چاپ خلاؤں کو گھورتی رہتی۔۔۔ وہ اظہارِ محبت کرتا رہے اور منزہ سر جھکائے دانتوں سے ناخن کترنے لگتی۔

آج بھی موقع دیکھ کر جمال صبح سویرے ہی منزہ کے کمرے میں آن دھمکا تھا۔ وہ ابھی ابھی نہانے سے فارغ ہوئی تھی بالوں کو رول کر کے تولئے سے لپیٹے بیٹھی تھی۔

"خادمِ حسین کے حضور صبح کا سلام عرض کرتا ہے" جمال نے جھک کر کہا اور منزہ کی شفاف پیشانی پر ناگواری کی سلوٹیں اُبھر آئیں۔

"جمال صاحب!" وہ گاؤن کے بٹن بند کرتے ہوئے بولی "یہ طرزِ تخاطب مجھے ناپسند ہے"

"تو یہ غلام حضورِ عالیہ کی پسند جاننا چاہتا ہے" منزہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"کہہ دو کامران" جمال کے لبوں پر عیارانہ مسکراہٹ کھیل گئی۔

"ہاں۔۔۔" منزہ جانے ضد میں یا بے خیالی میں بے ساختہ کہہ گئی۔

"تو میں تمھیں ناپسند ہوں۔۔۔؟" وہ غرایا "کیا اس کی وجہ بتاؤ گی؟"

"میں کچھ نہیں کہنا چاہتی" منزہ نے کہا "ہر انسان اپنے آپ کو جانتا ہے"

"یہی نا کہ میں ڈاکو ہوں"

"کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی بُرائی ہو سکتی ہے۔۔۔؟" منزہ نے کہا۔

"ڈاکو۔۔۔" جمال بڑھ کر منزہ کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بڑبڑایا۔

"میں رات کی تاریکیوں میں کاغذ کے بے جان ٹکڑے لوٹنے کے جرم میں ڈاکو بن گیا مگر کامران جو جیتی جاگتی بے داغ جوانیوں کو لوٹتا پھرتا ہے، وہ معزز ہے۔ ڈاکٹر ہے۔ اسے کوئی بُرا نہیں کہتا۔ میں حالات کا ستایا ہوا ایک دُکھی انسان ہوں۔ وہ انسان کے رُوپ میں درندہ ہے۔ اس نے منزہ کو شرافت کی آڑ میں ورغلایا پھر شریعت کی چار دیواری میں بند کر کے لوٹ لیا۔ غریب و نادار باپ کی معصوم تنویر کو خرید کر قیمت وصول کر لی اور رداج کو بہن بنا کر ساتھ لئے پھرتا ہے پھر بھی وہ منزہ کی پسند ہے، آسمان کا چاند ہے، تنویر کا ان داتا ہے اور رداج کے لئے قابلِ احترام یہ ظلم ہے، ناانصافی ہے۔ تم بتاؤ منزہ بُرا کون ہے۔ جواب دو منزہ، سینکڑوں لڑکیوں کی عزّت لوٹنے والا کامران بُرا ہے یا جمال جس نے اپنی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صرف امیروں کو لوٹا ہے"

"تم بُرے ہو" منزہ اُٹھتے ہوئے بولی "کامران جادوگر ہے اور دُنیا کا ہر مرد ناقابلِ اعتبار ہے۔ مجھے سب سے نفرت ہے، اپنے آپ سے بھی۔ تم سے بھی اور اس ظالم سے بھی" یہ کہتے کہتے اس کے آنسو نکل آئے تھے، عین اسی لمحے ملازم لڑکا دونوں کا ناشتہ لے کر اندر آ گیا۔ ڈبل ناشتہ دیکھ کر منزہ کا خون کھول اُٹھا لیکن کچھ سوچ کر ضبط کر گئی۔

"انٹارٹیکا کے شہزادے" جمال نے کہا "سائیکل لے جاؤ اور میرا پیغام نقوی صاحب تک پہنچا آؤ"

"اچھا صاحب" اس سے قبل کہ منزہ اُسے کچھ کہتی وہ جمال کا اشارہ پا کر دوڑتا ہوا باہر چلا گیا۔

"اسے کہاں بھیجا ہے؟" منزہ نے پوچھا۔

"ایک ضروری کام تھا" جمال نے بڑے سرپوش ہٹاتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتے ہیں آلو جانی بھی موجود نہیں ہیں اور۔۔۔"

"ہاں۔۔۔" جمال بول پڑا "ایسی ہی گھڑی کا مجھے بھی انتظار تھا"

منزہ کو پہلی بار خطرے کا احساس ہوا مگر اب وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

"میں آج فیصلہ کن اقدامات کا ارادہ لے کر حاضر ہوا ہوں"

"میرا جواب آپ سُن چکے ہیں" منزہ نے بظاہر سکون سے کہا۔

"لیکن مجھے تمھاری نفرت سے بھی اتنا ہی پیار ہے جتنا نفرت کرنے والی سے تم نفرت کرو۔ میں محبت کروں گا۔ تم ہاتھ سے نکلے ہوئے کامران کو دوبارہ اپنانے کی راہیں تلاش کرو اور میں اپنی محبوبہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا، اور فیصلہ

وقت کے ناشتہ کریں گے اور مجھے اپنے آپ پر کامل بھروسہ ہے کہ جیت میری ہو گی کیونکہ جمال اور ناکامی بہت عرصہ ہوا فاتح اور مفتوح کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔"

منزہ کچھ جواب دیئے بغیر باہر کی طرف چل پڑی۔

"کیا تم مجھ سے خوفزدہ ہو۔۔۔؟" جمال نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔"

"تو پھر یہ فرار کیسا۔۔۔؟" جمال بولا۔ "آؤ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" تب منزہ اپنی خود اعتمادی کو بحال کرنے کی خاطر پلٹ کر ناشتے کی میز پر بیٹھ گئی۔ جمال نے دو پیالیاں تیار کر کے ایک منزہ کے سامنے رکھ دی۔ اس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے شکاری آنکھوں میں اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے شکار کو نشانے کی زد میں دیکھتا ہے۔ منزہ گہری سوچ میں ڈوبی بے دلی سے ناشتہ کر رہی تھی۔

اسی وقت راج اپنا وینٹی بیگ جھلاتی ہوئی گیٹ سے داخل ہوئی۔ وہ بڑے اچھے موڈ میں تھی۔ اندر آ کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کوٹھی بالکل سنسان پڑی تھی۔ وہ چلتی ہوئی منزہ کے کمرے کے سامنے آ گئی۔ بند دروازہ دیکھ کر اس نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر بالکل آہستگی سے کواڑ اندر کی طرف دبائے۔ "گھامڑ ابھی سوئی ہوئی ہے۔" اس نے زیر لب کہا، اور پھر کھڑکی کی طرف گئی۔ پردے کی وجہ سے اندر کچھ دیکھنا ناممکن تھا۔ پھر اس نے ٹوٹے ہوئے شیشے کو دیکھ کر اپنے بیگ سے پین نکالا، اور ٹوٹے ہوئے شیشے میں پین کی مدد سے اس نے جونہی تھوڑا سا پردہ ہٹایا تو اسے بہت جلد پین باہر نکالنا پڑا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔ "کیا ڈاکٹر کامران؟ لیکن وہ تو۔۔۔؟" اس نے پھر وہی طریقہ اختیار کیا۔

سنسان گھر اور کمرے میں جمال کی موجودگی اور چہرے پر شیطانی مسکراہٹ نے اسے آنے والے خطرے کا احساس دلا دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بروقت پہنچی تھی ورنہ آج اس کی سہیلی برباد ہو جاتی۔ خوف کے مارے اس کے ہاتھ پاؤں بے جان سے ہو گئے تھے۔

اس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا تھا، اور اب اسے ہر چیز سے جلنے کی بو آ رہی تھی۔ چربی کی بو، گلے سڑے ماس کی سڑاند، اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ اس کی بری حالت تھی اور ہاتھ پاؤں بے جان سے ہو گئے تھے۔ جانے وہ اس طرح کب تک بے حس و حرکت کھڑی رہتی یا اس چوٹ سے لڑکھڑا کر گر جاتی، کار کی آواز پر وہ چونک پڑی اور دوسرے ہی لمحے وہ سیڑھیاں پھلانگتی کار کے پاس جا کر گرتے گرتے بچی۔

"بھب۔۔۔ بھب۔۔۔" وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ "بھائی جان۔"

"اچھا ہوا تم بھی موجود ہو۔" کامران کار کا دروازہ کھولتے ہوئے نحیف آواز میں بولا۔ "میں تمہارے گھر سے ہو کر آ رہا ہوں۔"

"آپ کو یوں نہیں آنا چاہیے تھا آپ۔۔۔ آپ۔۔۔"

"کیا بات ہے راج؟" کامران نے پوچھا۔ "تم اس قدر بوکھلا کیوں رہی ہو؟"

"جج۔۔۔ جی نہیں تو۔" اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی۔ "وہ دراصل میں آپ کو اس حال میں ڈرائیو کرتے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔" وہ دوسرا دروازہ کھول کر کامران کے برابر بیٹھ گئی۔ "میں منزہ سے ملنے آئی تھی۔"

"وہ اندر موجود ہے راج۔۔۔" کامران نے پھر باہر نکلنا چاہا۔

"نہیں، نہیں کامران۔" راج نے اس کا گریبان مضبوطی سے پکڑ لیا۔ "وہ یہاں نہیں ہے۔"

"راج۔۔۔!" کامران بولا۔ "کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ کامران نرا چغد ہے۔ کیا تم مجھے بزدل اور بے غیرت بنانا چاہتی ہو۔ میں جانتا ہوں راج کہ اس وقت دونوں اندر ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ساتھا کل سے غائب ہیں اور ان دونوں نے تنہائی کے لئے اپنا نوکر بھی بھیج دیا ہے۔ میں راستے میں اس لڑکے سے مل چکا ہوں۔ تم یہاں ہی بیٹھو میں اس ننگ انسانیت سے چند آخری باتیں کرنا چاہتا ہوں اور یہ میری اس سے آخری ملاقات ہو گی۔"

"آپ بیمار ہیں بھائی جان اور وہ۔۔۔" راج روہانسی ہو کر بولی۔ "نہیں نہیں ہرگز نہیں میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ آپ کو میرے سر کی قسم، آپ کو اپنی ماں کی قسم۔"

"راج۔" کامران چیخا۔ "ہوش میں آؤ۔"

"جائیے۔" راج کار کا راستہ روکتے ہوئے بولی۔ "لیکن یہ کبھی نہ بھولئے گا کہ جب آپ یہاں سے ایک قدم بڑھائیں گے تو راج سے آپ کا تعلق ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہو گا۔"

"اوہ! راج۔۔۔! تم بہت ظالم ہو۔" کامران نے اپنا اسٹیئرنگ وہیل پر دے مارا اور پھر وہ نڈھال سا ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔ راج نے اسے کچھ اس تیزی سے سنبھال کر پچھلی سیٹ پر لٹا دیا

کہ کامران جب سنبھلا تو کار واپس گیٹ سے نکل چکی تھی۔

منزہ کو جمال کی موجودگی اور اپنی تنہائی سے پیدا ہونے والے خطرے کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ جلد از جلد کمرے سے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ جمال اس کے خوف سے واقف تھا اور لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسی اثناء میں راج آگئی تھی۔ جمال نے راج کو جھانکتے دیکھ لیا تھا۔ اسے خوف ہوا کہ شاید کامران بھی ساتھ آیا ہوگا پھر آج کا کام کل پر ٹال کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

اس کے جاتے ہی منزہ نے سکون کی ایک طویل سانس لی۔

پھر اچانک اسے کامران کا خیال آگیا۔ وہ بیمار تھا۔ راج نے یہی بتایا تھا۔

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر ایک عزم کے ساتھ اٹھی۔

وہ ایک نئی زندگی کا خاکہ بنا رہی تھی۔

وہ کامران کے پاس جانا چاہتی تھی مگر اچانک جاتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی اس نے سوچا یہ جھجک، شرم ٹیلی فون پر کامران سے باتیں کر کے بہت جلد دور بھی ہو جائے گی۔ یوں ایک دم منہ اٹھائے اس کے سامنے کیسے جاؤں گی۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے اس نے کامران کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف رحمت خان تھا۔

"ہاں میں منزہ ہوں کامران کہاں ہیں؟"

"وہ لیٹے ہوئے ہیں۔" رحمت خان نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا کیونکہ وہ ابھی چند منٹ قبل کامران اور راج کی باتیں سن چکا تھا۔

"ان سے کہئے ٹیلی فون پر آئیں۔"

"کہہ دوں گا۔" رحمت خان نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا اور ٹیلی فون اٹھا کر کامران کے پاس جا کر رکھ دیا۔

"ہیلو کامران اسپیکنگ۔"

"کک۔ کامران۔" منزہ کی آواز کانپ گئی۔

"جی فرمائیے۔" کامران نے کہا۔

"میری آواز بھی نہیں پہچانتے کامران۔۔۔؟"

"تمہیں پہچان کر کون سا تمغہ اٹھایا جواب آواز سے دھوکہ کھاؤں۔"

"اوہ کامران یہ آپ کہہ رہے ہیں؟"

"مطلب کی بات کرو۔" کامران نے کہا۔ "میں تم سے کچھ کہنا نہیں چاہتا۔"

"میں اکیلی ہوں۔" منزہ نے جیسے رو کر کہا۔ "جلدی آجاؤ یا میں آجاؤں گی۔"

"اکیلی۔" کامران نے کھوکھلا سا نعرہ لگایا۔ "جمال کے ہوتے ہوئے بھی تم اکیلی ہو یا وہ باہر ہے۔"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ تو یہاں نہیں آتا۔" منزہ نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"پیشہ بہت سود مند ہے۔ ایک گیا دوسرا آیا لیکن میں اس قماش کا نہیں ہوں۔ تم نے غلط جگہ رنگ کیا ہے۔"

"کامران۔۔۔" منزہ کی چیخ سنائی دی۔ "اپنے الفاظ پر غور کرو۔"

"دیکھو میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی میں تم جیسی عورتوں کے منہ لگنا پسند نہیں کرتا۔ اگر چاہو تو راج سے بات کرلو۔"

"اوہ۔۔۔ تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ اب اس ناگن کا راج ہے۔"

"کچھ بھی سمجھ لو۔" کامران لاپروائی سے بولا۔ "بہر حال مجھے وہ عزیز ہے اور میں اسی کے سہارے جی رہا ہوں۔"

"کامران۔۔۔" منزہ نے سسک کر کہا۔ "تم اتنے برے بھی نہیں ہو سکتے ہو۔"

"اپنے گریبان میں جھانک کر اپنے سوال کا جواب مانگو۔"

"تو تم یہاں نہیں آسکو گے۔۔۔؟"

"صبح گیا تھا مگر تم اس وقت اکیلی نہ تھیں۔"

"تو کیا تم نے۔" اس کی آواز ڈوب گئی۔

"ہاں دروازہ بند دیکھ کر واپس آنا پڑا۔"

"اوہ۔۔۔ اچھا۔" منزہ نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "میں آج بہت دیر تک سوئی رہی۔"

"دیکھو منزہ۔" کامران نے کہا۔ "میں نے تمہارا سہارا لیا تھا مگر اب میں گر چکا ہوں اور دوبارہ اس جھوٹے سہارے کے قریب میں نہیں آنا چاہتا۔ تم اگر چاہو تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا ورنہ ماہانہ خرچ تم تک پہنچتا رہے گا۔" یہ کہہ کر کامران نے سلسلہ منقطع کر دیا اور منزہ ہاتھ میں ریسیور پکڑے سسک سسک کر روتی رہی اور پھر اٹھ کر خواب گاہ میں جا کر پلنگ پر ایسی گری جیسے طوفان کے زور سے درخت گرا ہو۔

راج اپنے آفس میں بیٹھی بظاہر خندہ پیشانی سے مہمان خواتین سے باتیں کر رہی تھی مگر اس کا دل رو رہا تھا۔

خواتین اٹھ کر رخصت ہوگئیں۔ انھیں گیٹ تک چھوڑنے وہ

خود بھی گئی اور پھر اپنے آفس سے گڑیا اٹھا کر شو روم میں چلی گئی کیونکہ اسے باہر سے آتے ہوئے آرڈر اپنی موجودگی میں پیک کرانے تھے۔ وہ اُدھر مصروف تھی اور اِدھر آفس میں منزہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ باہر چپڑاسی بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ منزہ آئی تو کافی تاؤ میں تھی مگر راج کی غیر حاضری نے اسے سوچنے اور ٹھنڈا ہونے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ وہ اب لڑنے کی بجائے صلح صفائی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو۔" اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"بھئی راج" یہ آواز کامران کی تھی "بڑی دیر کر دی مہربان آتے آتے۔"

"بہت مصروف ہوں کامران" منزہ نے آواز کو ذرا بدل کر کہا۔

"بھئی تمہاری مصروفیات کو کیا کہوں۔ یہاں تنہائی بڑا عذاب ہے راج۔"

"منزہ کو بلا لیں نا پھر۔"

"کس گندگی کا نام لے رہی ہو" کامران نے کہا اور منزہ نے ہونٹ کاٹ لئے "ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس نے فون پر مجھے بلایا تھا اور خود بھی آنا چاہتی تھی۔"

"اچھا۔"

"لیکن میں نے کہا بخشو بی بلی" وہ ہنسا "ٹھیک کہا نا۔"

"اچھا میں آ رہی ہوں" اس نے فوراً سلسلہ منقطع کر دیا۔ کیونکہ راج کی باتوں کی آواز آنے لگی تھی۔ وہ ریسیور رکھ کر بالکل لاتعلق سی ہو کر بیٹھ گئی۔

جوں ہی راج سامنے آئی منزہ نے پلٹ کر دیکھا۔ راج... ایک جھٹکے سے در میں رک گئی۔

وہ دونوں ایک دوسری کو یوں گھور رہی تھیں جیسے کسی جنگل میں دو درندوں کا آمنا سامنا ہو گیا ہو۔ راج شدتِ جذبات سے اپنے ہاتھ مروڑ رہی تھی۔ منزہ کے نتھنے پھول چکے تھے۔ وہ چہرے جو کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر پھول کی طرح مسکرایا کرتے تھے۔ آج بھیانک حد تک بگڑے ہوئے تھے وہ آنکھیں جن کبھی مروت، پیار اور اعتماد کی شمع روشن ہوا کرتی تھی اس وقت سرخیوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ نفرت کی چنگاریاں بھڑ رہی تھیں۔ دکھ کا دھواں نکل رہا تھا۔ انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ دونوں وہی تھیں۔ یک جان دو قالب، ہمراز جانثار سہیلیاں مگر وقت بدل چکا تھا... حالات کی بساط پر ہر مہرہ بدل چکا تھا۔ پیار نفرت میں اعتماد انتقام میں بدل چکا تھا۔

"بابا۔" راج اچانک پلٹ کر بولی "میں شو روم میں جا رہی ہوں۔ جب یہ چلی جائے تو آفس بند کر دینا۔"

"بہت اچھا بی بی مگر..." بابا کچھ کہتے کہتے راج کی سرخ سی آنکھیں دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"راج...!" منزہ اٹھتے ہوئے بولی "بھاگنے سے موت نہیں ٹلتی راج" لیکن راج نے پلٹ کر دیکھنا گوارہ نہ کیا۔ راج کا رخ پہلے شو روم ہی کی جانب تھا مگر منزہ کو تعاقب میں آتے دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا کیونکہ شو روم میں اس وقت لڑکیاں موجود تھیں اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ لڑکیوں کی موجودگی میں منزہ سے تلخ کلامی ہو۔ وہ سیدھی ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ اس وقت مارے غصے کے اس کا برا حال تھا کیونکہ منزہ نے اس کے اعتماد کو مجروح کر دیا تھا۔

"اس سے قبل کہ میں تمہارے بے وفا وجود کو اٹھا کر باہر پھینک دوں۔ تمہارے بے مہر چہرے پر تھوک دوں۔ تم خاموشی سے واپس چلی جاؤ۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو راج" منزہ دروازے میں رک کر بولی "میں خود تم جیسی آستین کی ناگن سے بات کرنا توہین سمجھتی ہوں۔ مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے۔ تمہاری پارسائی کا پول کھل چکا ہے تمہاری ہمدردی کا مطلب میں سمجھ چکی ہوں، ذلیل لڑکی۔ وہ تو تمہاری شکار تھا مگر تم تو ایسی نہ تھیں تم نے مجھے بہن کہا تھا۔ میں نے تمہیں اپنا رازدار بنایا تھا۔ تمہیں کم از کم میرا تو خیال کرنا چاہئے تھا لیکن اب یہ بات میری سمجھ میں آئی ہے کہ تمہاری کوششوں کی وجہ میرا درد نہ تھا بلکہ تم مجھے سیڑھی بنا کر اس تک پہنچنا چاہتی تھیں تم... تم بہت ہی کمینی ہو، رذیل ہو۔"

"منزہ...!" راج بلبلا اٹھی "بکواس بند کرو۔"

"اس قدر نہ چیخو مکار لڑکی" منزہ غرائی "ورنہ تمہاری شرافت کا بھرم بکھر جائے گا، تمہیں قابل تکریم سمجھنے والی لڑکیاں پہچان لیں گی کہ تم شرافت کے منہ پر طمانچہ ہو۔"

"خاموش...!" راج تڑپ اٹھی "بے غیرت اگر تم میں رتی بھر بھی شرم کا مادہ ہوتا تو یہاں اپنی غلیظ صورت دکھانے کی بجائے ڈوب مرتیں یہ کیوں نہ سوچا کہ تم کون ہو۔ تمہارا تعلق ایک فرشتہ صفت انسان سے ہے۔ وہ ظالم ہاں بس میں تمہارے کندھے پر جبار ملک کا ہاتھ دیکھ چکا ہے۔"

"ہاں میں آوارہ ہوں... بے حیا ہوں۔ ...مگر بہن بن کر بھائی سے درپردہ عشق نہیں کرتی" منزہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی جیسے حقیقت نے اس کے ذہن کو الٹ کر رکھ دیا

تھا۔ جاؤ اس بدصورت انسان سے کہہ دو کہ منزہ تمہیں نفرت کرتی ہے۔ منزہ اب ممال کی ہے۔ ڈاکو کمال کی۔ جاؤ اپنے منہ بولے بھائی سے کہہ دو کہ وہ معصوم منزہ مر چکی ہے جس نے تمہاری ظاہری خوبصورت سے دھوکہ کھایا تھا۔

"کاش! کاش تم صبح ہونے سے پہلے مر جاتیں اور میں تمہارے چہرے پر گناہ کا سیاہ کیچڑ نہ دیکھتی۔"

"دوشیزہ—!" وہ غرائی۔ "کامران کے ساتھ ہر وقت رہنے والی۔ آج مجھے کس منہ سے گناہ کا احساس دلا رہی ہے لیکن یاد رکھو بدبخت تم بھی سکون حاصل نہ کر سکو گی۔ ایک روز تمہیں بھی میری طرح پچھتانا پڑے گا۔ وہ دن دور نہیں جب بھنورا رس چوس کر کسی دوسرے پھول کی طرف اُڑ جائے گا۔ کامران کسی کا نہیں، نہ میرا، نہ تنویر کا اور نہ ہی تمہارا۔ وہ صرف ہوس کا غلام ہے۔"

"اور میں کہوں گی تم بکتی ہو۔" راج پھٹ پڑی۔ "وہ میرا بھائی ہے۔ وہ ایسا نہیں جیسا تم کہہ رہی ہو۔ تم اس کی بہن کر بھی اسے سمجھنے سے قاصر رہی ہو۔ تنویر اس کے چھوٹے بھائی کی منگیتر ہے۔ وہ اسے اتنا ہی چاہتا ہے جتنا کوئی بھائی بہن کو چاہ سکتا ہے۔ وہ بُرا نہیں بُری تم ہو جس نے محض شک کی بنا پر اس سے تعلق توڑ لیا ہے۔"

"خوب۔" منزہ زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ "تم بھی تو اسے بھائی جان کہتی تھیں۔ وہ بھی تمہیں بہن کہا کرتا تھا مگر اس رشتے کی آڑ میں تم نے اپنا ارمان پورا کر لیا یقیناً—" منزہ نے ہنس کر کہا۔ "اور تم بھی—؟"

"اچھا۔" راج دانت پیس کر غرائی۔ "پہلے تو ایسا سوچنا بھی میرے نزدیک کفر تھا مگر اب میں تمہارے شک کو یقین میں بدل کر دکھاؤں گی۔ کامران کو میں اپناؤں گی۔ اسے میں سارے جہان کا پیار دوں گی۔ اس کے لئے میں منزہ کی رسیلی راتیں اجاڑ دوں گی۔ اب اسے میرا بننا پڑے گا۔"

"یعنی تم ضد میں آ کر مجھے شکست دینا چاہتی ہو—؟"

"ہاں ہر قیمت پر۔"

"لیکن یہ دو مجنون منزہ کی زندگی میں ایسا نہیں کر سکو گی۔"

"تم—" راج غرائی۔ "تمہاری حیثیت ہمارے نزدیک خارش زدہ کتیا سے بھی کم ہے۔ تم میرا کچھ نہ بگاڑ سکو گی۔"

"بہت اچھا راج۔" منزہ واپس مڑتے ہوئے غرائی۔ "میں تمہارا چیلنج قبول کرتی ہوں۔"

"ہاں جاؤ اور اپنے اس ڈاکو سے کہہ کر راج کے گھر ڈاکہ ڈلوا تمہارا وہ گھٹیا ڈاکو میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔"

"بہت جلد تم اپنا کچھ بھی نہ بچا سکو گی۔" یہ کہہ کر منزہ پاؤں پٹختی باہر نکل گئی اور راج نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کامران کو اپناؤں گی۔" اسے اپنی ہی آواز سنائی دی اور اس نے گھبرا کر دیواروں کو دیکھا۔ "یہ... یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ بڑبڑائی۔ "اے اللہ یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ انھیں میں بھائی جان کہتی ہوں۔ وہ مجھے بہن کتنے پیار سے کہتے ہیں۔"

"جھوٹ۔" اس کے اندر کی لڑکی بولی۔ "اقرار سے فرار کیوں کرتی ہو۔ کیا تم نے پہلی دفعہ اسے دیکھ کر یہ نہ سوچا تھا کہ کاش منزہ سے پہلے تمہیں وہ ملا ہوتا۔ کیا تم اس کی مردانہ وجاہت سے مرعوب نہیں ہو۔ کیوں اپنے آپ کو جھوٹے سہاروں میں اُلجھانا چاہتی ہو۔ موقعے سے فائدہ اٹھاؤ۔ قدرت نے ایک راہ پیدا کر دی ہے اور اب تم منطق کے گرداب میں اپنے آپ کو پھنسا کر کھلی حماقت کا ثبوت دینے لگی ہو۔"

"سب کچھ درست سہی۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بڑبڑائی۔ "مگر میں اپنے مقام سے نیچے نہیں گر سکتی۔ کامران کی نظروں میں جو میرا مقام ہے اگر میں اس سے گر گئی تو مجھ میں اور منزہ میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ وہ بُری ہے تو میں ضد میں آ کر کیوں بُری بن جاؤں۔"

"کیا وہ تمہارا حقیقی بھائی ہے؟ کیا شریعت تمہارے آڑے آئے گی۔ کیا کوثر اپنے منگیتر کو شادی ہونے تک بھائی جان نہیں کہتی رہی؟" اس کے جذباتی الضمیر راج نے دوسرا وار کیا۔

"میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں نے اسے بھائی جان کہا ہے وہ مجھے بہن سمجھتا ہے چھوڑو۔ ضروری تو نہیں خون کا رشتہ ہی مقدس اور اٹوٹ ہو۔ رشتے اور بھی تو ہوتے ہیں۔ دل کا رشتہ، روح کا رشتہ اعتماد کا رشتہ، خلوص کا رشتہ۔"

"یعنی تم یہ موقع ضائع کر دو گی؟"

"ہاں۔" راج پُراعتماد آواز میں بولی۔ "میں وہی کروں گی، جو میرے رشتے کا تقاضا ہے۔ مجھے وہی کچھ کرنا پڑے گا جو ایک بہن بھائی کے لئے اور ایک سچی دوست اپنی دوست کی خاطر کر سکتی ہے میں اپنی پوزیشن بچانے کی خاطر ان دونوں میں صلح کراؤں گی۔ میں اپنے مقام اور وقار کی عزت کے لئے اندر کی ہاتھی اور راکھشش راج کا گلا گھونٹ دوں گی اور صرف راج زندہ رہے گی۔ بہن کا پیار زندہ رہے گا۔ ایک بہن اپنے بھائی کے لئے زندہ رہے گی۔ سہیلی اپنی سہیلی کی خوشی کی خاطر سب کچھ کر گزرے گی چاہے مجھے

اپنا مقصد حل کرنے کے لئے ان دونوں کے پاؤں بھی پکڑنے پڑیں تو میں ایسا کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گی۔ یہی میرا فرض ہے۔ یہی انسانیت ہے، اسی میں میرا روحانی اور ذہنی سکون ہے۔ میں منزہ سے مل کر اسے سب کچھ بتا دوں گی۔ اس کی غلط فہمی دور کر کے کامران کے پاس خود لے جاؤں گی اور کامران میرے اچھے بھائی جان بڑے ظرف والے ہیں۔ وہ میری بات کبھی رد نہیں کریں گے وہ گری ہوئی منزہ کو اُٹھا لیں گے۔ اے میرے خدا مجھے توفیق دے۔ وہ ایک عزم اور شوق سے اُٹھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر طمانیت کی روشنی تھی۔

راج نے آفس میں جاتے ہی کامران کے نمبر ڈائل کئے اور ہیلو کہتے ہی بولی۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"تمہیں بلانے کے لئے جھوٹ ہی بولنا پڑے گا۔ سخت بیمار ہوں۔" کامران نے جواباً کہا۔

"مگر میں جانتی ہوں میرے بھائی جان جھوٹے نہیں۔" راج نے پیار سے کہا۔

"جلدی آجاؤ ـــــ" کامران بولا۔ "میں سخت بور ہو رہا ہوں۔"

"شام تک آسکوں گی اور ساتھ ہی اپنی بھابی کو بھی لاؤں گی۔"

"کیوں زخم کریدتی ہو راج۔" کامران بے حد دُکھی انداز میں بولا۔ "اس ظالم کو مجھے لئے دو۔"

"نہیں بھائی جان آپ کو میری خاطر اس کی غلطی کو معاف کرنا پڑے گا۔ وہ ابھی میرے پاس آئی تھی۔"

"راج ـــ!" کامران اسی لہجہ میں بولا۔ "کیا تم مجھے اتنا ہی گرا ہوا سمجھتی ہو۔ راج مجھے مجبور نہ کرنا۔ اب میں جیتے جی وہ کمتی پیچھے نکل سکتا ہوں۔ نہیں راج وہ اب ہماری نہیں رہی۔ اس کا ذکر اب بھول کر بھی نہ کرنا۔ ہاں یہ تو بتاؤ وہ تمہارے پاس کیوں آئی تھی کیا تمہاری سفارش چاہتی ہے؟"

"نہیں،" راج نے کہا۔ "وہ طلاق نامہ لینے آئی تھی اور گرج برس کر چلی گئی۔ مجھے اس سے یہ اُمید نہ تھی۔"

"اُمید؟" کامران ہنسا۔ "پگلی وہ تو ہے ہی اُمیدوں کی قاتلہ اس نے میرے اعتماد کو توڑا۔ میرے پیار پر ٹھوکا۔ میرے ارمانوں کا خون کیا۔ میری اُمیدوں پر بجلی بن کر گری۔ اس نے کیا کچھ نہیں کیا راج۔ کامران کی زندہ دلی اور سکون تک غارت کر گئی

ـــــ"

"وہ جاتے جاتے مجھے دھمکی دے گئی ہے۔"

"دھمکی؟" کامران کی آواز سے تعجب عیاں تھا۔ "لیکن کیوں ـــ؟"

"وہ یہ سمجھتی ہے کہ میں اس کی جگہ لے رہی ہوں۔" راج نے اٹک اٹک کر کہا اور شرم سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"کمینی ہے ذلیل ـــ،" کامران نے دانت پیس کر کہا۔ "تم دل چھوٹا نہ کرو راج، وہ خود اپنا منہ کالا کر کے ہمیں بدنام کرنا چاہتی ہے۔"

"میں نہیں چاہتی یہ معاملہ آگے بڑھے۔" راج نے ٹھہرے انداز میں کہا۔ "اور اس وقت ممکن ہے کہ آپ منزہ کو معاف کر دیں ورنہ میں اب آپ سے کبھی نہیں ملوں گی اور دور رہ کر اپنے بھائی جان کے لئے دُعا کرتی رہا کروں گی۔"

"راج ـــ!" کامران گلوگیر آواز میں بولا۔ "کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں اپنی ماں کو بے سہارا چھوڑ کر مر جاؤں۔ کیا یہ تمہاری خواہش ہے کہ کامران اپنے اس بھائی کی خوشیاں نہ دیکھ سکے جسے اس نے اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے۔"

"بھائی جان ـــ!" راج چیخ پڑی۔ "آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں ـــ؟"

"باتیں تو راج ایسی کرتی ہے۔ راج کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں منزہ کے لگائے ہوئے زخم کو کیوں سہہ گیا۔ راج صرف تمہارے دم کے سہارے۔ تم ہی میرے زخموں کی مرہم ہو راج۔ اگر تم نہ ہوتیں مجھے تمہارا سہارا نہ ملتا تو ان کاری زخموں سے میں کب کا مر گیا ہوتا۔ اب تم بھی مجھے چھوڑنا چاہتی ہو۔ تمہاری مرضی راج۔ میں تو دُکھی ہوں ہی مگر تم خود غرض کیوں بن رہی ہو؟"

"نہیں کامران بھائی آپ مجھے غلط نہ سمجھیں، میں تو آپ کی ازدواجی زندگی خوشگوار دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہر مرض کی دوا ہے مگر شک کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ منزہ اب میرا وجود برداشت کبھی نہ کر سکے گی۔"

"اور میں منزہ کو برداشت نہ کر سکوں گا راج۔" کامران نے کہا۔ "اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ منزہ میرا غلط انتخاب اور جذباتی پسند تھی وہ سرے سے میرے لئے بنی ہی نہ تھی۔"

"کامران میری خاطر۔" راج زور دے کر بولی۔ "صرف ایک موقع اسے دیں۔ مجھے اُمید ہے اتنی بڑی ٹھوکر نے اس کی آنکھیں کھول دی ہوں گی اور جب غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا تو وہ سنبھل کر اپنی غلطی کی تلافی ضرور کرے گی۔"

"فضول ہے راج" کامران دھیمے لہجے میں بولا۔

"لیکن آپ میری پوزیشن کا بھی تو خیال رکھیں" راج نے کہا "گر ماگرمی میں میرے منہ سے بھی کچھ غیر ذمہ دارانہ باتیں نکل چکی ہیں۔ منزہ کی آنکھوں میں رقابت اور انتقام کے شعلے بھڑک رہے ہیں کیا خبر وہ کوئی خطرناک قدم اُٹھا بیٹھے۔ میں ایک شریف خاندان کی عزت ہوں ڈاکٹر بھائی اور جمال سے کچھ بعید نہیں۔ وہ منزہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر کیا کچھ نہیں کر سکتا"

"بُزدل نہ بنو راج" کامران مضبوط لہجے میں بولا "ابھی کامران کے ہاتھوں میں اتنی قوت ہے کہ راج کی طرف بڑھنے والا ہاتھ توڑ سکے۔ جمال نے اگر تمھارے بال کی طرف بھی دیکھنے کی حماقت کی تو کامران کے ناخن اس کی آنکھوں میں پیوست ہو جائیں گے۔ گھبرانے کی قطعی ضرورت نہیں بس ذرا عقل کی آنکھیں کھلی رکھنا"

"نہیں کامران" راج سہمی ہوئی آواز میں بولی "مجھے اس جھگڑے سے اُلجھن ہوتی ہے۔ میں آج ہی منزہ سے کسی وقت مل کر صلح صفائی کرا دونگی"

"اسے میں بالواسطہ اپنی توہین سمجھوں گا اور تمھاری حماقت"

"کچھ بھی سہی میں ضرور جاؤں گی ۔۔" راج نے اٹل فیصلہ دے دیا۔

"میری گڑیا پھر پچھتاؤ گی"

"منزہ کو منزل تک پہنچانے کے لئے اگر مجھے کسی قسم کا نقصان بھی اٹھانا پڑا تو مجھے خوشی ہوگی"

"اچھا" کامران نے لمبی سانس لی "کوشش کر دیکھو لیکن جانے سے پہلے مجھے رنگ کرنا نہ بھولنا"

"اگر یہ آپ کا حکم ہے تو تعمیل ہوگی"

"حکم نہیں بلکہ حفظ ماتقدم کے طور پر"

"بہت اچھا میں آپ کو اطلاع کر کے جاؤں گی۔ اچھا اب اجازت ۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے رسیور کھٹ سے کریڈل پر دے مارا۔

تین کب کے بج چکے تھے۔ ملازم دو بار چائے لے کر آ چکا تھا مگر منزہ نے دونوں ہی بار اسے جھڑک کر واپس کر دیا تھا۔ وہ بند کمرے میں ڈرامائی انداز میں سوچ رہی تھی۔ اس کے اندر باہر جیسے آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ دل و دماغ کے درمیان بڑی گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ وہ کبھی پلنگ پر اوندھی لیٹ کر سسکنے لگتی، کبھی اکڑوں بیٹھ کر سوچنے لگتی اور کبھی کمرے میں بے قراری سے ٹہلنے لگتی تھی۔ اس کے بال کھل کر شانوں پر بکھر آئے تھے۔ رونے سے آنکھیں سُرخ اور بوجھل ہو چکی تھیں۔ بار بار ناک سڑکنے سے سُرخ ہو گئی تھی۔ اس کے دماغ میں صرف ایک ہی سوچ تھی۔ راج سے انتقام اسے شکست خوردہ دیکھنے کی آرزو اور کامران کے شکار کو بدکانے کا جنون۔ وہ ابھی کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچی تھی کہ رانا صاحب نے بڑی عجلت میں دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ چونکی اس کے لب کھلے، بھنچے اور پھر بغیر منہ سے بولے اس نے دروازہ کھول دیا اس سے قبل کہ رانا صاحب اس کی طرف دیکھتے۔ اس نے ان کی طرف پشت کر لی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے بے بی؟" رانا صاحب نے پوچھا۔

"اچھی ہوں" وہ کرخت آواز میں بولی۔

"مجھے معلوم ہے میری بیٹی ناراض ہے" رانا صاحب نے اس کی پیٹھ پر دلاسہ دیتے ہوئے کہنا شروع کیا "لیکن بیٹی میں مجبور تھا اور میری مجبوریوں نے تمھیں دُکھی بنا دیا۔ میری مجبوری نے مجھے بہت کچھ گوارا کرنے پر مجبور کر رکھا تھا مگر میری بچی اب وقت بدل چکا ہے۔ میری مجبوریاں ہار گئی ہیں۔ جیت میری ہوئی ہے۔ اور میں آج اپنی بیٹی کے سامنے آنکھیں اٹھا کر بات کر سکتا ہوں تمھیں یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ اب اس کوٹھی کی مالک میری منزہ ہے میں نے قرض ادا کر دیا ہے"

"شکریہ ابو جان" منزہ جلتی ہوئی انگیٹھی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

"اور سُنو اب جمال یہاں نہیں آئے گا" رانا صاحب نے دردار لہجے میں بولے "میں اسے بہت ہی مجبور ہو کر برداشت کئے ہوئے تھا" منزہ ایک جھٹکے سے پلٹی، جیسے اسے اپنے ابو کے دماغی توازن پر شک گزرا ہو۔

"مجھے تمھارے دُکھ کا احساس ہے بے بی لیکن اب سب ٹھیک ہو جائے گا تمھیں تمھارا کامران مل جائے گا۔ ہاں میں وکیل کے پاس جا رہا ہوں۔ وکیل سے کوٹھی کے کاغذات لینے ہیں۔ رات کھانا مل کر کھائیں گے"

منزہ انھیں خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہ گئی اور وہ واپس باہر نکل گئے۔ تب وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"جمال اب یہاں نہیں آئے گا" اس نے یہ کہہ کر کھوکھلا سا قہقہہ لگایا "تمھیں تمھارا کامران مل جائے گا" وہ ایسے قہقہے لگا رہی تھی جیسے واقعی اس کا دماغ چل گیا ہو "جمال! او بیچارہ کیسے

نہیں آئے گا اسے تو اب آنا چاہیئے۔ جمال اس گھر کی بساط کا ایک اہم مہرہ تھا اس کا کام ہی اب شروع ہوگا۔ اس مہرے سے میں اپنے من کی آگ بجھاؤں گی۔ اس مہرے کو ابھی خطرناک چال چلنی ہے وہ پھر لڑکھڑا کر ہنسی اور عین اسی وقت دوسرے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی اور وہ ہنستی ہوئی پردہ ہٹا کر دوسرے کمرے میں داخل ہوگئی۔

"جی فرمایئے" منزہ نے مادتہ ہنسی میں کہا اور پھر اچھل پڑی۔ "تم ۔۔۔ !"

"ہاں ڈیئر مس" دوسری طرف راج کے سوا کوئی نہ تھا۔

"مجھے افسوس ہے۔ منزہ غصے میں زبان بہک گئی تھی۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔"

"بس ۔۔۔" منزہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "اتنی جلدی، ابھی تو بات صرف میری سوچ تک ہی محدود ہے۔ عمل تو ابھی باقی ہے ۔۔۔"

"میں شرمندہ ہوں منزہ" راج نرم آواز میں بولی۔ "ہم دونوں یہ بھول گئی تھیں کہ ہم ماضی میں کیا تھیں۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ تم نے شک میں جو کچھ کہا اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو ایسا ہی شاید کرتی میری بہن فون پر تفصیل ٹھیک نہیں۔ میں تمہارے پاس آرہی ہوں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔"

"یہ چال کہیں اور چلنا مکار لڑکی" منزہ دھاڑی۔

"اوہ منزہ خدارا مجھے غلط نہ سمجھو میں اب بھی تمہاری بہن ہوں مجھے حالات پر سے پردہ اٹھانے کی مہلت دو مجھے اُمید ہے کہ تم حقیقت کو معلوم کر کے مجھے ضرور گلے لگا لوگی۔"

"ہوں" منزہ کچھ سوچتے ہوئے غرائی۔ "اگر تم آنا ہی چاہتی ہو تو چھ بجے آسکتی ہو۔ اس سے پہلے میں نہ مل سکوں گی" راج نے کچھ کہنا ہی چاہا مگر منزہ نے فوراً سلسلہ منقطع کر دیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر منزہ لا بنے لا بنے قدموں سے کچن میں گئی۔ لڑکا اسے دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ چور کی داڑھی میں تنکا ہوتا ہے۔

"جمال کہاں ہے ۔۔۔؟" منزہ نے پوچھا اور لڑکا گھگھیا کر رہ گیا۔ "بولتے کیوں نہیں ۔۔۔؟" منزہ نے بہت ضبط کے باوجود صبح کا غصہ ایک دھڑلے سے جتایا۔

"جی ۔۔۔ جی ۔۔۔ وہ میری کوٹھری میں ہیں۔"

منزہ وہاں سے اسی تیزی سے باہر نکلی اور طوفان کی طرح کوٹھری میں جا گھسی۔ جمال لیٹا سگریٹ پی رہا تھا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھا۔

"ارے آپ یہاں کیا کر رہے ہیں" منزہ نے مسکرا کر کہا۔ "توبہ اللہ کب سے ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔"

"وہ ۔۔۔ وہ بات دراصل یہ تھی تھکا ہوا تھا لیٹتے ہی سو گیا" جمال کو بڑا تعجب تھا کہ منزہ اتنی ملائم کیوں ہوگئی اور اس نے صبح کا واقعہ یاد کیا اور معنی خیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھل گئی۔

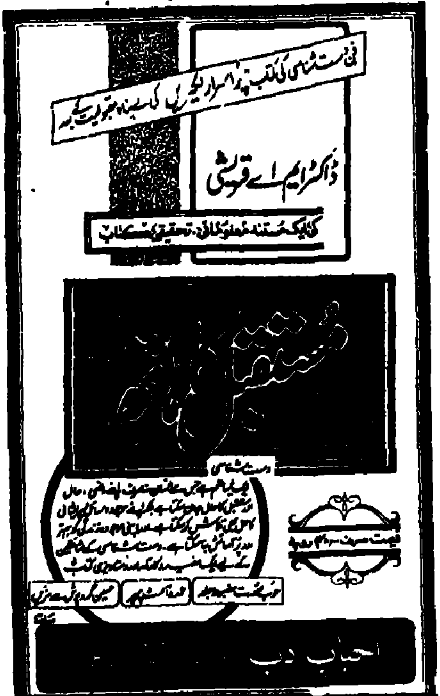
"آیئے کمرے میں بیٹھتے ہیں" منزہ نے کہا۔

"زہے نصیب" جمال اُٹھتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ پہلے تو جمال احتیاطاً منزہ سے ہٹ کر بیٹھا پھر منزہ کی مسکراہٹ نے اسے جیسے اپنے قریب آنے کی دعوت دی۔ وہ اُٹھ کر اس کے قریب ہوگیا۔

"ہٹیئے میں آپ سے نہیں بولتی" منزہ ایک ادا سے پرے ہٹ گئی۔

"اوہ ۔۔۔" وہ ہنسا۔ "ایسی حسین غلطیاں حسن کے حضور سرزد ہو جایا کرتی ہیں۔ بہرحال میں معافی چاہتا ہوں۔"

"جمال ۔۔۔!" منزہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی "جو تم جانتے ہو اب میں کامران کی نہیں رہی مجھے تمہارا سہارا لینا پڑے گا لیکن"



"لیکن کیا۔۔؟" جمال بے چین ہوگیا۔
"ہمارے درمیان ایک چٹان حائل ہوگئی ہے۔"
"وہ کون ہے، کیا کامران۔۔؟"
"نہیں کامران کی نئی محبوبہ راج۔ وہ تمہارے خلاف کامران کو ورغلا رہی ہے اور تم جانتے ہو کہ کامران ایک ذی حیثیت ڈاکٹر ہے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ مجھ سے انتقام لینے کی خاطر تمہیں قانون کے حوالے کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔"
"اوہ۔۔" جمال بھیڑیئے کی طرح غرّایا۔ "اس کی یہ جرأت، تم بتاؤ کیا چاہتی ہو؟"
"راج کا خاتمہ" منزہ کے چہرے پر سفاکی آگئی۔
"ختم کردی جائے گی اور کچھ۔۔۔؟"
"بس وہ چھ بجے یہاں آرہی ہے بہترین موقعہ ہے۔"
"اگر وہ اپنے پیچھے کوئی نشان چھوڑ آئی تب۔۔۔" جمال نے کہا۔
"میرا خیال ہے وہ ایسا نہیں کرے گی۔" منزہ نے جواب دیا۔ "پرائیویٹ معاملات میں خود مختار ہے۔"
"کام مشکل اور خطرناک ہے۔" جمال نے کاروباری لہجہ اختیار کرلیا۔ "لیکن میں تمہاری خاطر درجنوں زندگیاں ختم کرسکتا ہوں بشرطیکہ تم اپنے وعدے کا مجھے یقین دلادو اور وہ بھی تحریری۔"
"کیا مجھ پر تمہیں اب بھی بھروسہ نہیں۔۔؟" منزہ نے چونک کر کہا۔
"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے فضول جھک ماری ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ۔۔۔ ہاں اب انتظار کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے۔"
"تو پھر بتایئے نا اسے کہاں لے جایا جائے۔" منزہ نے پھر مطلب کی بات کی۔
"تم بے فکر رہو ایک پڑیا میری جیب میں موجود ہے چائے میں کسی طرح ڈال دینا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔"
"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اسے مارنے کی بجائے کچھ اور کیا جائے۔۔؟" منزہ نے کہا۔
جمال نے اُچکے لوفروں کی طرح کہا۔ "جمال کیا نہیں کرسکتا۔"
"تو بس ٹھیک ہے اسے کہیں دُور پہنچا دیجئے مگر ایسا نہ ہو کہ بلّی کی طرح سات دن بعد واپس آدھمکے۔"
"مطمئن رہو، جمال ایسی کتنی دیویاں یاترا بھیج چکا ہے اور ابھی تک کوئی بھی واپس نہیں آئی۔"
"اوہ۔۔" منزہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ "ساڑھے پانچ ہونے کو ہیں آپ اسی کوٹھڑی میں چلے جائیں۔ میں اس کو بے ہوش کرکے آپ کو بلالوں گی۔"
"ٹھیک ہے۔" جمال نے جیب سے خاکی کاغذ کی پڑیا نکال کر منزہ کو دے دی اور خود باہر نکل گیا۔

پانچ بج کر بادن منٹ پر ایک ٹیکسی گیٹ پر آکر رُکی اور بریک کی آواز پر برآمدے میں کھڑی منزہ کا دھڑکتا ہوا دل یوں ڈوبا جیسے بھرا ہوا لوٹا پانی کی سطح پر اُبھر کر پھر ڈوب گیا ہو۔ اس نے ستون کا سہارا لے کر بائیں ہاتھ سے سینہ تھام لیا ہو۔ وہ دیکھ رہی تھی راج ٹیکسی سے اُتری اور ٹیکسی چل پڑی تھی۔ غالباً ٹیکسی اس کی اپنی ہی تھی کیونکہ کرایہ لئے بغیر وہ واپس ہوگئی تھی یہ خطرے کا پہلا الارم تھا کہ راج اپنی ہی ٹیکسی پر آئی تھی۔ یہ بات منزہ کی اسکیم کے منافی تھی۔ ابھی وہ کچھ زیادہ سوچ بھی نہ سکی تھی کہ راج مسکراتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اس سے یوں لپٹ گئی جیسے برسوں بعد مل رہی ہو۔ منزہ نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ راج رو رہی تھی۔ راج ہنس رہی تھی۔ آنکھیں برس رہی تھیں۔ ہونٹ مسکرا رہے تھے۔
"آؤ اندر چلیں۔" منزہ منہ پھیر کر بولی اور دونوں ڈرائنگ رُوم میں جاکر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ راج اپنے جذبات کو روکنے کی کوشش کررہی تھی۔ منزہ کا ذہن جُرم کی راہیں بنانے میں معروف تھا۔ ایک طرف محبت، مروت اور پشیمانی کے چشمے اُبل رہے تھے تو دوسری طرف نفرت، کینہ اور انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔
"منزہ۔۔" راج بھرائی آواز میں بولی۔ "کیا ہماری اس محبت اور دوستی کا یہی انجام ہے۔۔۔؟"
"ہاں۔۔" منزہ غرّائی۔ "جس محبت اور دوستی میں ذاتی اغراض شامل ہوں اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔"
"کس طرح یقین دلاؤں میری بہن کہ تم بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ میری اچھی سہیلی راج کی رگوں میں پانی نہیں بلکہ ایک پاک دامن کے دودھ کا صاف خون ہے۔"
"ہوگا۔" منزہ لاتعلق سی ہوکر بولی۔
"اپنی مرحومہ ماں کے دودھ کی قسم کھا کر کہتی ہوں منزہ کامران کو میں اپنا ماں جایا بھائی سمجھتی ہوں۔ اس کی شرافت اور نیکی نے

تمھیں غلط فہمی میں ڈال دیا ہے۔ وہ نہ تو آوارہ ہے اور نہ ہی ہرجائی بلکہ وہ اتنا ہی معصوم ہے جتنا ایک بچہ، وہ بہت دُکھی ہے منزہ۔ تم نے اسے مسکراتے ہی دیکھا ہے۔ تم نے صرف اس کی محبت انگیز باتیں ہی سُنی ہیں۔ کاش تم نے کامران کی مسکراہٹ کے پیچھے کبھی جھانک کر اس کا دُکھ بھی دیکھا ہوتا۔ وہ رات رات بھر باہر رہنے لگا تھا۔ تم نے یہ جانے بغیر کہ وہ کہاں اور کیوں باہر رہتا ہے۔ اسے ہرجائی اور آوارہ سمجھ کر اپنا تعلق توڑ دیا ہے۔ میری انجان منزہ میں تمھیں بتاتی ہوں کہ تمھارا کامران اور میرا دُکھی بھائی راتیں کہاں گزارتا تھا۔"

راج کامران کی دُکھ بھری داستان سناتے ہوئے رو رہی تھی۔

"کیا واقعی یہ سب کچھ حقیقت ہے؟"

اسے تذبذب میں دیکھ کر راج نے اپنے پرس میں سے نیلے رنگ کا ایک لفافہ نکال کر منزہ کے حوالے کر دیا۔

"مزید تسلی کے لئے اسے بھی پڑھ لو۔ یہ پچھلے دنوں جب میرا ٹیلی فون خراب تھا کامران نے مجھے بھیجا تھا۔"

منزہ نے کامران کی تحریر پہچان لی تھی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافے سے خط نکالا اور پڑھنے لگی۔

میری پیاری بہن راج!

کئی بار فون کر چکا ہوں مگر جواب نہیں ملا۔ کیا کہوں؟ امی حضور کی حالت زیادہ خراب ہو چکی ہے تنویر کے پیپر شروع ہیں۔ میں منزہ کا لگایا ہوا زخم چاٹ رہا ہوں، اور تم نہ جانے کہاں مصروف ہو۔ اگر میرے حال پر رحم کھاؤ تو فوراً چلی آؤ۔ تاکہ تنویر کو پڑھنے کا کچھ وقت مل سکے۔ تم بھی سوچو گی کہ اچھا بھائی ملا لیکن میری بہن ماں کی خدمت ہر بیٹی پہ فرض ہے

تمھارا بھائی کامران

"راج۔۔۔" منزہ نے خط پڑھ کر کپکپاتی آواز میں کہا۔ اس وقت اس کے ہونٹ شدت جذبات سے کانپ رہے تھے۔

"میں۔۔۔ میں بہت بُری ہوں راج۔"

"نہیں منزہ۔۔۔" راج خوشی سے بولی۔ "تم بہت اچھی ہو۔"

"میں نے۔۔۔ وہ پھوٹ پڑی۔" راج میں نے کامران پہ بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ میں تمھاری مجرم ہوں راج، میرے منہ پہ تھوکو راج۔"

"میں اس چاند کے ٹکڑے کو صرف چوم سکتی ہوں۔"

راج نے اُٹھ کر منزہ کے گال پہ ہونٹ رکھ دیئے اور منزہ نے کہاں سے لپٹ گئی۔ میری راج، میری بہن! مجھے معاف کر دو اور مجھے ابھی کامران کے پاس لے چلو۔ میں ان کے قدموں میں سر رکھ دوں گی۔ لے چلو راج۔"

"ضرور لے جاؤں گی۔" راج نے اس کے بالوں پہ چہرہ رگڑتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمھیں لینے آئی ہوں۔ چلو ذرا منہ دھو کے کپڑے بدل ڈالو۔"

منزہ آنسو پونچھتے ہوئے اُٹھی اور راج اُٹھ کر کامران کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ منزہ ابھی دروازے سے دو قدم ادھر ہی تھی کہ اُسے یوں لگا جیسے کمرے کی چھت گر پڑی ہو۔

جمال دروازے کے وسط میں ٹانگیں پھیلائے خونخوار انداز میں کھڑا اُسے گھور رہا تھا۔

"اوہ۔۔۔" منزہ بوکھلا کر بولی۔ "ادھر میری فرینڈ ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ سپاٹ لہجے میں غرّایا۔

"آیئے میں آپ کو ملاتی ہوں۔"

"منزہ۔۔۔!" جمال دھاڑا اور منزہ لڑھک کر دُور جا پڑی عین اسی وقت کامران فون پہ سلسلہ قائم کر چکا تھا۔ اس نے یہ دھاڑ سُن لی تھی۔

"کامران بھائی! جمال۔۔۔" راج ماؤتھ پیس میں چیخی اور پھر کامران کو گھڑگڑاہٹ کی آوازیں سنائی دیں جیسے فون کرنے والے کا منہ کسی نے آ کر بند کر دیا ہو اور ریسیور گر پڑا ہو، ہوا بھی یہی تھا۔ جمال نے لپک کر راج کو دھکا دیا۔ وہ صوفے کے ہتھے پر جا لگی۔ منزہ دوڑ کر دروازے کے پاس گئی مگر دروازہ شاید باہر سے بند تھا۔ جمال ان کی ساری باتیں سُن کر مکمل بندوبست کر کے ہی اندر آیا تھا۔ راج صوفے پہ اوندھی پڑی اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور منزہ دروازے کے ساتھ لگی اس بے بس کبوتری کی طرح کانپ رہی تھی جیسے کسی باز بٹ نے نرغے میں لے رکھا ہو اور جمال دونوں کے درمیان کھڑا تھا۔

"او ہو۔" وہ بھیڑیئے کی طرح غرّا کر بولا۔ "تم کامران کے پاس جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔" منزہ نے کہا۔ "میں اپنے گھر جا رہی ہوں اور تم مجھے نہیں روک سکتے۔ تم جھوٹے اور ذلیل انسان ہو۔ تم نے مجھے کامران کے خلاف بہکایا تھا۔ تم ہی نے کامران کی رپورٹیں دی تھیں۔ چال باز انسان اب میں تمھاری کوئی بات نہیں سُنوں گی۔"

"باتوں کا اب وقت بھی کہاں ہے۔" جمال نے کہا۔ "اب تو عمل کا وقت آ گیا ہے اور یہ۔۔۔" وہ بولتے بولتے پھرتی سے نیچے جھک گیا اور راج کا پھینکا ہوا گلدان دیوار کے ساتھ جا لگا۔

"میرا نام جمال ہے اور پیشہ غنڈہ گردی ہے۔ اُستانی صاحبہ آپ آرام سے بیٹھیں آپ کو میں بالکل نہیں بھولا۔ آپ کی مہمان نوازی بھی ضرور کی جائے گی۔"

"ہاں منزہ" وہ پھر پلٹ کر منزہ سے مخاطب ہُوا۔ "اگر یہ تمھارا خیال ہو کہ کامران اب تمھیں بچالے گا تو یہ تمھاری خوش فہمی ہے کامران کو صرف اپنی بہن . . . یہ لو یہ گولی نگل جاؤ . . . منہ کھولو ــ"

"نہیں" منزہ نے اپنا منہ ہاتھوں میں دبالیا۔

"جمال" راج بولی۔ "کامران میری آواز سن چکا ہے۔ وہ چند منٹ تک یہاں پہنچ جائے گا اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"وہ بزدل ڈاکٹر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا" جمال نے کہا۔ "اس کا استقبال میں گرم سیسے سے کروں گا" اس نے جیب سے ریوالور نکال کر کہا اور منزہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا راج کے قریب چلا گیا۔ راج نے تڑپ کر منزہ کو بچانا چاہا مگر جمال کا آہنی مکا اپنا کام کر گیا۔ منزہ لڑکھڑائی، سنبھلی اور پھر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی جمال نے اسکے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور پھر راج کی طرف بڑھا جو اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مجھے افسوس ہے مس راج۔ تم نے ہاتھی کے منہ سے گنا چھیننے کی حماقت کی ہے میں تمھیں زندہ چھوڑ دوں گا تاکہ تم اپنے بھائی کو ماتم کرتی لو اور اسے آنکھوں دیکھا حال سُنا سکو۔ ہاں اس گیدڑ کو میرا پیغام دے دینا کہ منزہ کی تلاش میں میرا پیچھا نہ کرے ورنہ وہ اپنی ماں سے پہلے دوسری دُنیا میں چلا جائے گا۔ اب آؤ" وہ راج کو اٹھانے اس پر جھکا اور پھر ایک جھٹکے سے اُسے واپس اُٹھنا پڑا۔ راج نے اس کے مُنہ پر تھوک دیا تھا۔

"ذلیل انسان مجھے ہاتھ نہ لگانا" راج اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں منزہ کی طرح بزدل نہیں ہوں۔ تم جیتے جی راج کو برباد نہیں کر سکو گے۔ میں اپنی عزت پر جان دے دوں گی" راج نے قریب پڑے ریوالور پر جھپٹا مارا اور پھر اس کی چیخ نکل گئی کیونکہ جمال کا وزنی بوٹ اس کے ہاتھ پر آچکا تھا۔

"جمال ــــ!" منزہ چیخی۔ "راج کو جانے دو۔ میں تمھارے ساتھ چلوں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں جمال، اسے چھوڑ دو۔"

"ہرگز نہیں۔ میں ڈاکٹر کو دوہرا زخم لگاؤں گا۔ مس راج! مجھے جبر پر مجبور نہ کرو" جمال نے راج کو بالوں سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔

"او میرے خدا" راج سسکی۔ "میری عزت بچالے۔"

"اونہہ ــ!" جمال طنزاً ہنسا۔ "کبھی کامران، کبھی خدا مگر یہاں تو بچانے کوئی نہیں آئے گا۔" ٹھیک اسی وقت پہلے برآمدے میں کسی کے دوڑنے کی آواز آئی پھر دروازہ اس زور سے دبایا گیا جیسے ابھی ٹوٹ کر اندر آپڑے گا۔

"راج ــــ! منزہ ــــ!" کامران کی آواز تھی۔

"بھائی جان!" راج کی چیخ سنائی دی۔

"میں محفوظ ہوں میری بہن" کامران نے کہا اور ساتھ ہی بڑے زور سے اس نے دروازے کو دھکا دیا اور اندر سے پھر جمال نے فائر داغ دیا۔ کامران دراصل جمال سے فائر کروانا چاہتا تھا کہ گولیاں ختم ہو جائیں اور جمال کو بھی اس وقت ہوش آیا جب صرف ایک گولی باقی تھی اور اس کی ہار جیت کا انحصار اب صرف اس آخری گولی پر تھا۔ وہ یہ آخری گولی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ادھر کامران کی زور آزمائی دروازے کی چولیں ہلا رہی تھی۔ جمال کمرے کے وسط میں کھڑا ہلتے ہوئے کواڑوں کو دیکھ رہا تھا۔

"ڈاکٹر ــ!" جمال نے کہا۔ "جمال نے ہار کبھی نہیں مانی اور اب بھی جیت میری ہی ہوگی۔ تم منزہ کو نہ پا سکو گے۔ ایک گولی میرے ریوالور میں موجود ہے اور اس کا نشانہ تمھاری بیوی ہوگی اور تم خالی ہاتھ مجھے روک سکو گے ڈاکٹر۔"

"کامران ــ!" منزہ پیٹ کے بل لیٹی تڑپی۔ "بچاؤ کامران میں مرنا نہیں چاہتی۔"

راج نے سوچا: "صرف ایک گولی۔" وہ اپنی ہی سوچ پر کانپ گئی: "کامران کی خوشی منزہ ہے اسے نہیں مرنا چاہیئے۔ مجھے اپنے بھائی کی خوشی اپنی جان سے بھی عزیز ہے۔ یہ گولی اگر منزہ کی بجائے راج کو لگ جائے تو کیا ہوگا۔ کچھ بھی نہیں راج کسی کی آواز نہیں۔ راج کسی کی خوشی نہیں، راج کا کوئی نہیں، راج صرف ایک بہن ہے۔" وہ ایک عزم سے اٹھی اور انجام سے بےخبر جمال پر ٹوٹ پڑی۔ جمال اس ناگہانی حملے کے لئے تیار نہ تھا لیکن جری مرد تھا۔ بہت جلد سنبھل گیا۔ راج کا جسم بیری کا جھاڑ بن گیا۔ جمال اسے اپنے سے علیحدہ کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن وہ ربڑ کی طرح دب کر پھر اپنی جگہ آجاتی تھی۔ ابھی ان دونوں میں زور آزمائی شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک کواڑ دھم سے اندر آن گرا۔ جمال نے گھبرا کر اُدھر دیکھا۔ عین اسی لمحے راج نے اس کے ریوالور کو پکڑ لیا تھا۔ ریوالور کی نال اب راج کی طرف تھی۔ جمال نے اپنی پوری کوشش کی کہ

کس طرح رہا اور کو چھوڑنے مگر وہاں راج تھی جس کے خلوص میں ہمارے جہاں سے اپنی پوری کوشش سرف آئی تھی، جس کے جذبۂ ایثار میں پہاڑوں کا ماعزم تھا۔ کامران نے تھوڑا جھک کر اندر دیکھا اور پوزیشن کو سمجھ کر اس نے اندر چھلانگ لگا دی۔ ایک دھماکہ ہوا۔ کمرے میں باریک چیخ ابھری اور جب کامران کچھ سمجھنے کے قابل ہوا تو ڈرامہ ختم ہو چکا تھا۔ راج خون میں لت پت فرش پر پڑی تھی اور جمال بھاگ کر کھڑکی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کامران نے عقب سے اس پر چھلانگ لگائی اور جمال پلٹ کر گرم لوہے کی طرح کامران سے چمٹ گیا تھا۔ کامران گو بیمار تھا مگر جسمانی لحاظ سے جمال سے بہتر تھا۔ پھر وہ اپنے زمانے کا مانا ہوا باکسر تھا۔ چند ہی ماہرانہ ٹکروں نے جمال کو فرش چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جمال کے گرتے ہی کامران نے دوڑ کر راج کا دوپٹہ اٹھایا اور جمال کے ہاتھ پلنگ کے پائے سے جا کر کس دیئے۔ ویسے بھی جمال بے ہوش ہو چکا تھا۔

"راج ــــ! میری بہن!" کامران نے راج کا سر اپنی آغوش میں رکھ لیا اور بڑی تیزی سے اس کے ہاتھ زخم دیکھنے میں مصروف تھے۔ گولی دائیں کندھے کو پھاڑ کر نکل گئی تھی۔

"بھائی جان ــــ!" راج نے نیم وا آنکھوں سے کامران کو دیکھا۔

"گھبرانا نہیں راج" کامران زخم بند کرتے ہوئے بولا۔ "زخم بہت ہی معمولی ہے۔"

"کامران ــــ!" منزہ نے کراہ کر پکارا اور کامران نے پلٹ کر دیکھا اور اس کی پیشانی پر ناخوشگوار سلوٹیں ابھر آئیں۔ "میری راج زندہ ہے نا ــــ؟"

وہ پیٹ کے بل رینگ رہی تھی۔ "مجھے کھول دو کامران۔"

"ذلیل عورت" کامران منزہ کی طرف دیکھ کر غرایا۔ "اس معصوم نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔"

"بھائی جان ــــ!" راج نے اپنا خون آلود ہاتھ کامران کے منہ پر رکھ دیا۔ "منزہ کو کچھ نہ کہیئے۔ یہ بے قصور ہے۔ ہم دونوں آپ کی طرف آ رہی تھیں کہ وہ آ گیا۔"

"میری راج" منزہ اب اس کے قریب آ چکی تھی۔ "میری بہن" اس نے اپنا سر راج سے لپٹ لیا اور اپنا چہرہ اس کے خون آلود سینے سے رگڑنے لگی تھی۔

"ڈاکٹر! اسے بچا لیں۔ اسے زندہ رہنا چاہیئے۔ میں نے ابھی اس سے اپنی گستاخیوں کی معافی نہیں مانگی۔ میں نے ابھی اس کے پاؤں کی خاک کو آنکھوں میں نہیں سجایا۔ بچا لو اس کو کامران۔ خدارا کامران کچھ کرو۔ میری راج مر رہی ہے۔ تم بیٹھے دیکھ رہے ہو۔"

منزہ نے کامران کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"میں ٹھیک ہوں منزہ" راج نے آنکھیں کھول کر اسے سہارا دیا۔

"بھائی جان میں اٹھ سکتی ہوں مجھے سہارا دیجئے" کامران نے اسے سہارا دیا اور راج اپنا ہاتھ منزہ کے کندھے پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم راج کو فوراً اپنے گھر لے چلو" کامران نے پہلی مرتبہ نرم لہجے میں منزہ سے کہا۔

"میں اس خبیث کو پولیس کے حوالے کرنے کے لئے فون کرتا ہوں۔"

"کیا وہاں سے فون بہتر نہ ہوگا؟" منزہ نے کہا۔

"بہتر ــــ" کامران نے منزہ کو دیکھا۔ "چلو میں بھی چلتا ہوں۔"

دونوں اپنی عزیز راج کو بانہوں میں لئے آہستہ آہستہ باہر جا رہے تھے اور کونے سے جمال حسرت بھری نگاہوں سے انہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔

کامران نے منزہ کو معاف کر کے پھر ایک بار منزہ کو اس سے چھین لیا تھا۔



جوڈو

جوڈو کے فن پر ایک مکمل کتاب

اب تک

موجود تمام کتب سے آسان کتاب

جمیں

جوڈو کے مکمل اور آسان طریقے تین سو سے زائد تصاویر

سے آراستہ کتاب

ناشر: [illegible]